کتابی سلسلہ 4

ادب کے زندہ لہو کی گردش

آمد

سہ ماہی اُردو

مُدیر

عظیمہ فردوسی

مُدیر اعزازی

خورشید اکبر

ادب کے زندہ لہو کی گردش

سہ ماہی اُردو

آمد

کتابی سلسلہ (۴)

نظریاتی ادعائیت کے خلاف کشادہ ذہنی رویوں کی دستاویز

جلد: (۲) شمارہ: (۴)

جولائی تا ستمبر ۲۰۱۲ء

مدیر
عظیمہ فردوسی

مدیر اعزازی
خورشید اکبر

e-mail: khursheidakbar@gmail.com
Contact:09631629952 / 07677266932

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۷

☆ ازراہِ کرم چیک اور بینک ڈرافٹ پر صرف Azeema Firdausi کا نام لکھیں۔

Canara Bank A/c No. 1967101009012,Boring Rd,Patna

IFSC Code : CNRB0001967(For Money Transfer within India)

AAMAD

Urdu Book Series (4)

July to September ' 2012
Volume:(2) Issue:(4)

Editor
Azeema Firdausi

Honorary Editor
Khursheid Akbar

اشاعت	:	جولائی تا ستمبر ۲۰۱۲ء
زرتعاون فی شمارہ	:	ایک سوروپے (=/100) ۱۵ر امریکی ڈالر
زرتعاون سالانہ (چار شمارے)	:	پانچ سوروپے (رجسٹرڈ ڈاک سے، ہندستان میں)
برطانیہ	:	۵۰ر پاؤنڈ / امریکہ (ودیگر یوروپی ممالک): ۶۰ر امریکی ڈالر
خلیجی ممالک	:	۵۰ر امریکی ڈالر / پاکستان: ۲ر ہزار روپے (ہندستانی)
بنگلہ دیش ودیگر ایشیائی ممالک	:	۳ر ہزار روپے (ہندستانی)
خصوصی معاونین	:	ایک ہزار روپے (سالانہ)
ادارہ جات سے:		ایک ہزار روپے (سالانہ)
رکنِ تاحیات	:	دس ہزار روپے (=/10,000)
کمپوزنگ	:	شجاع الزماں، آئیڈیل کمپیوٹر، مہندرو، پٹنہ۔۶ (M-09334294492)
طباعت	:	کلاسک آرٹ پریس، دہلی۔۶
زیر اہتمام	:	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵
سرورق	:	اظہار احمد ندیم

کائناتِ آمد

شہرِ مدّعا

کچھ اُصولوں کا نشہ تھا، کچھ مقدّس خواب تھے
ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے

(حسن نعیم)

"Because massive changes in society can not occur without conflict, we believe the metaphor of history as 'waves' of change is more dynamic and revealing than talk about a transition to 'postmodernism'. Waves are dynamic. When waves crash in on one another, powerful crosscurrents are unleashed. When waves of history collide, whole civilizations clash. And that sheds light on much that otherwise seems senseless or random in today's world."

['War and Anti-war' : Alvin and Heidi Toffler, page-20, pub. 1994]

منظوم اداریہ

آمد

[نغمۂ نجات/ مُکتی گیت]

● خورشید اکبر

نہیں پوچھتا کوئی رَب سے
رَب سے کوئی نہیں پوچھتا

سورج کیسے نکل رہا ہے
دَھرتی کیسے دَہک رہی ہے
پَربَت کیسے پگھل رہا ہے
مٹّی کیسے دَمک رہی ہے
چڑیا کیسے چہک رہی ہے
چشمہ کیسے اُبل رہا ہے
بجلی کیسے کڑک رہی ہے
اگنی کیسے بھڑک رہی ہے
جنگل کیسے دہل رہا ہے
موسم کیسے بدل رہا ہے

نہیں پوچھتا کوئی رَب سے
رَب سے کوئی نہیں پوچھتا

بادل کیسے تڑپ رہے ہیں
پانی کیسے برس رہا ہے
پودے کیسے پنپ رہے ہیں
منواں کیسے ترس رہا ہے
تارے کیسے بکھر رہے ہیں
چندا کیسے چمک رہا ہے
ساگر کیسے سنک رہا ہے
سپنے کیسے سنور رہے ہیں
پریم پپیہا مچل رہا ہے
موسم کیسے بدل رہا ہے

نہیں پوچھتا کوئی رَب سے
رَب سے کوئی نہیں پوچھتا

بھور کا پنچھی کیسے جاگا
دِن کا باز اُسے لے بھاگا
شام نے کالی چادر تانی
جشن منائے رات کی رانی
ماں نے خوب سنائی لُوری
راجا گورا، رانی گوری
سانولی صورت راج کماری
بول ہیں میٹھے نین کٹاری

ننھا بالک سنبھل رہا ہے
موسم کیسے بدل رہا ہے

نہیں پوچھتا کوئی رَب سے
رَب سے کوئی نہیں پوچھتا

قدرت کے یہ سارے مظاہر: کیا کہتے ہیں
فطرت کے خوش رنگ مناظر: کیا کہتے ہیں
ظاہر کے پُرپیچ عناصر: کیا کہتے ہیں
باطن سے یہ سارے جواہر: کیا کہتے ہیں
غیب کے پردے کے سب طاہر: کیا کہتے ہیں
نظر، نظارے، نور سے ناظر: کیا کہتے ہیں
کہیں فرشتے، کہیں یہ شاطر: کیا کہتے ہیں
ذرّوں کی تفتیش کے ماہر: کیا کہتے ہیں

دور پرندہ نکل رہا ہے
موسم کیسے بدل رہا ہے

نہیں پوچھتا کوئی رب سے
رب سے کوئی نہیں پوچھتا

راحت کیا ہے، رحمت کیا ہے
خیر، خوشی اور خدمت کیا ہے
قدرت کیا ہے، فطرت کیا ہے
کیا الہام، بشارت کیا ہے
کیا سجدہ ہے، امامت کیا ہے
نور کی پہلی امانت کیا ہے
انساں ذات عبارت کیا ہے
مٹ جائے تو قیامت کیا ہے

نور سمندر اُچھل رہا ہے
موسم کیسے بدل رہا ہے

نہیں پوچھتا کوئی رب سے
رب سے کوئی نہیں پوچھتا

کون آیا ہے، کیا لایا ہے
آہٹ کی صورت آیا ہے
آہٹ پر سب چونک پڑے ہیں
آمد! آمد! کس کی آمد
'آوازوں' کے اس میلے میں
تنہا دُور سسکتی آمد
کب کی آمد، کیسی آمد
منہگی آمد، سستی آمد
چاروں اور برستی آمد
کب تک آمد، کتنی آمد
جَل وِچ مین ترستی آمد
دُور کی آمد، صوُر کی آمد
یعنی یومِ نشور کی آمد
وہی ملا ہے، وہی ملے گا:

جیسا اپنا عمل رہا ہے
موسم کیسے بدل رہا ہے

نہیں پوچھتا کوئی رَب سے
رَب سے کوئی نہیں پوچھتا

رفت وگزشت سے آگے بھی ہے
دھیان کی آمد
روز نئے عرفان کی آمد
ظلمت کی اندھی بستی میں
نور بھرے ایقان کی آمد
لمبے ہجر کے بعد
وصال کے ہونٹوں پر
مُسکان کی آمد
آنکھوں میں خوشیوں کے آنسو
اور نئے امکان کی آمد
موت کے آگے
جان کی آمد
صحرا میں ہو جیسے نخلستان کی آمد
سَمے! ترے نِروان کی آمد

کون یہاں پر اٹک رہا ہے
موسم کیسے بدل رہا ہے

پٹنہ
۲۳؍جون ۲۰۱۲ء

"Freud is certainly to be remembered and honoured as one of the pioneers of scientific psychology. But it is probable that like Kepler he will be regarded as a scientist who discovered important empirical facts but was unable to sythesise these discoveries except in a primitive semi-magical framework. Kepler with his divine Sun God, lived in the religious age of physics. Freud for all his honesty lives in the mythical era of psychology."

['Studies in a dying culture' : Christopher Caudwell, Page- 103 Pub. 1990]

فرائڈ : تفسیرِ خواب سے ادب و آرٹ کی تفہیم تک

● سیّد خالد قادری

آرٹ اور آرٹسٹ یا ادب اور ادیب کو فرائڈ کے نظریات کی روشنی میں سمجھنے اور اُن کے تخلیقی عمل کا تجزیہ کرنے سے متعلق متعدد مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں اعتراف و اختلاف دونوں کا رنگ ملتا ہے۔ طبعیات، لسانیات، نفسیات اور عمرانیات کے جدید مطالعوں کے منظرِ عام پر آنے کے بعد اس مسئلہ کے کئی اور نئے پہلو بھی دریافت ہوئے ہیں۔ ان تمام تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے یہاں فرائڈ کے حوالے سے آرٹسٹ اور ادیب اور اُن کے تخیل و تخلیقیت سے متعلق چند ایسی بنیادی اور اہم باتیں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو غالباً اس موضوع پر اردو میں تحریر کردہ مضامین میں کسی ایک جگہ نہ مل سکیں ــــــ اس مساعی کا محرک کسی دانشور کے اس قول سے میرا اتفاق بھی ہے کہ آرٹ اور ادب کی ہماری سمجھ بوجھ میں ارسطو کے بعد سب سے زیادہ اضافہ شاید فرائڈ نے ہی کیا ہے۔

۱۹۱۹ میں شائع ہوئے اپنے مشہور مضمون 'The Uncanny' میں فرائڈ نے اعتراف کیا تھا کہ نفسیات کے عالمِ جمالیاتی تحقیق (Aesthetic investigations) کی جانب کبھی کبھار ہی مائل ہوتے ہیں ہر چند کہ خود اُس کی ابتدائی تحریروں نے جو Psychopathology, Screen Memory اور family Ramances، jokes اور dreams سے متعلق تھیں اس دور کے عمومی جمالیاتی تصوّرات کو بڑی حد تک متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ نیز ایسے تحلیل نفسی مطالعے بھی جو ذہنِ انسانی کی بہ ظاہر پُر اسرار کارکردگی کو معالجانہ اغراض سے سمجھنے کے لیے شروع کیے گئے تھے اس کے تخلیقی عمل کو بھی خصوصی طور پر سمجھنے کی سمت بڑھنے سے زیادہ دنوں تک نہ روکے جا سکے تھے۔ اپنے کلیدی مضمون The Interpratation of Dreams کے حوالے سے بعد کے

دنوں میں فرائڈ نے آرٹ اور ادب سے اپنی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا تھا:

"A group of men who regarded it as settled fact that the essential riddles of dreaming have been solved by the effort of the author of the present work found their curiosity aroused one day by the question of the class of dreams that have never been dreamt at all— drams created by imaginative writers and ascribed to invented characters in the course of a story."

یہاں فرائڈ نیند کے دوران دکھائی دینے والے خوابوں سے ہٹ کر ان خوابوں یا Fantasies کی بات کر رہا ہے جو کسی ادیب کا تخیل اُس کے فکشن کے لیے یا اُن میں موجود کرداروں کے لیے اختراع یا وضع کرتا رہتا ہے۔ تحلیل نفسی میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ اور ہی طرح کے خواب تھے جن کی جانب اُن دنوں وہ پہلی بار متوجہ ہوئے — چنانچہ فرائڈ نے جلد ہی یہ بھی اعتراف کر لیا کہ آرٹسٹ اور ادیب نفسیاتی مطالعے کرنے والوں کے لیے بہترین معاون اور آرٹ اور ادب اس ضمن میں بیش قیمت مواد مانا جانا چاہیے کیوں کہ تخلیق کار زمین سے آسمان تک اپنے تخیل کے بل پر ایسی تصوراتی سچائیوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں جن کا خواب عقل و فلسفہ مل کر بھی اب تک نہیں دکھا سکے۔ فرائڈ کے اس بیان اور شیکسپیر کے اہم ترین ڈرامے ہیملٹ کی مندرجہ ذیل لائنوں میں اس قدر مماثلت محض اتفاق بھی ہو سکتی ہے:

"There are more things in heaven and earth, Horatio! than are dreamed of in our philosophy."

فرائڈ کا یہ بیان واقعی معنی خیز تھا کہ اس کے نظریات اور تحلیل نفسی مطالعوں سے قبل سائنس اور فلسفہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے تھے کہ بظاہر پہیلیاں لگنے کے باوجود خوابوں کی تفہیم و تفسیر ممکن ہو سکتی ہے۔ فرائڈ نے تحلیل نفسی مطالعوں پر مبنی اپنے پیپر 'The Interpretation of Dreams' کے ذریعے خواب کی گتھیوں کو سلجھانے کے کچھ بنیادی اصول فراہم کیے تھے۔ اس سے پہلے وہ شعور و لاشعور کے مسابقتی اور مسلسل کشمکش کے اس رشتہ پر روشنی ڈال چکا تھا جو ذہن و ادراک اور انسان کی باطنی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی حد ہماری راہ نمائی کر سکتا تھا۔ خوابوں کو بھی اُس نے ایک قسم کی تخلیقات ہی مانا جو شعور و لاشعور کے مزاحمتی عمل کے ملتوی ہونے کے درمیانی وقفوں میں (ہلکی نیند کے دوران جب لاشعور کو Upper hand مل جاتا ہے) وجود میں آتی رہتی ہیں۔

"In fact dreams are works of art born of a compromise between the conscious and the unconscious"

اُس کے مطابق ذہنِ انسانی کی مسلسل وجود میں آتی رہنے والی ان تخلیقات کی تفہیم اُس کی ذہنی، تخیلاتی زندگی نیز اُس کی سوانحی تفصیلات واجتماعی لاشعور سے وابستہ یادداشت کے گہرے مطالعے کے ذریعے ممکن ہوسکتی ہے۔اس کی یہی سوچ تھی جس نے اُسے یہ بھی یقین دلادیا تھا کہ ایسے تحلیل نفسی مطالعات کے طریقۂ کار پر چل کروہ کبھی نہ کبھی آرٹ کی پہیلی کوبھی بوجھ ہی لے گا۔غور کیا جائے تو اس ضمن میں فرائڈ کا رول ازلی پہیلیوں کا حل نکالنے کا حوصلہ رکھنے والے Oedipus کا سا ہے۔تلاش وتجسس کے بے پناہ جذبے سے بھرپور ایک ایسا کھوجی جو ذہنِ انسانی کی کارکردگی کے مختلف پہلوؤں پر دسترس حاصل کرنا اوراس کے اظہار کی انجانی وحیرت انگیز جہتوں سے آشنائی کا طلبگار ہو۔

فرائڈ کے اہم ترین Psychoanalytical متون بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں لکھے گئے۔ Psychopathology of everyday life, Jokes, The Interpretation of Dreams, Studies in Hysteria,اور Three essays on the theory of sexuality وغیرہ۔مگراب تک اس نے جمالیاتی تحقیق کی جانب توجہ نہ کی تھی۔مندرجہ بالا تصنیفات میں فرائڈ نے ذہنِ انسانی کی کارکردگی سے متعلق ان تمام پیچیدہ حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی جن کو سمجھ پانا اب تک دشوار رہا تھا ہسٹریائی عمل، یادداشت کی اسکرینگ،خواب اور Nightmare یا Fantasy اور Hullucination اور /Sexual Aberration Erotic motives وغیرہ۔ وہ ان سبھی کوانسانی برتاؤمیں پیچیدگی کی علامتیں یا اشاریے قرار دیتا ہے جن کی وجہ اور جن کے پیغام کوجاننے کے کے لیے انہیں ڈی کوڈ یا Decipher کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔نیز یہ کہ وہ انہیں کوئی نقص نہ مان کر بنیادی نفسیاتی عمل کی ہی ایسی صورتیں قرار دیتا ہے جومخصوص حالتوں میں دبے ہوئے لاشعور کے بیدار ہوجانے اوراوپری سطح پرآجانے سے ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں اوران سب کا خالق ذہن انسانی ہی ہے،جس کا وجوداس تضاد سے عبارت ہے کہ وہ مخصوص صورت حال میں خوداپنے آپ کے لیے اجنبی ہوجاتا ہے۔ اُن دنوں انسان کے خوداپنی نفسیاتی وذہنی شناخت سے اجنبی ہونے کے اس فرائڈین نظریے نے ذہن انسانی سے متعلق مروجہ Cartesian تصورکوپوری طرح متزلزل کردیا تھا۔

معالجانہ تحلیل نفسی کے اپنے مطالعے بڑی حد تک مکمل کرلینے کے بعد فرائڈ آرٹ اورادب کی جانب رجوع ہوا۔۱۹۱۰ میں فرائڈ نے یونگ (Jung) سے اس سلسلے میں گفتگو کی تھی جس کے دوران اس نے اپنے تحلیل نفسی مطالعوں کووسعت دینے اوراس کا اسکوپ بڑھا کر Psychopathology سے آگے دوسری ڈسپلنس تک لے جانے کی بات کہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۷ میں اس نے obsessive Actions and religious practices اور بعد میں Totem and Taboo اور Moses and Mono-theism وغیرہ شائع کرکے مذہب اوراساطیر کے کچھ پہلوؤں کواپنے Psychoanalytical مطالعوں کے دائرے میں لانے کی کوشش کی۔

فرائڈ کا ۱۹۰۹ میں شائع ہونے والا مختصر مضمون 'Family Romances' تخلیقی ذہن کو سمجھنے کی اُس کی پہلی کوشش کے طور پر اس لیے اہم تھا کہ یہ بچپن کی Fantasies اور فکشن کے باہم تعلق کے اُس نظریے کو مزید توسیع دیتا ہے جسے وہ 'The creative writer and day dreaming' میں اس سے قبل پیش کر چکا تھا۔ اس کا جرمن عنوان Familian Roman Der Neurotiker تھا۔ چونکہ جرمن اصطلاح 'Roman' ناول اور پاپولر رومانس دونوں اقسام کے آرکی ٹائپل بیانیہ کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے جو اسطوری کہانیوں یا دیوؤں اور پریوں کی داستانوں کے فارم میں بھی ہوسکتی ہیں اس لیے انگریزی میں اس کا ترجمہ 'The Family Novel', 'Fiction of Neurotics' کے طور پر دیکھا اور سمجھا گیا۔ فرائڈ نے انھیں سب سے زیادہ تعداد میں پائے جانے والے بیانیہ کے طور پر دیکھا جو کسی زبان کے ادب، فکشن، ڈرامہ یا بیانیہ شاعری کی اصناف میں موجود ہوسکتا ہے گوکہ اس نے کچھ زیادہ مثالیں نہیں دیں مگر قدیم یونانی ڈرامے اور بیانیہ شاعری، کرشچین Myths اور Allegories اور انگنت طلسمی اور مافوق الفطرت داستانیں اس کی نمائندہ سمجھی گئیں۔ 'Family Romances' کا اُس کا یہ نظریہ Heroic کرداروں اور مذہبی رہنماؤں وغیرہ کے ابتدائی سوانحی حالات کے نفسیاتی مطالعوں سے اُبھرا جہاں بیشتر حالات میں انھیں بچپن اور جوانی میں اپنے گھر، وطن اور حقیقی والدین سے دور ہوکر اجنبی جگہوں اور غیروں کی سرپرستی میں رہنے کے تجربات سے گذرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ بچپن کی اس صورتِ حال کے لیے وہ 'The romance of Parentage in Paronia' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے جس کے ذریعے اس کے مطابق مغرب کے بیشتر فکشن کی کہانی کی بنیاد اور اُن میں موجود اہم کرداروں کی مسابقتوں، ذہنی پیچیدگیوں یا Neurosis اور Oedipal رجحانات کی تفہیم میں مدد لی جاسکتی ہے۔ Fantasies کا بھی رول اس سلسلے میں اہم مانا جانا چاہیے جو خاندانی رشتوں اور سماجی اقدار وغیرہ کے دباؤ کے بیچ پھنسے انسان کو Survive کرنے کے لیے ایک طرح کی Double-life کی سی صورتِ حال یا یوٹوپیہ کی آغوش فراہم کردیتی ہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو فرائڈ کا یہ نظریہ یکسر نیا نہیں بلکہ Shiller اور Jean-Paul وغیرہ کی اس رومانوی جمالیاتی روایت سے جڑا ہوا ہے جس میں آرٹ، خواب اور بچپن کے تاثرات تینوں اپنے اپنے طور پر اہم مانے جاتے رہے ہیں مگر اس فرق کے ساتھ کہ رومانویت آرٹ کو آفاقی جہات عطا کرنے کے لیے خواب یا فینٹیسی سے مربوط کرتی ہے جب کہ فرائڈ ان کے باہم رشتوں میں، لاشعور میں پوشیدہ ان مسابقتی جذبات، جنسی خواہشات یا فطری جبلتوں کی تکمیل کی صورتیں تلاش کرتا ہے جن کا براہ راست اظہار نام نہاد مہذب انسانی معاشرے میں دشوار ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اُس نے زیادہ تر مثالیں زولا (Zola) کے ناولوں سے دی ہیں۔ غالباً آرٹ اور ادب سے متعلق اُس کے ان نظریات کی بنیاد زیادہ تر درمیانی درجے کی رومانی اور پاپولر تحریریں یا Pulp Fiction ہی رہا ہوگا نہ کہ کلاسیک وغیرہ یا پھر دوستووسکی، ٹالسٹائے، فلابیئر یا ہنری جیمس کا فکشن دراصل

فرائڈ نے 'The Creative Writer and Day-Dreaming' میں اپنے تصورِ خواب/ فینٹسی کو تخلیقی عمل سے جوڑنے کی جو نظریاتی کوشش کی تھی اسے ہی یہاں مزید توسیع دی گئی ہے۔ تخلیقی عمل کو کیفیت خواب کے مماثل قرار دیے جانے والے اُس مضمون میں تخلیق کاروں اور ان کے قارئین کے درمیان پائی جانے والی ذہنی صورت حال کے افتراق سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یہاں گو کہ 'Der Dichter' (بمعنی شاعر) کو ہی موضوع بنایا گیا ہے مگر اس کے دائرے میں دوسرے قسم کے تخلیق کار بھی آجاتے ہیں۔ اسی طرح 'Fantasieren' سے مراد ہمہ اقسام کی Fantasies سے ہے۔ جس میں Day-Dreaming وغیرہ آجاتے ہیں مگر اسے زیادہ تر بچپن کے حوالے سے ہی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ یہاں اس نے یہ کلیدی نظریہ پیش کیا ہے کہ اپنے بچپن کے کھیلوں میں مشغول بچہ تقریباً ویسا ہی ہے جیسے اپنے تخلیقی عمل میں منہمک ایک تخلیق کار۔ اُس کے Oedipus اور Hamlet کے کرداروں کے نفسیاتی تجزیے اور دوستووسکی کے سوانحی بیانیے کی مخصوص قرأت (Dostoevsky and Parricide) نے اس نظریے کو مزید تقویت بخشی۔

کیا ہمیں شعری تخلیقیت کی ابتدا بچپن میں تلاش کرنی چاہیے؟ تو فرائڈ کا جواب 'ہاں' میں ہے۔ اُس کے مطابق بچپن کے کھیلوں میں منہمک بچہ ایک تخلیق کار کی طرح ہی ہے جو اپنی خود کی ایک دنیا تشکیل دینا چاہتا ہے یا پھر یوں کہا جائے کہ اپنے اطراف موجود دنیا کو ایک زیادہ خوشگوار نظام عطا کرنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ بچپن سے جوانی کے دوران اسی Pleasure-Principle کے تحت Daydreaming اور Fantasies اُسے اُن کھیلوں کے متبادل کے طور پر ملتے جاتے ہیں اور پھر آرٹ یا دوسرے تخلیقی عمل۔ اُس کے خیال میں عمر کی مناسبت سے دوران ارتقاء متبادلات کا یہی پیچیدہ کھیل ہمیں جینے اور دنیا کو وہ سب کچھ دے سکنے کے قابل بناتا ہے جو ہم اُسے دیتے ہیں۔ فرائڈ کا یہ نظریہ 'Art As Play' کا اُس کا مخصوص تخلیقی مینی فیسٹو کہا جا سکتا ہے جس کا پرتو اس کی زیادہ تر تحریروں میں دکھائی دیتا ہے 'Family romances' میں پیش کیے گئے اُس کے فکشن سے متعلق نظریات کے حوالے سے غور کیا جائے تو وہ ہمارے ذہن کی کہانیوں سے رغبت کا جواز بچپن کی خواہشات و جذبات کی تکمیل کرنے والی کہانیوں میں ہی تلاش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں نوعمری سے ہی ہم اپنی زندگیوں کو ایک رومانی کہانی تصور کرنا شروع کردیتے ہیں جسے ہر انسان کی نرگسیت کی اپنی اسطور (Narcissistic myth) کہا جا سکتا ہے۔

اسی دور میں اُس نے یونگ کو کہیں لکھا تھا کہ اب ہمیں سوانحی تحریروں (Biographies) کو بھی اپنے تحلیل نفسی مطالعوں میں شامل کرلینا چاہیے۔ اس منصوبے کا محرک بھی 'بچپن' اور 'خواب' کا انسان کی بعد کی باطنی زندگی میں دخل سے ہی تھا۔ اُن دنوں (۱۸۸۱) لیونارڈو دا ونسی (Leonardo da vinci) کی نوعمری میں لکھی ڈائریوں کی دریافت ہوئی تھی جنھیں بعد میں شائع کیا گیا۔ اُن کے مطالعے کے دوران فرائڈ نے یونگ کو لکھا تھا کہ انھیں پڑھ کر لیونارڈو کی پُراسرار شخصیت کے راز مجھ پر منکشف ہونے لگے ہیں۔ دراصل نشاۃ الثانیہ کے دور کے

اُس افسانوی شہرت رکھنے والے سائنٹیسٹ اور آرٹسٹ کے نوعمری کے خوابوں کی تفصیلات سے فرائڈ نے اس سے متعلق خود اپنا ایک بیانیہ وضع کر لیا تھا جس کے مطابق بچپن میں لیونارڈو کے والدین کے کشیدہ تعلقات اور علیحدگی، اُس کی اپنے باپ سے اجنبیت اور ماں سے جنس زدگی کی حد تک لگاؤ اور ہم جنسی سے رغبت وغیرہ۔ ابتدائی زندگی کے یہ تمام تجربات مستقبل کے سائنٹسٹ رآرٹسٹ کی ذہنی و تخلیقی زندگی میں دخیل معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ اس موضوع پر اُس نے "Leonardo da vinci And Memory of Childhood" اور "Leonardo, Fantansy and knowledge" جیسے اہم مضامین شائع کیے جن میں اُس نے لیونارڈو کی شہرۂ آفاق پینٹنگ 'مونالیزا' میں دکھائی گئی ایک ادھیڑ عمر کی عورت کی پُر اسرار، طنزیہ اور ادھوری مسکراہٹ کو اُس کی ماں کی مسکراہٹ کا پرتو قرار دیا جو ماں سے جذباتی رشتے کی بنا پر اُس کے دل پر نقش رہی تھی۔ اُسے تحلیل نفسی مطالعوں کے پس منظر میں بصری آرٹ (Visual Art) اور آرٹسٹ کی شخصیت کو باہم مربوط کر کے دیکھنے کی فرائڈ کی ایک اہم کوشش سے تعبیر کیا گیا۔

لیونارڈو اور اس کی تخلیقات میں فرائڈ کی دلچسپی کے کئی محرکات میں سے ایک معروف انگریزی نقاد والٹر پیٹر (Walter Pater) کے رسالے 'Renaissance' میں شائع ہوا اُس کا وہ مضمون بھی تھا جس میں پہلی بار لیونارڈو کو ایک پُر اسرار شخصیت کا مالک اور Morbid-Proto decadent کہا گیا تھا۔ جس کی پینٹنگس بھی اُس کی ہی طرح پُر اسرار تھیں۔ اس طرح فرائڈ کے لیے لیونارڈو کی ذات اور اس سے منسوب تخلیقات ایک نفسیاتی پہیلی بن گئی جسے حل کرنا اُسے ایک چیلینج لگا ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ اُس نے لیونارڈو پر لکھے اپنے مضامین میں والٹر پیٹر کا بار بار حوالہ دیا ہے۔ لیونارڈو کا ہم جنس کی طرف جھکاؤ بھی (جس کے لیے اُس پر مقدمہ بھی چلایا گیا تھا) فرائڈ کی اُس کی شخصیت اور تخلیقات میں دلچسپی کی ایک اور وجہ ہو سکتی ہے (فرائڈ نے خود اپنے ہم جنسی کے رجحانات کا دفاع ان نفسیاتی دلائل کی بنا پر کیا ہے کہ انسان بنیادی طور Bisexual ہے اور یوں ہم جنسی بھی میں ایک Latent trait کے طور پر پائی جاتی ہے)۔ ویسے بھی لیونارڈو پر فرائڈ کے مضامین ان دنوں شائع ہوئے تھے جب جنسی تحقیق پر پہلی بار بے شمار کتابیں ایک ساتھ منظر عام پر آ گئیں تھیں Havlock Ellis, Kraft-Ebing اور Otto Weininger وغیرہ کی تحریریں۔ اس کے علاوہ براہ راست یا بالواسطہ ہم جنسی کے موضوع پر بھی کافی کچھ شائع ہو رہا تھا جس میں سائمنڈس (Symunds) کی 'A Problem of Modern Ethics' آسکر وائلڈ (Oscar wilde) کی 'Portrait of Mr. W. H.' آندرے گائڈ (Andre Gide) کی 'La' Immortaliste' تھامس مان (Thomas Mann) کی 'Death In Venice' اور مارسل پروست (Marcel Proust) کی 'A la Researche Temps Perdu' وغیرہ تھی۔ اس پس منظر میں فرائڈ کے لیونارڈو ونسی سے متعلق مضامین بھی بے حد اہم مانے گئے جو ایک ہم جنس سائنٹسٹ و آرٹسٹ کی جنسی بے راہ روی کے رجحانات کو Sublimation کے ذریعے سائنسی علوم اور آرٹسٹک ریاضت کی جانب موڑ دینے

کی چونکا دینے والی رُوداد پیش کرتے ہیں۔ مگر معروف اور اہم شخصیتوں کے ایسے تحلیل نفسی مطالعوں کے ان دنوں پہلی بار سامنے آنے کے باعث اُنہیں ذہنی طور پر قبول کر پانا دشوار تھا۔ چنانچہ اس کے خلاف شدید ذہنی ردِ عمل بھی دیکھنے میں آئے جو کم سے کم فرائڈ کے لیے غیر متوقع نہ تھے۔ مثال کے طور پر 'The spat on Genius' عنوان سے لکھا گیا مضمون جس میں فرائڈ اور اسکے ہم پیشہ لوگوں کو 'Psychoanalytical Hynas' کہا گیا تھا جو آرٹ اور ادب کے قبرستان پر حملہ آور ہوئے تھے اور جن کا تازہ ترین شکار Leonardo da Vinci تھا اور یہ کہ ڈاکٹر فرائڈ کی اس کی تصویروں کے حُسن تک رسائی نہ تھی۔ تو ایسے میں وہ اس کے اعضائے رئیسہ کا معائنہ کرنے سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ تاہم اس منفی وقتی ردِ عمل سے قطع نظر لیونارڈو سے متعلق والٹر پیٹر، Munther (تاریخ داں) اور فرائڈ کے مضامین نے نہ صرف اُس کی شہرت میں غیر معمولی اضافہ کیا بلکہ اُنھی کی بدولت اُس کی تخلیق مونالزا کو بھی یوروپین آرٹ کی تنقید میں تقریباً وہی درجہ حاصل ہو گیا جو ادبی تنقید میں شیکسپیئر کے ڈرامائی کردار ہملیٹ کو۔

۱۹۳۸ میں فرائڈ کی کسی ادبی تخلیق کے تحلیلِ نفسی مطالعے پر مبنی پہلی باقاعدہ تحریر شائع ہوئی۔ یہ "Delusions and Dreams in Jensen's Gradiva" تھی جسے ادبی تنقید کے نسبتاً اجنبی میدان میں اُس کا پہلا قدم کہا جا سکتا ہے۔ یہ جنس زدہ محبت کی ایک تاریخی داستان تھی جو محض فرائڈ کے مضمون کی وجہ سے خاصی معروف ہو گئی۔ یہاں 'Gradiva' کے کردار اور اس کی کہانی پر فرائڈ کے 'Studies in Hysteria' اور 'Interpratation of Dreams' میں موضوع بحث بنی بیشتر باتوں کا بڑی حد تک اطلاق ہوتا ہے اور غالباً اسی لیے اس نے اسے اپنے تجزیاتی مطالعے کا موضوع بھی بنایا۔ اس میں اس نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ لاشعور کے فعّال اور کارگر ہونے کی جس حالت میں خواب تشکیل پاتے ہیں تقریباً اُسی صورتِ حال میں تخلیقی عمل بھی وقوع پذیر ہوتا ہے۔ فرائڈ کی بعد میں سامنے آنے والی جمالیاتی تحقیق میں اس نظریے سے کہیں کوئی بنیادی انحراف نہیں ملتا۔

فرائڈ کے غیر معمولی طور پر حیرت افروز تحلیلِ نفسی مطالعوں کا کوئی بھی ذکر 'The uncanny (1919)' کے بغیر ادھورا ہوگا۔ فرائڈ کا یہ پیپر انسانی ذہن کے آسانی سے نہ سمجھ میں آنے والے Fobias, Fixations اور Death Drive وغیرہ نفسیاتی تحقیق سے متعلق ہے۔ اسے پڑھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ جمالیات کے اوّلین محققوں میں سے ایک Edmund Burke کی طرح فرائڈ بھی جمالیات کو حُسن یا خوبصورتی کے تصور تک ہی محدود نہیں مانتا۔ چنانچہ اپنے Pleasure Principle سے آگے جا کر 'Beyond the Pleasure Priciple 1920' میں وہ یہاں 'Aesthetics of anxiety' اور 'wishful Fears' جیسی اصطلاحات وضع کرتا ہے جن پر Gothic History اور لٹریچر اور کئی طرح کی کلینیکل کیس ہسٹری کی مدد سے اس مضمون میں بحث کی گئی ہے اور پھر کچھ نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ دراصل ان دنوں The uncanny

(اجنبی اور عجیب وغریب) سے متعلق نفسیاتی مطالعے شروع کیے جانے کی ایک وجہ تو یورپین آرٹ اور ادب میں نشاۃ الثانیہ کے زیر اثر ماضی کی بازیافت کے ساتھ Gothic میں غیر معمولی دلچسپی تھی اور دوسری ۱۹۱۹ میں سامنے آیا 'Wolf Man' کا قدیم اور عجیب وغریب کیس تھا جو عمرانیات ونفسیات کے ماہروں کے لیے ایک چیلنج بنا ہوا تھا۔ کسی مبصر کے الفاظ میں ان دنوں کیے گئے مطالعوں کے ذریعے پہلی جنگ عظیم کے بعد کی دنیا کی جدیدئی اور روشن عمارت کے اندر اب بھی موجود کئی ایسے بند کمرے کھلے جن میں انسان کے پُر اسرار اور تاریک ماضی کے خوف اور اندھے عقائد کے آسیب رہا کرتے تھے۔

'The Uncanny' فرائڈ کے مضامین میں بالکل انوکھا اور الگ مضمون ہے جس کا موضوع عجیب و غریب ذہنی تجربات اور نفسیاتی اظہار کے اجنبی طریقہ کار ہیں۔ فرائڈ ان سبھی کو ایسے رجحانات سے تعبیر کرتا ہے جو یوں تو ماضی بعید کے انسان کی عمومی نفسیاتی صورتِ حال کا حصہ تھے مگر زمانے کے ساتھ اور متمدن معاشرے کے وجود میں آنے کے دوران Repression کے نتیجے میں لاشعور میں دفن ہو گئے۔ ماضی میں Gothic یا مافوق فطرت Supernatural کے طور پر ہمارے شعور، آرٹ اور Ritual کے یہ اہم اجزاء آج کے نام نہاد متمدن انسان کو آسیب کی طرح اجنبی اور ڈراونے لگتے ہیں۔

اس مضمون کی تحریک فرائڈ کو رومانوی ادیب اور موسیقار T.A.Hoffman کی ایک مافوق الفطرت کہانی 'The Saned Man' کے مطالعے سے ملی تھی جس کے مرکزی کردار Nathaniel کی نفسیات 'Oedipal Castration' کے خوف وتشویش سے عبارت ہے۔ فرائڈ اسے Nathaniel کی 'Ominous life' کہتا ہے جو اس کے نزدیک ایک Neurotic سوانح ہے اور خواب میں وقوع پذیر ہونے والی حیرت انگیز باتوں سے بھری ہے۔ اسے نفسیاتی ادبی تنقید کے ضمن میں فرائڈ کی ایک بھرپور کوشش کہا جا سکتا ہے جس کے دائرے میں وہ انفرادی کیس ہسٹری، حادثات و واقعات، اخباری خبریں، عمرانی مطالعے اور ادبی حوالوں کے طور پر لٹریری اور کلچرل 'Uncanny' سے متعلق کئی مباحث لے آیا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے آگے آنے والی ادبی تنقید اور تھیوری پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ معروف نقاد ہیرالڈ بلوم (Herald Bloom) کے الفاظ میں:

"It is the only contribution that the twentieth century, has made to the aesthetics of the sublime; the uncanny the represents an exploration of unfamiliar territory, the sublime territory of unfamiliarity it self. Freud's account of it underpins much of the huge modern critical literature on both Gothic and the sublime. It is not only a theoratical

commentry on the power of strangeness but one of the weirdest theoretical texts in the Freudian Canon."

فرائڈ کے اس اہم اور غیر معمولی مضمون میں استعمال کیے گئے The Canny اور The uncanny کے انھی تلازمات کی روشنی میں بعد میں کئی Gothic تحریروں کے ادبی وتنقیدی مطالعے سامنے آئے جن میں کولرج کی 'Christabel' میری شیلی کی 'Frankenstein' شارلاٹ برانٹے کی 'Jane Eyre' وغیرہ پر لکھے گئے مضامین قابل ذکر ہیں۔ لیونارڈو داونسی کی 'مونالزا' کی مسکراہٹ کو بھی فرائڈ نے ابہام سے پُر اور Uncanny قرار دیا جس کی تفہیم کے لیے اُس کے خالق کے بچپن کی جذباتی صورتِ حال، ماں سے رشتے اور oedipal اور erotic یادداشت سے واقفیت لازمی تھی۔

آرٹ اور ادب میں uncanny کے اپنے تصور پر مبنی مباحث کو آگے بڑھاتے ہوئے اس مضمون میں فرائڈ نے دیووں پریوں اور بھوت پریت کی کہانیاں، ہومر، شکسپیر اور دانتے کے کلاسیکی ادب میں مافوق الفطرت (Supernatural) کی مداخلت اور رومانسیز (Romances) کے سوپر ہیروز وغیرہ کے حوالے بھی جگہ جگہ دیے ہیں۔ بعد کے دنوں کے ادب میں uncanny کی موجودگی کو فرائڈ نسبتاً جدید دور کے سیکولر تناظر میں قدیم اور 'Primitive' کی واپسی سے تعبیر کرتا ہے۔ Adam Philips کے الفاظ میں:

"The uncanny is a paradoxical mark of modernity. It is associated with moments when an author, fictional character, or reader experiences the return of the primitive in a apparently modern and secular context. For freud as uncanny theorist, however, this is also a survival from the abandoned psychic culture of our childhood bearing the Gothic signature of our own earliest terrors and desires."

فرائڈ کے uncanny کے تصور کا جدید دور کے ادب پر اطلاق کسی قدر تصرف کے ساتھ ایٹس (Yeats) اور ایلیٹ (Eliot) کے شعری شاہکار "The second coming" اور "The waste land" پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس دور کی دو بڑی نظمیں جو جنگِ عظیم کے بعد کے ٹوٹے بکھرے اور تباہ حال یورپ کے حوالے سے پڑھی اور سمجھی جاتی رہی۔ فرائڈ کے نظریے سے دیکھا جائے تو ایٹس کی نظم میں دکھائی گئی بھیانک مخلوق (طاغوت یا اینٹی کرائیسٹ) کی دنیا میں واپسی۔

"And what rough beast slouches towards Bethlehlm to be born? It's hour come round again,"

اور ایلیٹ کی نظم میں موجود دانتے کے after-world سے مماثل آسیب زدہ یورپین خرابہ ایک طرح سے جدید دور کے تمدنی وروحانی زوال کے تناظر میں Poetic Uncanny کی بھرپور نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس

طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فرائڈ کے اس 'آسیب زدہ مضمون' نے ''اجنبی عجیب الخلقت اور عجیب و غریب'' (The uncanny) کو جمالیاتی تنقید کے نقشے پر ایک ایسی مخصوص اور مستقل جگہ فراہم کروادی ہے جس کا تصور شاید خود اُس نے بھی نہ کیا ہوگا۔ آج ہم اس کے حوالے سے آرٹ، ادب اور فلم وغیرہ پر اکثر تبصرے کرتے رہتے ہیں۔ چاہے ہم اسے موٹے طور پر ''ماضی کی واپسی'' یا Return of the Primtive کا ہی نام کیوں نہ دیں۔ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فرائڈین "Uncanny" آنے والے دنوں میں بھی ہمارے ادبی بیانیہ اور تھیوری میں مختلف انداز سے ظہور پذیر ہوتی رہے گی۔

فرائڈ نے آرٹ اور ادب سے متعلق اپنے تحقیقی مضامین کو یکجا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ جدید دور کے ماہر لسانیات سا سیور (Saussure) کی طرح اُس کے ایسے پیپرس بھی بعد میں "Art and Literature" کے عنوان کے تحت جمع کر کے شائع کیے گئے جو یہ التباس پیدا کرتے ہیں کہ اُس کی سوچ اس ضمن میں مربوط رہی ہے اور وہ ان موضوعات پر باقاعدہ یا پابندی سے لکھتا رہا ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اس کے ایسے مضامین بکھرے ہوئے، وقفے وقفے سے لکھے گئے اور آدھے ادھورے سے لگتے ہیں۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ جرمن فلسفیانہ روایت میں Schopenhaur, Schiller اور Nietzsche کی زیادہ تر تحریریں اسی طور پر وجود میں آئیں اور بعد میں یکجا کر کے شائع کی گئیں۔ ہر چند کہ فرائڈ کے نفسیات اور Psychopathology سے متعلق پیشہ ورانہ تحقیقی مضامین اہم سائنسی جرنلس میں شائع ہوتے رہے تھے مگر آرٹ اور ادب سے متعلق تحریروں کے ضمن میں اس کا رول a phychoanalist on a holiday جیسا بیان کیا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود فرائڈ کی ان تحریروں کی اہمیت و وقعت اس لیے کم نہیں ہو سکتی کہ ان کے وجود میں آنے سے قبل ہمارے لیے نفسیاتی ادبی تنقید کا کوئی ترقی پذیر فریم ورک وضع کرنا دشوار رہا تھا۔ Hugh Haughton کے الفاظ میں:

"Freud's relatively few aesthetic investigations have certainly changed the ways in which, for better and worse, we now talk about art and practice it."

شہرِ احتساب

"There is, however, a serious question to be asked as to whether the tradition of arguments and disputations has been confined to an exclusive part of the Indian population - perhaps just to the members of the male elite. It would be uniformly distributed over all segments of the population, but India has had deep inequalities along the lines of gender, class, caste and community (on which more presently). The social relevance of the argumentative tradition would be severely limited if disadvantaged sections were effectively barred from participation. The story here is, however, much more complex than a simple generalization can capture."

['The Argumentative Indian' : Amartya Sen, Pub. Penguine Books,2004, Page-6]

'آہنکار': علاقائی شناخت، معمولاتِ حیات اور محرومی کی نفسیات کا تخلیقی تلازمہ؟

● خورشید اکبر

نور الحسنین بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں اور 'آہنکار' ان کا لکھا ہوا پہلا مختصر ناول ہے جو جنوری ۲۰۰۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس ناول کا انتساب اورنگ آباد (دکن) کے ایک موضع پمپری چمنار اجہ اور کنٹر (تعلقہ) کے نام ہے جن کی وادیوں، کھیت کھلیانوں، جنگل بیابانوں اور گلی کوچوں میں مصنف کا بچپن گزرا ہے۔ اسی گاؤں کے ایک معمولی کسان اور اس کی زندگی کے متعلقات و ماحول کی سوانحی مصوری غائب راوی (ناول نگار) نے بڑی چابک دستی اور تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ پیش کی ہے۔ یہاں ایک فطری سوال پیدا ہوتا ہے کہ نور الحسنین نے اپنے ناول کا موضوع ایک دور افتادہ چھوٹے سے گاؤں کے ایک معمولی کسان سمپت راؤ اور وہاں کے چھوٹے چھوٹے کرداروں کو کیوں بنایا؟ اس سلسلے میں ناول کے انتساب سے جواز فراہم کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی مزید نفسیاتی توجیہ عرضِ مصنف میں بھی موجود ہے ملاحظہ کیجیے :

> ''میری پیدائش سے بہت پہلے ہی میرے خاندان سے مشائخی کا جبہ و دستار اور جاگیردارانہ ٹھاٹھ باٹ رخصت ہو چکے تھے۔ پھر رہی سہی کسر حیدرآباد پولس ایکشن نے پوری کردی اور عزتِ سادات کو بچانے کا ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا۔ ملازمت سرکار۔.............. میری نانیہال پمپری راجہ کے نہایت معزز اور خوش حال زمین داروں میں سے تھی۔ میرے والد سیّد نور الوحید (مرحوم) عدالت میں ملازم تھے۔'' ('ادبا عرض ہے ص۔۶۔ 'آہنکار' مطبوعہ ۲۰۰۵)

گویا 'آہنکار' محدود دائرے میں، مصنف کے بچپن کی یادوں کا عکس نیز جاگیردارانہ اور صوفیانہ اقدار کی بازیافت کا

تخلیقی وسیلہ ہے، جو کم و بیش انسان کی محرومی اور تلافی کی نفسیات کا غماز ہے۔

بہ ظاہر یہ ایک روایتی انداز کا ناول ہے جس میں ای۔ ایم۔ فاسٹر کی شناخت کردہ ناول کی شعریات کے اہم اجزائے ترکیبی مثلاً قصہ، کردار، پلاٹ، فنتاسی، پیش گوئی اور نسبتاً پیٹرن اور آہنگ کا پورا خیال رکھا گیا ہے مگر اس کی باطنی سطح ایک آفاقی، اخلاقی اور مثالی (آئیڈیل) فلسفۂ حیات سے بھی وابستہ اور پیوستہ ہے۔ ناول کا تخلیقی بیانیہ، اس کے مکالمے اور منظرنامے اس پر مستزاد!

عنوان: 'آہنکار' یا 'اَہنکار'؟ سب سے پہلے ناول پر گفتگو اس کے عنوان سے شروع کی جائے کہ صحیح لفظ 'آہنکار' ہے یا 'اَہنکار'؟ خیال رہے کہ 'اَہنکار' سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کا تلفظ ہندی اور اردو میں اسی طور پر مستعمل ہے جس کا مفہوم ہے : غرور، گھمنڈ، تکبر مگر 'آہنکار' کہنے سے خبطِ معنی کا اندیشہ ہے۔ ممکن ہے دکن کے دیہی علاقے پمپری راجہ یا کنتر تعلقہ میں 'اَہنکار' کو جغرافیائی اثرات یا مقامی ثقافت کے زیرِ اثر 'آہنکار' کے طور پر ادا کیا جاتا ہو اور مصنف اس سے باخبر بھی ہوں لیکن انھوں نے ناول میں کہیں بھی اس کی وضاحت نہیں کی ہے، اگر انھوں نے اس لفظ کو کسی دیگر معنوی تناظر میں استعمال کیا ہے تو اس کا جواز متن سے فراہم نہیں ہو پایا ہے۔ شاید انھوں نے 'آہنکار' کو 'آہن گر' کے مفہوم کے مماثل سمجھا ہو تو ناول کا ایک اہم کردار اور مرکزی کردار سمپت راؤ کے بچپن کا دوست کونڈی با کی طرف ذہن منتقل ہو سکتا ہے کہ کونڈی با پیشے سے لوہار ہے لیکن ناول کا متن تو 'اَہنکار' بمعنی گھمنڈ اور تکبر کی سمت اشارہ کرتا ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ مصنف ناول کی اگلی اشاعت میں اس کی وضاحت فرمائیں گے اور عنوان کے صحیح املا اور تلفظ پر نظرِ ثانی بھی کریں گے۔

قصہ : 'اَہنکار' ایک با ماجرا ناول ہے جس کے قصے کی بساط نہایت محدود ہے۔ یہ کہانی ہے ایک گاؤں کے معمولی کسان سمپت راؤ کی جو مالی تنگدستی کے سبب اپنی بیوی کے مناسب علاج کے لیے پیسے کا بندوبست کرنے سے معذور رہتا ہے اور اس کی بیوی موت کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے گاؤں کی موروثی جائداد بیچ کر شہر چلا جاتا ہے اور محنت مزدوری کر کے اپنے اکلوتے بیٹے ولاس کو ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرتا ہے۔ اس کا بیٹا لندن میں ایک بڑا ڈاکٹر ہو جاتا ہے اور باپ کے لیے کافی روپے پیسے بھیجتا رہتا ہے جس کی بدولت سمپت راؤ اپنے گاؤں میں بہت ساری جائداد اور کھیت باغات خرید کر بڑا آدمی بن جاتا ہے اور اپنے لیے ایک شاندار حویلی تعمیر کراتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی مادیت پرستی اور دولت کی ہوس کاری بے جا نخوت و تکبر میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ خود کو گاؤں کا سب سے زیادہ طاقت ور شخص تصور کرنے لگتا ہے حتیٰ کہ اپنے بچپن کے دوست کونڈی با لوہار کے بیٹے شنکر اور اس کی بھولا جونتی کو بھی پیسے کی طاقت اور جذباتی استحصال کے سہارے اپنا بنا لیتا ہے اور قدم قدم پر حسد اور بڑبولے پن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جب سمپت راؤ کو دل کا دورہ پڑتا ہے تو کونڈی با اور شنکر اسے شہر کے اسپتال میں بر وقت پہنچا کر اس کی جان بچاتے ہیں۔ پھر سمپت راؤ کا بیٹا اپنی ہم پیشہ انگریز بیوی کے ساتھ باپ کو دیکھنے آتا ہے۔ بالآخر سمپت راؤ سب کے ساتھ، صحت یابی کے بعد، اپنے آبائی گاؤں پہنچتا

ہے اور اپنی جائداد میں سے شنکر کو بھی حصہ دیتا ہے۔ گویا ایک ہمدرد اور سچے انسان کی شکل میں سمپت راؤ منقلب ہو جاتا ہے۔ بیٹا اور بہو بھی اس کے ساتھ گاؤں ہی میں رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور گاؤں والوں کی مفت طبی خدمات کے لیے ماں کے نام پر ایک اسپتال کی تعمیر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اس طرح سمپت راؤ کی سچی خوشیاں اسے واپس مل جاتی ہیں۔

پلاٹ : ننگ اور کوتاہ قصے کے مقابلے میں 'اہنکار' کا پلاٹ چست ہے جس میں تناسب و توازن کا پورا خیال رکھا گیا ہے جس کے سبب کہانی کا فریم ورک نمایاں ہوا ہے اور اس کی واقعاتی ساخت و ترتیب میں ایک منطقی تسلسل، فطری ارتقا اور معنوی ربط کا بھی اہتمام کیا گیا ہے لیکن اس کا نقطۂ عروج غیر متاثر کن ڈرامائی کیفیت کا غماز ہے کیوں کہ ناگہانی طور پر سمپت راؤ کے دل کے دورے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے اور یہ فطرت کے خلاف بھی نہیں ہے مگر شفایاب ہوتے ہی اس کے ذہنی رویے کی مثالی تقلیب کے ساتھ سب کچھ آئیڈیل طریقے سے انجام تک پہنچ جاتا ہے گویا 'اہنکار' کے نقطۂ عروج ہی میں اس کے نقطۂ زوال کا راز پوشیدہ ہے۔ پھر یہ بھی کہ بغیر کسی تصادم، کشمکش یا نفسیاتی آویزش کے ناول اپنے مقصد یا فلسفۂ حیات سے ہم کنار ہو جاتا ہے، یہ بھی ایک اہم سوال ہے۔

کردار نگاری : اس ناول کا مرکزی کردار سمپت راؤ ہے جس کے اردگرد تمام واقعات، حالات، ماحول اور دیگر تمام چھوٹے بڑے کردار طواف کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ناول نگار نے سمپت راؤ کا کردار خلق کرنے پر پوری توجہ دی ہے۔ یہ ایسا کردار ہے جس کی پیچیدہ نفسیات نے اسے اور کرداروں کی طرح Flat یا اکہرا نہیں رہنے دیا ہے بلکہ اسے کسی قدر Round یا پیچیدہ کردار کا حامل بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس کونڈی با، شانتی، شنکر، لاجونتی، ولاس، روزی برگیزا وغیرہ کے کردار اکہرے ہونے کے باوجود ناول میں اپنی موجودگی کا احساس کراتے ہیں۔ بقیہ ذیلی کرداروں میں بلونت، سرپنچ، ہیرالال، فیاض سیٹھ، سکھ رام، قاسم علی، رحمت، گنگو، منجو، کیشو، مرلی دھر، سیتا دیوی، دوگمبر ماسٹر، سدھا، ڈاکٹر مسعود، وامن گروجی وغیرہ جھلک دکھلانے بھر کی حیثیت رکھتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے سمپت راؤ کا کردار اُبھارنے کی خاطر تمام کرداروں کو قربان کر دیا ہے پھر بھی سمپت راؤ کی مرحومہ بیوی شانتی، جگری دوست کونڈی با (کنڑوبا)، دوست کا بیٹا شنکر اور شنکر کی بیوی لاجونتی دیرپا نقش چھوڑنے والے کردار ہیں جب کہ سمپت راؤ کا بیٹا ولاس اور بہو روزی بھرتی کے کردار ہونے کے باوجود کہانی میں ناگزیر حیثیت کے مالک ہیں۔

مذہب اور تصوف کی اصطلاح میں اس ناول کے اہم کرداروں کی تمثیلی تعبیریں یوں بھی پیش کی جا سکتی ہیں کہ ـــــ سمپت راؤ نفسِ امّارہ (तमस गुण) کے نمائندہ ہیں، اس کی مرحومہ بیوی شانتی ضمیر یا نفسِ لوّامہ (रजस गुण) کی علامت ہے جو ہر موقعے سے سمپت راؤ کے غلط رویے اور غیر انسانی افعال پر روکتی ٹوکتی رہتی ہے۔ اسی طرح کونڈی با، شنکر، لاجونتی وغیرہ نفسِ مطمئنہ (सतव गुण) کی مثال ہیں جو جبر و قدر دونوں صورتوں میں صابر و شاکر رہتے ہیں اور شر کے برعکس سراسر خیر کے ترجمان بنے رہتے ہیں۔ اس تناظر میں بھی

'آہنکار' کے فلسفۂ حیات یا کلیدی نکتے کو شرح وبسط کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ جو خیر وشر کے معصومانہ تصادم کا استعارہ ہے۔

بہ ظاہر اسلوب وتکنیک کی سطح پر یہ ناول روایتی اور فرسودہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے اندر غائب راوی کی خلق کردہ فضا سازی، مرکزی کردار کے ضمیر کا انکشافی رویہ یا مرحومہ شانتی کے ہمزاد کا حاضراتی عمل، علاقائی بول چال کے برجستہ اور بامحاورہ الفاظ سے بھرپور مکالمے، متحرک منظرنامے اور حسب ضرورت تخلیقی بیانیے کے استعمال سے 'آہنکار' کے متن میں جابہ جا خوش نما پیٹرن اور آہنگِ حیات کی کارفرمائیاں قابلِ دید وشنید ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں :

(۱) ''باہر اب بھی ویسی ہی روشنیاں تھیں۔ سارے لوگ دعوت اڑا کر جا چکے تھے......... اس نے (سمپت راؤ) نظریں اٹھائیں اور اپنی امارت کی غیر مفتوح نشانیوں کو دیکھ کر فخر سے گردن اونچی کی۔ بیڑی کا آخری طویل کش لیا اور پھر اسے پیر سے مَسل دیا............ ('آہنکار' ص ۱۶)

(۲) ''اپنی برتری کا احساس جب کسی نو دولتیئے کو ہوتا ہے تو اس کا جسم اور اس کی زبان بے قابو ہو جاتی ہے۔'' (ایضاً ص ۔۲۷)

(۳) ''سمپت راؤ نے بیڑی سلگائی۔ ایک کش لیا اور پھر اپنا عکس پانی میں دیکھنے لگا۔ ''سمپت راؤ—دولت تو چھایا ہے۔ اپنے کل کو مت بھولو—!'' ''کل—؟'' طنزیہ مسکراہٹ شریر بچّے کی طرح اس کے چہرے پر کھیلنے لگی—اور حوض کا شانت پانی اپنے اندر موجود سارے ہی عکس کو گنوا بیٹھا۔ ''میں آج ہوں—اور میرا آج کسی مست سانڈ کی طرح پورے گاؤں میں دندناتا پھر رہا ہے۔'' (ایضاً ص ۔۲۸)

(۴) ''اس نے ایک بار پھر چابک کو ہوا میں لہرایا اور بیل گاڑی کا سفر شمشان گھاٹ پر ختم ہوا۔ ارتھی (بیوی کی) سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور ان ہی شعلوں میں اسے وہ نروان (؟) بھی مل گیا جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا نہیں تھا........ اس کے آنسوؤں کی تاب نہ لاکر سارے ہی شعلے بجھ گئے اور راکھ کا ڈھیر ہواؤں سے منتشر ہونے لگا۔ ایک نئی قوت کا گمان اسے اپنے اندر محسوس ہوا— کیا یہ واقعی ممکن ہے؟''

(ایضاً ۔۳۱)

(۵) ''سمپت راؤ— تم شہر میں رہتے ہوئے وہاں کی بولی بھی سیکھ گئے۔ ارے جوان بیٹا جب باجو کی کھولی میں بہو کے ساتھ سوتا ہے تو لگتا ہے مانو ایشور کی شکتی ہے اپنے پاس—پھر یہ بڑھاپا، بڑھاپا نہیں لگتا—'' (ایضاً ص ۔۳۱)

(۶) ''کونڈی باتم دولت کی شکتی کو نہیں جانتے، یہ دھرم کھرید سکتا ہے، ایمان کھرید سکتا ہے، وکھت پڑنے پر ماں ہی نہیں ماماتا بھی کھرید سکتا ہے۔ اس میں طاکت ہوتی ہے اور کان کھول کر سن لو میں جس دن چاہوں گا تمھارے شنکر کو بھی کھرید کر بتادوں گا ـــــ سمجھے ـــــ؟''

(ایضاً ص ۳۲)

(۷) ''سمپت راؤ ـــــ تم نے ابھی کوئل کی کوک سنی ہوگی۔ کوا ابھی دھوکے میں کوئل کے بچوں کی پرورش کرتا ہے، پن آکھر میں کیا ہوتا ہے ـــــ؟ وہ اسے چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ تمھارا انت بھی ایسا ہی ہوگا۔''

(ایضاً ص۔۳۲)

(۸) ''اپنے آپ سے بہت دنوں تک جنگ لڑنے کے بعد سمپت راؤ گھر سے باہر نکلا، گاؤں میں وہی چہل پہل تھی۔ قاسم علی کی دکان پر اب اس کا بیٹا رحمت علی بیٹھا پڑیا باندھ رہا تھا۔ چوڑی کے سامنے کھڑے ہوئے نیم کے درختوں کے نیچے اسی طرح حجام بیٹھے لوگوں کی داڑھیاں اور بال کاٹ رہے تھے۔ آوارہ بکریاں ادھر اُدھر منہ مار رہی تھیں، کنوئیں پر تنگی ہوئی عورتیں پانی بھی کھینچ رہی تھیں اور باتیں بھی کر رہی تھیں۔''

(ایضاً ص۔۳۷)

اتنے برس بیت گئے لیکن گاؤں بالکل نہیں بدلا ـــــ سمپت راؤ نے آہستہ سے اپنے دل میں کہا۔ اب وہ بازار کی طرف قدم اٹھا رہا تھا۔''

(ایضاً ص۔۳۷)

(۹) ''اسی اندھیرے میں چلتے چلتے باپو نے کہا تھا ـــــ ''کونڈیا ـــــ لوگ ڈراتے ہیں اَن دیکھے بھوتوں سے، ان کو پتہ ہی نہیں کہ پیٹ سے بڑا کوئی بھوت نہیں ہوتا ـــــ اور پھر جس کو جوان چھوکرا ہوتا ہے نا ـــــ وہ بھوت پریت تو کیا، بھگوان سے بھی نہیں ڈرتا ـــــ!'' تب مجھے گیان ہوا تھا کہ میں اپنے باپو کی شکتی ہوں ـــــ''

(ایضاً ص۔۵۶)

(۱۰) ''........ لیکن جوں ہی اس کی نظر شنکر کی دھوتی پر پڑی، اس کی عجیب حالت ہوگئی۔ وہ بے ساختہ اس سے لپٹ گئی اور پھر اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں اور اسے عجیب سی تسکین ہونے لگی۔''

(ایضاً ص۔۷۵)

(۱۱) ''پیر سلطان جی اس گاؤں میں کب اور کہاں سے آئے تھے یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ تھی۔ لیکن ان کا روحانی فیض آج بھی اسی طرح جاری تھا۔ جیسے کہ ان کی حیات میں۔ گاؤں کے لوگ جب بھی کسی پریشانی کا شکار ہوتے، ان کی درگاہ میں چراغ روشن

کر لیتے اور پھر پریشانیوں سے چھٹکارا پا لیتے تھے۔ لاجونتی بھی اسی عقیدت کے ساتھ درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئی۔ لوگ ظہر کی نماز ادا کر کے مسجد سے نکل رہے تھے۔''

(ایضاً ص۔۷۶)

(۱۲) ''اب تم سے کیا بولوں ——!'' شنکر کی نظریں جھک گئیں، —— ''سچ تو یہ ہے کہ میں پریم اور بھاونا ؤں کی رسّی پر ناچنے والا ایک نٹ ہو کر رہ گیا ہوں —— جسے لاچاری رسّی سے نیچے اترنے نہیں دیتی، اور ابھیمان ڈھنگ سے ناچنے بھی نہیں دیتا۔''

(ایضاً ص۔۸۶)

(۱۳) ''سرپنچ نے اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھا دیں، لیکن آسمان اب بھی بادلوں سے پاک تھا اور سورج اپنی پوری تمازت کے ساتھ جلوہ گر تھا، —— ''کونڈی با، یہ تیسرا برس ہے، لگتا ہے بھگوان ہم سے روٹھا ہوا ہے، ہمارے کھیتوں میں دھول اُڑ رہی ہے اور کنویں سوکھے پڑے ہیں، کتنے ہی لوگ روجی روجگار کے چکّر میں گاؤں چھوڑ چکے ہیں اور جو ہیں وہ مٹّی کے مول اپنے کھیت بیچ رہے ہیں —— سمجھ میں نہیں آتا آگے کیا ہوگا ——؟''

(ایضاً ص۔۱۰۱)

(۱۴) ''........ سرپنچ، دھرتی کا سمبندھ سکھ چین سے نہیں، آتما سے ہوتا ہے۔ اور آتما کی ویاکلتا ایک نہ ایک دن ضرور واپس لاتی ہے ——!'' (ایضاً ص۔۱۳۱)

(۱۵) ''اور اسی موسلا دھار بارش میں لاجونتی نے ایک خوبصورت بچّے کو جنم دیا۔''

(ایضاً ص۔۱۳۱)

(۱۶) ''پن کچھ بھی بولو کونڈی با، دگمبر ماسٹر کی چھوکری سدھا تھی ہی ایسی!''

(ایضاً ص۔۱۳۹)

(۱۷) ''ارے نصیب کوئی پنچھی تو ہے نہیں کہ کوئی بھی جال لگائے اور اسے دبوچ لے ——!'' شنکر نے اپنی کھولی کا دیا روشن کیا، اور اسے طاق میں رکھ دیا۔ کھولی روشن ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر شنو کو دیکھا۔ وہ زرد روشنی میں کسی چاند کی طرح نظر آ رہا تھا۔''

(ایضاً ص۔۱۴۵)

(۱۸) ''سمپت راؤ تمھاری مشین میں اگر میری بہو کی آواج آسکتی ہے تو سن لو وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ارے رشتے جب پیار مان سمّان کی بھٹّی میں تپ کر کندن بن جاتے ہیں تو ان کی پوترتا انسان کو انسان سے بھگوان بنا دیتی ہے، پن .... تم تو دھن کو رشتوں سے بڑا مانتے ہو۔ اسی لیے آج بھی اجاڑ مہاری میں اکیلے بیٹھے جیون کا بن باس

بھوگ رہے ہو— !اب جرا میری چھوٹی سی کٹیا کی طرف دیکھو— شنکر پاروتی نئی سرشٹی کا نرمان کرر ہے ہیں۔" (ایضاً ص۔۱۴۸)

(۱۹) "سوامی— !اولاد سے بڑا دھن کوئی نہیں ہوتا، اپنی اولاد کو سمپتی کا ناگ بن کر نہیں کونڈی با بن کر دیکھو— اس کے بعد جو شکتی تمھارے پاس آئے گی وہ تمھارے دھن کی شکتی سے بہت زیادہ بلوان ہوگی— !" (ایضاً ص۔۱۸۰)

(۲۰) "سمپت راؤ نے آنکھیں کھولیں، اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ پانی کے دو گھونٹ لیے۔ "پن، جب میں بیمار پڑا— !" اس کی آواز بھر آگئی تھی"، تو میرے کو پھر ایک نروان (؟) ہوا کہ دھن تو آتی جاتی چھاؤں ہے وہ کیسے شکتی بن سکتی ہے— ؟ جب یہ بات سمجھ میں آئی میں پراشچت کرر ہا ہوں، بھگوان مجھے ماپھ کرے گا یا نہیں۔ یہ میرے کو مالوم نہیں پن کونڈی با، میں تیرا اپرادھی ہوں، تو جو بھی مجھے ڈنڈ دے گا وہ مجھے سُویکار ہے— آج میں تیرا بیٹا اور تیری بہو تجھے واپس کرر ہا ہوں— !"

(ایضاً ص۔۱۸۸)

(۲۱) "لان پر بیٹھی ہوئی بینا نے سب کی طرف باری باری دیکھا اور پھر اس کی نظریں سمپت راؤ پر ٹھہر گئیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے وہیں رک گیا— "سوامی تم اب ایشور کی روشنی میں آگئے ہو۔ تمھارا یہ پریورتن میرا اسنتوش ہے۔ آج میرے دکھوں کا انت ہو گیا اور مجھے مکتی مل گئی۔" بینا نے اڑان بھری۔ سمپت راؤ اسے دیکھتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ نظروں سے دور ہو گئی— .... اور شنکر کی گاڑی پھر ایک بار اپنی کرمی بھومی کی طرف روانہ ہوئی۔" (ایضاً ص۔۱۹۰)

مذکورہ اقتباسات حسب ترتیب (۱) سمپت راؤ کی شوکت نمائی، (۲) بے قابو احساسِ برتری اور نودولتیے پن کا تفاخر، (۳) مطلق العنانیت، (۴) مادیت پرستی کا جھوٹا شعور، (۵) کونڈی با کا رشتوں پر سچا اعتماد، (۶) سمپت راؤ کا، دولت کی ہمہ جہت قدرت پر ایمان، (۷) کونڈی با کا سمپت راو کو انجام شناسی کا درس، (۸) دیہی ماحول کی تصویر کشی، (۹) کونڈی با کی بے خوفی اور توہم شکنی، (۱۰) لاجونتی کا شنکر کی یاد میں والہانہ اظہار، (۱۱) صوفیانہ اقدار کا ازلی تسلسل اور اساطیری علامت کے تئیں عقیدت مندی، (۱۲) کیسو کے طنزیہ جملے کے جواب میں شنکر کی بے بسی کا خلاّقانہ اظہار، (۱۳) گاؤں کی قحط زدگی کا بیان، (۱۴) کونڈی با کا سرپنچ کے منفی نقطۂ نظر کے جواب میں ڈاکٹر ولاس کی وطن واپسی کے امکان کا روحانی پہلو، (۱۵) لاجونتی کی خواہش مادرانہ کی تکمیل کے ساتھ بچّے کی پیدائش کی مبارک ساعت (۱۶) سمپت راؤ اور کونڈی با کے بچپن کی خوشگوار یاد یعنی دگمبر ماسٹر کی بیٹی سدھا، (۱۷) شنکر کی پدرانہ شفقت کا چاند یعنی اس کا نوزائیدہ فرزند شنو،

(۱۸) سمپت راؤ کے اکیلے جیون کا بن باس اور کونڈی با کی کٹیا میں شنکر پاروتی (یعنی شنکر اور اراجونتی کی تمثیل) کے ذریعہ نئی سرشٹی کا نرمان، (۱۹) شانتی کی روح کا اپنے شوہر کو بیٹے کے تئیں کونڈی با کی طرح نقطۂ نظر میں تبدیلی کے لیے اصرار، (۲۰) سمپت راؤ کا اعتراف گناہ یا پرائشچت اور (۲۱) مینا یعنی مرحومہ شانتی کی روح یا سمپت راؤ کے ضمیر کا استعارہ (جسے پرائشچت کے بعد نفس امارہ کی بندشوں اور اذیتوں سے مکتی (نجات) مل گئی اور اخیر میں شنکر یعنی نیا انسان (نئی نسل) ایک بار پھر اپنی کرم بھومی (کارزار حیات) کی سمت گامزن ہے!) وغیرہ ایسے بلیغ اشارے ہیں جن کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ یہ تو محض چند مختصر مثالیں تھیں ورنہ اس ناول میں ایسے تخلیقی شواہد جابہ جا اپنے سیاق وسباق کے ساتھ روشن ہیں۔

لیکن ان حقایق کے برعکس اس ناول کی چند کمزوریوں کی جانب بھی اشارہ کرنا لازمی ہے کہ: (۱) جو سمپت راؤ اپنی بیوی شانتی سے بے پناہ محبت کرتا ہے وہ روپیوں پیسوں کی تنگی کے سبب شہر کے ڈاکٹر کے مطالبات پورے کرنے سے قاصر ہے اور بالآخر شانتی کو گنوا بیٹھتا ہے لیکن وہی شخص اپنے گاؤں کی موروثی جائداد بیچ کر اکلوتے فرزند کی بہتر تعلیم کے لیے شہر میں مزدوری کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ کیا موروثی جائداد گروی رکھ کر یا فروخت کرکے ڈاکٹر کی فیس ادا نہیں کی جاسکتی تھی؟ شاید اس طرح شانتی کو بچایا جاسکتا تھا۔ لیکن اس حالت میں سمپت راؤ کے کردار کا کیا ہوتا؟ اس طرح مصنف کے منصوبۂ تخلیق کو خطرہ لاحق تھا۔

(۲) ناول کی انفرادی سطح جتنی توانا ہے اس کے مقابلے میں اس کے سماجی سروکار کی جھلک نمایاں ہونے سے رہ گئی ہے۔

(۳) جس طرح علاقائی شناخت کے حوالے سے آہنکار کو خلق کیا گیا ہے اس کا احساس اس کے مطالعے کے دوران نہیں ہوتا ہے۔ یہ کہانی تو کسی بھی گاؤں یا شہر سے منسوب کی جاسکتی ہے پھر موضع پمپری راجہ کی تخصیص کیوں؟

اس ناول میں Topography اور مقامی ماحول کو شناخت کرنا بہت دشوار ہے۔ پمپری کے جنگل، بیابان کھیت کھلیان اور وادیوں کے مناظر کی جھلک کہیں نہیں ملتی ہے۔ البتہ گاؤں کے گلی چوراہے، بیروبا کے مندر، سلطان جی کی درگاہ وغیرہ کے حوالے سے علاقے کی پہچان کو نشان زد کیا جاسکتا ہے۔

(۴) سمپت راؤ کے گھر کے علاوہ گاؤں کے کسی گھر میں کمپیوٹر یا انٹرنیٹ نہیں ہے جب کہ ہم آج عالمی گاؤں Global Village کے باشندے ہو چکے ہیں اور اب تو بڑی تعداد میں دیہی علاقے میں بھی ٹیلی ویژن، موبائل فون اور انٹرنیٹ کی سہولتیں میسر آنے لگی ہیں۔

(۵) دولت کی فراوانی کے باوجود سمپت راؤ کا معیار زندگی نہیں بدلا ہے۔ وہ حویلی میں رہتا ہے، بیڑی پیتا ہے اور پانچ شالا تک کی تعلیم رہنے کے باوجود انٹرنیٹ استعمال کرتا ہے اور اپنے اعلا تعلیم یافتہ بیٹا اور بہو کے ساتھ ویڈیو کانفرنسنگ کرتا ہے۔ اس طرح کے تضادات ناول کی بُنت پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔

(۶) گاؤں کے لوگوں کی سماجی وسیاسی بیداری حتیٰ کہ سرپنچ تک کا سیاسی شعور مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ آج کا گاؤں اتنا بھی بے حس اور مردہ نہیں ہے جیسا کہ مصنف نے پمپری راجہ کو بہ طور ماڈل پیش کیا ہے۔

(۷) گاؤں کے ماحول، ثقافت، تضادات و تنازعات اور سماجی رشتوں کے متعلق ناول نگار کا مشاہدہ وسیع اور گہرا نہیں ہے ورنہ علاقائی شناخت کی یک رخی تصویر پیش نہیں کی جاتی۔

(۸) 'آہنکار' میں مفادات کے تصادم کی کمی بہت کھٹکتی ہے۔

(۹) یہ ناول مقصدِ فکر و فن کے اعتبار سے اخلاقیات پُر ور اور مبلغانہ نوعیت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔

(۱۰) معمولاتِ حیات پر مصنف کی گرفت ڈھیلی رہنے کے سبب جزئیات نگاری اور جذبات نگاری کا حق ادا نہیں ہو سکا۔

درج بالا چند خامیوں کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت زمانے کے بعد نور الحسنین نے اردو کو ایک ایسا مختصر مگر پُر اثر ناول دیا ہے جو پریم چند، سہیل عظیم آبادی، علی عباس حسینی کی روایت کی توسیع کے ساتھ ابھرے بیانیے کی جگہ تخلیقی بیانیے کی قدرت کا قابلِ قدر اظہاریہ ہے اور کسی حد تک علاقائی شناخت (مقامی زبان اور محاورے کی حد تک)، معمولاتِ حیات اور محرومی کی نفسیات کا تخلیقی تلازمہ بھی! مجموعی طور پر 'آہنکار' ایک دلچسپ ناول ہے جس کی کہانی ظاہر سے کہیں زیادہ باطن میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔

........☆........

"It is plain that no one systematization can claim a supreme position. Men are naturally different and in any society specialisation is inevitable. There are evidently a great number of good systematizations and what is good for one person will not be good for another."

['Principles of Literary Criticism' : I.A. Richards, Page-45, Reprint edition-1996]

نیاز فتح پوری مستقلاً پاکستان کیوں آئے؟

● ڈاکٹر فرمان فتح پوری

نیاز صاحب ایک باشعور اور ذمے دار شہری کی حیثیت سے یقیناً کوئی نہ کوئی سیاسی نقطۂ نظر رکھتے تھے، اور برِعظیم پاک و ہند کی تحریک آزادی کے قلمی مجاہدوں میں تھے، لیکن کبھی کسی سیاسی جماعت سے خود کو وابستہ نہیں کیا، البتہ ان کی ہمدردیاں زبان و ثقافت کے حوالے سے ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ رہیں، اس لیے 1935ء کے قریب جب زبان کا مسئلہ برِعظیم کی سیاست میں مرکزی اہمیت حاصل کر گیا تو انھوں نے کانگریس کے بعض زعما کی ہندو ذہنیت اور اس کی جارحیت کے خلاف کھل کر قلم اٹھایا کہ اس کے بعد انھیں مسلم لیگ کا حامی خیال کیا جانے لگا۔ اس سلسلے میں ''نگار'' جولائی 1936ء میں ''ملاحظات'' کے تحت ان کا طویل اداریہ مطالعے کے لائق ہے۔ نگار کے کے ابتدائی صفحات میں 'ملاحظات' کے عنوان سے وہ عموماً سیاسی مسائل ہی پر اظہار خیال کرتے تھے۔ یہ مسائل برصغیر پاک و ہند کی ہندو مسلم سیاست سے متعلق بھی ہوتے تھے اور بین الاقوامی امور سے بھی۔ لیکن ان کی سیاسی تحریروں کی حیثیت بے لاگ تبصرے کی ہوتی تھی۔ ادب کی طرح سیاست میں بھی ان کا نقطۂ نظر آزاد، بے باک اور غیر جانب دارانہ ہوتا تھا، وہ ہر سیاسی جماعت کے اس اقدام کو سراہتے یا ہدف تنقید بناتے تھے جو ان کے زاویۂ نظر سے درست یا غلط ہوتا تھا۔ البتہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، ان کی ہم دردیاں، ملتِ اسلامیہ کے ساتھ تھیں اور ان کو ہر اس عمل اور ردِ عمل سے دکھ ہوتا تھا جس سے مسلمانوں کے قومی بقے اور تہذیبی سرمایے کو نقصان پہنچنے کا خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اردو ہندی قضیے کو سیاست میں داخل کیا گیا، انھوں نے کھل کر اردو کی حمایت کی اور ہندی کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا۔ مسلم لیگ سے وابستہ

مولوی عبدالحق کے ساتھ، مسلم لیگ سے الگ رہ کر، اگر کوئی بڑا ادیب پیش پیش تھا تو وہ مولانا نیاز فتح پوری تھے۔ پاک و ہند کی ملت اسلامیہ سے گہری ہم دردی رکھنے کی دوسری مثال 1948ء کا سالنامہ ہے۔ نیاز نے قیام پاکستان کے فوراً بعد جنوری فروری 1948ء میں ''نگار'' کا 'پاکستان نمبر' لکھنؤ سے شائع کیا۔ ڈھائی سو صفحے کا پورا پرچہ نیاز کی تراوشِ قلم کا نتیجہ ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے ایسا اہم صحیفہ ہے کہ اس کا جواب ہماری کتب و مقالات میں اب بھی نظر نہیں آتا۔ اس میں نیاز نے برِعظیم میں مسلمانوں کے داخلے کی تاریخ سے لے کر یہ بتایا ہے کہ یہاں مسلمانوں نے صرف ڈنڈے کے زور سے حکمرانی نہیں کی بلکہ مروّت و رواداری اور انصاف و رحم دلی سے عوام کے دلوں کو مسخر کیا ہے اور مختلف علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی روشنی پھیلائی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود جیسا کہ اوپر میں نے لکھا ہے، نیاز صاحب صرف ایک آزاد خیال سیاسی مبصر تھے۔ وہ عملاً یا مسلکاً کوئی ایسی سیاسی شخصیت نہ تھے کہ پاکستان آنے یا نہ آنے کا عوامی سطح پر کسی طرح کا ردِّ عمل ہوتا۔ ہاں ان کا شمار اُردو کے ان بڑے اور منفرد ادیبوں میں تھا جن کی زندگی کے معمولی اور نجی سے نجی واقعات بھی قابلِ توجہ خیال کیے جاتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب جولائی 1962ء میں نیاز صاحب مستقلاً پاکستان آ گئے تو ان کی آمد کے سلسلے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی گئیں۔ ہندستان میں خاص طور پر اُن کے نقلِ مکانی کو موضوعِ سخن بنایا گیا۔

بعض صحافیوں اور ادیبوں نے ان کی ہجرت کو نیاز صاحب کی حرص و ہوس کا نام دیا اور بعض نے ہندستان سے بے وفائی پر محمول کیا۔ حرص و ہوس کی تہمت اس قیاس پر تھی کہ انھیں پاکستان آنے کے لیے کسی بڑے عہدے کی پیش کش کی گئی ہوگی اور بے وفائی اس سبب سے کہ انھوں نے ہندستان کی جانب سے دیے گئے اس اعزاز کا بھی لحاظ نہ کیا تھا، جو انھیں ''پدم بھوشن'' کے نام سے چند روز پہلے ملا تھا۔ بعض نے یہ کہا کہ وہ اپنی ساری منقولہ و غیر منقولہ جائداد فروخت کر گئے اور اپنا ذاتی کتب خانہ جو بیش بہا مخطوطات پر مشتمل تھا، پاکستان منتقل کر کے آئے ہیں۔

نیاز صاحب چاہتے تو بڑی آسانی سے ان تہمتوں کا جواب دے سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا۔ طعن و تعریض کا نشانہ بننا پسند کیا لیکن زبان نہیں کھولی۔ کسی سیاسی وجہ یا مصلحت کی بنا پر نہیں، یکسر ذاتی، نجی اور نفسیاتی وجوہ کی بنا پر۔ میں نے بارہا چاہا کہ وہ قمر زمانی بیگم اور اپنی ہجرت کے واقعات کو وضاحت سے لکھ جائیں۔ 1963ء میں 'نیاز نمبر' کی اشاعت کے وقت میں نے خصوصاً اصرار کیا کہ وہ اپنے حالات کے ساتھ قمر زمانی اور ہجرت کی تفصیلات بھی بیان کر جائیں۔ لیکن ان دونوں باتوں کو وہ خوش اسلوبی سے ٹال گئے۔ مالک رام صاحب نے اپنے مضمون میں قمر زمانی بیگم کے قصے کا ذکر بھی کیا تھا لیکن نیاز صاحب نے یہ کہہ کر کہ جب اسے منظرِ عام پر لایا جائے تو پوری تفصیل اور صحت کے ساتھ لایا جائے، مالک رام صاحب کے مضمون سے اس حصے کو حذف کر دیا۔

میرے اصرار پر کچھ دنوں بعد وہ ''قمر زمانی'' کی تفصیلات شائع کرنے پر رضا مند ہو گئے اور ''نگار'' میں اس کا اشتہار بھی دے دیا گیا، لیکن بعض وجوہ سے یہ کام بھی نہ ہو سکا اور مجھے حکم دیا گیا کہ میری وفات کے بعد

شائع کر دینا۔ یہ کام تو چند برس بعد میں نے کتابی صورت میں کر دیا۔ 'قمر زمانی بیگم' نامی کتاب کا پہلا اڈیشن 1970ء میں لاہور سے اور دوسرا 1979ء میں اُردو اکاڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوا۔ اپریل، مئی 1979ء کا 'نگار پاکستان' بھی اس کے لیے مخصوص کیا گیا۔ البتہ ہجرت کے واقعات کو زبان پر لانے اور بیان کرنے کی اجازت نہ مجھ کو دی اور نہ گھر کے کسی فرد کو۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ اس واقعے کے تذکرے سے انھیں ذہنی الجھن ہوتی تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو اس تذکرے سے ان کی چہیتی بیٹی شوکت جہاں مرحوم کی روح کو تکلیف ہوگی، لیکن اب نیاز صاحب کی وفات کو کم و بیش بیس سال ہونے کو ہیں۔ مختلف جامعات اور جامعات سے باہر ان پر تنقیدی و تحقیقی کام بھی ہو رہا ہے اور بعض کام کرنے والے ان کی مہاجرت کے اسباب کو کچھ سے کچھ بنائے دے رہے ہیں۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کو وضاحت سے بیان کر دیا جائے تاکہ آئندہ جب نیاز کی سوانح حیات پر کوئی قلم اٹھائے تو وہ غلط اندیشی اور غلط روی کا شکار نہ ہو۔

ادب کے قارئین کو شاید یاد ہو کہ نیاز صاحب نے 1963ء کے 'نیاز نمبر' میں اپنے متعلق جو مضمون لکھا تھا، اس میں اپنی ہجرت کے اسباب کا تذکرہ بھی کنایتاً اس طور پر کر دیا تھا:

''یہاں (لکھنؤ میں) زندگی کے بہت اندوہ ناک واقعے پیش آئے۔ پہلے 1947ء میں میری رفیقۂ حیات اور اس کے چند سال بعد میری لڑکی شوکت کی موت اور میں ان کو بھی جھیل گیا، لیکن یہ خبر نہ تھی کہ زمانے کے ترکش میں ایک آخری تیر اور بھی ہے، ایسا زہر آلود تیر کہ اس سے جانبر ہونا میرے لیے دشوار ہو جائے گا۔ اس کی توضیح ضروری نہیں۔ مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ میری زندگی کا یہ دردناک تجربہ 1961ء سے شروع ہوا، اور اس نے رفتہ رفتہ میرے نظامِ عصبی، دل و دماغ کو اس درجہ متاثر کیا اشتہا مفقود ہوگئی اور غذا ترک۔ یہاں تک کہ میں صاحبِ فراش ہو گیا اور زندگی سے بلکل مایوس۔ پھر اگر میں تنہا ہوتا تو مجھے اپنی جان اتنی عزیز نہیں کہ اس ماحول میں جان دینے سے گریز کرتا، لیکن چونکہ میری رفیقۂ حیات اور اپنے دو چھوٹے بچوں کا مستقبل میرے سامنے تھا اور مجھے یقین تھا کہ میرے بعد ان کو سخت تکلیف کا مقابلہ کرنا پڑے گا، اس لیے میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کو لے کر پاکستان آ جاؤں۔''

('نگار پاکستان'۔ مارچ اپریل 1963ء، ص:41)

لیکن اس بیان میں چونکہ نیاز صاحب نے توضیح کو غیر ضروری قرار دیا ہے، اس لیے ان لوگوں کے سوا جو کہ لکھنؤ میں اپنی آنکھوں سے نیاز کی ذہنی الجھنوں کو دیکھ چکے تھے، کوئی دوسرا امر واقعہ سے آگاہ نہ ہو سکا۔ ہر چند کہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے عینی شاہد کے طور پر اسی وقت لکھ دیا تھا کہ:

''نیاز صاحب اور ان کے ساتھ 'نگار' کا ہندستان سے ہجرت کر جانا ہندستان والوں کے لیے ایک بہت افسوس ناک واقعہ ہے۔ مجھے یہ بخوبی معلوم ہے کہ نیاز صاحب کسی جلب منفعت کی خاطر پاکستان نہیں گئے، اگر ایسا خیال ہوتا تو نیاز پاکستان کے وجود میں آنے کے وقت ہی چلے گئے ہوتے۔ ان کے سیاسی خیالات میں بھی

یہاں ایسی کوئی نمایاں تبدیلی ظہور میں نہیں آئی تھی جس کے تحت ہندستان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہوں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں انھیں سیاسیات میں عملی طور پر کبھی دل چسپی نہیں رہی۔ انھیں اپنے کام سے کام رہا ہے۔ ملک میں چاہے جس قسم کے خیالات رائج ہوں، علم و ادب سے شغف رکھنے والے ہر حال میں اپنی گزر بسر کر لیتے ہیں۔ یہی حال نیاز صاحب کا ہے۔ اسی لیے ان کی ہجرت کی توضیح کسی سیاسی عقیدے میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک کہ قدر دانی کا سوال ہے تو خود ہندستان کی سرکار نے ابھی پچھلے دنوں انھیں 'پدم بھوشن' کے خطاب سے نوازا تھا۔ سرکار سے زیادہ خود اُردو داں طبقہ ان کی حتی الوسع قدر و منزلت کرتا تھا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر اگر بعض ہندستانی یا پاکستانی اخباروں یا ادیبوں نے اس قسم کے الزام تراشے ہیں تو وہ صریحاً بے بنیاد ہیں۔ نیاز صاحب اب عمر کے اس دور میں پہنچ چکے ہیں جب کہ منفعت یا مزید حصولِ شہرت و عزت کے خیالات کوئی خاص معنی یا اہمیت نہیں رکھتے بلکہ اس عمر میں پہنچ کر ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ اپنے بقیہ ایام بے فکری اور آرام و اطمینان سے بسر کرتا جائے اور جتنا کچھ ہو سکے اپنا ادبی یا علمی کام بغیر کسی فکر و اندیشہ کرتا رہے۔ یہی چیز اب نیاز صاحب کے لیے یہاں ممکن نہیں رہی تھی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مہاجرت کن افسوس ناک حالات کے تحت پیش آئی ہے۔"

('نگار پاکستان'، مئی جون 1963ء، ص:23)

لیکن اس بیان سے بھی یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ کون سے افسوس ناک حالات تھے جن کے تحت نیاز صاحب کو ہندستان چھوڑنا پڑا۔ جاننے والے جانتے تو ہیں لیکن ڈاکٹر ہاشمی کی طرح مجملاً ہی لکھتے ہیں، افسوس ناک حالات کی وضاحت نہیں کرتے۔ مثلاً نادم سیتاپوری جو نیاز صاحب کے اسبابِ ہجرت سے خوب واقف تھے، نیاز صاحب کی ہجرت کے بارے میں صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ:

"نیاز صاحب مع 'نگار' جب پاکستان پہنچے تو ہندستان سے ادبی حلقوں میں ان کی ہجرت پر طرح طرح سے تبصرے کیے گئے۔ تقریباً ویسی ہی فکر انگیزی جیسی جوش کے بارے میں چلی تھی، بعض لوگوں نے کہا کہ ہندستانی ادیبوں کو 'پدم بھوشن' کے غیر شاعرانہ خطاب راس نہیں آتے۔ بعض حضرات کی رائے تھی کہ نیاز صاحب نے وطن سے غداری کی، کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ جتنے منہ اُتنی باتیں۔ حالانکہ ان نکتہ چینوں نے ایک منٹ کے لیے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ ادبی زندگی کے علاوہ نجی زندگی بھی ہوتی ہے اور نجی زندگی کے تقاضے بھی، اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہر شخص اپنی نجی زندگی کے بارے میں آزادانہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہے اور کسی دوسرے کو اس پر رائے زنی کا حق نہیں پہنچتا، خواہ وہ اس کی شہرت کی بنیاد بنا کر اپنے آپ کو کتنا ہی قریب محسوس کرتا ہو۔ نیاز صاحب کی نقل مکانی بھی اسی قسم کا ایک نجی مسئلہ تھا، جس پر غیر ذمے دارانہ تنقید کرنے والوں نے نہ محض نیاز کے ساتھ ناانصافی کی بلکہ خود اپنے اوپر ظلم کیا۔"

('نگار پاکستان'، نومبر 1966ء، ص:8)

نادم صاحب نے اس جگہ نیاز صاحب کی ہجرت کی تفصیل سے دانستہ گریز کیا ہے۔ غالباً صرف اس

لیے کہ انھیں نیاز صاحب کی گزارش کا پاس تھا یا پھر یہ کہ اصل حقیقت سے وہ بھی بے خبر تھے۔ بات یہ ہے کہ نیاز صاحب ہر واقف سے واقف ہر دوست اور عزیز سے گزارش کر چکے تھے کہ ان کی نجی زندگی کا جو مسئلہ انھیں ہندستان چھوڑنے پر مجبور کر رہا ہے اُسے پبلک میں زیر بحث نہ لایا جائے کہ ایسا کرنا ان کے لیے اور ان کی مرحوم بیٹی کی روح کے لیے تکلیف دہ ہوگا۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، میں بھی اب تک اس مسئلے پر اسی خیال سے خاموش رہا، لیکن یہ محسوس کر کے کہ میری خاموشی مجرمانہ بنتی جا رہی ہے اور نیاز کی ہجرت کے بارے میں اُن کے محققین و ناقدین من گھڑت سے کام لے کر، حقائق کو کچھ سے کچھ کیے دے رہے ہیں، ضروری معلوم ہوا کہ اصل واقعات کو منظر عام پر لایا جائے۔

ہندستان سے نیاز صاحب کی ہجرت کا سبب دراصل خود نیاز صاحب کے داماد مجدّد نیازی اور مجدّد کی دوسری بیگم ہوئیں۔ مجدّد نیازی کون ہیں؟ اس کی بہت مختصر سی وضاحت اس جگہ ضروری ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خاں (صوبہ سرحد) میں نیاز صاحب کے ایک دوست تھے جناب اخوند فیض محمد فاروقی صاحب۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ شعر و ادب کا سچا ذوق رکھتے تھے۔ نگار و نیاز دونوں سے انھیں ربط خاص تھا۔ نگار کی اشاعت کے لیے بھی انھوں نے پنجاب اور سرحد کے علاقوں میں بہت کچھ کیا تھا۔ نتیجتاً نیاز صاحب سے برادرانہ تعلقات ہو گئے اور گھر جیسا آنا جانا ہو گیا۔ نیاز صاحب نے انھیں ایک اعزاز بھی دیا کہ ادارے کے تحت ان کا نام بھی 'نگار' میں چھپنے لگا۔1 بلکل اس طرح جیسے جلیل اعظمی، مخمور، مجدّد نیازی اور شوکت کے نام کچھ عرصے 'نگار' کی ادارت میں شامل رہے۔ مجدّد نیازی صاحب ان ہی اخوند فیض محمد فاروقی کے بڑے صاحب زادے ہیں۔

1931ء میں جس وقت فاروقی صاحب کی پہلی بیوی (والدۂ مجدّد) کا انتقال ہوا تو مجدّد کی عمر دس گیارہ سال کی رہی ہوگی۔ فاروقی صاحب سے نیاز صاحب کی خط و کتابت تو تھی ہی، چنانچہ نیاز صاحب نے جن کے نزدیک تمدنی زندگی کے لیے نفسیاتی و عائلی اور معاشرتی ہر اعتبار سے گھر میں عورت کا ہونا بہت ضروری تھا۔ فاروقی صاحب کو دوسری شادی کر لینے کا مشورہ دیا۔ مشورہ خلوص اور وقت کے تقاضے پر مبنی تھا، لیکن فاروقی صاحب صرف اس خیال سے کہ بچوں کے ساتھ ان کی سوتیلی ماں نہ جانے کس قسم کا سلوک کرے، شادی کرنے پر تیار نہ تھے۔ لیکن جب نیاز صاحب نے یہ پیش کش کر دی کہ ''مجدّد کو لکھنؤ میرے پاس بھیج دیا جائے، میں اسے اپنے بچوں کی طرح رکھوں گا۔'' تو فاروقی صاحب رضامند ہو گئے۔ نیاز صاحب نے واقعی مجدّد کو اپنی اولاد کی طرح پالا۔ پروان چڑھایا اور اعلا تعلیم دلوائی۔ لکھنؤ کے ماحول میں مجدّد کی زندگی بہت کچھ بدل گئی۔ اب وہ لکھنؤ کے ہو رہے۔ نیاز صاحب نے فاروقی صاحب کے مشورے سے 1941ء میں اپنی اکلوتی بیٹی شوکت سے مجدّد کی شادی کر دی۔ کچھ دنوں بعد اپنی ساری منقولہ و غیر منقولہ جائیداد بھی بیٹی کے نام کر دی۔ مجدّد کے دو بیٹے جاوید و جواد اور ایک بیٹی ہوئی۔ ابھی بچے چھوٹے ہی تھے کہ 1953ء میں اچانک شوکت کا انتقال ہو گیا۔ یہ سانحہ نیاز کے لیے کتنا جاں کاہ تھا اس کا کچھ اندازہ اس اداریے سے ہو سکتا ہے، جو انھوں نے 1953ء کے 'نگار' میں لکھا

تھا۔ پھر بھی نیاز صاحب اس صدمے کو جھیل گئے۔

مجدّ د نیازی، آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے۔ ان کی لا اُبالی طبیعت، خوے ناؤنوش اور بے اعتدال زندگی سے ان کے جاننے والے بخوبی واقف ہیں۔ شوکت کی وفات کے بعد مجدّ د کے بچوں کی نگہداشت و پرورش کا مسئلہ بھی نیاز صاحب کے سر آن پڑا اور سخت الجھن کا باعث بنا۔ اس درمیان خود نیاز صاحب کو اللہ نے آخری عمر میں اولادِ نرینہ دے دی تھی۔ وہ اپنے دو کمسن بیٹوں سرفراز نیازی اور ریاض نیازی 2 کے مستقبل کے بارے میں بھی متفکر رہا کرتے تھے۔ ان الجھنوں میں ایک بار پھر تمدنی زندگی میں عورت کی ضرورت کا احساس ہوا اور گھر میں گھر کی حقیقی فضا پیدا کرنے کے خیال سے جو مشورہ انھوں نے مجدّ د کے والد فاروقی صاحب کو دیا تھا وہی مجدّ د کو دیا۔ چنانچہ 1960ء میں نیاز نے لکھنؤ ہی میں انڈین سول سروس کے ایک افسر کی بیٹی سے مجدّ د کی شادی کر دی۔ شادی نیاز صاحب کی ترغیب پر خوش گوار ماحول میں ہوئی تھی۔ کچھ دنوں کے لیے گھر واقعی گھر بن گیا۔ بچّوں کے لیے عورت کی کمی پوری ہوگئی، لیکن یہ فضا بہت دنوں برقرار نہ رہ سکی، جلد ناخوش گواری میں بدل گئی، خانگی مسائل میں اختلافِ رائے شروع ہوا۔ بیگم مجدّ د نیازی کی عمروشوق کے تقاضے اور مطالبے کچھ اور تھے۔ ان کی مداخلت گھر کے غیر ضروری معاملات میں بھی ہونے لگی اور رفتہ رفتہ حد سے بڑھ گئی۔ نیاز صاحب کے لیے ان کا رویہ سخت تکلیف دہ تھا، پھر بھی وہ پورے صبر وضبط کے ساتھ مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔

جب مجدّ د نیازی اپنی بیگم کی طرح نیاز صاحب کے منہ آنے لگے تو بھی نیاز صاحب کے ہاتھوں سے صبر وضبط کا دامن نہ چھوٹا، لیکن ان کا دل اندر سے یکسر بیٹھ گیا۔ طبیعت روز بروز گرتی گئی، جیسا کہ پچھلی سطور میں خود نیاز صاحب کا بیان گزر چکا ہے ''اشتہا مفقود ہوگئی اور غذا ترک۔'' اس دماغ سوز فضا میں جب ایک دن مجدّ د اور بیگم مجدّ د کے یہ الفاظ ان کے کانوں میں پڑے کہ'' آپ کا اس گھر میں کیا ہے، آپ جہاں چاہیں چلے جائیں، یہ گھر آپ کا نہیں ہمارا ہے۔'' تو نیاز صاحب پر بجلی گر پڑی، سکتے میں آگئے۔ اُن کے لیے زمین تنگ اور آسمان سخت ہوگیا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن اس کو کہتے ہیں۔ دل کا دورہ پڑا، کئی مہینے صاحب فراش رہے، جیسا کہ بعض حضرات نے اشارتاً لکھا ہے کہ اگر نیاز صاحب چاہتے تو اس دُکھ کا مداوا کر سکتے تھے۔ قانونی چارہ جوئی کے دروازے کھلے ہوئے تھے، صرف عدالت سے رجوع کرنے کی دیر تھی۔ لیکن نیاز صاحب یہ کیسے کرتے۔ مجدّ د ان کے داماد تھے۔ ان کی چہیتی بیٹی شوکت کے شوہر تھے۔ ان کے عزیز دوست کے بیٹے تھے۔ جاوید و جوّاد کے ابو تھے۔ اگر نیاز صاحب کوئی قدم اٹھاتے تو مرنے کے بعد شوکت کو کیا منہ دکھاتے، اور اپنی نواسی نواسوں سے نظریں کس طرح ملاتے! اپنی افتادِ طبع اور دل کے ہاتھوں مجبور رہے۔ دوستوں کے اصرار کے باوجود عدالت کا رُخ نہ کیا اور پابدستِ دگرے دست بدستِ دگرے، کے مصداق اپنے سوتیلے بیٹوں کے پاس کراچی چلے گئے۔

مالک رام صاحب نے بہت صحیح لکھا ہے کہ'' ان کا ہرگز ارادہ نہیں تھا کہ ہندستان چھوڑ کر پاکستان چلے جائیں، حالانکہ اس کے بہت مواقع پیدا ہوئے لیکن روز بروز ان کی صحت خراب ہوتی گئی۔ کچھ شدید خانگی

پریشانیاں لاحق ہوگئیں۔ اب انھیں رہ رہ کر اس بات کا خیال آنے لگا کہ موت تو اٹل ہے اور ایک نہ ایک دن آ کر رہے گی۔ میری بیوی اور ان خورد سال (خُرد سال۔ اسیم) بچوں کا کیا حشر ہوگا۔ اس تشویش نے ان کی صحت پر ناخوش گوار اثر کیا۔ آخر کار انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہر پہلو سے یہی بہتر ہے کہ میں پاکستان چلا جاؤں۔" ("وے صورتیں الٰہی"، ص: 232، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1976ء، طبع دوم)

چنانچہ پاکستان چلے آئے، یہ تھا سانحہ جو سبب ہوا نیاز صاحب کے ہندستان چھوڑنے کا اور پاکستان آنے کا۔ اس کا کوئی تعلق نہ تو ہندستان سے غداری کا تھا نہ پاکستان کی طرف سے کسی عہدے یا انعام واعزاز کا۔ یہ مسئلہ نیاز صاحب کی زندگی کا یکسر نجی اور ذاتی تھا اور شاید وہ اسی لیے اس کو کسی اور تک پہنچانے کے قائل نہ تھے۔

نیاز صاحب کو جس بے بسی کے عالم میں پاکستان کے لیے ہجرت کرنی پڑی، وہ ایسا نہ تھا کہ بشاش بشاش آتے۔ نیم جان و پژمردہ آئے تھے۔ چند خاص الخاص کے سوا کسی کو انھوں نے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی۔ خاموشی سے آ کر ناظم آباد کے ایک فلیٹ میں پڑ گئے۔ نہ اخبار میں کوئی خبر چھپی نہ کہیں کوئی جلسہ یا استقبالیہ ترتیب دیا گیا۔ مجھے یہ خبر تھی کہ وہ مستقلاً آ رہے ہیں، لیکن کب، کس گاڑی سے، کس وقت؟ اس کا علم مجھے بھی نہیں تھا۔ کراچی پہنچتے ہی البتہ انھوں نے یہ دو سطریں مجھے لکھ بھیجیں۔

"گرامی عزیز!

اوّلین فرصت میں مجھ سے آ کر مل لیجیے، لیکن کسی سے اس کا ذکر نہ کیجیے کہ میں آیا ہوں۔"

(خط بنام راقم الحروف، مرقومہ یکم اگست 1962ء)

میں نے خط پاتے ہی حاضری دی اور سارے احوال سے مطلع ہوا۔ مجیب انصاری مرحوم، ادبیات کا اور خصوصاً فارسی ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ نیاز صاحب کے عاشقوں میں سے تھے اور دلی ہم دردی رکھتے تھے۔ وزارت مالیات میں افسر اور کراچی میں ایک مدت سے مقیم ہونے کے سبب ممتاز حسن مرحوم 3 سے گہرے مراسم تھے۔ مجیب صاحب نے نیاز صاحب کو ممتاز حسن صاحب کے علاوہ دوسرے اہل علم اور صاحب اثر ورسوخ حضرات سے ملوایا۔ چند مہینوں میں نیاز صاحب کی زندگی معمول پر آ گئی۔ 'نگار' جیسا تیسا، ان کے آنے سے پہلے ہی کراچی سے نکلنے لگا تھا، لیکن اس کی آمدنی، ان کی اقتصادی مشکلات کا حل نہ بن سکتی تھی۔ نیشنل میوزیم کراچی کے عربی و فارسی مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے پر مامور ہوگئے تو یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا۔ یہاں سے انھیں ایک ہزار روپے مہینہ ملتا تھا۔ ترقی اردو بورڈ کے مسودۂ لغت پر نظر ثانی کے سلسلے میں بھی انھیں کچھ رقم مل جاتی تھی۔ "جنگ" میں کالم لکھنے لگے تو آمدنی میں اور اضافہ ہوگیا۔ غرضیکہ کئی مہینوں کی جدوجہد کے بعد وہ اقتصادی طور پر سنبھلنے اور علمی و ادبی مشاغل کو اطمینان وسکون کے ساتھ اپنانے کے لائق ہوئے۔

(ماہنامہ 'انشا' (کلکتہ) کے 'نیاز فتح پوری نمبر' مطبوعہ دسمبر 1996ء سے منقول)

حواشی:

1- دیکھیے 'نگار' جنوری تا دسمبر 1945ء

2- سرفراز نیازی 10 جولائی 1949ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ 1969ء میں کراچی یونی ورسٹی سے فارمیسی میں گریجویشن کر کے فروری 1970ء میں امریکا چلے گئے۔ 1973ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور وہیں شکاگو کی ایک یونی ورسٹی میں پروفیسر ہو گئے۔ اپنے مضمون میں غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی معیار کے انگریزی رسائل میں ان کے تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ترکِ غذا کے بغیر موٹاپے کا علاج بھی انھوں نے دریافت کیا ہے اور جدید طب کے موضوع پر ایک بلند پایہ کتاب بھی لکھی ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے اور بہترین ٹیکسٹ بک شمار کی جاتی ہے۔

ریاض نیازی 14 فروری 1951ء میں پیدا ہوئے۔ 1971ء میں ان ای ڈی یونی ورسٹی کراچی سے بی اے کیا ہے۔ ایک نیم سرکاری ادارے کے ذمے دار عہدے پر فائز تھے۔ ان دنوں امریکا میں ہیں۔

3- حکومت پاکستان میں مالیات کے سکریٹری اور نیشنل بنک آف پاکستان کے مینجنگ ڈائرکٹر رہے۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ صاحبانِ علم و ادب کے جیسے قدردان تھے، کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

........☆........

بازدید

نیاز فتح پوری پاکستان کیوں گئے!

● اسیم کاویانی

فرمان فتح پوری کا مضمون ''نیاز فتح پوری مستقلاً پاکستان کیوں آئے؟'' 28 مئی 1979ء کی شام کو آرٹس کونسل کراچی میں نیاز فتح پوری کی تیرھویں برسی کے موقع پر ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا، جس میں نیاز کی موت کے بعد فرمان نے پہلی بار اُن کی ہندستان سے ہجرت کی تفصیلات کو ظاہر کیا تھا۔ پروفیسر کرار حسین نے بحیثیت صدر اور ڈاکٹر خلیق انجم معتمد انجمن ترقی اردو (ہند) نے بطور مہمانِ خصوصی جلسے میں شرکت کی تھی اور اُس وقت مجدّد نیازی حیات تھے۔

فرمان نے نیاز کی ہجرت کے اسباب واضح کرتے ہوئے جہاں اُن کی زندگی کے نجی المیے کا ذکر کیا ہے، اُسے نہ ماننے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور پھر فرمان کے علاوہ نیاز کی زندگی کے ان واقعات کی طرف اُن کے چند قریبی معاصرین (مالک رام، نادم سیتاپوری اور نورالحسن ہاشمی وغیرہ) بھی اپنی تحریروں میں اشارے کر چکے تھے، لیکن جہاں فرمان نے نیاز کی ہجرت سے اُن کے افکار کا رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور یہاں تک لکھا ہے کہ 'نیاز، مسلم لیگ کے حامی تصور کیے جانے لگے تھے۔' وہ تلبیسِ حقائق کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اگر فرمان نے نیاز کی زندگی میں ایسی کوشش کی ہوتی تو نیاز شاید کبھی اس کی اجازت نہ دیتے۔ فرمان نے ضمناً 'نگار' کے 1948ء کے سال نامے 'پاکستان نمبر' کا ذکر کیا ہے اور 'نگار' کے جولائی 1936ء کے اڈیٹوریل (ملاحظات) کا بھی۔ 'قمر زمانی بیگم' کا میرے موضوع سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے وہ خارج از بحث ہے۔

فرمان، نیاز سے کوئی تیرہ سال پہلے پاکستان جا کر آباد ہو چکے تھے۔ شاید یہ خیال کیا جائے کہ وہ اپنی

تقریباً ڈیڑھ دہائی کی وطنیت کی بنیاد پر اس روایت کا احترام کرنے پر مجبور ہوئے ہوں گے کہ 'روم میں رہو تو رومیوں کی طرح رہو'۔ لیکن میری رائے میں نیاز کے سیاسی نظریے پر اُن کا مذکورہ تبصرہ نیاز کی بجائے خود اُن کے اپنے ذہنی رجحان اور فکری وابستگی کا غماز ہے، جیسا کہ آگے کی تفصیلات سے واضح ہوگا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی ایک اوسط درجے کی تالیف 'ڈاکٹر فرمان فتح پوری - ایک جہت نما صاحب قلم' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر سلیم نے فرمان کی خود کی لکھی ہوئی غیر مطبوعہ سوانحی تحریر بھی شامل کر لی ہے۔ اس خودنوشت سے فرمان کی ذہنی اُفتاد اور فکر و عمل کی وابستگی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(1) ''فتح پور شہر میں بہ حیثیت طالب علم اور بہ حیثیت اسکول ٹیچر دس سال کے قریب رہا۔ یہ دس سال وہاں کن مشاغل میں اور کس طرح گزارے، صرف اس جگہ اتنا بتا دوں کہ میں نے مسلم لیگ اور 'تحریک پاکستان' کے سلسلے میں بہت فعال کردار ادا کیا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے سارے رہنما مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ فتح پور میں بعض تحریکیں بھی میں نے اس قسم کی شروع کر رکھی تھیں کہ ہندو زعما مجھ سے ناراض تھے۔'' (ص:76)

(2) ''میرا خاندان اب چار افراد پر مشتمل تھا۔ اس لیے کہ ابرار (بیٹا) کی پیدائش کے دو سال بعد اللہ نے مجھے شمیم کے نام سے ایک بیٹی بھی دے دی تھی۔ میری عمر ابھی صرف 23 سال تھی اور مجھے کسی بھی سرکاری محکمے میں آسانی سے ملازمت مل سکتی تھی، لیکن ہندستان کے حالات مسلمانوں کے حق میں ایسے خراب تھے کہ ملازمت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے پاکستان کا ارادہ کیا کہ اس کے قیام کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اسی کی محبت میں کچھ کھویا تھا۔'' (ص:77)

مجھے نہیں پتا کہ فرمان نے 'ہندستان' کے علاوہ اپنا اور کیا کھویا تھا، لیکن اُن کی اس تحریر سے اتنا بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کا تصور بھی محال سمجھنے والے فرمان، مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے لیے فعال کردار ادا کرتے ہوئے بھی یہاں اسکول ٹیچر کی ملازمت کر رہے تھے۔ خیر وہ 1948ء میں ایک بار پرشین گلف جا چکے تھے اور اُن کے پاس انٹرنیشنل پاسپورٹ موجود تھا۔ چونکہ بقول اُن کے 'اس زمانے میں پاکستان کا رُخ کرنا ایک طرح کا جرم تھا' اس لیے انھوں نے اپنے پاکستان جانے کے ارادے سے صرف ایک دو عزیزوں کو مطلع کیا تھا اور خاموشی سے مسقط کے مسافر کے طور پر بمبئی سے بحری جہاز پر سوار

ہو گئے تھے۔ اُن کے الفاظ میں 'جون 1950ء کا آخری ہفتہ تھا۔ رمضان کا مہینہ۔ کیماڑی کے پورٹ پر جہاز رُکا۔ (ص:77)

میں سمجھتا ہوں کہ فرمان کے فکر و نظریے پر یہاں مزید گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فرمان نے 'نگار' کے 'پاکستان نمبر' کا ذکر شاید اضافی شہادت کے طور پر کیا ہے۔ ڈاکٹر عقیلہ شاہین نے بھی نیاز فتح پوری پر اپنے تحقیقی مقالے میں اس خاص نمبر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے:

> ''ایسے پُر آشوب دور میں جب کہ ہندستان میں پاکستان کا نام لینا بھی بڑے حوصلے اور جرأت کی بات تھی، نیاز کا ہندستان میں رہ کر 'پاکستان نمبر' نکالنا قابلِ تحسین ہے۔ جو برصغیر اور خاص طور پر مسلمانوں کی ایک اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا انتساب بھی اُنھوں نے پاکستان کے مسلمانوں کے نام کیا ہے۔'' ('نیاز فتح پوری۔ شخصیت اور فن'، ص:318)

برسبیل تذکرہ عرض ہے کہ یہ ایک ایسا ہی مبالغہ آمیز اور غیر ذمے دارانہ بیان ہے جیسا ایک زمانے میں سرسید کی جرأت تحریر کو سراہتے ہوئے شبلی نے 'اسباب بغاوتِ ہند' کے سلسلے میں لکھا تھا کہ 'یہ کتاب ایسے عالم میں لکھی گئی' جب کورٹ مارشل کے شعلے بلند ہو رہے تھے، اور طفیل احمد منگلوری نے اُن سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر لکھا تھا کہ ''اُس کتاب کو توپ کے منہ کے سامنے بیٹھ کر ایک ملازم سرکار نے لکھا تھا۔'' اگر سرسید نے اسے توپ کے سامنے بیٹھ کر لکھا تھا تو وہ اُن کے لیے سلامی کی توپ ثابت ہوئی تھی، چوں کہ 'اسباب بغاوتِ ہند' کے متعدد ترجمے ہوئے تھے اور اسے کافی سراہا گیا تھا۔ اس کتاب کے مطالب کو نئی برطانوی حکومت نے اپنی پیش رو ایسٹ انڈیا کمپنی کو مطعون و معتوب کرنے کے لیے اپنی منشا کے عین مطابق پایا تھا۔ دوسری طرح سرسید بھی انگریزوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہے تھے کہ اُن کی کتاب سے ہندستانی رعایا کی انگریزوں سے نفرت نہیں بڑھے گی، اس لیے کہ اُس کی چند جلدوں کے ماسوا جو کہ اُن کی تحویل میں ہیں، وہ ساری جلدیں نذرِ ولایت کر چکے ہیں۔ آمدم برسرِ مطلب 'نگار' کے 'پاکستان نمبر' کو برصغیر کے اُس دور کی سیاست سے دُور کی بھی نسبت نہ تھی۔ اُس میں پچھلی ربع صدی میں 'نگار' ہی میں چھپے نیاز کے ایسے مضامین کو یک جا کر دیا گیا تھا، جن میں ہندستان اور بلادِ عرب میں مسلم حکمرانوں کے عہد کا، تمدنِ اسلام کے درخشاں پہلوؤں اور اُن کی رواداری کی روایات کا تذکرہ تھا۔ اس خاص نمبر کا مقصد یہ تھا کہ نظریۂ پاکستان کے متوالے اپنی نئی مملکت کی راہِ عمل طے کرتے ہوئے اپنے ماضی کی شان دار روایات کو بھلا نہ بیٹھیں۔ 'پاکستان نمبر' کے نام سے اُس کی نسبت محض استعاراتی تھی۔

فرمان نے 'نگار' کے جولائی 1936ء کے جس اڈیٹوریل کا ذکر کیا ہے وہ مکمل طور پر صرف اردو اور ہندی کے تنازعے سے متعلق ہے۔ جس کا لب ولباب یہ ہے کہ تقسیم ملک کے سانحے نے ہندوؤں اور مسلمانوں

میں مذہبی عصبیت کو بہت بڑھادیا تھا۔ اردو کے لیے ماحول سازگار نہیں رہا تھا۔ تقسیم سے قبل صوبہ متحدہ، پنجاب، بہار اور وسطِ ہند کے بالائی علاقے کا ہر پڑھا لکھا ہندو اردو پڑھتا، بولتا اور لکھتا رہا تھا، لیکن اب فرقہ واریت اور مذہبی عصبیت نے اُن لوگوں میں ہندی کو رائج کر دیا تھا۔ ناگپور کی بھارتیہ ساہتیہ پریشد میں گاندھی جی کے اس بیان نے کہ ''اردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے پھیلایا تھا'' لسانی منافرت کے ماحول کو اور زیادہ مسموم کر دیا تھا۔ اردو زبان سے عربی و فارسی الفاظ کے اخراج کی تجویز پر نیاز نے لکھا تھا کہ علمی و دقیق مضامین کے ادائے اظہار میں ان کے بغیر کام نہ چلے گا اور 'زبان نام صرف بیوی سے باتیں کرنے کا ہے اور نہ ہوٹلوں میں جا کر بیرا (خانساماں) سے توس مکھن مانگنے کا۔' اُنھوں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اردو اور ہندی کے نزاع کی خلیج شاید کبھی پُر نہ ہو سکے گی۔

گاندھی جی کے اُس متنازعہ بیان کے سلسلے میں ایک زمانے تک بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے۔ نیاز کا حقیقت پسندانہ اداریہ اسی دور کے اردو طبقے کے خیالات کا عکاس تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ فرمان کو 'نگار' کا اتنا قدیم وہ اداریہ ہی کیوں یاد رہا! اس درمیان میں 'نگار' کے 'ملاحظات' میں برصغیر کے کتنے ہی نازک مسائل پر سیکڑوں چشم کشا اور سخت تنقیدی شذرات نیاز کے قلم سے نکل چکے تھے۔ نیاز نے بین الاقوامی نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ برصغیر کے حالات پر بھی نگاہ رکھی تھی۔ اُن کے اداریوں میں دونوں ہی ملکوں کے عوام کی پامال آرزوؤں کا نوحہ بھی ہے اور ہند و پاک کی سیاست کے پست و بلند کا محاسبہ بھی۔ مذہبی عصبیتوں کے فروغ اور مذہبی و مسلکی اقلیتوں کی زار و زبوں حالت کی ترجمانی بھی ہے اور لسانی، ثقافتی، علاقائی تفریق و امتیاز کی مذمت بھی۔ برصغیر کے معاملات میں عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا انتباہ بھی ہے اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود کو سیاسی موقع پرستی اور ذاتی مفاد کی بھینٹ چڑھانے والوں کی سرزنش بھی، بہ ایں ہمہ دونوں ہی ملکوں کے عوام کو اُمید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنے کا پیغام بھی ہے۔ غرض کہ 'نگار' بعہدِ نیاز کے نصف صدی پر محیط اداریوں میں ہماری سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ کے درد و داغ و سوز و ساز و آرزو کی داستان بند ہے۔ جس کا بنیادی سُر (Key-note) یہ ہے کہ نیاز دونوں ملکوں میں ایک صحیح معنوں میں سیکولر (غیر مذہبی) معاشرے کا قیام چاہتے تھے۔ اُس پر فرمان نے کان نہ دھرا اور پنبہ بگوش رہے!

نیاز نے 1947ء میں اپنی زوجۂ دوم مختار بیگم کی وفات کے بعد اپنی چھوٹی سالی گلزار بیگم سے شادی کر لی تھی، جو کچھ عرصے قبل بیوہ ہوئی تھیں اور اپنے چار بیٹوں (محمد یوسف خان، محمد آصف خان، محمد عارف خان اور محمد قمر خان) اور ایک بیٹی کے ساتھ لکھنؤ ہی میں مقیم تھیں۔ [1] حُسنِ اتفاق سے وہ بیٹوں کی پیدائش کے معاملے میں بڑی زرخیز ثابت ہوئیں۔ نیاز نے کبھی اولادِ نرینہ کی طرف سے مایوس ہو کر اپنے ایک دوست کے بیٹے مجدد کو گود لیا تھا۔ اب اُن کے بڑھاپے میں (66 سال کے بعد) گلزار بیگم نے دو بیٹے (سرفراز نیازی اور ریاض نیازی) پیدا کر دیے تھے۔ اپنی بیوی اور بیٹوں کے مستقبل کی طرف سے نیاز کی تشویش اور فکرمندی فطری تھی۔ اُن حالات کا فرمان نے ذمے داری کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ یہاں پر بہتر ہوگا کہ نیاز سے فرمان کے تعلق کی ابتدا اور

نوعیت پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

یہ سن 39-1938ء کی بات ہے۔ فرمان، مسلم کالج فتح پور میں زیرِ تعلیم تھے۔ انھیں دنوں اپنے کالج کے سالانہ مشاعرے میں نیاز کو مدعو کرنے کے لیے اُن کے وطن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے وہ پہلی بار اُن سے لکھنؤ میں ملے تھے۔2 نیاز نے اپنے وطنِ مالوف کے مشاعرے میں شرکت کے لیے نہ صرف مسرت و آمادگی ظاہر کی تھی اور شریک بھی ہوئے تھے بلکہ اُن کی ایما پر کئی اہم شعرا نے بھی اپنی شرکت سے مشاعرے کو رونق بخشی تھی۔ بس وہیں سے فرمان نیاز کے معتقد ہو گئے تھے اور نیاز سے اُن کے تعلقات کا آغاز ہوا تھا۔ غالباً 1950ء کے بعد 'نگار' کے پرچوں میں اُن کے اکادُکا مضمون بھی نظر آنے لگے تھے۔ 1950ء ہی میں وہ پاکستان جا بسے تھے، لیکن وہاں جا کر بھی اُنھوں نے نیاز سے اپنا رابطہ استوار رکھا۔

مارچ 1952ء میں فرمان ہی کی فرمائش پر نیاز ایک بین الملکی مشاعرے کی صدارت کے لیے (تقسیم ملک کے بعد) پہلی بار پاکستان گئے تھے۔ اس یادگار مشاعرے میں اُس دور کے چوٹی کے شعرا (فراق، جوش، اثر، جگر وغیرہ) شریک ہوئے تھے۔ نیاز نے اس موقع پر "سندھ کا ایک تاریخی رومان" کے عنوان سے اپنا صدارتی خطبہ دیا تھا۔

پاکستان کے اس دورے میں نیاز کے ساتھ کچھ بدمزگیاں بھی لگی رہیں۔ نیاز کی مذہبی تحریروں کی بنا پر مذہبی علما تو اُن سے بدظن رہا ہی کرتے تھے، اس کے علاوہ تقسیم ملک کے عبوری دور اور تقسیم کے بعد 'نگار' کا سیاسی موقف بھی پاکستانیوں کے لیے کوئی مرغوبیت نہیں رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نیاز کے اس دورے کے موقع پر اُن کے مخالفین نے کافی شورشیں برپا کیں، جو بالآخر فرو کر دی گئیں۔ اسی سال نومبر میں وہ اپنے (اور گلزار بیگم کے) رشتے داروں سے ملنے کی غرض سے ایک بار پھر پاکستان گئے، تب غالباً اُن کے مخالفین کا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور یوں بھی یہ اُن کا ایک نجی دورہ تھا۔ اپنے پاکستان کے ان دو سفروں کا موازنہ کرتے ہوئے نیاز نے 'نگار' کے 'ملاحظات' (دسمبر 1952ء) میں لکھا تھا:

> "اس سے قبل جب کبھی پاکستان گیا ہوں تو یہاں کے مذہبی اداروں کی طرف سے میری پذیرائی اس شان سے کی گئی کہ میرے کفر و الحاد کے پوسٹر بازاروں میں چسپاں کیے گئے۔ میرے خلاف احتجاجی جلسے برپا ہوئے۔ اخباروں میں میری آمدِ پاکستان کو بڑا زبردست اسلامی خطرہ قرار دیا گیا، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ مجھے ہندستانی جاسوس قرار دے کر حکومت پاکستان کو بھی میرے خطرناک وجود سے متنبہ کیا گیا۔ حتا کہ ایک بار بات اس حد تک پہنچ گئی کہ انڈین ہائی کمشنر کو مجھے اپنے یہاں منتقل ہو جانے کا مشورہ دینا پڑا، گو میں نے اسے قبول نہیں کیا، لیکن اس

مرتبہ ع ایک بھی فرقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی! کیا بات ہے؟ جیسا
سلامت گیا تھا، ویسا ہی صحیح سلامت واپس آ گیا۔ سوچتا ہوں کہ اس کا
سبب کہیں یہ تو نہ تھا کہ ع تیغ جفائے یار ہی کچھ کند ہو گئی! یا پھر یہ کہ
میں خود ع شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا!''

اس کے چند برس بعد پھر کسی موقع پر اُن کے احباب کراچی نے اُن سے پاکستان آنے کے لیے اصرار کیا۔ نیاز نے اُنھیں جواب دیتے ہوئے 'نگار' ('ملاحظات'، اگست 1955ء) میں یہ قطعہ درج کیا تھا اور اُن کی خواہش پوری کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی:

ملّا زدہ سر زمین سے میرا کیا ربط
مذہب کا جلوہ وہاں، یہاں عقل کا خبط
کیوں کر میں کراچی آؤں بولو جب تم
کر لیتے ہو دانتے کی 'انفرنو' ضبط

جیسا کہ نیاز کے جواب سے ظاہر ہے، پاکستان میں اٹلی کے عظیم شاعر دانتے (1265ء تا 1321ء) کی 'انفرنو' 3 پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ اگرچہ اپنے اس شاہکار میں دانتے نے اپنی دانست میں ذہنی کشادگی کا ثبوت دیتے ہوئے ابن رشد، ابی سینا اور صلاح الدین کو جہنم سے باہر جگہ دی تھی، لیکن اپنے نقطۂ نظر سے اُنھیں اس بات کا قصور وار ٹھہرایا تھا کہ اُنھوں نے عیسائیت کے نور سے فیض کیوں نہیں اُٹھایا۔

نیاز ایک کاروباری ذہن رکھتے تھے اور اپنی زندگی میں سخت ڈسپلن اور سلیقے کے عادی تھے۔ اُن کے فکری رویے کو میں اس ایک مقولے سے واضح کرنا چاہوں گا کہ 'اعتقاد ذہانت کی موت ہے۔''

('Belief is the death of intelligence'- Robert Auton Wilson)

اس لیے مذہبی بنیاد تو اُن کی ہجرت کی وجہ بن نہیں سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے تقسیم ملک کے بعد مہاجرین کے مسائل اور اُن کی تبدیلیِ حالات کے نتائج کو قریب سے دیکھا تھا۔ مادّی حاصلات میں اگر کوئی مہاجر خسارے سے بچ بھی گیا تھا تو اپنے زاد بوم سے اجڑنے کے ذہنی و نفسیاتی زیاں سے کوئی نہ بچ سکا تھا۔ 'نگار' 1952ء کے پرچوں میں ہند و پاک کے پچاسوں مہاجر شعرا و ادبا کے ناموں کا گوشوارہ ان کے نئے اور پرانے پتوں کے ساتھ چھپا تھا۔ جوش اور مولوی عبدالحق کی ہجرت کے بعد کے پچھتاوے کے تذکرے نیاز، 'نگار' کے صفحات پر پیش کر چکے تھے۔ (مثلاً: 'مولوی عبدالحق پر کیا گزری؟' مشمولہ 'نگار' جون 1958ء)

چوں کہ نیاز ایک کاروباری ذہن رکھتے تھے تو کیا ایسے میں کوئی پُرکشش ترغیب اُن کے سامنے ہوتی، تب بھی وہ پاکستان جا بسنے کا قصد نہ کرتے؟ یہ کہنا مشکل ہے، لیکن اُن کی زندگی کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے ایسی کوئی ترغیب کبھی نہیں رہی اور قیاس کہتا ہے کہ ایسی کوئی ترغیب ہوتی بھی تو فکری خلیج حائل

ہو جاتی۔ ایک دو لکھنے والوں کے یہاں ایسے اشارے ملتے ہیں کہ نیاز نے بھی کبھی ہجرت کر پاکستان جانے کی نیم دلانہ خواہش ظاہر کی تھی، لیکن کہیں انھیں ذہنی اطمینان کی ضمانت نہ ملی اور کہیں پر انھیں خطرۂ ایمان سمجھ کر اُن کی بات ہی آگے نہیں بڑھائی گئی۔ آئندہ سطروں میں ان بیانات کی اصلیت اور محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

تقسیم ہند کے بعد پرستارانِ نگار کی خاصی تعداد پاکستان میں رہ گئی تھی، اور دونوں ملکوں کے درمیان کشیدہ تعلقات کا اثر کتب ورسائل کی ترسیل پر بھی پڑا تھا۔ نیاز کے بہت سے خیر خواہ اصرار کر رہے تھے کہ نیاز پاکستان چلے آئیں۔ اُنھیں میں سے ایک فضل حق قریشی نے 1948ء میں نیاز سے درخواست کی تھی کہ وہ مستقل طور پر پاکستان چلے آئیں، تب نیاز نے اُنھیں اپنے ترکِ وطن نہ کرنے کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ 'دہلی سے جو حضرات کراچی گئے، وہ بحالتِ مجبوری اور یہاں تباہ ہو کر وہاں گئے، لیکن اُن کے سامنے ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ دوسری بات اُن کے لیے یہ اہمیت رکھتی ہے کہ کیا وہاں جانا کاروباری اعتبار سے اور (ذہنی) اطمینان کے لحاظ سے اُن کے لیے بہتر ثابت ہوگا؟ اور اسی بات کی اُنھیں کوئی ضمانت نظر نہیں آتی۔ وہاں جانے کی کوئی کشش ہے تو صرف یہ کہ اُن کے اعزہ وہاں موجود ہیں اور اُن کے بیچ جان و مال کی سلامتی کا اطمینان رہے گا۔'' شاید اسی کشش کی بنا پر کراچی میں کہیں مل رہے پلاٹس کی خریداری میں اُنھوں نے دلچسپی بھی لی تھی، لیکن بوجوہ اُنھوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ 4

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے 'نگار' کے 'نیاز نمبر' میں لکھے اپنے ایک مضمون 5 میں ضمنی طور پر یہ انکشاف کیا ہے کہ نیاز نے اُن کی کتاب ''اردو زبان کا ارتقا'' کو شائع کرنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ اسی سلسلے میں مئی 1951ء میں شوکت ڈھاکے سے میرٹھ جاتے ہوئے لکھنؤ میں نیاز سے ملنے گئے تھے۔ اُس ملاقات میں نیاز نے اُن سے کہا تھا کہ ''وہ ترکِ وطن کر کے ڈھاکا آنا چاہتے ہیں۔ اگر وہاں فضلی صاحب (ڈھاکے میں مشرقی پاکستان کے معتمدِ تعلیمات) 'نگار' کے لیے کوئی مکان یا بدرجہ اقل انتظام کر سکیں تو وہ وہیں بیٹھ کر اردو زبان کی خدمت کریں گے۔'' یہ امر باعث حیرت ہے کہ نیاز نے کراچی یا لاہور کی بجائے ڈھاکے جانے میں دلچسپی کیوں دکھائی تھی، جب کہ وہاں اُن کے عزیز و اقارب میں سے کوئی نہ تھا اور وہ خود لاہور اور کراچی سے مانوس تھے (وہ ایک دور میں 'زمیندار' لاہور کے ادارے سے ایک سال تک منسلک رہ چکے تھے) شوکت کے بیان کا کلائمکس یہ ہے کہ ڈھاکے میں جب اُن کے کسی بزرگ نے اُنھیں نیاز کا پیغام فضلی کے گوش گزار کرنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ 'نیاز یہاں آکر بے دینی پھیلائیں گے، اس لیے اُن کا یہاں آنا بہتر نہ ہوگا۔' تو شوکت، نیاز کا پیغام فضلی تک پہنچانے کی جسارت بھی نہ کر سکے تھے۔

'نگار' ماہ اپریل 1958ء کے شمارے میں نیاز نے 'نگار' کے 37 سالہ صحافتی سفر پر نگاہِ بازگشت کرتے ہوئے دیگر ادبی رسائل کے مقابلے میں 'نگار' کی رفتارِ ترقی پر اطمینان کا اظہار کیا تھا، لیکن پھر بھی اُن کے دل کی یہ بات زبانِ قلم پر آ ہی گئی کہ ع تعمیر ما بہ اندازۂ ویرانی ما نیست۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے علم و ہنر کی خاطر خواہ

پذیرائی نہ کیے جانے کی شکایت عموماً ہر دور کے فنکار کو رہی ہے تو نیاز کا یہ گلہ بھی بے جا نظر نہیں آتا کہ انھوں نے اردو ادب کو جتنا کچھ دیا، انھیں اس کا صلہ توقع سے کم ملا۔ یہ ایک ایسی عام سی شکایت ہے، جس کے اور کوئی معنی ڈھونڈنا بے جا سی بات ہوگی۔

اگلے سال ماہ مئی 1959ء کے 'نگار' میں انھوں نے پیش کش کی تھی کہ اگر پاکستان میں کوئی صاحب 'نگار' اور 'مطبوعات نگار' کی اشاعت کرنا چاہیں تو وہ اس کے لیے آمادہ ہیں۔ انھیں کوئی فائدہ مطلوب نہیں، بلکہ صرف وہاں کے عوام تک اپنی بات پہنچانا اُن کا مقصود ہے۔ اس اعلان کا پس منظر بھی اس کے سوائے اور کچھ نظر نہیں آتا کہ تقسیم ہند کی خلیج نے وطن عزیز کو بانٹ کر اور نظریاتی فاصلوں نے لوگوں کے دلوں کو جدا کر کے جو ستم ڈھایا تھا، اُس کے مداوے کی کوشش کی جائے۔

جیسا کہ فرمان نے نیاز کے ذاتی حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نیاز نے مجدد نیازی کی زندگی کو معمول پر لانے کے لیے 1960ء میں لکھنؤ کے ایک آئی سی ایس افسر کی بیٹی سے مجدد کی دوسری شادی کر دی تھی۔ اس کے بعد مختصر مدت کے لیے گھر میں خوشیوں کا ماحول قائم ہو گیا تھا۔ اسی اثنا میں نیاز اپنے اور گلزار بیگم کے عزیزوں سے ملنے کے لیے کراچی چلے گئے تھے، اس بارے میں عقیلہ شاہین نے اپنے مقالے میں لکھا ہے:

> ''اکتوبر 1960ء میں (وہ) عزیزوں سے ملنے کے لیے ایک بار پھر کراچی آئے اور واپس چلے گئے۔ مستقلاً پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، لیکن آخری عمر میں ایک ایسا نجی واقعہ رونما ہوا کہ اُن کے لیے ایک سانحۂ غم بن گیا۔ انھیں چار و ناچار پاکستان آنا پڑا۔'' ('نیاز فتح پوری۔ شخصیت اور فن'، ص:39)

اُن کے نجی دُکھوں کا سلسلہ کراچی سے ہندستان لوٹتے ہی شروع ہو گیا۔ اُن کی بہو کا عمل و دخل گھریلو مسئلوں میں تکلیف دہ حد تک بڑھتا چلا گیا اور رفتہ رفتہ ان کے لیے سوہانِ روح بن گیا۔ یہاں تک کہ نیاز سے کہہ دیا گیا کہ مکان و جائیداد میں اُن کا کچھ نہیں ہے، وہ جہاں چاہیں چلے جائیں اور جب انھوں نے مجدد نیازی کو بھی اُس کی بیوی کا ہم نوا پایا تو آہنی عزم و ارادے کے مالک ہونے کے باوجود نیاز کو ایک ناقابلِ برداشت ذہنی صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اپنے ہی عزیزوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کو انھوں نے اخلاق و مروت سے بعید سمجھا اور 1961ء کے بعد کے ان اندوہ ناک اور مایوس کن حالات میں انھوں نے پہلی بار سنجیدگی سے ترکِ وطن کر کے پاکستان جا بسنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ زخمی احساسات اور شکستہ جذبات کے عالم میں بھی انھوں نے تدبیر اور تدبر سے کام لیا۔ اپنے سوتیلے بیٹے عارف نیازی سے کراچی میں 'ادبِ عالیہ' کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھوائی اور اسے اپنی کتابوں کے حقوق اشاعت تفویض کیے۔ 'نگار' (اگست ستمبر 1961ء) میں جب قارئین کو یہ اطلاع دی گئی کہ 'نگار پاکستان' کے رجسٹریشن کا انتظار ہے اور بہت جلد اس کی اشاعت وہاں

سے شروع ہو جائے گی، اُس وقت بھی ہندستان کے ادبی حلقے میں یہی خیال کیا گیا کہ 'نگار پاکستان' نیاز کے اس مجوزہ منصوبے کا حصہ ہے، جس کے تحت وہ پاکستان میں اپنی نگارشات کی اشاعت کے خواہاں ہیں۔

1962ء میں حکومت ہند نے اُن کی ادبی خدمات کے عوض انھیں 'پدم بھوشن' دینے کا اعلان کیا، لیکن اس اعزاز سے بھی اُن کے ذاتی غموں کا علاج ممکن نہ تھا۔ 27اپریل 1962ء کو نیاز پدم بھوشن کا تمغہ لینے کے لیے دہلی میں آئے تو خانم ممتاز مرزا کے یہاں ٹھہرے تھے (جن کے والد اور شوہر دونوں نیاز کے مداحوں میں سے تھے) چھ سات سال کے وقفے کے بعد خانم نے انھیں دیکھا تھا، لکھتی ہیں کہ:

> ''اتنا عظیم انقلاب ہو چکا تھا اُن میں کہ میرا دل رو دیا۔ اعصاب کے مریض، بے خوابی کے شکار، مولانا پہچانے نہیں جاتے تھے۔'' 6

فرمان فتح پوری اور عارف نیازی کی کوششوں سے کراچی میں جنوری 1962ء سے 'نگار پاکستان' کی اشاعت شروع ہو گئی تھی، جو کہ 'نگار' لکھنؤ ہی کا چربا ہوا کرتا تھا۔

جولائی 1962ء کا 'نگار' لکھنؤ کا آخری شمارہ تھا، جسے شائع کر کے نیاز کراچی چلے گئے۔ وہاں اگست ستمبر 1962ء کا 'نگار' اُن کی نگرانی میں شائع ہوا، جس کے 'ملاحظات' میں اُنھوں نے اپنی آمدِ پاکستان اور ذہنی کیفیت کے تعلق سے یوں لکھا تھا:

> ''پچھلے دو سال سے بعض ذہنی صدمات کی بنا پر میری صحت و قوتِ عمل بہت متزلزل رہیں۔ حتیٰ کہ اس دوران میں گاہ گاہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ موت کا تصور بھی مجھے خوش گوار نظر آنے لگا، لیکن چونکہ میرے اعضائے رئیسہ نے میرا ساتھ نہ چھوڑا تھا، اس لیے احساس کی تلخیاں میری اس سخت جانی کو شکست نہ دے سکیں... رفتہ رفتہ زندگی کو اپنے لیے گوارا بنا لیا گیا۔ میرے اس نفسیاتی کرب و اضطراب کا تعلق صرف لکھنؤ کے ماحول سے تھا، جس نے دفعتاً بلکل خلاف اُمید، سخت اذیت رساں و روح فرسا صورت اختیار کر لی اور میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ فی الحال اس ماحول سے جُدا ہو کر کسی دوسری جگہ چلا جاؤں اور یہ جگہ کراچی کی خنک فضا کے علاوہ اور کہاں میسر آ سکتی تھی۔ چنانچہ میں یہاں 31 جولائی کو آ گیا ہوں۔ ماضی و مستقبل دونوں کے تصور سے خالی الذہن ہو کر آیا ہوں۔ رہا سوال 'منزل گہِ مقصود' کا سو اس کی فکر جب مجھ ہی کو نہیں تو آپ کیوں اس کی جستجو کریں۔ ع عالمِ بے خبری راہ بھی ہے، منزل بھی۔

یہ درست ہے کہ 80 سال قبل جو آنکھ کھلی تھی، وہ اب تک بند نہیں ہوئی ہے اور جس دل نے 1302ھ کی کسی تاریخ کو دھڑکنا شروع کیا تھا وہ اب تک دھڑک رہا ہے...''

مذکورہ بالا تحریر میں اپنے دلی کرب کے کنایتاً اظہار کے علاوہ نیاز کی شرافتِ نفس نے کبھی گوارا نہ کیا کہ وہ اپنے خاندانی تنازعے کو عوام میں لے جائیں، اپنی زندگی میں انھوں نے فرمان کو بھی اس کی تفصیل ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ نیاز کی اس تحریر میں 'فی الحال' کا لفظ بھی بڑا معنی خیز ہے۔ گویا نیاز کو اپنی درازیِ عمر کے لحاظ سے احساس ہو چلا تھا کہ اُن کے چل چلاؤ کا وقت آیا ہی چاہتا ہے۔ دارالقرار تو کہیں اور ہے اور پاکستان کا پڑاؤ عبوری ہے۔ اپنی پیرانہ سالی کے باوصف انھوں نے پاکستان میں اپنے خاندان کو ازسرِ نو آباد کیا۔ وہاں کی اُن کی چار سالہ زندگی میں بھی اُن کے قلم سے کبھی ہندستان کے سلسلے میں ناپسندیدہ جذبات کا اظہار نہیں ہوا، بلکہ اُنھوں نے یوں اعترافِ حقیقت کیا:

''ہندستان میں مَیں نے جیسی کامیاب زندگی بسر کی اور وہاں کی حکومت نے میری جتنی قدر افزائی کی، اُس کا اقتضا یہی تھا کہ میں وہیں جان دے دیتا، لیکن افسوس کہ اُن ناگزیر حالات نے مجھے ہجرت پر مجبور کر دیا۔''[7]

نیاز کو پاکستان جا کر تین برس بھی نہیں ہوئے تھے کہ اُن کے گلے کے قریب ایک گلٹی نمودار ہوئی جو کہ سرطان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ایک برس تک اُنھوں نے اس کا مقابلہ کیا۔ زندگی نے اور مہلت نہ دی، آخر 82 برس کی عمر میں 24 مئی 1966ء کو اُنھوں نے اس عالمِ خاکی سے منہ موڑ لیا۔

اپنی موت سے پہلے نیاز نے 'نگار' کے تمام مالکانہ حقوقِ اشاعت دائمی طور پر فرمان فتح پوری کے نام کر دیے تھے اور اُن کی اہلیہ گلزار بیگم نے بھی مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔ یہ فرمان ہی تھے جنھوں نے نیاز کی غیر موجودگی میں، اُن کی ایما پر 'نگار پاکستان' کا پودا کراچی میں لگایا تھا۔ نیاز کی وفات کے بعد اُنھوں نے 'نگار' کی وراثت کو جس طرح قائم رکھا، اس کی مثال تاریخِ ادب میں شاید ہی کہیں ملے گی۔ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جنوری 2012ء میں 'نگار' نے اپنی زندگی کے 90 سال پورے کر لیے ہیں۔ 'نگار' بعہدِ نیاز کی مدتِ حیات ساڑھے چوالیس برس کی تھی۔ وفاداری بشرطِ استواری کی کیسی انوکھی مثال ہے کہ فرمان نے نہ صرف اتنی مدت تک بلکہ اُس مدت سے بھی آگے 'نگار' کو جاری رکھ کر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ 'نگار پاکستان' میرے مطالعے میں کم ہی رہا ہے، اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ فرمان نے نیاز کی خرد افروزی کی روایت کو کس حد تک برقرار رکھا ہے!

ماخذ:

1- ص: 14، 'نیاز فتح پوری - شخصیت اور فن' (ڈاکٹر عقیلہ شاہین) مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان، سال اشاعت 1995ء

2- مضمون ''علامہ نیاز اور فتح پور'' از: ضیا حسنی، مشمولہ 'انشا (کلکتہ)' 'نیاز فتح پوری نمبر' ص: 42۔

3- انفرنو، بمعنی جہنم، دانتے کی مشہور زمانہ تخلیق 'ڈیوائن کامیڈی' کا پہلا حصہ۔

4- نگار پاکستان'، 1966ء میں مطبوعہ فضل حق قریشی کے مضمون 'نیاز فتح پوری مرحوم' میں مشمولہ اُن کے نام نیاز کے خط کا خلاصہ۔

5- مضمون ''نیاز کا مذہب'' مشمولہ 'نیاز نمبر (اول)' ص: 111۔ 'نگار پاکستان' 1963ء

6- مضمون 'دلّی کی آخری صحبت' (خانم ممتاز مرزا) ص: 82، نیاز نمبر (اول) 'نگار پاکستان' 1963ء

7- مضمون: ''والد مرحوم، میں اور نگار'' (نیاز فتح پوری) ص: 41، 'نیاز نمبر (اول)' 'نگار پاکستان' 1963ء

8- ''نیاز فتح پوری - شخصیت اور فن'' (ڈاکٹر عقیلہ شاہین) ص: 43-42 کا خلاصہ۔

Aseem Kavyani, Flat No. 702, Ketan Apartment,
Belvedar Road, Mazgaon, Mumbai - 400010
aseemkavyani@gmail.com, Mob. : 09322154702

"ایک محقق کی زبان اور زبانِ قلم کی واشگاف گوئی اور حقیقت نگاری کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں لیکن اس سلسلہ میں بات کبھی کبھی خود رشید حسن خاں کے یہاں جائز حدوں سے آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے...... گمراہ کن رجحانات اور علمی جرائم کی حوصلہ شکنی جتنی ضروری ہے اتنا ہی تحقیقی طریقِ رسائی میں لب ولہجہ کی تندی اور طعن وتعریض کی نشتر زنی سے بچنا بھی احتساب کی ایک مستحسن صورت ہے........... جگہ جگہ ان کی زبان تحقیقی اندازِ بیان کے سادہ وسنجیدہ دائرہ سے باہر آ گئی ہے۔ اس سے گفتگو کا لطف بڑھ گیا ہے۔ چبھتے ہوئے فقرے یوں بھی زیادہ یاد رہ جاتے ہیں اور گرمیِ محفل کے کام آتے ہیں لیکن ایک محقق کے صحیح علمی مزاج اور اس کے سنجیدہ مقصد کی نمایندگی نہیں کرتے۔"

[''رشید حسن خاں ایک منفرد محقق'': ڈاکٹر تنویر احمد علوی، مشمولہ ''اظہار'' بمبئی، جنوری ۱۹۸۴ء، ص۔۷۴۔۷۵]

ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ

● ظفر کمالی

تحقیق دراصل پتھر نچوڑ کر پانی نکالنے کا نام ہے۔ اس کے لیے جس جگر کاوی کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کے بس کا روگ نہیں۔ یہاں سہل پسندی اور عقیدت مندی کا بھی گزر نہیں۔ دقت پسند طبیعتیں ہی اس میدان میں سرخ رو ہوتی ہیں۔ اردو تحقیق میں اس معیار پر کھری اترنے والی جو چند شخصیتیں ہیں ان میں ایک اہم نام رشید حسن خاں کا بھی ہے۔ انھوں نے تدوین اور املا کے متعلق گرانقدر کام کیے۔ ''فسانۂ عجائب'' کی تدوین کو ان کا تحقیقی شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ خان صاحب نے اصولِ تحقیق اور ان سے متعلق دیگر مسائل پر بھی کافی شرح وبسط کے ساتھ لکھا اور اس طرح لکھا کہ ہر گوشے کو آئینہ کر دیا۔ اس سلسلے کی ان کی پہلی کتاب ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' ہے جس کا پہلا ایڈیشن ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے ۱۹۷۸ء میں چھپا تھا۔ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ نے ۱۹۹۰ء میں اس کا دوسرا نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن شایع کیا اور یہی ایڈیشن اس وقت پیشِ نظر ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ادبی تحقیق کے اصول وضوابط سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں چار کتابوں پر تفصیلی تحقیقی تبصرے ہیں۔ ذیل کی سطور میں مذکورہ کتاب کے پہلے حصے کے مندرجات اور اس کے مباحث کا تفصیلی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' کا پہلا باب اصولِ تحقیق کے بارے میں ہے۔ اس میں تحقیق کی تعریف صرف ایک جملے میں جامع ترین انداز میں بیان کی گئی ہے کہ حقائق کی بازیافت تحقیق کا مقصد ہے۔ رشید حسن خاں نے قاضی عبدالودود کے اس قول کو اپنی بات کی تائید میں پیش کیا ہے کہ ''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔'' انھوں نے اس قول کی باریکیوں کی بھی وضاحت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ادبی تحقیق میں کسی امر کی اصلی شکل کا تعین اصولِ تحقیق کی روشنی میں ہی کیا جائے گا۔ یہاں کوئی بھی حتمی رائے صرف تاویل، تعبیر اور

قیاسات کی روشنی میں نہیں قائم کی جا سکتی۔ انھوں نے یہ نکتہ بھی پیش کیا ہے کہ تحقیق میں واقعے کا چھوٹا یا بڑا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہاں ہر واقعے کی بذاتِ خود اہمیت ہوتی ہے۔ کوئی چھوٹا واقعہ یا معمولی بات اپنے موقع ومحل کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کے حامل ہو سکتے ہیں۔ خاں صاحب نے اس اہم نکتے پر بھی زور دیا ہے کہ درست معلومات کے حصول کے لیے جو شہادتیں اکٹھی کی جائیں وہ ہر طرح کے شکوک وشبہات سے پاک اور اتنی مضبوط ہونی چاہئیں کہ ان پر استدلال کی بنیاد رکھی جا سکے۔ غیر متعین اور مشکوک خیالات اور قیاسات کے سہارے تحقیقی نتائج نہیں اخذ کیے جا سکتے۔ بقول خاں صاحب تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ کوئی حقیقت ایک مرتبہ ہی اپنی مکمل صورت میں سامنے آجائے۔ بعض حقیقتوں پر مختلف پردے پڑے ہوتے ہیں جو ایک ایک کر کے بالتدریج اٹھتے ہیں۔ اسی لیے تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں ہی طے ہوتا ہے۔ اسی طرح دریافت کا عمل جاری رہنے کی صورت میں ردّ وقبول کی صورتوں میں بھی تبدیلی ہوتی رہے گی۔ تحقیق میں دعوے کی قبولیت کے لیے قابلِ اعتماد سند کا ہونا ضروری ہے۔ روایت کے سلسلے میں راوی کیسا ہے اس کی چھان پھٹک بھی لازمی ہے۔ اگر راوی صادق القول نہ ہو تو اس کی روایتوں پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ محتاط راوی بھی کبھی کبھی اپنے اور اپنے متعلقین کے متعلق کذب بیانی یا مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ وہ کسی ایسے موضوع سے بھی جن سے ان کا جذباتی تعلق ہوتا ہے، احتیاط کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا نہیں کر پاتے لہٰذا محقق کو یہاں بھی محتاط رہنا چاہیے۔ رشید حسن خاں نے قابلِ حصول مآخذ سے براہ راست استفادے پر بھی زور دیا ہے اور بالواسطہ روایت پر انحصار سے حتی الامکان بچنے کی تلقین کی ہے۔ انھوں نے حافظے کے دھوکے کی جانب بھی اشارے کیے ہیں اور آخر میں تحقیق کی زبان کو آرایش اور مبالغے سے پاک رکھنے کی بات کہی ہے۔ تقریباً نو صفحات پر مشتمل اس مختصر باب میں خاں صاحب نے اصولِ تحقیق کا ایک جامع خاکہ پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنی باتوں کی وضاحت کے لیے مختلف مثالیں بھی پیش کی ہیں جن سے کہیں بھی انکار کی گنجایش نظر نہیں آتی۔ اسی باب میں انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ زندہ لوگوں کو تحقیق کا موضوع بنانا مناسب نہیں ہے۔ ان کے خیال میں مختلف اثرات کے تحت حقائق کا صحیح علم نہیں ہو سکتا اور اگر ہو بھی جائے تو ان حقائق کی تفصیلات کو بے کم وکاست پیش کرنا ممکن نہیں۔ ان کے الفاظ میں:

> ''آدمی جب تک زندہ رہے گا، اس کا امکان ہے کہ وہ فکر وعمل کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہے اور ایسی تبدیلیوں کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ اس لیے زندہ آدمی کے اعمال وافکار کا مکمل تجزیہ ممکن نہیں اور مکمل تجزیے کے بغیر کسی شخص کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔'' (ص ۱۸)

خاں صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں بھی زندہ شخصیات پر تحقیق کی مخالفت کی ہے۔ مشفق خواجہ اور ہمارے کچھ دوسرے معتبر محققین بھی ان کے ہم نوا ہیں۔ یہاں دوسروں کے خیالوں سے بحث نہیں لیکن خاں

صاحب نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے پوری طرح اتفاق نہیں۔ میرے خیال میں جن لوگوں کی عمر ساٹھ ستر کی ہو چکی ہے اور ان کی ادبی خدمات واقعی وقیع ہیں تو ان پر تحقیق کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ مثلاً آج کوئی چاہے تو انصار اللہ نظر، حنیف نقوی، تنویر احمد علوی، نیر مسعود، قاضی عبدالستار، کمال احمد صدیقی، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، سیدہ جعفر، شمیم حنفی، شفیع جاوید، عابد سہیل، اقبال مجید، رتن سنگھ، ظفر گورکھپوری، مجتبیٰ حسین، کلیم عاجز، لطف الرحمٰن، سلطان اختر وغیرہ جیسی شخصیات پر تحقیقی مقالہ لکھ سکتا ہے اور ان میں کئی لوگوں پر مقالے لکھے بھی جا چکے ہیں۔ قاضی عبدالودود پر ان کی زندگی میں ڈاکٹر تحریر انجم نے بہترین مقالہ لکھا۔ خود رشید حسن خاں پر بھی پاکستان میں تحقیق ہوئی۔ البتہ لکھنے والے میں اتنی جرأت ضرور ہونی چاہیے کہ وہ منفی حقائق کو بھی غیر جذباتی انداز میں پیش کر سکے۔ جس میں اس جرأت کی کمی ہو اسے ایسے موضوع سے گریز بہتر ہے۔

جہاں تک فکر و عمل کی تبدیلیوں کا تعلق ہے ایسا ہو سکتا ہے جیسا ظ۔ انصاری کے ساتھ ہوا کہ مرنے سے کچھ پہلے انھوں نے ترقی پسندی سے اپنی براءت کا اظہار کیا لیکن اس اعلان سے ترقی پسند ادب سے متعلق لکھی گئی ان کی تحریریں منسوخ نہیں ہو جائیں گی۔ ان تحریروں کا جائزہ بھی اسی طرح لیا جائے گا جو اس اعلان کے نہیں ہونے کی صورت میں لیا جاتا۔ یہ ضرور ہے کہ آخر میں اس تحریک سے ان کی بے زاری کے اسباب بھی بیان کیے جائیں گے۔ اگر کسی شخص پر تحقیقی مقالہ چھپ جانے کے بعد ایسی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس تحقیقی مقالے پر بھی نظر ثانی کر لی جائے گی یا کوئی دوسرا شخص آئندہ اس پر روشنی ڈالے گا۔ یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ ایک کتاب میں ہی کسی شخص کے ساتھ مکمل انصاف کیا جا سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو غالب اور اقبال پر اتنی تحقیقی کتابیں لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

بزرگوں پر ان کی زندگی میں کام نہ ہونے کی صورت میں بعض اوقات چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کا علم ہونا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قاضی صاحب کو ہی لیجیے۔ یہ بات معلوم ہے کہ ان کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی اہلیہ کا وصال رخصتی سے قبل ہی ہو گیا۔ قاضی صاحب پر ان کی زندگی میں تحقیق ہوئی، کلیم الدین احمد نے ''معاصر'' کا خاص نمبر نکالا لیکن کسی نے ان سے پہلی اہلیہ کا نام دریافت نہیں کیا۔ قاضی صاحب پر کئی کتابیں چھپیں مگر کسی نے بھی یہ نام نہیں لکھا۔ قاضی صاحب کے وصال کے بعد راقم الحروف نے ان کے کئی قریبی عزیزوں سے یہ بات دریافت کی لیکن سب نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا اور ہنوز یہ بات تشنۂ تحقیق ہے۔ قاضی صاحب سے ان کی زندگی میں یہ بات پوچھ لی گئی ہوتی تو یہ مسئلہ ایک منٹ میں حل ہو جاتا۔ لہٰذا میرا خیال یہ ہے کہ سینیر لکھنے والوں پر ان کی زندگی میں ریسرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن آج کل جو یہ بدعت پھیلی ہوئی ہے کہ جس کی دو تین کتابیں چھپ گئیں ان پر کوئی نہ کوئی ریسرچ کے لیے آمادہ ہے یا آمادہ کیا جا رہا ہے اس کی ہمت افزائی کی نہیں بلکہ حوصلہ شکنی کی ضرورت ہے۔

''ادبی تحقیق......'' کا دوسرا باب تحقیق سے متعلق بعض مسائل پر مبنی ہے جسے چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا

ہے۔ پہلی فصل میں تحقیق کے ان بنیادی ماخذ خصوصاً تذکروں سے بحث کی گئی ہے جو فارسی میں ہیں۔ بعض حضرات نے ان تذکروں کے اردو ترجمے کی وکالت کی ہے۔ خاں صاحب کا موقف یہ ہے کہ ترجمے کو اصل ماخذ کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ چوں کہ انیسویں صدی کے اواخر تک ہندستان میں فارسی کے اثرات نمایاں رہے ہیں لہٰذا اس عہد پر تحقیق کرنے کے لیے فارسی سے اچھی طرح واقف ہونا لازمی ہے۔ اسی لیے وہ فارسی تذکروں کے اردو تراجم کے سخت مخالف ہیں۔ ان کے بقول :

> ''تذکرے، عام لوگوں کی دل چسپی کی چیز نہیں اور خواص جو ایسے مصادر و ماخذ سے سروکار رکھتے ہیں، ان کے لیے یوں بے کار ہیں کہ وہ بہر صورت اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوں گے.......... در حقیقت یہ ایسا فضول کام ہے جو فضول ہونے کے ساتھ ساتھ گم راہ کن بھی ہے۔'' (ص ۲۲)

خاں صاحب نے تذکروں کے تراجم کی گمراہی ثابت کرنے کے لیے شیفتہ کے تذکرے ''گلشنِ بے خار'' کے دو پاکستانی ترجمے اور میر کے تذکرے ''نکات الشعراء'' کے ہندستانی ترجمے پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور ان کے نقائص کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے تذکروں کے شائع شدہ فارسی متن سے بھی اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے اور حتی الامکان تذکروں کے اہم خطی نسخوں سے استفادے کی وکالت کی ہے۔ ایک ضمنی بات کے طور پر انھوں نے لکھا ہے کہ بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی علاج نہیں اور حد درجہ مجبوری کے طور پر اسے استثنا کے ذیل میں رکھنا پڑتا ہے۔ مثال انھوں نے گارساں دتاسی کی تصانیف کی دی ہے جو فرانسیسی زبان میں ہیں۔ چوں کہ اردو والے انگریزی کی طرح فرانسیسی سے واقف نہیں ہو سکتے اس لیے اس کی کتابوں کے تراجم سے ہی استفادہ کرنا پڑے گا۔ تذکروں سے قطع نظر کچھ ایسی فارسی کتابیں بھی ہیں جو تحقیق میں بہ طور ماخذ استعمال کی جاتی ہیں جیسے درگاہ قلی خاں کی ''مرقع دہلی'' اس جیسی کتابوں کے متعلق خاں صاحب کا موقف یہ ہے کہ ان کا ترجمہ ضرور ہونا چاہیے لیکن ترجمے کے ساتھ اصل متن کو بھی شامل کرنا ضروری ہوگا۔

خاں صاحب محترم کا یہ خیال کہ تذکروں کے تراجم کو اصل ماخذ کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا، حقیقت پر مبنی ہے۔ انھوں نے تذکروں کے خطی نسخوں سے استفادے کی جو بات کہی ہے وہ بھی اپنی جگہ درست ہے حالاں کہ اس سے دقتیں بڑھیں گی لیکن معیاری تحقیق کے لیے انھیں برداشت کرنا ہی پڑے گا لیکن انھوں نے تذکروں کے اردو تراجم کو فضول کام کہا ہے اور اسے عام لوگوں کی دل چسپی کی چیز نہیں مانا ہے اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ پروفیسر عطا کاکوی نے تو یہ ''فضول کام'' خوب خوب کیا ہے۔ اگر ''عام دل چسپی'' کے اصول پر عمل کیا جائے تو فلسفے کی کتابوں کا ترجمہ بھی نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ یہ عام دل چسپی کی چیز نہیں۔ یہی بات عروض و بلاغت کی فارسی کتابوں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ تذکرے صرف عام لوگوں نے نہیں لکھے۔ محمد تقی میر، میر حسن اور مصحفی جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں نے بھی یہ کام کیے ہیں۔ فارسی سے ناواقف یا کم واقف باذوق قاری کی

اس میں دل چسپی ہو سکتی ہے کہ میرؔ اور میر حسنؔ نے دیگر ادبی ہستیوں کے متعلق کیا لکھا ہے لہٰذا ان تذکروں کے تراجم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ غلط ترجمے کی وجہ سے یہ کام نہیں ہونا چاہیے تو بھی اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات گویا فرض کر لی گئی ہے کہ اردو میں صحیح ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے لوگ کم ہیں جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے ہوں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ کام سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اگر تراجم میں غلطیاں ہیں تو دوسرے ذہین حضرات تفصیل سے ان خامیوں کو اجاگر کریں اور ان کی روشنی میں خامیوں کو درست کر لیا جائے۔ جہاں تک گارساں دتاسی کی تصانیف کا سوال ہے تو اسے بھی قبول کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ خاں صاحب کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ تحقیق نہایت دقت طلب کام ہے اس لیے اگر عام محققین سے نہیں تو کم از کم خواص سے مطالبہ کیا ہی جا سکتا ہے کہ وہ فرانسیسی سے بھی واقف ہوں۔ قاضی عبدالودود نے گارساں دتاسی کو غلط فہمیوں کا بادشاہ کہا ہے (شعراء کے تذکرے۔ خدا بخش لائبریری ۱۹۹۵، ص ۲۳۶) ظاہر ہے کہ جو مصنف خود غلط فہمیوں کا بادشاہ ہو، اس کی تصانیف کے تراجم کی صورت میں (جیسا کہ ترجموں کے متعلق خاں صاحب فرماتے ہیں) کیا کیا گل افشانیاں ممکن ہو سکتی ہیں، ایسے حالات میں ان تراجم پر مجبوری کی حالت میں بھی کیسے بھروسا کیا جا سکتا ہے اور اگر اس پر بھروسا کیا جائے گا تو فارسی تراجم کے ساتھ بھی اتنی سختی مناسب نہیں۔

دوسری فصل میں یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق کے مسائل کا بے لاگ تجزیہ ہے۔ خاں صاحب نے ابتدا میں ہی یونیورسٹیوں کے تحقیقی مقالوں کے کارخانے کی حیثیت اختیار کرنے اور اس کے سبب معیار کی پستی کے عام ہونے کی بات کہی ہے۔ ان کے خیال میں بہت سے طلبہ تحقیق سے دل چسپی کے تحت نہیں بلکہ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد محض وقت گزاری کے طور پر ریسرچ میں داخلہ لے لیتے ہیں بقول خاں صاحب :

> ''طالب علم تو محض طالب علم ہوتا ہے، وہ اس وقت نہ تحقیق کے مسائل سے واقف ہوتا ہے، نہ اس کی شرائط سے باخبر ہوتا ہے، ہاں پریشاں خاطر ضرور ہوتا ہے اس لیے اگر وہ اس وادیِ پرخار میں چلنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے، تو یہ چنداں قابلِ تعجب نہیں؛ وہ اساتذہ جن کے مشورے اور مرضی سے یہ سب کچھ ہوتا ہے، ذمّے داری ان کی ہے۔ ان حضرات کے طرزِ عمل سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یونیورسٹیوں میں ایم۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی میں جس قدر زیادہ طالب علم ہوں گے، اس قدر اردو کی بقا کا سروسامان زیادہ مہیا ہوگا؛ مگر یہ بڑا مغالطہ ہے۔ وجہ جو بھی ہو، صورتِ حال یہ ہے کہ اربابِ حل وعقد اس سلسلے میں اس ناروا فیاضی کے خوگر ہو گئے ہیں جو کم معیاری کی ضمانت ہوا کرتی ہے۔ اس کا اندوہناک پہلو یہ ہے کہ اس طرح تحقیق کی اوّلین تربیت گاہ، آسان پسندی کا دبستاں بن کر رہ جاتی ہے۔'' (ص۔ ۳۴)

خاں صاحب دہلی یونیورسٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ ممکن ہے انھوں نے وہاں کی صورتِ حال اور کچھ اور

مرکزی یونیورسٹیوں کی اس وقت کی صورتِ حال کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی ہو لیکن آج کی تعلیم گاہوں میں تحقیق کی جو صورتِ حال ہے وہ کسی ڈراونے خواب سے کم نہیں۔ مرکزی یونیورسٹیوں میں تو تحقیق کا بھرم کسی حد تک قائم ہے لیکن ملک کے طول وعرض میں پھیلی یونیورسٹیوں کی حالت اس معاملے میں آخری حد تک تشویش ناک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نوے فیصد سے زیادہ لڑکے تحقیق میں داخلہ لینے کے گناہگار ضرور ہوتے ہیں لیکن وہ تحقیق کے نام پر چار سطریں لکھنے کے اہل نہیں ہوتے۔ ایسے بھی لڑکے یا تو درمیان میں ہی اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں یا دوسروں سے مقالے لکھواتے ہیں۔ بہت جگہ یہ کام خود ان کے نگراں انجام دیتے ہیں یا وہ اپنے کسی شناسا سے معاملہ طے کرتے ہیں اور اس میں خود بھی کمیشن لیتے ہیں۔ نگراں حضرات کی اکثریت بھی کچھ نہیں جانتی۔ چوں کہ یہ کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے اس لیے جو چند اصحاب لکھنا جانتے ہیں انھی کے سر پر سارا بوجھ پڑتا ہے۔ وہ پیسے لے کر بھی بے گار ٹالتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ موضوع پر کوئی دوسری کتاب موجود ہو جو عموماً ہوتی ہے تو اس کے بیش تر حصے جوں کے توں اور کبھی الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ نقل کر دیے جاتے ہیں۔ کبھی اس موضوع پر کوئی اور کام ہوا ہو تو اسے حاصل کر کے صرف اس کا ٹائٹل بدل دیا جاتا ہے اور ڈگری مل جاتی ہے۔ اس حمام میں بڑے بڑے ننگے ہیں۔ یہ صرف اردو کا ہی نہیں بلکہ دیگر زبانوں اور آرٹس اور سائنس کے فیکلٹس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ اگر اس کی سی بی آئی جانچ کرادی جائے تو بڑے بڑے عبرت ناک مناظر اس کے سامنے، پیچ نظر آئیں۔ ایسے ایسے نگراں حضرات موجود ہیں جن کی نگرانی میں سینکڑوں مقالے لکھے گئے ہیں لیکن ان میں کوئی منظرِ عام پر نہیں آیا۔ وہ منظرِ عام پر لانا چاہیں بھی تو نہیں لا سکتے۔ تحقیقی اصول وضوابط تو اس کے لیے ہیں جو تحقیق کرتا ہو لیکن جہاں تحقیق کے نام پر ہر بے اصولی اصول بن گئی ہو وہاں سوائے سر پیٹنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے لہٰذا نا رد افیا ضی اور آسان پسندی کی باتوں سے معاملہ کوسوں آگے بڑھ چکا ہے۔

لیکن اس اندھیرے میں بھی بعض یونیورسٹیوں میں ابھی تحقیق کے چراغ جھل ملا رہے ہیں اور بعض محنتی نگراں حضرات اپنے پیشے کی لاج بچائے ہوئے ہیں، خاں صاحب کی باتیں ایسے لوگوں کے لیے ہی کارگر ثابت ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے تدوین اور تحقیق کے لیے طبعی مناسبت کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے بغیر یہ بیل منڈھے چڑھ ہی نہیں سکتی۔ خاں صاحب کا یہ شکوہ بھی درست ہے کہ آج طلبہ اور اساتذہ اصول تو بہت پڑھ لیتے ہیں لیکن ادب کو صحیح پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق بہت کم کو نصیب ہوتی ہے۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ :

> ''ایم۔اے پاس طلبہ میں سے صرف انھی کو تحقیق میں داخلہ دیا جائے جو واقعتاً اس کے اہل ہوں اور یہ میرا تجربہ ہے کہ ایک دو طالب علم ہر سال ایسے مل سکتے ہیں جو صحیح تربیت پانے کے بعد تحقیق یا تدوین کا کام مناسب طور پر انجام دے سکتے ہیں۔'' (ص۔۳۶)

تجویز تو بہت معقول ہے لیکن موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر اس پر عمل درآمد کا دور دور تک امکان نظر نہیں آتا۔ خان صاحب نے ایم۔اے کے بعد سال دو سال کے خاص نصاب (ایم۔فل) کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے

اور اسے ضروری قرار دیا ہے لیکن ان کا مشورہ یہ ہے کہ اسے وہی حضرات پڑھائیں جو فارسی سے آشنا ہوں اور خود ان کے مزاج کو تحقیق سے لگاؤ ہو۔ انھوں نے اساتذہ کے دواوین کو بھی مرتب کرنے کی جانب توجہ دلائی ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ اس کام میں وہی لگے جو اصولِ تدوین سے واقف ہو اور اچھی فارسی جاننے والا ہو۔ وہ قواعدِ زبان و بیان، لسانی مباحث، تذکیر و تانیث کے مسائل، متروکات کی بحثوں، تلفظ و املا کے مسائل، عروض و قوافی کی مشکلات اور اسی طرح کے دیگر متعلقات کو اچھی طرح جانتا ہو۔ ظاہر ہے کہ تحقیق کے موجودہ منظرنامے کو دیکھتے ہوئے ایسے طلبہ کا ملنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کام کو تجربہ کار اساتذہ اور پختہ کار محقق ہی انجام دے سکتے ہیں۔ ایسے کام نئے طلبہ کے حوالے کرنا متن کا خون کرنے کے مترادف ہے۔

خاں صاحب نے ایک اور اہم نکتے کی جانب بھی اشارا کیا ہے جو ریسرچ کے ذمے دار حضرات کے لیے بہت مفید ہے۔ ہر شخص ہر موضوع پر نہ خود تحقیق کر سکتا ہے اور نہ اس کی نگرانی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے اس لیے نگراں حضرات کو بھی اسی موضوع کی نگرانی قبول کرنی چاہیے جس سے ان کی طبعی مناسبت ہو اور وہ خود بھی اس موضوع پر دست رس رکھتے ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ ایمانداری کے فقدان کے سبب سب کچھ جانتے ہوئے بھی عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ یہ بھی ہے کہ نگراں اس موضوع سے متعلق جانتا تو ہے لیکن وہ دوسرے غیر ادبی کاموں میں اتنا مصروف رہتا ہے کہ طلبہ کو کبھی وقت ہی نہیں دے پاتا اور اس کی نگرانی میں ایسے ایک نہیں کئی کئی طلبہ ہوتے ہیں۔ خاں صاحب نے ایک بات ایسی بھی لکھی ہے کہ ایسے جہاندیدہ انسان کی سادگی پر تعجب ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تحقیقی مقالوں کے ممتحنین کے انتخاب میں بھی بے امتیازی برتی جاتی ہے اور یہ انتخاب موضوع سے مناسبت کی بنا پر نہیں ہوتا لہٰذا ایسے مقالوں پر اسناد عطا ہو چکی ہیں یا کر دی جاتی ہیں جن کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ممتحن نے یا تو خود اسے دیکھا نہیں یا وہ اس کے متعلقات سے باخبر نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نگراں حضرات کا اپنا اپنا حلقہ اور یک دوسرے سے خاموش معاہدہ ہے کہ تم میرے پاس مقالے بھجواؤ میں تمھارے پاس بھجواؤں گا۔ ریسرچ اسکالر کو ڈگری دلوانے کا معاہدہ پہلے طے ہو چکا ہوتا ہے لہٰذا بہت آسانی سے بھی مراحل بہ خیر و خوبی طے پا جاتے ہیں۔ معاملہ جو بھی ہو خاں صاحب کی اس تمنا کی ان دیکھی نہیں کی جا سکتی کہ :

> "یہ مسائل اساتذہ کی توجہ کے طلب گار ہیں، کیوں کہ وہی طالب علم کے راہ نما ہوتے ہیں، وہی ممتحن بنتے ہیں اور وہی طالب علم کے لیے مثال و معیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی تو تحقیق کا معیار گرتا ہی چلا جائے گا۔" (ص۔۴۴)

تیسری فصل میں رشید حسن خاں نے تحقیق و تدوین کے لیے ایک بنیادی شرط کا ذکر کیا ہے کہ یہ کام مالی منفعت کے جذبے سے بلند ہو کر کیا جانا چاہیے۔ مالی منفعت بذاتِ خود کوئی بری چیز نہیں لیکن اسے حصولِ مدعا کا ذریعہ سمجھ لیا جائے تو تحقیق و تدوین کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ وہ دنیاداری اور جاہ و منصب کے حصول کی تمنا سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں کہ اس کے لیے جس خاص مزاج کی ضرورت اور جن آداب کی پابندی لازمی ہے

اس سے سب سے پہلے صداقت پر ضرب پڑتی ہے اور یہ چیز تحقیقی مزاج کے منافی ہے۔ وہ محققوں کے لیے دولت قناعت اور بے نیازی ضروری قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے فن کو کلاسیکی موسیقی سے تشبیہ دی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے عجلت، آسان پسندی، بل ہوسی اور خفیف الحرکاتی سے بچنا پڑتا ہے۔ جو لوگ عشق اور ہوس کا فرق نہیں سمجھتے وہ راہِ تحقیق کے مسافر نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے کہ محض مادی فائدے کے لیے تحقیق کی جائے تو محقق کا مزاج بدلے گا اور جب مزاج بدل جائے گا تو معیار کی توقع ہی فضول ٹھہرے گی۔

رشید حسن خاں نے طلبہ کے علاوہ تحقیق کرنے والوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے زمرے میں وہ لوگ ہیں جو تحقیق کو ایک مقدس فریضہ سمجھ کر انجام دے رہے ہیں، ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ دوسرے زمرے میں وہ اصحاب آتے ہیں جو مختلف اداروں میں بعض منصوبوں کے تحت کام کرتے ہیں خاں صاحب ان کے پنچایتی کاموں سے مطمئن نہیں۔ تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کا تعلق اعلا دانش گاہوں سے ہے اور یہی لوگ تحقیقی خلفشار کے سب بڑے ذمے دار ہیں۔ یہاں رشید حسن خاں نے اپنے عہد کے تحقیقی منظرنامے کو سامنے رکھتے ہوئے سب کچھ لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک ایک حرف صداقت پر مبنی ہے۔ مثلاً ایسے حضرات جو صرف تحقیقی اسناد رکھنے کے گناہ گار اور دنیاداری میں ماہر ہیں وہ بھی محقق اور تحقیقی مقالوں کے نگراں بن بیٹھے ہیں۔ کچھ لوگ ادب کے کسی دوسرے شعبے میں شہرت رکھتے ہوئے اس پر قناعت نہیں کرتے اور وہ بھی تذکروں کی تدوین کا کام سنبھال لیتے ہیں حالاں کہ وہ سرے سے اس کے اہل نہیں ہوتے صرف ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے تحقیق کا بیڑا غرق کرتے ہیں۔ بعض حضرات استادی کا منصب سنبھالتے ہی فن سے واقف ہوئے بغیر کتابیں لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ کسی موضوع پر کتابوں کی عدم دستیابی کو دیکھتے ہوئے اس موضوع پر کتابیں لکھنے بیٹھ جاتے ہیں حالاں کہ وہ اس کام کے لائق نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ انٹرویو میں شریک ہونے کے لیے تحقیق و تدوین کو آسان کام سمجھ کر جلدی جلدی کتابیں لکھتے یا مرتب کرتے ہیں، اس سے عموماً ذاتی فائدہ تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن نقصان صرف تحقیق کا ہوتا ہے۔ خاں صاحب نے ہندستانی نظامِ تعلیم کی عکاسی کرتے ہوئے جو شکوہ کیا ہے وہ بالکل درست ہے کہ:

> ”ہمارے نظامِ تعلیم کا یہ کرشمہ ہے کہ استاد جس قدر سینیر ہوتا جائے گا اور بلندی کے زینوں پر چڑھتا جائے گا، اسی قدر دنیا کے دوسرے دھندوں میں زیادہ پھنستا جائے گا۔ اس سفر میں ایک منزل وہ بھی آتی ہے کہ جب اس کے پاس واقعتاً اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ لکھنے پڑھنے کا حق بھی ادا کر سکے، لیکن مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ تصنیف و تالیف سے قطع تعلق بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ انھیں اوراقِ جمشیدی کی مدد سے تو وہ اپنا طلسمِ ہوش ربا سجائے ہوئے ہے۔ اس صورت میں تحقیق کا حق کیسے ادا ہو سکتا ہے، مجبوراً کم معیاری پر قناعت کرنا ہوگی اور مالِ غنیمت پر بھی نظریں لگی رہیں گی۔ (ص ۵۱)

یہ صورتِ حال آج بھی برقرار ہے اور اس میں تبدیلی کے کچھ آثار نظر نہیں آتے۔ اساتذہ تحقیق و تدوین کے نام پر ایسی کتابیں لکھ رہے ہیں جن کا معیار سے کوئی سروکار نہیں۔ جب استاد ہی اپنی ذمّے داریوں کا لحاظ نہیں رکھے گا تو اس کے شاگرد جیسے ہوں گے اس کا اندازہ بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔

میدانِ تحقیق میں بہت سے ایسے کام ہیں مثلاً لغت، تاریخِ ادب، تاریخ زبان اور قاموس الکتب وغیرہ، انھیں انفرادی طور پر سرانجام دینا بہت دشوار ہے۔ رشید حسن خاں نے "تحقیق سے متعلق بعض مسائل" کے چوتھے اور آخری حصّے میں اسی موضوع کو چھیڑا ہے۔ انھیں شکوہ ہے کہ اردو میں کسی منصوبے پر مل جل کر کام کرنے کی صالح روایت نہیں بن سکی اور اسی لیے اخلاقیاتِ تحقیق کا ضابطہ بھی مرتب نہیں ہو سکا۔ اس سے بے نیازی کے سبب ہی اجتماعی تحقیقی کام میں معیار کی پستی عام ہے۔ خاں صاحب نے کم معیاری کی جو وجوہات بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں اجتماعی تحقیقی کاموں کی منصوبہ سازی خالص علمی مقاصد کے تحت نہیں ہوتی، علمی اداروں میں باصلاحیت افراد سے بھی شخصی وفاداری کی توقع کی جاتی ہے اور بعض اوقات اس وفاداری کو حقیقی صلاحیت پر فوقیت دی جاتی ہے۔ لوگوں کے شخصی وقار، عزتِ نفس اور احساسِ خودداری کا لحاظ کم سے کم رکھا جاتا ہے۔ احساسِ انا اور احساسِ وقار کا درجۂ حرارت کم ہوئے بغیر اسے کام کا آدمی ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے علاوہ جب کسی علمی منصوبے پر کام ہوتا ہے تو اس میں سبھی کو برابر کا حصّے دار نہیں تسلیم کیا جاتا۔ یہاں کام دوسرے کرتے ہیں اور وہ نگرانِ اعلا یا صاحبِ مرتبت کے نام سے چھپتا ہے۔ جب یہ بات تسلیم شدہ ہو کہ کتاب دوسرے کے نام سے چھپے گی تو دوسرے کام کرنے والے محنت سے جی چراتے ہیں اور ایسا ہونا فطری ہے۔ اس طریقۂ کار نے اجتماعی تحقیق کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

کسی منصوبے پر کام کرنے کے لیے صرف اہلِ نظر کا ہی انتخاب نہیں ہوتا ان میں شہرت اور منصب کا لحاظ رکھنے کی وجہ سے غیر مستحق لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں اس طرح وہ کام جو بہتر طور پر انجام پا سکتا تھا وہ غارت ہو جاتا ہے۔ بعض اساتذہ کسی ادارے کا کام قبول کر لیتے ہیں لیکن اپنی غیر علمی مصروفیت کے سبب صلاحیت رہتے ہوئے بھی اسے خود سے نہیں کرتے بلکہ اپنے شاگردوں کو سونپ دیتے ہیں اور شاگرد اسے بیگار سمجھ کر جیسے تیسے بھگتا دیتے ہیں۔ اس انداز کا جو کام ہوگا اس میں معیار کی تلاش ہی فضول ہے۔ خاں صاحب اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اس کے قائل ہیں کہ اجتماعی ادبی منصوبوں کا خاکہ خاص علمی سطح پر مرتب کرنے کے بعد محنت سے کام کرنے والوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔ انھوں نے ایک معنی خیز بات یہ کہی ہے کہ:

> "نئے کام کرنے والے احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے میں زیادہ ساعی ہوں گے، کیوں کہ ان کی پشت پر شہرت کا پشتارہ نہیں ہوگا، جس کی وجہ سے مطمئن اور بے نیاز ہوں (گے)۔ یک سوئی، لگن اور اچھی رہ نمائی؛ یہ ایسی چیزیں ہیں جو بہت سی کمیوں کو پورا کر سکتی ہیں۔" (۶۰)

اجتماعی کام کے لیے سازگار فضا سے محرومی کی وجہ سے خان صاحب خاصے دل شکستہ نظر آتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق کی اس بوجھل اور ناسازگار فضا میں چبھتے ہوئے سوالات کے پتھر اچھالے ہیں اور اپنے دل کا درد اس شعر کے حوالے سے یوں اجاگر کیا ہے :

در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہے جواب

تحقیق سے شغف رکھنے والے حضرات اچھی طرح واقف ہیں کہ اس میدان میں قدم قدم پر حوالوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے بغیر محقق ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔ تحقیق میں جب کوئی حوالہ پیش کیا جائے گا تو اس کا معتبر ہونا بھی ضروری ہے۔ رشید حسن خاں نے ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' کے باب ''غیر معتبر حوالے'' میں اس پہلو پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے حوالوں کو تین درجوں (مستند، غیر مستند اور مشکوک) میں تقسیم کیا ہے اور ان تینوں کی تعریف بھی بیان کی ہے۔ وہ یہ بات تو تسلیم کرتے ہیں کہ مشکوک حوالہ وہ ہے جس کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی لیکن استدلال کی حد تک وہ مشکوک اور غیر مستند حوالوں کو ایک ہی درجے میں رکھتے ہیں۔ احقر کے خیال میں بے شک مشکوک حوالے پر استدلال کی عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اسے ہم غیر معتبر کے درجے میں رکھ دیں۔ مشکوک حوالے کو قبول کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ کسی دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق ہو جائے۔ تصدیق نہیں ہونے کی صورت میں بھی اسے سرے سے مسترد نہیں کیا جا سکتا اور جب مسترد نہیں کیا جا سکتا تو اسے غیر مستند کے درجے میں بھی نہیں جانا چاہیے۔ یقین اور عدم یقین کی درمیانی صورت قیاس کی ہے قیاس کی بنیاد معقول ہو تو اس پر بہت حد تک بھروسا کیا جا سکتا ہے۔

رشید حسن خاں حوالے کے قابلِ قبول ہونے کی ایک شرط یہ بیان کرتے ہیں کہ واقعے اور روایت کے درمیان اتنا زمانی فصل نہ ہو کہ روایت کا تسلسل ٹوٹ جائے۔ وہ راوی کی ذاتی معلومات پر مبنی روایات کو بھی ٹھوک بجا کر دیکھ لینے کے قائل ہیں جیسے کہ اس روایت میں غلط فہمی اور جانب داری کی کارفرمائی تو نہیں ہے۔ انھوں نے راوی کی حیثیت پر بھی سوال اٹھایا ہے۔ جو لوگ ہر طرح کی روایتوں کو بلا تحقیق تسلیم کر لیتے ہیں یا جن لوگوں کو افسانہ تراشی کا شوق ہوتا ہے ان کی باتیں جرح و تعدیل کے بغیر قبول نہیں کی جا سکتیں۔ روایت کے سلسلے میں خاں صاحب نے ملا وجہی کی ''سب رس'' میں امیر خسرو کے نام سے منسوب ایک دوہے کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امیر خسرو کی وفات اور ''سب رس'' کی تصنیف میں تین سو سال کا فرق ہے۔ اس زمانی فصل کو دیکھتے ہوئے اسے خسرو کا دوہا تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ روایت کے تعلق سے کئی لوگوں نے اس خیال سے اختلاف کیا ہے۔ مثلاً پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر طلحہ رضوی برق وغیرہ۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں لیکن مجھے خاں صاحب کا موقف درست معلوم ہوتا ہے کیوں کہ زبانی روایتوں کو اگر استناد کا درجہ دے دیا جائے تو ''قصۂ چہار درویش'' کے مصنف امیر خسرو ٹھہریں گے اور دیوان خواجہ معین الدین کے شاعر مولانا معین الدین نہیں بلکہ خواجہ اجمیری قرار پائیں گے۔ اس سے تحقیق میں انتشار کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

اسی مضمون میں خان صاحب نے کلیاتِ سودا کے اس خطی نسخے کو جو انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور جو "نسخۂ جانسن" کے نام سے مشہور ہے الحاقی کلام سے پاک اور کلامِ سودا کے لیے معتبر قرار دیا ہے۔ یہ بات انھوں نے مذکورہ کتاب میں کئی جگہوں پر اور "انتخابِ سودا" میں بھی لکھی ہے۔ لیکن ڈاکٹر نسیم احمد نے اپنی کتاب "متعلقاتِ سودا" میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ "نسخۂ جانسن" میں دیدہ و دانستہ تحریفیں بھی کی گئی ہیں اور اس میں الحاقی کلام بھی موجود ہے۔ (متعلقات سودا ص ۳۲۔۴۰)

رشید حسن خاں نے تاریخِ ادب کی کتابوں، لغات، انتخابات اور نصابی کتب میں محفوظ ادب پاروں کو صحتِ انتساب اور صحتِ متن کے اعتبار سے معتبر تسلیم نہیں کیا کیوں کہ ایسے کاموں میں عام طور پر بے احتیاطی برتی جاتی ہے۔ اسی طرح وہ محیر العقول حکایتوں، معاملاتِ تصوّف اور مذہبی معتقدات کو بھی اسی زمرے میں رکھتے ہیں۔ بیاضوں کے حوالوں پر بھی انھیں پورا یقین نہیں اور اس عدم یقین کا سبب بیان کرتے ہوئے انھوں نے حافظ محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" صفیر بلگرامی کے تذکرے "جلوۂ خضر (جلد اوّل)" نصیر حسین خیال کی "مغل اور اردو" ڈاکٹر جمیل جالبی کی "تاریخِ ادبِ اردو" اور عبدالباری آسی کی "مکمل شرح کلامِ غالب" سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ "پنجاب میں اردو" کے مشکوک اور غلط انتسابات کا خصوصی جائزہ لیا گیا ہے اس لیے وہ سفارش کرتے ہیں کہ :

> "روزنامچوں اور بیاضوں کے اندراجات ہوں یا زبانی روایتیں یا اس قسم کے دوسرے ذرائع، ان کا مطالعہ تو ضرور کرنا چاہیے مگر بہ طورِ حوالہ ان کو قبول کرنے میں احتیاط اور بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے، کیوں کہ غیر معتبر روایتوں کی کمی نہیں۔ جب تک صحتِ انتساب کا یقین نہ کر لیا جائے اس وقت تک بہ طور سند ایسے حوالوں کو نہ قبول کرنا چاہیے اور نہ پیش کرنا چاہیے۔ بیاضوں وغیرہ کے پرانے اندراجات تو الگ رہے، شاعر کی زندگی میں اس کے کلام میں تحریف کی مثالیں مل سکتی ہیں اور غلط انتساب کی بھی۔" (۷۴۔۷۵)

خان صاحب نے بیاضوں کے علاوہ انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر اب تک جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ انھوں نے "آبِ حیات" کو بہت سے غیر معتبر بیانات کا مخزن اور صفیر بلگرامی وغیرہ کے تذکروں کو غیر معتبر واقعات کا مال خانہ اور بے سرو پا روایتوں کا گنجینہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے مالک رام کے "تذکرۂ معاصرین" سے بھی بیانِ واقعات اور سنین کی غلطیاں دکھائی ہیں اور بیش تر جگہوں پر ماخذ کا اندراج نہیں ہونے کی بنا پر اس پر تنقید کی ہے۔ وہ مضامین کے مجموعوں کی معلومات اور ان کے مندرجات کو جانچے پرکھے بغیر تسلیم کرنے پر خبردار کرتے ہیں۔ وہ اولین ماخذ کے ہوتے ہوئے ثانوی ماخذ پر بھروسا کرنے کے قائل نہیں۔ رشید حسن خاں کا کوئی دعوا بغیر شافی دلیل کا نہیں اس لیے اس پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

حوالے کے معتبر ہونے کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کا متن اسقام سے پاک اور قابلِ اعتماد ہو۔ غیر درست متن کی موجودگی میں محقق بہت ٹھوکریں کھاتا ہے اور اس کے اخذ کردہ نتائج قابلِ وثوق نہیں ہوتے۔ رشید حسن خاں نے زیرِ بحث تصنیف کے باب "حوالہ اور صحتِ متن میں کافی تفصیل سے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اپنی پریشانیوں کا اظہار کیا ہے۔ ان کی نگاہ میں اردو میں ایسے متون بہت کم ہیں جن پر بھروسا کیا جا سکے۔ اساتذہ کے دواوین، قدیم نثری تصانیف اور تذکروں کے صحیح معنوں میں تحقیقی ایڈیشن نہیں کے برابر تیار ہو سکے ہیں۔ تحقیق کے طلبہ کے لیے یہ صورتِ حال کسی مصیبت سے کم نہیں۔ موجودہ صورت میں ایسے متون سے حوالہ دیتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ غلط فہمیوں اور غلط نتائج سے بچنا ناممکن ہو جائے گا۔ ایک ہی کتاب کی مختلف اشاعتوں میں متن میں تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ کبھی مصنف کی طرف سے ہوتی ہیں، کبھی کاتب کی ستم ظریفی کا نتیجہ ہوتی ہیں اور کبھی کوئی مصحح اپنا کمال دکھاتا ہے۔

اردو ہو یا فارسی، مشہور شاعروں کے کلام میں خاصا الحاقی کلام موجود ہے۔ اس میں عمر خیام کی رباعیات حتیٰ کہ فردوسی کا شاہنامہ بھی شامل ہے۔ رشید حسن خاں نے ایران کے بزرگ محقق محمد قزوینی کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ دیوانِ حافظ کے جو نسخے نویں صدی ہجری تک کے لکھے ہوئے ملتے ہیں ان میں غزلوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد بارھویں صدی کے اوائل تک چھ سو اور موجودہ صدی میں آٹھ سو تک پہنچ گئی ہے۔ اب یہ تین سو غزلیں حافظ کی ہیں یا نہیں اس کا جب تک کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہو ان پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے اور ثبوت نہیں ہونے کی صورت میں ان سے جو نتائج اخذ کیے جائیں گے وہ کیسے قابلِ اعتنا قرار پائیں گے؟ کلیاتِ سودا کے مطبوعہ ایڈیشنوں میں میر سوز کی غزلیں شامل ہیں۔ محمد حسین آزاد کے مرتبہ دیوانِ ذوق میں آزاد کی ترمیمیں موجود ہیں، ناسخ کے کلام میں ان کے شاگرد میر اوسط علی رشک نے تبدیلیاں کی ہیں، اسیر اور امیر مینائی نے مل کر مصحفی کے کلام کا جو انتخاب کیا ان میں ان کی تصحیحات موجود ہیں۔ ایسی حالت میں ادب کے سنجیدہ طلبہ اور محققین کی ذمے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ رشید حسن خاں نے پرانی کتابوں کے اچھے خطی نسخوں اور مطبوعہ کتابوں کے متن کے اختلافات کا بھی ذکر کیا ہے اور مختلف مثالیں پیش کی ہیں معروف اشعار کے متن میں بھی اکثر اختلافات پائے جاتے ہیں لہٰذا خاں صاحب کا یہ مشورہ بہت صائب ہے کہ اشعار نقل کرتے وقت اصل مجموعوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس معاملے میں تاریخِ ادبِ اردو اور انتخابات کے مجموعوں سے حتی الامکان پرہیز بہتر ہے۔ یہی حال لغات، تذکیر و تانیث اور قواعد سے تعلق رکھنے والے رسائل میں موجود اشعار کا ہے۔ کم سواد کاتبوں کے کتابت شدہ نسخوں پر بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ خاں صاحب کربل کتھا کے واحد خطی نسخے کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے کاتب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کی تحریر میں فاش غلطیاں موجود ہیں۔ اس نے ڈھارس کو "ڈھارث"، "سات" کو "ثات" اور "فرات" کو فراط" لکھا ہے۔ اب اگر کوئی اس نسخے کی بنیاد پر اس کتاب کا لسانی تجزیہ کرنے بیٹھ جائے تو یہ تجزیہ کبھی درست نہیں ہو

سکتا۔ انھوں نے یہ بات بھی بہت صحیح کہی ہے کہ کتابوں کی اولین اشاعتیں یا اس کے معتبر نسخے اکثر لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ مجبوری کے عالم میں دیگر نسخوں سے کام لینا پڑتا ہے لیکن اس مجبوری اور اس کے اثرات کا صحیح اندازہ ہو تو اس سے احتیاط کے تقاضوں کو جلا ملتی ہے اور لکھنے والا بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' کے پہلے حصے کا آخری مضمون ''تدوین اور تحقیق کے رجحانات'' ہے جس میں ۱۹۴۷ کے بعد تحقیق اور تدوین میں جو رجحانات نمایاں ہوئے ہیں اس کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں نے پہلے تدوین اور تحقیق کے فرق کی وضاحت کی ہے۔ وہ تحقیق و تدوین کو ایک نہیں بلکہ دو علاحدہ مستقل موضوع سمجھتے ہیں البتہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی حدیں کہیں کہیں مل جاتی ہیں۔ فرماتے ہیں :

> ''اگر ایک شخص صحیح طریقے سے حقائق کا کھوج، مناسب انداز سے واقعات کو ترتیب دینے اور خالص منطقی ڈھنگ سے نتائج نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے؛ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ متن کو بھی پورے آداب کے ساتھ مرتب کر سکتا ہے، اس سے اس کی تحقیقی صلاحیت پر حرف بھی نہیں آتا۔ تحقیقی کام کرنے والے کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ ترتیب متن پر بھی اسی طرح دسترس رکھتا ہو، البتہ تدوین کا کام کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کو آداب تحقیق سے بھی اسی قدر واقفیت ہو اور لگاؤ بھی ہو۔ اس کے بغیر تدوین کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔'' (ص ۱۲۱۔۲۲)

پروفیسر گیان چند جین کو اس سے اختلاف ہے کہ تحقیق اور تدوین دو علاحدہ فن ہیں۔ وہ خان صاحب کے اس قول پر کہ تحقیق کرنے والے کے لیے لازم نہیں کہ وہ اچھا مدوّنِ متن بھی ہو اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں :

> ''لیکن ایک موضوع پر تحقیق کرنے والے کے لیے یہ کہاں لازم ہے کہ وہ ہر موضوع یا ادب کے ہر شعبے کا اچھا محقق ہو۔ تدوینِ متن کا کام محقق ہی کرتے آئے ہیں۔ متن کی تشکیل و تعبیر کے علاوہ مصنف اور متن کے بارے میں تحقیقی مقدمہ اور حواشی لکھنا تحقیق نہیں تو اور کیا ہیں۔ اردو میں سب سے اچھے متن محمود شیرانی، مولانا عرشی، مالک رام، مسعود حسین خاں، نورالحسن ہاشمی، مختارالدین احمد، نثار احمد فاروقی اکبر علی خاں عرشی زادہ، محمود الٰہی، اکبر حیدری وغیرہ نے تیار کیے ہیں۔ یہ سب محقق ہیں، تنقید میں ان کا اہم مقام نہیں۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، سید محمد وغیرہ نے بہت سے متون ترتیب دیے۔ یہ کام تدوینِ متن کے جدید تقاضوں کو پورا نہیں کرتے لیکن ان لوگوں نے کام تو بہت کیا۔ خود رشید حسن خاں کچھ معرکے کے متون تیار کر رہے ہیں۔ ان سب مدوّنوں میں سے ہر شخص محقق ہے جس نے تدوینِ متن کے علاوہ تحقیق کا دوسرا کام بھی معتد بہ مقدار میں کیا ہے۔ دوسری طرف جن مشہور نقادوں نے متن

ترتیب دیے ہیں ان میں سے کسی نے تدوین کا حق ادا نہیں کیا۔ اس سے تحقیق اور تدوین کی ہم آہنگی بلکہ یک جائی ثابت ہے۔" (تحقیق کا فن۔ گیان چند جین، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۰ء ص ۱۰۱)

اسی کتاب کے ص ۴۲۸۔۲۹ پر وہ انھی خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"رشید حسن خاں کے خیال کے علی الرغم تدوین تحقیق سے جدا فن نہیں۔ یہ تحقیق ہی کی ایک شاخ ہے۔ اس کے لیے انھیں صلاحیتوں اور ذہنی رجحان کی ضرورت ہوتی ہے جو تحقیق کے لیے درکار ہیں۔ اچھے مدوّن محققوں کے سوا کوئی دوسرے نہیں اردو میں عموماً ہر بڑا محقق تدوینِ متن کے بھی کچھ کام کرتا ہے مثلاً محمود شیرانی قاضی عبدالودود .... سبھی نے تدوینِ متن کے کام کیے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تدوین تحقیق کا ہی ایک حصہ ہے۔"

یہاں یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ گیان چند جین نے رشید حسن خاں کی باتوں پر ٹھیک سے غور ہی نہیں کیا۔ خاں صاحب نے ابتدا میں ہی وضاحت کر دی ہے کہ حقائق کی بازیافت، صداقت کی تلاش، حقائق کا تعین اور ان سے نتائج کا استخراج ادبی تحقیق کا مقصد ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں آگے چل کر مرتبِ متن کے لیے جو شرائط پیش کی ہیں وہ یہ ہیں کہ مرتبِ متن کے لیے لازم ہے کہ وہ صحتِ متن کا مفہوم اور اختلافِ نسخ کا مطلب سمجھتا ہو، قواعدِ زبان، قواعدِ بیان، قواعدِ شاعری اور اچھی فارسی سے واقف ہو، جس عہد کا متن ہے اس عہد کی زبان کی بھی اسے اچھی جانکاری ہو اور اس عہد کے اہم مصنفین کا اس نے مفصل مطالعہ کیا ہو اور ان کے یہاں زبان و بیان کی پائی جانے والی خصوصیات مثلاً لفظوں کے استعمال، جملوں کی تراکیب، تذکیرو تانیث اور متروکات کی بحثوں سے آشنا ہو، وہ مصنفِ متن کے ہم عصروں کے یہاں خاص خاص الفاظ کے متعلق ان کے طرزِ عمل سے بھی باخبر ہو اس کے ساتھ ساتھ املا کے مسائل سے باخبر اور اصلاحِ زبان کی مختلف تحریکوں سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ ان تمام پہلوؤں سے آشنائی کے بغیر کوئی متن صحیح طریقے سے مرتب ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ واضح طور پر لکھتے ہیں اور بالکل درست لکھتے ہیں کہ محقق کے لیے لازم نہیں ہے کہ وہ مرتبِ متن بھی ہو لیکن مرتبِ متن کے لیے لازمی ہے کہ وہ محقق ضرور ہو۔ یعنی کوئی مرتبِ متن ہوئے بغیر محقق تو ہو سکتا ہے لیکن وہ محقق ہوئے بغیر مدوّن نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے تدوین تحقیق سے آگے کی منزل ہے۔ گیان چند جین کا یہ کہنا کہ اچھے مدوّن محققوں کے سوا کوئی دوسرے نہیں، یہ دراصل رشید حسن خاں کے ہی قول کی تائید ہے۔ وہ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا امتیاز علی عرشی اور مشفق خواجہ وغیرہ کا نام اچھے مرتبین متن کی حیثیت سے لیتے ہیں یہ بالکل ٹھیک ہے۔ رشید حسن خاں کی باتوں کی تردید اس وقت ہوتی جب وہ ایسے معیاری مرتب شدہ متون کا تذکرہ کرتے جنھیں کسی محقق نے ترتیب نہیں دیا ہو۔ "من چہ می سرایم وطنبورہ من چہ می سراید" شاید اسی کو کہتے ہیں۔ اس

بات کو اس مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ قاضی عبدالودود ابن امین اللہ طوفان کا ''تذکرۂ شعراء'' دلدار بیگ کے ''قطعاتِ دلدار''، ''قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ'' کو مرتب کیے بغیر بھی اپنی دیگر تحقیقی تصانیف کی بدولت بہترین محقق ہیں لیکن وہ محقق نہ ہوتے تو مذکورہ کتابوں کی تدوین اپنی خواہش کے باوجود بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جین صاحب کا یہ کہنا کہ ایک موضوع پر تحقیق کرنے والے کے لیے یہ کہاں لازم ہے کہ وہ ہر موضوع یا ادب کے ہر شعبے کا اچھا محقق ہو، یہ اَنمل بے جوڑ والی بات ہے۔ رشید حسن خاں نے جب ایسا دعواہی نہیں کیا اور کوئی کر بھی نہیں سکتا تو یہاں اس بات کا تذکرہ ہی فضول ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ تحقیق اور تدوین میں باہمی رشتہ ہوتے ہوئے بھی یہ دونوں دو مستقل موضوع ہیں۔

رشید حسن خاں اس سے متفق ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو دنیا نے تدوین کی ضرورت اور اس اہمیت کو محسوس کیا اور اس چیز کو بھی سمجھا کہ تحقیق کی طرح اس کے بھی اپنے مسائل اور ضابطے ہیں۔ لوگوں نے متن کی ترتیب میں کی گئی جگر کاوی کا بھی اعتراف کرنا شروع کیا۔ اگر پرانے متون کو پورے آداب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے تو صحیح لسانی جائزہ بھی ممکن نہیں اور نہ کوئی معیاری لغت ترتیب پا سکتا ہے۔ درست متن کے بغیر اس سے اخذ کردہ نتائج گمراہ کن بھی ہو سکتے ہیں۔ ۴۷ء کے بعد تحقیق کے فروغ کے نتیجے میں احتیاط کے تقاضے عام ہوئے اور لوگوں نے معتبر ماخذ کی تلاش شروع کی لیکن ان باتوں کے ساتھ ساتھ خاں صاحب کا یہ شکوہ بھی ہے کہ اس زمانے میں کتابیں مرتب تو ہو رہی ہیں لیکن زیادہ تر کام اصولِ تدوین کے لحاظ سے معیاری نہیں۔ کچھ لوگوں نے تحقیق کی طرح تدوین کو بھی مادّی فوائد کے حصول کا ذریعہ بنالیا ہے۔ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی مالی مدد کی خاطر لوگ تحقیق و تدوین کی بے حرمتی پر آمادہ ہیں۔ مدوّن حضرات میں سے بہت کم ایسے ہیں جو کسی متن کے تمام اہم نسخوں کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کام نہایت صبر آزما ہے جو عجلت پسندی اور آسان طلبی کی صورت میں انجام نہیں پا سکتا۔ خاں صاحب نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ اچھے محقق اور مدوّن کے لیے یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ اچھا نقاد اور اچھا ماہرِ لسانیات بھی ہو لہٰذا اسے اپنی حدود کو سمجھنا چاہیے۔ جن لوگوں نے اس حد سے تجاوز کیا ہے وہ عدم توازن کا شکار ہو گئے ہیں۔

رشید حسن خاں نے تحقیق کی اہمیت کے اس بڑھتے احساس پر بھی روشنی ڈالی ہے جو ۴۷ء کے بعد نمایاں ہوا۔ تنقید نگار بھی سمجھنے لگے کہ انھیں محققین کے ذریعے پیش کیے گئے حقائق اور شواہد کے تعین کو ہر حال میں نظر میں رکھنا ہوگا اس سے وہ مفروضہ نتائج نکالنے کی بدعت سے محفوظ رہیں گے۔ اسی عہد میں علاقائی ادب کو اجاگر کرنے کی بھی ضرورت محسوس کی گئی۔ مختلف شہروں اور قصبوں میں جو ادبی سرگرمیاں رہی ہیں انھیں عرصے تک عام طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا لیکن اب رفتہ رفتہ برف پگھلنے لگی ہے اور علاقائی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پر بھی لوگوں کی نظر پڑی ہے۔ خاص طور سے دکنی ادب پر بہت کام کیا گیا۔ اسی عہد میں احتساب کی روایت پھر سے زندہ ہوئی اور قاضی عبدالودود نے اپنے احتسابی جائزے سے اس روایت کو سب سے زیادہ توانائی بخشی۔ یہاں یہ کہنے کو جی

چاہتا ہے کہ تحقیق کے اس احتسابی عمل کو قاضی صاحب کے بعد خود رشید حسن خاں نے مضبوطی سے آگے بڑھایا۔ ان کے علاوہ پروفیسر عطا کاکوی، پروفیسر حنیف نقوی، عابد پیشاوری اور کسی حد تک پروفیسر ظفر احمد صدیقی بھی اس راہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلے۔ خاں صاحب کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ احتساب سے خفیف الحرکاتیاں ختم نہیں ہو سکتیں لیکن اسی وجہ سے لوگوں نے برے کام کو برا سمجھا ہے اور وہ احتیاط کے معنوں سے واقف ہوئے ہیں۔

آزادی کے بعد جب احتساب کا سلسلہ پروان چڑھا تو اس کی زد میں آنے والے حضرات نے مثبت اور منفی تحقیق کی اصطلاح وضع کی۔ رشید حسن خاں اس روش پر سخت رویہ اپناتے ہوئے کہتے ہیں :

> ''جن کے گھٹیا کام اور غیر ایماندارانہ روش کا احتساب کیا جاتا ہے ان لوگوں نے ایک اصطلاح وضع کی ہے ''منفی اندازِ نظر''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ غلط کام کو غلط کہتے ہیں وہ ادب کو نقصان پہنچاتے ہیں اور معقول لوگوں کے کام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ یعنی جھوٹ بولنا اور تحقیق و تدوین کے نام پر تجارت تو تعمیری کام ہے، پرانے دواوین کو تدوین کے نام پر مسخ کرنا بھی تعمیری کام ہے؛ اور یہ کہنا کہ یہ باتیں غلط ہیں، تخریبی انداز ہے۔ لوگ غلط کام اور گھٹیا کام اس سے پہلے بھی کرتے تھے لیکن اس پر ڈھٹائی سے اس طرح فخر نہیں کر پاتے تھے۔ یہ انداز خاص اسی زمانے کی پیداوار ہے کہ ادب و تحقیق کے نام پر ہر قسم کی بے عنوانی کی جائے گی اور اس پر ٹوکا جائے گا تو اس کو منفی اندازِ نظر اور تخریبی عمل کہا جائے گا۔'' (ص۔۱۳۹)

رشید حسن خاں نے ۱۹۴۷ء کے بعد کے تحقیقی رجحانات کا خاکہ کھینچتے ہوئے یہ بات بتائی ہے کہ اردو میں ادبی تحقیق کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا جس کے سب سے اہم نمایندے حافظ محمود شیرانی ہیں۔ ان کے کام کی عظمت اور اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ان کے اثرات عام نہیں ہو سکے۔ لوگ حالی، شبلی اور مولوی عبدالحق کے طرزِ تحقیق کے زیادہ اسیر رہے۔ خاں صاحب نے شبلی، حالی اور مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات کی خوبیوں اور خامیوں کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے ان تینوں میں مولوی عبدالحق کی خدمات کو زیادہ سراہا ہے۔ وہ انھیں اپنے عہد کا گل کرسٹ کہتے ہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہتے کہ انھوں نے نہ تحقیق کا صحیح حق ادا کیا اور نہ ان کے مرتب شدہ متون میں آدابِ تدوین کی مکمل پابندی نظر آتی ہے۔ آزادی کے بعد تحقیق کی دنیا میں لوگوں نے شک کرنا سیکھا، ان میں انکار کی جرأت پیدا ہوئی، روایت پرستی کا اثر کم ہونا شروع ہوا اور لوگ دعوے کی دلیل طلب کرنے لگے۔ رشید حسن خاں کی نظروں میں قاضی عبدالودود کی تحریروں سے اس رجحان کو تقویت ملی۔ ان کے تبصروں کو پڑھ کر لوگ تحقیق کے اصول و آداب سے واقف ہوئے لیکن اب بھی یہ تبدیلی ادھوری ہے۔ روایت کا اثر مکمل طور پر زائل نہیں ہوا۔ خاں صاحب کو یہ امید ہے کہ ملک میں صنعتی ترقی کے ساتھ صنعتی کلچر فروغ پائے گا جس میں روایتوں کا رنگ دھیما پڑ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں انھی کے لفظوں میں ''تحقیق کے منطقی انداز کو فروغ

پانے کے لیے قومی سطح پر بھی مناسب ماحول مل جائے گا۔" (ص ۱۴۶)

"ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ" کے اس جائزے میں اس کے اسلوب کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ رشید حسن خاں کا تحقیقی اسلوب بڑا دل کش، توانا اور جاندار ہے۔ تحقیق کے نام ہونے والی خفیف الحرکاتیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے بیان میں ذرا کھردرا پن ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن عام طور پر ان کے اسلوب میں نہایت شائستگی اور شگفتگی ہے اور اس شگفتگی سے معنی کی قطعیت میں کہیں فرق نہیں پڑتا۔ خاں صاحب جب یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق اور اس کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں یا وہ مختلف سرکاری و نیم سرکاری اداروں کی مدد سے ہونے والے کاموں پر اظہار خیال فرماتے ہیں تو ان کے لہجے میں بہ ظاہر شدت نظر آنے لگتی ہے۔ خاں صاحب کے لب ولہجے کی اس تندی کی جانب مختلف اصحاب نے اشارے کیے ہیں۔ میں بہ طور مثال صرف ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا ذکر کروں گا۔ وہ اپنے مقالے "رشید حسن خاں ایک منفرد محقق" مشمولہ "اظہار" بمبئی، جنوری ۱۹۸۴ء میں فرماتے ہیں:

> "ایک محقق کی زبان اور زبان قلم کی واشگاف گوئی اور حقیقت نگاری کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں لیکن اس سلسلہ میں بات کبھی کبھی خود رشید حسن خاں کے یہاں جائز حدوں سے آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے......... گمراہ کن رجحانات اور علمی جرائم کی حوصلہ شکنی جتنی ضروری ہے اتنا ہی تحقیقی طریق رسائی میں لب ولہجہ کی تندی اور طعن و تعریض کی نشتر زنی سے بچنا بھی احتساب کی ایک مستحسن صورت ہے......... جگہ جگہ ان کی زبان تحقیقی انداز بیان کے سادہ و سنجیدہ دائرہ سے باہر آگئی ہے۔ اس سے گفتگو کا لطف بڑھ گیا ہے۔ چبھتے ہوئے فقرے یوں بھی زیادہ یاد رہ جاتے ہیں اور گرمی محفل کے کام آتے ہیں لیکن ایک محقق کے صحیح علمی مزاج اور اس کے سنجیدہ مقصد کی نمائندگی نہیں کرتے۔" (۷۴۔۷۵)

تنویر احمد علوی آٹھ مختصر اقتباسات درج کرنے کے بعد رقم طراز ہیں کہ "یہ دل چسپ فقرے اور چبھتے ہوئے جملے تحقیقی طنزیات و مضحکات کا حصہ تو بن سکتے ہیں، کچھ دیر ان کے چٹخارے کا لطف بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن انھیں تحقیق کی زبان اور انداز بیان کا حصہ ماننے میں تامل ہوتا ہے۔"

محقق کو بے شک لہجے کی تندی اور طعن و تعریض کی نشتر زنی سے بچنا چاہیے لیکن کم معیاری جب عام رجحان بن جائے، لوگ مادی فوائد کی خاطر جان بوجھ کر تحقیق کا خون کرنے پر آمادہ ہوں، محنت سے جی چرانا، عجلت پسندی سے کام لینا، تحقیقی بل ہوسی کا شکار ہو جانا، علمی جوابدہی کے احساس سے بے نیاز ہو جانا جیسے رویے فروغ پانے لگیں تو ضرورت سخت تبصروں کی ہی ہوتی ہے۔ جب چور گھر میں گھس آئیں یا گھر میں آگ لگ جائے تو شور مچانا ضروری ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں اگر تحقیق کی دنیا میں ایسا خلفشار دیکھتے ہیں تو ان کے لہجے کا تند ہونا بے جا نہیں ہے۔ کوئی ایماندار شخص اگر "گمراہ رجحانات اور علمی جرائم" پر قلم اٹھائے گا تو فطری طور پر اس کے

فقرے چبھتے ہوئے ہی ہوں گے۔ طنز وتعریض بھی برائیوں اور کمزوریوں کے خلاف لڑنے کا ایک موثر ہتھیار ہے۔ اس کا استعمال اعتدال کے ساتھ کہیں بھی کیا جا سکتا ہے اور اچھے اچھے تنقید نگاروں اور محققوں نے اس سے کام لیا ہے۔ قاضی عبدالودود نے بھی، جن کے لہجے کی خشکی کی عام طور پر شکایت کی جاتی ہے اس حربے کا خوب استعمال کیا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ کسی کی غلطیوں کو لاکھ نرمی کے ساتھ بیان کیجیے اسے اچھا محسوس نہیں ہوگا۔ ہمارے یہاں عام طور پر لوگوں کا ظرف ایسا نہیں ہے کہ غلطیوں پر متنبہ کیے جانے پر وہ ٹوکنے والوں کے تئیں شکر گزاری کا جذبہ رکھیں۔ رشید حسن خاں جن مسائل پر لکھتے ہوئے چبھتے فقروں کا استعمال کرتے ہیں ذرا معترضین بھی انھیں مسائل پر دل سوزی کے ساتھ تفصیل سے لکھ کر دیکھیں۔ انھیں اقبال کے الفاظ میں پتہ چل جائے گا کہ جب روح کے اندر خیالات متلاطم ہوں تو گفتار کے اسلوب پر قابو رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں کے یہاں طنز وتعریض کا جو انداز ہے وہ اس سچے اور کھرے جذبے کی دین ہے جو تحقیق کو ہر طرح کی آلائشوں سے پاک دیکھنا چاہتا ہے اور یہ جذبہ سچے خلوص کی کوکھ سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' کا پہلا حصہ صرف کتابی علم پر مبنی نہیں بلکہ اس میں خاں صاحب کے ذاتی مشاہدے اور تجربے کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں تحقیق کی تعریف، اس کے اجزائے ترکیبی، محقق کے ذاتی اوصاف، تحقیق کے تئیں طبعی مناسبت، خوش عقیدگی کے نقصانات، کسی موضوع سے جذباتی تعلق، محتاط محققین کی کسی موقع پر بے احتیاطی، غیر معتبر اور بالواسطہ حوالے سے بچنا اور اصل ماخذ سے استفادے کی کوشش، حافظے کی کرشمہ سازیاں، اہم اور غیر اہم کی پہچان اور اس جیسے دیگر نکات کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور مختلف مثالوں سے اپنی باتیں ثابت کی ہیں۔ انھوں نے جتنی توجہ تحقیق کے اصل مسائل پر مرکوز رکھی ہے، جزئیات اور ذیلیات پر بھی وہی توجہ صرف کی ہے۔ کن وجوہات سے تحقیق کی حرمت پر حرف آتا ہے اور محققین کو اپنے ہوش وگوش کا دائرہ کتنا وسیع رکھنا چاہیے ان باتوں کا بیان بھی انھوں نے بہت ہنرمندی کے ساتھ کیا ہے۔ مصالحت آمیز رویہ ان کے مزاج کو راس نہیں آتا اور نہ اچھے محقق کو آنا چاہیے۔ انھوں نے سچ کو سچ کہنے میں تامل سے کام نہیں لیا، وہ بڑے بڑوں کی غلطیوں کی نشاندہی میں کبھی نہیں جھجکے۔ مذکورہ کتاب میں بھی انھوں نے صداقت کا علم بلند رکھا ہے۔ انھوں نے جو تحقیقی اصول وضع کیے ان پر خود بھی سختی سے کاربند رہے۔ رشید حسن خاں صحیح معنوں میں قاضی عبدالودود کے سچے جانشیں کہلانے کے مستحق ہیں۔ جو لوگ تحقیق کی دنیا میں قدم رکھنا چاہتے ہوں اور وہ سرخ روئی وسرفرازی کے بھی متمنی ہوں تو انھیں ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' کو وظیفے کی طرح پڑھنا چاہیے۔

Dr. Zafar Kamali, Dept. of Persian, Z.A. Islamia College,
Siwan-841226 (Bihar), Mob. : 09431056963

شہرِ غزل

پیش رَو غزلیں

ندا فاضلی ر کرشن کمار طور ر ضیا فاروقی ر
ارمان نجمی ر شہپر رسول ر شاہین ر راشد جمال فاروقی

دس خاص غزلیں

شکیل اعظمی

ہم عصر غزلیں

سلیم انصاری ر ڈاکٹر علی عباس اُمید ر ظفر اقبال ظفر ر
راجیش ریڈی ر احمد کمال حشمی ر طارق قمر ر
عزم شاکری

پیش رَو غزلیں

● ندا فاضلی

رستے میں مل گیا تھا کل ایک غم اچانک
کتنا بدل گئے ہیں پہلے کے ہم اچانک

ملتی ہے کس کو اتنی عزت شرافتوں سے
تم کیسے بن گئے ہو یوں محترم اچانک

جانے سے اس کے یوں تو سب کچھ ہے پہلے جیسا
دنیا وہی ہے لیکن لگتی ہے کم اچانک

شاید ضرورتوں کی یہ مہربانیاں ہیں
گنتی میں بڑھ گئے ہیں ان کے کرم اچانک

کوئی کبیر آئے جو دیکھے وہ سنائے
بنائی کھو چکے ہیں سب کے قلم اچانک

بدلا بدلا تھا ہر منظر گلی محلّہ بھول گیا
یاد رہا وہ لیکن اس کا چہرہ مہرہ بھول گیا

بنا بنا کے بادل سورج اُڑا رہا ہے پانی کو
ساگر تک جانے کا رستہ بہتا دریا بھول گیا

جنگل سے محفوظ تھا پنجرا لیکن اسی حفاظت میں
کھلی فضا کا ایک پرندہ پروں سے اُڑنا بھول گیا

بھٹک رہا ہے تنہا تنہا انجانوں کی بستی میں
شاید اپنے ساتھ وہ اپنے شہر کو لانا بھول گیا

آدم زاد فرشتہ بن کر چمکا دور ستارے سا
گھر زمیں پر بہن کی چوڑی ماں کا چشما بھول گیا

Sunrise Apartments 201-B, Aram Nagar, Versova, Andheri, Mumbai-400061, Mob. : 09869487139

● کرشن کمار طوؔر

شب ہے قائم سحر ندارد
اس خوف سے ہے مفر ندارد
جچتا ہی نہیں نظر میں کچھ بھی
ہمتیں تو ہیں سفر ندارد
یہ صورت بھی ہے کتنی دل چسپ
کہنے کو ہوں میں مگر ندارد
ایسا بھی زوال دیکھنا تھا
نظارہ تو ہے نظر ندارد
اطراف ہی بس کھلے ہوئے ہیں
رہنا ہے جہاں وہ گھر ندارد
باعث ہے یہ میری حیرتوں کا
ہیں لوگ بہت بشر ندارد
موجود جہاں میں پھر ہے کیا طوؔر
ہم ہی ہیں یہاں اگر ندارد

Krishna Kumar "Toor"
134/E-Khanyara Rd,
Dharamshala, 176215
Himachal Pradesh

دیوار کا خود سایۂ دیوار میں آنا
ہے موت کسی نرغۂ اغیار میں آنا
لگتا ہی نہیں اپنے سے خود کتنے الگ ہیں
ہم کو بھی بہت بھایا ہے دوچار میں آنا
مشکل جو نہیں کوئی تو آساں بھی نہیں ہے
یہ اپنا کسی چشمِ خریدار میں آنا
نایاب نہ ہو جائیں جہاں میں جو یہ ہم نے
منظور کیا درپئے آزار میں آنا
اس مرحلۂ شوق نے اتنی تو خبر کی
بازار میں آنا ہے تو بازار میں آنا
سچ پوچھو تو یہ ظلم سے کچھ کم تو نہیں ہے
لوگوں کا کسی سایۂ اشجار میں آنا
اے طوؔر یہ نازک سی تمھیں بات بتادیں
سر ہو تو یہاں گردشِ تلوار میں آنا

ضیا فاروقی

میری آنکھوں میں جو تھوڑی سی نمی رہ گئی ہے
بس یہی عشق کی سوغات بچی رہ گئی ہے

وقت کے ساتھ ہی گُل ہو گئے وحشت کے چراغ
اک سیاہی ہے جو طاقوں پہ ابھی رہ گئی ہے

بوجھ سورج کا تو میں کب کا اُتار آیا مگر
دھوپ جو سر پہ دھری تھی سو دھری رہ گئی ہے

اور کچھ دیر ٹھہرائے مری بینائی کہ میں
دیکھ لوں روح میں جو بخیہ گری رہ گئی ہے

سوچتا ہوں کہ تصور کو سمیٹوں کیسے
بسترِ خواب پہ بھی آنکھ کھلی رہ گئی ہے

یوں تو اس گھر کے در و بام بھی ٹوٹ گئے
ہاں مگر بیچ کی دیوار ابھی رہ گئی ہے

جانے کیا بات ہے موسم میں ضیاؔ اب کے برس
دھوپ کے ہوتے ہوئے برف جمی رہ گئی ہے

Zia Farooqui, Flat No. 2,
Shan-e-Fiza Apartnemt, Face-2,
Saifia College Road,
Ahmedabad Palace, Koh-e-Fiza,
Bhopal,462001 (M.P.), Mob. :
09406541986

یاد آیا ہے گھر لوٹ کے صحرا بھی بہت دن
نکلا نہ مرے پاؤں سے کانٹا بھی بہت دن

انجان رہا میں بھی غم و درد سے برسوں
بیگانہ رہی مجھ سے یہ دنیا بھی بہت دن

اک چاند گرہن منظر ہر شب پہ ہوا بار
اے ذوقِ بصارت یہ اندھیرا بھی بہت دن

ممکن ہی نہیں وقت مٹا دے یہ خد و خال
ہم نے اُسے یکسوئی سے دیکھا بھی بہت دن

شہرت بھی ملی مجھ کو ترے شہر سے لیکن
کھایا ہے تری بزم میں دھوکا بھی بہت دن

دیکھا ہے ضیاؔ خود کو زمانے کی نظر سے
کرتا رہا بے لطف تماشا بھی بہت دن

● ارمان نجمی

بجھی نہیں ابھی یہ پیاس بھی غنیمت ہے
زباں پہ کانٹوں کا احساس بھی غنیمت ہے

رواں ہے سانس کی کشتی اسی کے دھارے پر
یہ ایک ٹوٹی ہوئی آس بھی غنیمت ہے

نشاں نمو کے ہیں کچھ تو بساطِ صحرا پر
جھلستی جلتی ہوئی گھاس بھی غنیمت ہے

پھر اس کے بعد تمھاری شناخت کیا ہوگی
روایتوں کی یہ بو باس بھی غنیمت ہے

وہ اب بھی ملتا ہے اپنی ادائے خاص کے ساتھ
کہ وضع داری کا یہ پاس بھی غنیمت ہے

Dr. Arman Najmi, New Azimabad Colony, P.O. Mahendru,
Patna - 800006, Mob. : 09835401490

اپنی سچائی کا آزار جو پالے ہوئے ہیں
خود کو ہم گردشِ آفات میں ڈالے ہوئے ہیں

بند مٹھی میں جو خوشبو کو سنبھالے ہوئے ہیں
یہ سمجھتے ہیں کہ طوفان کو ٹالے ہوئے ہیں

ہیں تو آباد مگر در بدری کی زد پر
وہ بھی میری ہی طرح گھر سے نکالے ہوئے ہیں

اپنی رفتار سے آگے بھی نکل سکتا ہوں
مجھ پہ کب حاوی مرے پاؤں کے چھالے ہوئے ہیں

اب کسی بابِ سماعت پہ نہ دستک دیں گے
دفن صحرا کی فضاؤں میں جو نالے ہوئے ہیں

سرخ رو جو ہے وہ میرا کوئی ہم زاد ہے کیا
نوکِ نیزہ پہ وہ سر کس کا اچھالے ہوئے ہیں

ان کے شانے ہیں ہر اک بارِ گراں سے خالی
اب وہ دستار نہیں سر کو سنبھالے ہوئے ہیں

• شہپر رسول

تمام وصفِ جہاں میرے نام کردے گا
کسے خبر تھی کہ قصہ تمام کردے گا

مجھی سے بات کرے گا مرے ہی لفظوں میں
مجھے وہ مجھ سے ہی یوں ہم کلام کردے گا

قصیدہ اپنا نہ سنتا اگر خبر ہوتی
یہ تجربہ مجھے کچھ اور خام کردے گا

ابھی تو کیسی کھنچی پھر رہی ہیں تلواریں
مگر وہ لہجہ کہ سب کو نیام کردے گا

مرے عیوب کی تشہیر کرکے ہوگا کیا
وہ عام باتوں کو کچھ اور عام کردے گا

وہ میری جان کا آزار بن کے اے شہپر
مری بقا کا ہی کچھ انتظام کردے گا

لفظ آئینہ ہیں جو عکسِ معانی بھی تو ہو
صرف کرداروں سے کیا ہوگا کہانی بھی تو ہو

ایسے لفظوں سے نہیں ڈھلتے یہ دامن، یہ ضمیر
لفظ کے آنکھ بھی ہو آنکھ میں پانی بھی تو ہو

جبر ناموں کے اُڑا کرتے ہیں پرزے کیسے
دل دوانہ بھی تو ہو، عقل دوانی بھی تو ہو

وہ جو اوروں سے مری ہجو سنا کرتے ہیں
میرا کچھ ذکر کبھی ان کی زبانی بھی تو ہو

منزلیں دور تو ہوتی ہیں بجا ہے لیکن
دل میں کچھ بات کبھی آپ نے ٹھانی بھی تو ہو

یوں مکمل مرا خاکہ نہیں ہوگا شہپر
سادگی اپنی جگہ سحربیانی بھی تو ہو

ایک دن نہ رونے کا فیصلہ کیا میں نے
اور پھر بدل ڈالا اپنا فیصلہ میں نے
دل میں ولولہ سا کچھ چال میں انا سی کچھ
جیسے خود نکالا ہو اپنا راستہ میں نے
مجھ میں اپنی ہی صورت دیکھنے لگے ہیں سب
جانے کب بنا ڈالا خود کو آئینہ میں نے
اُس کو بھی تھا کچھ کہنا، مجھ کو بھی تھا کچھ سننا
اور کچھ کہا اُس نے، اور کچھ سنا میں نے
کچھ خبر نہ تھی مجھ کو کھل رہا ہے کوئی گُل
بس ہوا کا آئینہ دیکھ ہی لیا میں نے
وقت نے ہر آہٹ پر خاک ڈال دی شہپر
کردیا ادا آخر جزیۂ انا میں نے

Shahper Rasul, Deptt. of Urdu,
Jamia Milia Islamia, Jama
Nagar,New Delhi, 110025,
Mob. : 09891721187

بے انتہا ہونا ہے تو اِس خاک کے ہو جاؤ
امکاں کی مسافت کرو افلاک کے ہو جاؤ
سب قصوں کو چھوڑو دلِ صد چاک کے ہو جاؤ
اس دورِ جنوں خیز میں ادراک کے ہو جاؤ
اس باغ میں شمشیرِ ہوا سے نہ بچو گے
خوش رنگ ہو، جاؤ کسی پوشاک کے ہو جاؤ
بے ذائقہ ہونے سے یہی ذائقہ اچھا
اشجار سے اترو خس و خاشاک کے ہو جاؤ
سرپوشی کا فن ہاتھوں کو سکھلاؤ وگرنہ
بے آنکھ کے، بے کان کے، بے ناک کے ہو جاؤ
شہپر کی طرح خاک سے اُڑتے ہی پھرو گے
بننا ہے، تو بس جاؤ کسی چاک کے ہو جاؤ

• شاہین (کینیڈا)

اندر بھی ویرانی ہے
وحشت لا امکانی ہے
گھر والے بھی گھر میں نہیں
کس گھر کی مہمانی ہے
بستی والے پوچھتے ہیں
اب کے کہاں کی ٹھانی ہے
گہرا بیچ سمندر میں!
موسم ہی طوفانی ہے
داناؤں میں گھری ہوئی
اک سچی نادانی ہے
اندیشوں میں کٹتی رات
ہر پل بڑی سہانی ہے
جو دیکھا سچ وہ بھی نہیں
سب شاہین کہانی ہے

• راشد جمال فاروقی

لکھا ہے عیش وطرب آسمان پر میرے
کہ ہُن برسنے لگا خاکدان پر میرے
الٰہی خیر! کہ ابتک تو جو ہُوا سو ہُوا
وہ اُڑ گیا ہے بس اب امتحان پر میرے
یہ بدشگونیاں آخر یہاں بھی آپہنچیں
لگا ہے ایک نشاں سائبان پر میرے
وہ سادہ لوح مجھے اب بھی اپنا جانتا ہے
اسے یقین ہے پچھلے بیان پر میرے
میں اپنے کھیت میں یوں نصب ہوگیا راشدؔ
کہ اب بجوکا ہے قابض مچان پر میرے

Rashid Jamal Farooqui,
C-1452-I.D.P.L. Township
Virbhadra (Rishikesh) Dehradun
(Uttarakhand) 249202 ,
Mob. : 09456753096

• شکیل اعظمی

نہ پھل، نہ پھول، نہ پتے، گئے جمال کے دن
درخت کاٹ رہے ہیں کڑے زوال کے دن

وہی ہے دائرہ مجھ پر کئی نگاہوں کا
وہی جواب سے خالی مرے سوال کے دن

وہی ہے روح سے ہمسائیگی عذابوں کی
وہی گناہ کی راتیں وہی ملال کے دن

ابھی بھی بوجھ ہے پلکوں پہ رتجگوں کا ترے
ابھی بھی مجھ میں ہیں روشن ترے خیال کے دن

نہ سرد ہوتے ہیں موسم نہ دھوپ لگتی ہے
کوئی نکال رہا ہے بہت سنبھال کے دن

اسی کے ہاتھ میں سب راز روشنی کے ہیں
بکھیرتا ہے زمیں پر وہی اُچھال کے دن

بڑا غرور تھا مجھ کو بھی اپنی آنکھوں پر
کہیں یہ لوگ بھی اندھے نہ ہوں نکال کے دن

زندگی کی نئی اڑان تھے ہم
اپنی مٹی میں آسمان تھے ہم

چاند نے رات گھر پہ دستک دی
رات بھر اس کے میزبان تھے ہم

ڈھے گئے اک ذرا ہوا جو چلی
کیا کریں ریت کا مکان تھے ہم

جب تلک اس نے ہم سے باتیں کی
جیسے پھولوں کے درمیان تھے ہم

اس کو چپ چاپ سن لیا ہم نے
جیسے سچ مچ کے بے زبان تھے ہم

جس سے ملتی تھی جھوٹ کی سرحد
اس حقیقت سے بد گمان تھے ہم

لوگ سمجھے نہیں ہمیں شاید
مسجدوں سے اٹھی اذان تھے ہم

کما کے پورا کیا جتنا بھی خسارہ تھا
وہیں سے جیت کے نکلا جہاں میں ہارا تھا

نہ میرے چہرے پہ داڑھی نہ سر پہ چوٹی تھی
مگر فساد نے پتھر مجھے بھی مارا تھا

جہاں پہ لوگ مری جان لینا چاہتے تھے
اسی گلی سے گزرنا مجھے دوبارہ تھا

ہوا چلی تو مجھے اس نے پھر کیا روشن
بچا ہوا جو مری راکھ میں شرارہ تھا

کہانی سنتے ہوئے بجھ گئی تھیں سب آنکھیں
جو جل رہا تھا مرے ساتھ اک ستارہ تھا

جہاں سے دیکھ رہا تھا میں بہتے دریا کو
وہیں سے ٹوٹ کے گرتا ہوا کنارہ تھا

کئی مکان تھے لیکن کھلا نہ مجھ پہ کوئی
ہر اک مکان پہ میں نے تجھے پکارا تھا

سَر گئے قبر میں، دستار پڑی ہے گھر میں
اک وراثت ہے جو بیکار پڑی ہے گھر میں

دھول اڑاتی ہے ہوا جنگ کے میدانوں میں
زنگ کھائی ہوئی تلوار پڑی ہے گھر میں

کشتیاں بہہ گئیں سیلاب ہے چاروں جانب
ایک ٹوٹی ہوئی پتوار پڑی ہے گھر میں

ہم نے آنکھوں میں چھپا رکھی تھی باہر کی گھٹا
اب جو برسی ہے تو بوچھار پڑی ہے گھر میں

میں اِدھر رہتا ہوں ٹوٹتے ہوئے آئینے سا
ایک صورت ہے جو اُس پار پڑی ہے گھر میں

میں کہیں کھویا ہوا ہوں کسی پازیب کے ساتھ
اور بکھری ہوئی جھنکار پڑی ہے گھر میں

ایک چوکھٹ سے ہی سب آتے ہیں جاتے ہیں مگر
اندر اندر کوئی دیوار پڑی ہے گھر میں

کدھر کو جاؤں کہ ہوتا نہیں اشارہ کوئی
کہیں سے ٹوٹ کے گرتا نہیں ستارہ کوئی

یہ کس عذاب میں ڈوبا ہوا ہے گاؤں مرا
ندی بچی ہے نہ آنکھوں میں ہے کنارہ کوئی

کسی کا سر مرے قدموں کے ساتھ چلتا ہے
چھپا ہوا ہے زمینوں میں رہگزارہ کوئی

جو دور ہی سے مجھے دیکھ کے گزرتا ہے
قریب آئے تو بن جائے استعارہ کوئی

جہاں سے تیری صدا کا گمان گزرا تھا
پکارتا ہے وہیں سے مجھے دوبارہ کوئی

وہ میں نہیں ہوں مگر ہوں اسی کے اندر میں
پہن کے گھوم رہا ہے مرا اُتارا کوئی

جہاں ہے چھت مری، در بھی وہیں نکالتا ہوں
میں اپنے قدموں سے اپنی زمیں نکالتا ہوں

کھڑی ہے پھر کوئی دیوار میرے رستے میں
لہو لہان میں پھر سے جبیں نکالتا ہوں

یہ سانپ میرے گلے سے لپٹنے لگتے ہیں
میں اپنے کُرتے سے جب آستیں نکالتا ہوں

ذلیل کر مجھے لیکن بہت ذلیل نہ کر
یہ زہر میں بھی تو جا کر کہیں نکالتا ہوں

اے ممبئی! میں تجھے وارتا ہوں تجھ پر ہی
جو تو نے مجھ کو دیا ہے یہیں نکالتا ہوں

ندی بھی آج اکیلی ہی بہنا چاہتی ہے
تو میں بھی آج یہ کشتی نہیں نکالتا ہوں

غرض کہ ٹوٹ چکا ہوں مگر سلامت ہوں
بچا ہوا اسی احساس کی بدولت ہوں

کٹوں گا میں تو بہاؤں گا خون تیرا بھی
سمجھ کہ تیری طرح میں بھی بے مروّت ہوں

اٹھے جو ہاتھ تو ہاتھوں میں آ گئے تارے
میں اپنے آپ میں کتنا دراز قامت ہوں

کسی زمیں پہ تو نقشِ قدم ملیں گے مرے
تو مجھ کو ڈھونڈ اگر میں تری ضرورت ہوں

مری زمین! مری دھوپ سے گریز نہ کر
مجھے سمجھ کہ میں برسات کی علامت ہوں

ہزار رنگ ابھر کر مٹیں گے دنیا میں
رہوں گا میں کہ میں جدّت نہیں روایت ہوں

نہ جانے کب وہ مجھے خرچ کر دے مجبوراً
میں اک غریب کے گھر میں رکھی امانت ہوں

کبھی ہیں جھوٹے تو سچ میں بھی بول کر دیکھوں
بہت اندھیرا ہے لیکن ٹٹول کر دیکھوں

مرا چراغ بجھے گا یا روشنی ہوگی
ہوا کے ساتھ یہ جھگڑا بھی مول کر دیکھوں

پتا چلے کہ مرا شہر کتنا بے حس ہے
فضا میں زہر کسی روز گھول کر دیکھوں

یہ دیکھنا ہے وہ کتنا قریب آتا ہے
اس اجنبی سے ذرا میل جول کر دیکھوں

پکڑ رکھے ہیں کئی خواب میری آنکھوں نے
جو نیند آئے تو دروازہ کھول کر دیکھوں

سنا ہے عشق میں دیوانگی ضروری ہے
تو ایک ۔ئے میں بدل میں بھی ڈول کر دیکھوں

تو زندگی ہے تو ہو جاؤں میں فنا تجھ میں
تو فلم ہے تو کوئی میں بھی رول کر دیکھوں

بچ وہ قطرہ جو گہر ہو ہی نہیں سکتا تھا
اس کمائی سے تو گھر ہو ہی نہیں سکتا تھا

وہ تو تم آب وہوا لائے کہ آباد ہوا
اس خرابے میں نگر ہو ہی نہیں سکتا تھا

یہ ترے لمس کی گرمی تھی کہ ہم جل نکلے
ایسی سردی میں سفر ہو ہی نہیں سکتا تھا

موم سے میرا تعلق تھا ترا شعلوں سے
اپنا اک ساتھ گزر ہو ہی نہیں سکتا تھا

اس طرف لوگ گنہگار بھی تھے اپنے بھی
میں کسی طرح ادھر ہو ہی نہیں سکتا تھا

شاہ کو اس کے پیادوں سے لڑایا میں نے
ورنہ یہ معرکہ سر ہو ہی نہیں سکتا تھا

سلسلہ میرا تھا سورج کے گھرانے سے شکیلؔ
مجھ پہ آندھی کا اثر ہو ہی نہیں سکتا تھا

چراغ بن کے ہواؤں کی میزبانی کی
زمین ہم نے بہت تیری پاسبانی کی

چکانی پڑتی ہیں اور وہ بھی روز قسطوں میں
عجیب قیمتیں ہوتی ہیں مہربانی کی

تمھارے درد سے لے کر ہمارے آنسو تک
بڑی طویل کہانی ہے آگ پانی کی

تمام رشتوں میں اک گانٹھ پڑتی جاتی ہے
ہوائیں چلتی ہیں ذہنوں میں بدگمانی کی

فضا خراب ہے لیکن بہت خراب نہیں
بس اک ذرا سی ضرورت ہے ساودھانی کی

جو ڈور میں بھی نہیں تھے انہیں پتنگوں نے
ہوا ملی تو بہت بات آسمانی کی

سمندروں کے کہیں بھی نکل کے پانی سے
بدھائی دیتے ہیں مجھ کو مری روانی کی

Shakeel Azmi, 5-B/002, Venus Narendra Park, Naya Nagar, Mira Road (E) Mumbai-401107, Mob. : 09820277932

ہم عصر غزلیں

• سلیم انصاری

فصیل شہر پہ روشن ہنر ہوا نے کیا
مرے چراغ تجھے معتبر ہوا نے کیا
شجر سے ٹوٹ کے گرنے کا غم نہیں لیکن
ملال یہ ہے مجھے در بہ در ہوا نے کیا
بجھا کے دشتِ جنوں میں چراغ وحشتِ دل
مجھے تماشۂ اہلِ ہنر ہوا نے کیا
ہُوا نہ ایک بھی پتّا مرے درخت کا زرد
خزاں میں اب کے اکیلے سفر ہوا نے کیا
جو برف جمنے لگی میری شعلگی پہ سلیم
تو میری راکھ میں رقصِ شرر ہوا نے کیا

Saleem Ansari, LIG-II, New
Anand Nagar Colony,
Adhartal, Jabalpur (M.P.)
482004, Mob. : 07500319079

مری انا کا تماشہ ضرور خاک ہُوا
مگر خوشی ہے کہ تیرے حضور خاک ہُوا
مجھے بدن کے بکھرنے کا غم نہیں لیکن
ملال یہ ہے دلِ ناصبور خاک ہُوا
میں اپنی خاک سے روشن ہوا جو صورتِ مُشک
تمام موسمِ گُل کا شعور خاک ہُوا
بچھڑ کے تجھ سے یہ کم تو نہیں زیاں میرا
ہر ایک منظرِ نزدیک و دور خاک ہُوا
ہر ایک سطر میں روشن تو میں ہُوا لیکن
لکھا ہوا تھا جو بین السطور خاک ہُوا

علی عبّاس اُمید

تیرے بن دیوار و در سب کچھ مجھے سونے لگے
اور چھت غالب کی ہے بارِش نہ ہو چونے لگے

جتنے قد آور تھے اُن کے سر تو گھٹنوں میں گئے
اب تماشہ یہ ہے بونے آسماں چھونے لگے

بس یہی حسرت ہے پہنچے زندگی اُس موڑ پر
ہاتھ آہستہ سے شانے پر رکھا تو نے، لگے

سب کی چاہت امن ہے پھر بھی کوئی قیمت نہیں
دیکھیے وحشت کو اس کے دام پھر دونے لگے

سیدھی آنکھوں اُلٹے قدموں وقت جب چلنے لگا
آنے والے لمحے بھی اُمّید پھر سونے لگے

Dr. Ali Abbas 'Ummid',
President : All India Qalamkar
Parishad, 01, Star Residency,
Idgah Hills, Bhopal-462 001
Mob. : 09200846045

رنگ بے رنگ ہوئے دید کے معیار گرے
کھا کے ٹھوکر نہ کہیں گرمیِ بازار گرے

آبلہ پائی بتا اب تو کہاں جائے گی
دُھوپ کو ضِد ہے کہ وہ بھی تہہ دیوار گرے

سانس کے شانہ بہ شانہ جو چلی آتی تھی
ہائے کل رات اُسی یاد کے آثار گرے

پیار کے نام پہ بستی میں صدا دی لیکن
سارے دَروازوں سے کشکول میں انکار گرے

لڑکھڑایا تھا میں حالات کی ٹھوکر سے مگر
جانے کیا سوچ کے پہلے ہی مرے یار گرے

خوب ہے رُت کا بدلنا مگر ایسا تو نہ ہو
شاخ کا پھول گرے، لفظ کی دستار گرے

اجنبی اپنے ہی گھر میں نظر آتا ہوں اُمیّد
اب ضروری ہے کسی طرح یہ کردار گرے

ظفر اقبال ظفر

کہوں کیسے عذابوں سے بھرا ہے
مرا احساس خوابوں سے بھرا ہے
صدائیں سنتا ہوں لفظوں کی ہردم
مرا کمرہ کتابوں سے بھرا ہے
کہاں جاؤں میں پیاس اپنی بجھانے
علاقہ یہ سرابوں سے بھرا ہے
سوال آخر کوئی کرتا بھی کیسے
ہر اک چہرہ جوابوں سے بھرا ہے
چمن میں پھول مرجھانے لگے ہیں
نیا موسم عذابوں سے بھرا ہے
کہاں لے جاؤں اپنے آپ کو میں
ہر اک کوچہ خرابوں سے بھرا ہے
ظفرؔ کیا گلبدن گزرا ہے کوئی
یہ جنگل تو گلابوں سے بھرا ہے

Zafar Iqbal Zafar, 170,
Kheldar-Fatehpur,
U.P. - 212601 (INDIA)
Mob. : 09236692111

تیرِ دشمن کا کہاں کوئی کماں سے آیا
اور خوں ہے کہ ہمیشہ رگِ جاں سے آیا
عمر بھر خوابِ نظارا مری آنکھوں میں رہا
پھر مرے پہلو میں یہ چاند کہاں سے آیا
لے کے میں کیا کروں یہ دولت وثروت کہ مجھے
زندہ رہنے کا سلیقہ تو زیاں سے آیا
طنز کے وار زمانے نے بہت مجھ پہ کیے
پھر بھی ہر لفظ محبت کا زباں سے آیا
جان پر کھیل گیا لب نہ کیے وا اُس نے
عشق کا اُس میں سلیقہ یہ کہاں سے آیا
تم نے جب دیکھا نہیں میرؔ کا دیوان ظفرؔ
ذات کا کرب یہ پھر تم میں کہاں سے آیا

● راجیش ریڈی

بچ رہیں گے ہم ہمارے بعد کیا
وقت کو رہ جائیں گے ہم یاد کیا

جسم سے ہم کو رہا کر دے گی موت
پر کرے گی زندگی آزاد کیا

میں تو کچھ بھولا نہیں اے زندگی
تجھ کو بھی آتا ہے کچھ کچھ یاد کیا

کتنی گہری ہو گئی ہے دوستی
دشمنی کی پڑ گئی بنیاد کیا

زندگی میں زندگی ہی جب نہیں
کاٹیے پھر عمر کی میعاد کیا

دِل ہی ٹوٹا ہے کوئی ساغر نہیں
اِک ذرا سی بات کی فریاد کیا

کہہ رہے ہو شعر تازہ اِن دنوں
پھر نیا غم کر لیا ایجاد کیا

پکڑ میں آتے آتے ہاتھ سے پھسلا تھا کچھ تو
لکیروں میں مری کچھ دیر کو اُبھرا تھا کچھ تو

جھجکتی بوند تھی آنسو کی یا ٹھٹکا ہوا خواب
مری آنکھوں میں جگنو کی طرح چمکا تھا کچھ تو

وہ کوئی گیند تھی بچّے کی یا دنیا پڑی تھی
اندھیرے میں مرے پیروں سے ٹکرایا تھا کچھ تو

نہ جانے وقت نے کھولی نہیں کیوں اپنی مُٹھی
مجھے لگتا تھا وہ میرے لیے لایا تھا کچھ تو

وہ اپنا جھوٹ تھا کوئی کہ اوروں کا کوئی سچ
زباں تک آتے آتے بار ہا اٹکا تھا کچھ تو

لبوں کی خامُشی تھی یا کہا اُس کی نظر کا
مرے دل کو کہیں گہرائی میں اکھرا تھا کچھ تو

نہ دُور جا سکا دنیا سے دُور جا کر بھی
مَیں خرچ ہو گیا خود کو بچا بچا کر بھی

لکیریں کھینچنا ہے کھیل جن کا نقشے پر
کبھی تو دیکھیں لکیریں ذرا مٹا کر بھی

جو کام موت کا تھا زندگی نے کر ڈالا
وہ کیا کرے گی بھلا اب یہاں پر آ کر بھی

فقط گھروندہ نہیں ہوں مَیں گھر کا سپنا ہوں
مٹا نہ پائیں گی موجیں مجھے مٹا کر بھی

مَیں جس کو ریت سمجھتا تھا زندگی نکلی
پھسل گئی جو مری مٹھیوں میں آ کر بھی

دھواں سا رہ گیا اٹھ کر ہمارے سینے میں
ہوئی نہ روشنی دِل کا دِیا جلا کر بھی

Rajesh Reddi, A/403, Silver Mist,
Near Amarnath Tower,
7 Bungalows. Andheri (W)
Mumbari-400061
Mob. No. 9821547423

کتنی آسانی سے دُنیا کی گرہ کھولتا ہے
مُجھ میں اِک بچّہ بُزرگوں کی طرح بولتا ہے

کیا عجب ہے کہ اُڑاتا ہے کبوتر پہلے
پھر فضاؤں میں وہ بارود کی بُو گھولتا ہے

روپ کِتنے ہی بھریں، کِتنے ہی چہرے بدلیں
آئینہ آپ کو اپنی ہی طرح تولتا ہے

سوچ لو کل کہیں آنسو نہ بہانے پڑ جائیں
خون کا کیا ہے رگوں میں وہ یوں ہی کھولتا ہے

ہاتھ اُٹھاتا ہے دُعاؤں کو فلک بھی اُس دم
جب پرندہ کوئی پرواز کو پر تولتا ہے

کون واقف نہیں سنسار کے سچ سے، لیکن
سب کا سنسار کی ہر چیز پہ من ڈولتا ہے

● احمد کمال حشمی

اک درد ہے ایسا کہ جو دیتا نہیں جینے
مرنے سے مجھے روک بھی رکھا ہے اسی نے
دنیا نے مرے پاس خوشی رہنے نہیں دی
اک غم کا اثاثہ ہے بچا وہ بھی نہ چھینے
دریا تو خوشامد پہ اُتر آیا ہے میری
منھ موڑ لیا جب سے مری تشنہ لبی نے
تو پیاس زمانے کی بجھا دے تو میں جانوں
اک روز کہا ہنس کے سمندر سے ندی نے
پھر خود ہی کمالؔ اس کو بھلا دے گا ترا دل
بچھڑا ہے تو یاد آئے گا دو چار مہینے

H/28/1, BL No. 2 Naya Bazar
Kankinara - 743126 (WB) Mob. :
09433145485

یوں جیا کرتے ہیں دنیا میں جری
زندگی سے موت رہتی ہے ڈری
ہاتھ میں تیشہ نہیں فرہاد کے
قیس اب کرتا نہیں جامہ دری
اب کے ایسے شخص پر اُتری کتاب
جس کو آتی ہی نہیں پیغمبری
سب سے کٹ کر وہ اکیلا رہ گیا
ہائے ہائے زعمِ برتری
سلسلہ در سلسلہ در سلسلہ
داستانِ غم ہے یا انت اکشری
اس کے غم کے کارسیوک اے کمالؔ
توڑتے ہیں دل کی مسجد بابری

طارق قمر

ہر اک زباں پہ اُگے ہیں ببول میرے خدا
کہاں کھلیں گے محبت کے پھول میرے خدا

چھپا ہے کون سے پردے میں آفتابِ اُمید
بہت ہُوا شبِ ظلمت کو طول میرے خدا

یہ تارتار قبائیں یہ زخم زخم بدن
لہولہو ہیں کرم کے اصول میرے خدا

وہی ہوا کہ زمانے نے کہہ دیا بزدل
شرافتیں بھی ہوئیں سب فضول میرے خدا

تلاش خامیاں کرتا ہے فیصلوں میں ترے
بہت عجیب ہے انساں کی بھول میرے خدا

Dr. Tariq Qamar, Sr. Editor
ETV Urdu, 12A/I Mall Avenue
Lucknow-UP,
Mob. : 09335915058

وہ میرے خواب کی تعبیر تو بتائے مجھے
میں دھوپ میں ہوں مگر ڈھونڈتے ہیں سائے مجھے

میں روشنی کی کسی سلطنت کا شہزادہ
مگر چراغ ملے ہیں بجھے بجھائے مجھے

تو موتیوں میں نہ تلنے کا رنج ختم ہوا
کسی کی آنکھ کے آنسو خرید لائے مجھے

لرزتے کانپتے ہاتھوں کو پھر نہ ہو زحمت
خدا کرے کہ یہی زہر راس آئے مجھے

میں چاہتا ہوں کبھی یوں بھی ہو کہ میری طرح
وہ مجھ کو ڈھونڈنے نکلے مگر نہ پائے مجھے

• عزم شاکری

کسی چراغ کی آنکھوں میں ڈر نہیں آئے
وہ رات ہی نہ ہو جس کی سحر نہیں آئے

میں کائنات کا وہ کمتر و حقیر چراغ
کہ جس کی لَو بھی کسی کو نظر نہیں آئے

یہی ہے عشق میں جاناں خراشِ دل کا علاج
اسی کی راہ تکو جو نظر نہیں آئے

محبتوں کے امیں تھے صداقتوں کے سفیر
وہ لوگ ایسے گئے لوٹ کر نہیں آئے

دیارِ نوحہ گراں سے گزر ہوا لیکن
کسی بھی آنکھ میں آنسو نظر نہیں آئے

ہزار شمعیں جلیں اور جل کے بجھ بھی گئیں
ہمارے چاہنے والے مگر نہیں آئے

Azm Shakri, Patiali Road, Ganj
Dundowara, Etah- 207242
(U.P.)Mob. : 09412674814

دریدہ پیرہنوں میں شمار ہم بھی ہیں
بہت دنوں سے اَنا کے شکار ہم بھی ہیں

فقط تمھیں کو نہیں عشق میں یہ دربہ دری
تمھاری چاہ میں گرد و غبار ہم بھی ہیں

کسی کی یاد سے مہکے ہوئے ہیں بام و در
یہ لگ رہا ہے کہ باغ و بہار ہم بھی ہیں

چڑھی جو دھوپ تو ہوش وحواس کھو بیٹھے
جو کہہ رہے تھے شجر سایہ دار ہم بھی ہیں

بلندیوں کے نشاں تک نہ چھو سکے وہ لوگ
جنھیں گماں تھا ہَوا پر سوار ہم بھی ہیں

شہرِ اعتراف

سعادت حسن منٹو صدی کے نام

[آمد: ۱۱رمئی ۱۹۱۲ء   رفت: ۱۸رجنوری ۱۹۵۵ء]

یزید

● سعادت حسن منٹو

سن سینتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح موسم میں خلافِ معمول چند دن خراب آئیں اور چلے جائیں۔ یہ نہیں کہ کریم داد، مولا کی مرضی سمجھ کر، خاموش بیٹھا رہا تھا۔ اس نے اس طوفان کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ مخالف قوتوں کے ساتھ وہ کئی بار بھڑا تھا۔ شکست دینے کے لیے نہیں بلکہ مقابلہ کرنے کے لیے۔ اس کو معلوم تھا کہ دشمنوں کی طاقت بہت زیادہ ہے مگر ہتھیار ڈال دینا وہ اپنی ہی نہیں ہر مرد کی توہین سمجھتا تھا۔ سچ پوچھیے تو اس کے متعلق یہ صرف دوسروں کا خیال تھا، ان کا جنہوں نے اسے وحشی نما انسانوں سے بڑی جانبازی سے لڑتے دیکھا تھا، ورنہ اگر کریم داد سے اس بارے میں پوچھا جاتا کہ مخالف قوتوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈالنا کیا وہ اپنی یا ہر مرد کی توہین سمجھتا ہے تو وہ یقیناً سوچ میں پڑ جاتا۔ جیسے آپ نے اس سے حساب کا کوئی بہت ہی مشکل سوال پوچھ لیا ہو۔ کریم داد جمع تفریق اور ضرب تقسیم سے بالکل بے نیاز تھا۔

سن سینتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ لوگوں نے بیٹھ کر حساب لگانا شروع کیا کہ کتنا جانی نقصان ہوا، کتنا مالی۔ مگر کریم داد اس سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا باپ رحیم داد اس جنگ میں کام آیا ہے۔ اس کی لاش کریم داد نے اپنے کندھوں پر اٹھائی اور ایک کنویں کے پاس گڈھا کھود کر دفنا دی تھی۔

گاؤں میں اور بھی بہت سی وارداتیں ہوئی تھیں۔ سیکڑوں جوان اور بوڑھے قتل ہوئے تھے، کئی لڑکیاں غائب ہو گئی تھیں، کچھ بہت ہی ظالمانہ طریقے پر بے آبرو ہوئی تھیں۔ جن کو بھی یہ زخم لگے تھے، وہ روتا تھا اپنے پھوٹے نصیبوں پر، اور دشمنوں کی بے رحمی پر مگر کریم داد کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا تھا۔ اپنے باپ رحیم داد کی شہ زوری پر اسے ناز تھا۔ جب رحم داد پچیس تیس برچھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح بلوائیوں کا مقابلہ کرتے کرتے نڈھال ہو کر گر پڑا تھا، اور کریم داد کو اس کی موت کی خبر ملی تھی تو کریم داد نے اس کی روح کو مخاطب کر کے صرف اتنا کہا تھا۔

"یار، یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک آدھ ہتھیار اپنے پاس ضرور رکھا کرو"

اور اس نے رحیم داد کی لاش کو اٹھا کر کنویں کے پاس گڑھا کھود کر دفنا دی تھی اور قبر کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ کے طور پر یہ چند الفاظ کہے تھے۔ ''گناہ ثواب کا حساب خدا جانتا ہے... اچھا تجھے بہشت نصیب ہو۔''

رحیم داد جو نہ صرف اس کا باپ تھا بلکہ ایک بہت بڑا دوست بھی تھا۔ بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ لوگ جب اس کی افسوس ناک موت کا ذکر کرتے تھے تو قاتلوں کو بڑی گالیاں دیتے تھے مگر کریم داد خاموش رہتا تھا اس کی کئی کھڑی فصلیں تباہ ہو گئی تھیں، دو مکان جل کر راکھ ہو گئے تھے لیکن اس نے اپنے ان نقصانوں کا کبھی حساب نہیں لگایا تھا۔ وہ کبھی کبھی صرف اتنا کہا کرتا تھا۔ ''جو کچھ ہوا ہے ہماری اپنی غلطی سے ہوا ہے۔''

اور جب کوئی اس سے اس غلطی کے متعلق استفسار کرتا تو وہ خاموش رہتا۔

گاؤں کے لوگ ابھی سوگ میں مصروف تھے کہ کریم داد نے شادی کر لی، اسی مٹیار جیناں کے ساتھ، جس پر ایک عرصے سے اس کی نگاہ تھی۔

جیناں سوگوار تھی۔ اس کا شہتیر جیسا کڑیل جوان بھائی بلوں میں مارا گیا تھا۔ ماں باپ کی موت کے بعد ایک صرف وہی اس کا سہارا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جیناں کو کریم داد سے بے پناہ محبت تھی، مگر بھائی کی موت کے غم نے یہ محبت اس کے دل میں سیاہ پوش کر دی تھی، اب ہر وقت اس کی سدا مسکراتی آنکھیں نمناک رہتی تھیں۔

کریم داد کو رونے دھونے سے بہت چڑ تھی۔ وہ جیناں کو جب بھی سوگ زدہ حالت میں دیکھتا تو دل ہی دل میں بہت کڑھتا، مگر وہ اس سے اس بارے میں کچھ کہتا نہیں تھا۔ یہ سوچ کر کہ عورت ذات ہے، ممکن ہے اس کے دل کو اور بھی دکھ پہنچے۔

ایک روز اس سے رہا نہ گیا۔ کھیت میں اس نے جیناں کو پکڑ لیا اور کہا۔ ''مردوں کو کفنائے دفنائے پورا ایک سال ہو گیا ہے... اب تو وہ بھی اس سوگ سے گھبرا گئے ہوں گے... میری جان ہمیں ابھی زندگی میں جانے اور کتنی موتیں دیکھنی ہیں... کچھ آنسو تو اپنی آنکھوں میں جمع رہنے دے۔''

جیناں کو اس کی یہ باتیں بہت ناگوار محسوس ہوئی تھیں، مگر وہ اس سے محبت کرتی تھی اس لیے اکیلے میں کئی گھنٹے سوچ سوچ کر اس نے کریم داد کی ان باتوں میں معنی پیدا کر لیے اور آخر خود کو یہ سمجھانے پر آمادہ کر لیا کہ کریم داد جو کچھ کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے۔

شادی کا سوال آیا تو بڑے بوڑھوں نے مخالفت کی، مگر وہ مخالفت بہت ہی کمزور تھی، وہ لوگ سوگ منا منا کر اتنے نحیف ہو گئے تھے کہ ایسے معاملوں میں سو فیصدی کامیاب ہونے والی مخالفتوں پر بھی زیادہ دیر تک نہیں جمے رہ سکتے تھے۔

چنانچہ کریم داد کا بیاہ ہو گیا۔ باجے گاجے آئے۔ ہر رسم ادا ہوئی اور کریم داد اپنی محبوبہ جیناں کو دلہن بنا کر گھر لے آیا۔

فسادات کے بعد قریب قریب ایک برس سے سارا گاؤں قبرستان سا بنا ہوا تھا۔ جب کریم داد کی

بارات چلی اور خوب دھوم دھڑاکا ہوا تو گاؤں میں کئی آدمی سہم سہم گئے۔ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ کریم داد کی نہیں، کسی بھوت پریت کی برات ہے۔

کریم داد کے دوستوں نے جب اس کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسا۔ ہنستے ہنستے ہی ایک روز اس نے اس بات کا ذکر اپنی نئی نویلی دلہن سے کیا تو وہ ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔

کریم داد نے جیناں کی سوہے چوڑے والی کلائی اپنے ہاتھ میں لی اور کہا۔ ''یہ بھوت تو اب ساری عمر تمہارے ساتھ چمٹا رہے گا۔ رحمن سائیں کا جھاڑ پھونک بھی اسے اتار نہیں سکے گی۔''

جیناں نے اپنی منہدی میں رچی انگلی دانتوں تلے دبا کر اور ذرا شرما کر صرف اتنا کہا۔ ''کیسے تجھے تو کسی بات سے ڈر نہیں لگتا۔''

کریم داد نے اپنی ہلکی ہلکی سیاہی مائل بھوری مونچھوں پر زبان کی نوک پھیری اور مسکرا دیا۔ ''ڈر بھی کوئی لگنے کی چیز ہے۔''

جیناں کا غم اب بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔

کریم داد اس کی جوانی کا نکھار دیکھتا تو بہت خوش ہوتا اور جیناں سے کہتا۔ ''خدا کی قسم جیناں تو پہلے کبھی اتنی خوبصورت نہیں تھی۔ اگر تو اتنی خوبصورت اپنے ہونے والے بچے کے لیے تو میری اس سے لڑائی ہو جائے گی۔''

یہ سن کر جیناں شرما کر اپنا ٹھلیا سا پیٹ چادر سے چھپا لیتی۔ کریم داد ہنستا اور اسے چھیڑتا۔ ''چھپاتی کیوں ہو اس چور کو..... میں کیا جانتا نہیں یہ بناؤ سنگار صرف تم نے اسی سور کے کے بچے کے لیے کیا ہے۔''

جیناں ایک دم سنجیدہ ہو جاتی۔ ''کیوں گالی دیتے ہو اپنے بچے کو؟''

کریم داد کی سیاہی مائل بھوری مونچھیں ہنسی سے تھرتھرانے لگتیں۔ ''کریم داد بہت بڑا سور ہے۔''

چھوٹی عید آئی، پھر بڑی عید آئی۔ کریم داد نے دونوں تہوار بڑے ٹھاٹ سے منائے۔

بڑی عید سے بارہ روز پہلے، دو روز ہوئے، اس کے گاؤں پر بلوائیوں نے حملہ کیا تھا اور اس کا باپ رحیم داد اور جیناں کا بھائی فضل الٰہی قتل ہو گئے تھے۔ جیناں ان دونوں کی موت کو یاد کر کے سال بھر روتی رہی تھی مگر پھر کریم داد کی صدمہ کو یاد نہ رکھنے والی طبیعت کی موجودگی میں اتنا غم نہ کر سکی تھی، جتنا اسے اپنی طبیعت کے مطابق کرنا چاہئے تھا۔

جیناں جب کبھی سوچتی تھی تو اس کو بڑا تعجب ہوتا تھا کہ وہ اتنی جلدی کہ اپنی زندگی کا اتنا بڑا صدمہ کیسے بھول سی گئی ہے۔ ماں باپ کی موت اسے قطعاً یاد نہیں تھی۔ اس کا بھائی فضل الٰہی اس سے چھ سال بڑا تھا اور وہی اس کا باپ تھا وہی اس کی ماں، اور وہی اس کا بھائی۔ جیناں اچھی طرح جانتی تھی کہ صرف اسی کی خاطر اس کے بھائی نے شادی نہیں کی تھی، اور یہ تو سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ جیناں کی عصمت بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دی تھی۔

بھائی کی موت جیناں کی زندگی کا یقیناً بہت ہی بڑا حادثہ تھا۔ ایک قیامت تھی جو بڑی عید سے ٹھیک

بارہ روز پہلے اس پر یکایک ٹوٹ پڑی تھی۔ اب وہ اس قیامت کے بارے میں سوچتی تو اس کو بڑی حیرت ہوتی کہ وہ اپنے دکھ سے کتنی دور سی ہوگئی ہے۔

محرم قریب آیا تو جیناں نے کریم داد سے اپنی پہلی فرمائش کا اظہار کیا، اسے گھوڑا اور تعزیہ دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اپنی سہلیوں سے وہ ان کے متعلق بہت سی باتیں سن چکی تھی۔

اس نے کریم داد سے کہا۔ ''میں ٹھیک ہوئی تو لے چلو گے مجھے گھوڑا دکھانے؟''

کریم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''تم ٹھیک نہ ہوئی تب بھی لے چلوں گا..اس سور کے بچے کو بھی۔''

جیناں کو یہ گالی بہت ہی بری لگتی تھی۔ وہ اکثر بگڑ جاتی، مگر کریم داد کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا پر خلوص ہوتا کہ جیناں کی تلخی فوراً ہی ایک ناقابلِ بیان مٹھاس میں تبدیل ہو جاتی، اور وہ سوچتی کہ 'سور کے بچے' میں کتنا پیار کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کی افواہیں ایک عرصے سے اڑ رہی تھیں اصل میں تو پاکستان بنتے ہی یہ بات گویا ایک طور پر طے ہوگئی کہ جنگ ہوگی اور ضرور ہوگی۔ کب ہوگی اس کے متعلق گاؤں میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کریم داد سے جب کوئی اس کے متعلق سوال کرتا تو وہ یہ مختصر سا جواب دیتا۔ ''جب ہوگی، ہو جائے گی...فضول سوچنے سے کیا فائدہ؟''

جیناں جب ہونے والی اس لڑائی بھڑائی کے متعلق سنتی تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے۔ وہ طبعاً بہت ہی امن پسند تھی۔ وہ معمولی سی تو تو میں میں سے بھی گھبراتی تھی۔ اس کے علاوہ گزشتہ بلوں اس نے کئی کشتوں خون دیکھے تھے، اور ان ہی میں اس کا پیارا بھائی فضل الٰہی کام آیا تھا۔ بے حد سہم کر وہ کریم داد سے صرف اتنا کہتی۔ ''کیسے کیا ہوگا؟''

کریم داد مسکرا دیتا۔ ''مجھے کیا معلوم؟ لڑکا ہوگا یا لڑکی!''

یہ سن کر جیناں بہت زچ بچ ہوتی مگر فوراً ہی کریم داد کی دوسری باتوں میں لگ کر ہونے والی جنگ کے متعلق سب کچھ بھول جاتی۔

کریم داد بندوق خریدنے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں نشانے کا بہت ہی پکا ہو گیا تھا، اور یہ بات جیناں کو حوصلہ دلاتی تھی مگر اس کے باوجود تر جنوں میں جب وہ اپنی کسی خوفزدہ ہجولی سے جنگ کے بارے میں گاؤں کے آدمیوں کی اڑائی ہوئی ہولناک افواہیں سنتی تو ایک دم سن سی ہو جاتی۔

بختو دائی تو ہر روز جیناں کو دیکھنے آتی تھی، ایک دن وہ یہ خبر لائی کہ ہندوستان والے دریا بند کرنے والے ہیں۔ وہ اس کا مطلب نہ سمجھی۔ وضاحت کے لیے اس نے بختو دائی سے پوچھا۔ ''دریا بند کرنے والے ہیں...کون سے دریا بند کرنے والے ہیں؟''

بختو دائی نے جواب دیا۔ ''وہی دریا جن سے ہمارے کھیتوں کو پانی ملتا ہے۔''

جیناں نے کچھ دیر تک سوچا پھر ہنس کر کہا۔ ''موسی! تم بھی کیا پاگلوں سی باتیں کرتی ہو۔ دریا کون بند کر سکتا ہے، وہ بھی کوئی موریاں ہیں۔''

بختو نے جیناں کے پیٹ پر ہولے ہولے مالش کرتے ہوئے کہا۔ ''بی بی مجھے معلوم نہیں..... جو کچھ میں نے سنا۔ تمہیں بتا دیا۔ گاؤں والے کہتے ہیں کہ یہ بات تو اخباروں میں بھی آ گئی ہے۔''

''کون سی بات؟'' جیناں کو یقین نہیں آیا۔

بختو نے اپنے جھرّیوں والے ہاتھ سے جیناں کا پیٹ ہلکے سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''یہی دریا بند کرنے والی۔'' پھر اس نے جیناں کے پیٹ پر قمیض کھینچی اور اٹھ کر بڑے ماہرانہ انداز سے کہا۔ ''اللہ خیر رکھے تو بچہ آج سے پورے دس روز کے بعد ہو جانا چاہیئے۔''

کریم داد گھر آیا تو سب سے پہلے جیناں نے اس سے دریا کے متعلق پوچھا۔ کریم داد نے پہلے تو بات ٹالنی چاہی، پر جب جیناں نے کئی بار اپنا سوال دہرایا تو کریم داد نے کہا۔ ''ہاں! کچھ ایسا ہی سنا ہے۔''

جیناں نے پوچھا۔ ''کیا؟''

''یہی کہ ہندوستان والے ہمارے دریا بند کر دیں گے۔''

''کیوں؟''

کریم داد نے جواب دیا۔ ''کہ ہماری فصلیں تباہ ہو جائیں۔''

یہ سن کر جیناں کو یقین ہو گیا کہ دریا بند کیے جا سکتے ہیں۔ نہایت بے چارگی کے عالم میں اس نے صرف اتنا کہا۔ ''کتنے ظالم ہیں یہ لوگ.....''

کریم داد اس دفعہ کچھ دیر کے بعد مسکرایا۔ ''ہٹاؤ ان باتوں کو..... یہ بتاؤ موسی بختو آئی تھی؟''

جیناں نے بے دلی سے جواب دیا۔ ''آئی تھی۔''

''کیا کہتی تھی؟''

''کہتی تھی، آج سے پورے دس روز کے بعد بچہ ہو جائے گا۔''

کریم داد نے زور سے نعرہ لگایا۔ ''زندہ باد!''

جیناں نے اسے پسند نہ کیا اور بڑبڑائی۔ ''تمہیں خوشی سوجھتی ہے..... جانے یہاں کیسی کربلا آنے والی ہے۔''

کریم داد بنا کچھ کہے چوپال چلا گیا۔

چوپال میں قریب قریب گاؤں کے سب مرد جمع تھے۔

سب چودھری نتھو کو گھیرے، اس سے دریا بند کرنے والی خبر کے متعلق باتیں پوچھ رہے تھے۔ کوئی پنڈت نہرو کو گالیاں دے رہا تھا، کوئی بددعائیں مانگ رہا تھا۔ کوئی یہ ماننے سے ہی یکسر منکر تھا کہ دریاؤں کا رخ

بدلا جا سکتا ہے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ جو کچھ ہونے والا ہے، وہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے اور اسے ٹالنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ مل کر مسجد میں دعا مانگی جائے۔

کریم داد ایک کونے میں خاموش بیٹھا سب باتیں سنتا رہا۔

ہندوستان والوں کو گالیاں دینے میں چودھری نتھو سب سے پیش پیش تھا۔ ''دریا بند کرنا بہت ہی اوچھا ہتھیار ہے.... انتہائی کمینہ پن ہے.... ذلالت ہے.... عظیم ترین ظلم ہے۔ بدترین گناہ ہے.... یزید پنا ہے....''

کریم داد کچھ اس طرح بار بار اپنی نشست بدل رہا تھا جیسے اسے بہت کوفت ہو رہی ہو۔ وہ دو تین بار اس طرح کھانسا جیسے کچھ کہنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہو۔ چودھری نتھو کے منہ سے جب ایک اور لہر موٹی موٹی گالیوں کی اٹھی تو کریم داد چیخ پڑا۔ ''گالی نہ دے چودھری، کسی کو۔''

ماں کی ایک بہت بڑی گالی چودھری کے منہ میں پھنسی کی پھنسی رہ گئی۔ اس نے پلٹ کر ایک عجیب انداز سے کریم داد کی طرف دیکھا جو سر پر اپنا صافہ ٹھیک کر رہا تھا۔ ''کیا کہا؟''

کریم داد نے آہستہ سے، مگر مضبوط آواز میں کہا۔ ''میں نے کہا گالی نہ دے کسی کو۔''

حلق میں پھنسی ہوئی ماں کی گالی بڑے زور سے باہر نکال کر چودھری نتھو نے بڑے تیکھے لہجے میں کریم داد سے کہا۔ ''کسی کو...... کیا لگتے ہیں وہ تمھارے؟'' پھر وہ چوپال میں جمع شدہ آدمیوں سے مخاطب ہوا۔ ''سنا تم لوگوں نے.... کہتا ہے گالی نہ دو کسی کو.... پوچھو اس سے.... کیا لگتے ہیں وہ اس کے؟''

کریم داد نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''میرے کیا لگتے ہیں.... میرے دشمن لگتے ہیں''

چودھری کے حلق سے پھٹا پھٹا سا قہقہہ بلند ہوا، اس قدر زور سے کہ اس کی مونچھوں کے بال بکھر گئے۔ ''سنا تم لوگوں نے...! دشمن لگتے ہیں... اور دشمن کو پیار کرنا چاہیئے... کیوں برخوردار؟''

کریم داد نے برخوردارانہ انداز میں جواب دیا۔ ''نہیں چودھری میں یہ نہیں کہتا کہ پیار کرنا چاہیئے ...میں نے صرف یہ کہا ہے کہ گالی نہیں دینی چاہیئے''

کریم داد کے ساتھ ہی اس کا لنگوٹیا دوست میراں بخش بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

کریم داد صرف میراں بخش سے مخاطب ہوا۔ ''کیا فائدہ ہے یار! وہ پانی بند کر کے تمھاری زمین بنجر کرانا چاہتے ہیں اور تم انھیں گالی دے کر سمجھتے ہو کہ حساب بے باق ہو گیا..... یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔ گالی تو اس وقت دی جاتی ہے جب اور کوئی جواب پاس نہ ہو۔''

میراں بخش نے پوچھا۔ ''تمھارے پاس کوئی جواب ہے؟''

کریم داد نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ ''سوال میرا نہیں، ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا ہے.. اکیلا میرا جواب سب کا جواب نہیں ہو سکتا..... ایسے معاملوں میں سوچ سمجھ کر ہی کوئی پختہ جواب تیار کیا جا سکتا ہے... وہ ایک دن میں دریاؤں کا رخ نہیں بدل سکتے، کئی سال لگیں گے انھیں ....لیکن یہاں تو تم لوگ گالیاں دے کر ایک

منٹ میں اپنی بھڑاس نکال باہر کررہے ہو۔'' پھر اس نے میراں بخش کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔ ''میں تو جانتا ہوں یار ہندوستان کو کمینہ، رذیل اور ظالم کہنا بھی غلط ہے۔''

میراں بخش کی جگہ چودھری نتھو چلایا۔ ''لو اور سنو......''

کریم داد پھر میراں بخش سے مخاطب ہوا۔ ''دشمن سے، میرے بھائی، رحم و کرم کی توقع رکھنا بے وقوفی ہے۔ لڑائی شروع ہو اور یہ رونا رویا جائے کہ دشمن بڑے بور کی رائفلیں استعمال کررہا ہے... ہم چھوٹے بم گراتے ہیں، وہ بڑے بم گراتا ہے.... تم اپنے ایمان سے کہو، یہ شکایت بھی کوئی شکایت ہے... چھوٹا چاقو بھی مارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور بڑا چاقو بھی.. کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟''

میراں بخش کی بجائے چودھری نتھو نے سوچنا شروع کیا، مگر فوراً ہی جھنجھلا گیا۔ ''لیکن یہ سوال یہ ہے کہ وہ پانی کیوں بند کررہے ہیں....؟ وہ ہمیں بھوکا اور پیاسا مارنا چاہتے ہیں۔''

کریم داد نے میراں بخش کے کندھے سے اپنا ہاتھ علاحدہ کیا اور چودھری نتھو سے مخاطب ہوا۔ ''چودھری، جب کسی کو دشمن کہہ دیا تو پھر یہ گلا کیسے کہ وہ ہمیں بھوکا پیاسا مارنا چاہتا ہے..وہ تمھیں بھوکا پیاسا نہیں مارے گا، تمھاری ہری بھری زمین ویران اور بنجر نہیں بنائے گا تو کیا وہ تمھارے لیے پلاؤ کی دیگیں اور شربت کے مٹکے وہاں سے بھیجے گا۔ تمھاری تفریح کے لیے باغ بغیچے لگائے گا؟''

چودھری نتھو بھنا گیا۔ ''یہ تو کیا بکواس کررہا ہے؟''

میراں بخش نے بھی ہولے سے کریم داد سے پوچھا۔ ''ہاں یار، یہ کیا بکواس ہے؟''

''بکواس نہیں ہے میراں بخش۔'' کریم داد نے سمجھانے کے انداز میں میراں بخش سے کہا۔ ''تو ذرا سوچ تو سہی کہ لڑائی میں دونوں فریق ایکدوسرے کو پچھاڑنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے.... پہلوان جب لنگر اور لنگوٹیں کس کے اکھاڑے میں اتر آتے ہیں تو انھیں ہر داؤ استعمال کرنے کا حق ہوتا ہے۔''

میراں بخش نے اپنا گھٹا ہوا سر ہلایا۔ ''یہ تو ٹھیک ہے۔''

کریم داد مسکرایا۔ ''تو پھر دریا بند کرنا بھی ٹھیک ہے... ہمارے لیے یہ ظلم ہے، مگر ان کے لیے روا ہے۔''

''روا کیا ہے... جب تیری جیبھ پیاس کے مارے لٹک کر زمین تک آجائے گی تو پھر میں پوچھوں گا کہ ظلم روا ہے یا ناروا.... جب تیرے بال بچے اناج کے ایک ایک دانے کو ترسیں گے تو پھر بھی یہی کہنا کہ دریا بند کرنا بالکل ٹھیک تھا۔''

کریم داد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔ ''میں جب بھی یہی کہوں گا چودھری... تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ صرف وہ ہمارا دشمن نہیں، ہم بھی اس کے دشمن ہیں.... اگر ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم نے بھی اس کا دانہ پانی بند کردیا ہوتا... اب جبکہ وہ ایسا کرسکتا ہے، اور کرنے والا ہے تو ہم ضرور اس کا کوئی توڑ سوچیں گے... بے کار گالیاں دینے سے کیا ہوتا ہے۔ دشمن تمھارے لیے دودھ کی نہریں جاری نہیں کرے گا چودھری نتھو

.....اس سے اگر ہو سکا تو وہ تمھارے پانی کی ہر بوند میں زہر ملا دے گا..... تم اسے ظلم کہو گے، وحشیانہ پن کہو گے، اس لیے کہ مارنے کا یہ طریقہ تمھیں پسند نہیں..... عجیب سی بات ہے کہ لڑائی شروع کرنے سے پہلے دشمن سے نکاح کی سی شرطیں بندھائی جائیں... اس سے کہا جائے کہ دیکھو، مجھے بھو کا پیاسا نہ مارنا... بندوق سے اور وہ اتنے بور کی بندوق سے، البتہ تم مجھے شوق سے ہلاک کر سکتے ہو... اصل بکواس تو یہ ہے کہ..... ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔"

چودھری نتھو جھنجھلاہٹ کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ "برف لا کے رکھ میرے دل پر۔"

"یہ بھی میں ہی لاؤں؟" یہ کہہ کر کریم داد ہنسا۔ وہ میراں بخش کے کندھے پر تھپکی دے کر اٹھا اور چوپال سے چلا گیا۔

کریم داد گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ اندر بختو دائی باہر نکلی۔

کریم داد کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پوپلی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "مبارک ہو کیمے.. چاند سا بیٹا ہوا ہے..... اب کوئی اچھا سا نام سوچ اس کا۔"

"نام...؟" کریم داد نے ایک لحظے کے لیے سوچا۔ "یزید... یزید"

بختو دائی کا منہ کھلا کہ کھلا رہ گیا۔

کریم داد نعرے لگاتا اندر گھر میں داخل ہوا۔

جیناں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ کسی قدر زرد.. اس کے پہلو میں ایک گول گوتھنا سا چپڑ چپڑ بچہ اپنا انگوٹھا چوس رہا تھا۔

کریم داد نے اس کی طرف پیار بھری فخریہ نظروں سے دیکھا اور اس کے ایک گال کو انگلی سے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "اوئے میرے یزید۔"

جیناں کے منہ سے ہلکی سی متعجب چیخ نکلی۔ "یزید؟"

کریم داد نے غور سے اپنے بیٹے کا ناک نقشہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں یزید... یہ اس کا نام ہے۔"

جیناں کی آواز بہت نحیف ہو گئی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو کیمے... یزید...؟"

کریم داد مسکرایا۔ "کیا ہے اس میں... نام ہی تو ہے۔"

جیناں صرف اس قدر کہہ سکی۔ "مگر کس کا نام؟"

کریم داد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ضروری نہیں کہ یہ بھی وہی یزید ہو..... اس نے دریا کا پانی بند کیا تھا یہ کھولے گا۔"

.......☆.......

منٹو کی کہانی

● رتن سنگھ

منٹو مرنے کے بعد "رب" کے دربار میں حاضر ہوا

"منٹو ! میں نے سُنا ہے تم نے جنت میں جانے سے انکار کر دیا ہے۔ کیا وجہ ہے؟"

"جی ہاں وہ لوگ مجھے جینے نہیں دیں گے جنھوں نے ملک کی تقسیم کے وقت ثواب کمانے کے لیے دوسرے دھرم کے لوگوں کا قتل کیا، لوٹا اور زِنا بالجبر کیے۔"

"تمھارے ساتھ ان کی کیا دشمنی ہے؟"

"جی میں نے اُن کے خلاف کہانیاں جو لکھی ہیں۔"

پھر تمھیں سورگ میں بھیج دیتے ہیں۔"

"جی نہ، یہ کام نہ کرنا۔ آوا تو دونوں طرف آوت گیا تھا۔" بیاس اس حد تک لال ہو گیا تھا کہ ویاس رشی کی روح تڑپ اُٹھی تھی۔

رہی ستلج کی بات تو اُس کے پاٹ میں بہتے لہُو کو دیکھ کر فیروز پور کے نزدیک حُسینی والا میں شہید اعظم بھگت سنگھ اور سُکھ دیو اور راج گورو کے بُتوں کی نظریں شرم سے جُھک گئی تھیں۔

"تب تو اسے دوزخ میں بھیج دو"۔ رب کے دربار میں دور کہیں بیٹھے اُپیندر ناتھ اشک نے صلاح دی۔

"نہ مولا، نہ۔ اشک کی بات نہ سُننا۔ ویسے بھی یہ مجھے اپنا دشمن ہی کہتا آیا ہے۔ دوزخ میں میں نے اس لیے نہیں جانا کیونکہ آپ کی پیدا کی ہوئی دنیا میں میں دوزخ سے بھی بدترین مصیبتیں جھیلتا رہا ہوں۔ یہ تو دنیا جانتی ہے کہ وہاں میں پاگل خانے تک رہ آیا ہوں۔ دوزخ اس سے زیادہ بُری کیا ہوگی؟"

''جی کیا کرنا ہے اس بندے کا؟'' ملک الموت نے کچھ بولے بغیر اشارے اشارے میں پوچھا۔
''کرتے ہیں فیصلہ جلدی کیا ہے۔''
چل منٹو۔ سناؤ۔ ایک دو کہانیاں جس کی وجہ سے مذہب کے ٹھیکیدار تم سے ناراض ہیں۔
منٹو۔ چُپ۔
''سُنا بھائی۔ کوئی کہانی'' رب نے پھر کہا۔
منٹو۔ اب کی بھی چُپ ہی رہا۔
''جی اس کے آگے شراب رکھو گے تبھی اسے کہانی سُوجھتی ہے۔ نزدیک ہی بیٹھے راجندر سنگھ بیدی یا کرشن چندر یا احمد ندیم قاسمی میں سے کسی نے کہا۔
ایسا سُنتے ہی رب کے اشارے پر حُوریں جام لے کر حاضر ہو گئیں۔
دو گھونٹ بھرتے ہی منٹو چہک اُٹھا، کہنے لگا۔ جی پوری کہانی تو سُنانی مشکل ہے۔ میں تو آپ کو اُن کا نچوڑ ہی بتا سکتا ہوں۔
سیاہ حاشیے کی ایک چھوٹی سی کہانی ہے۔'' گھاٹے کا سودا'' بیالیس روپے کی موٹی رقم خرچ کر کے ترکوں نے ایک لڑکی خریدی لیکن ہو گیا گھاٹے کا سودا۔
''لڑکی اپنے ہی مذہب کی نکلی۔''
ایسی ہی ایک اور کہانی سناتا ہوں۔ دوسرے دھرم کے بندے کو جان سے مارنے کے لیے پیٹ میں چھرا مارا۔ چھرے سے پاجامے کا ازار بند بھی کٹا تو پتہ چلا کہ مرنے والا اپنے ہی دھرم کا تھا۔
مارنے والے کے منہ سے نکلا۔ سالا مسٹیک ہو گیا۔''
یہ لوگ اپنے دھرم کو کتنا جانتے ہیں۔ اس کی بھی کہانی سُن لیجیے۔
یہ جاننے کے لیے کہ بندہ واقعی اپنے دھرم کا ہے۔ یہ پوچھا گیا۔
''تو رسول کا نام بتاؤ۔''
بندے نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''خان محمد''
رب کے دربار میں زور کا ٹھہا کا گونجا اور کسی نے کہا۔ پیروکاروں نے نام ہی بدل دیا ہے۔
میں نے سُنا ہے تمھاری کہانیوں پہ مقدمے بھی چلے ہیں۔ اُن میں سے سُناؤ۔ ایک دو۔''
''نہ رب جی نہ۔ اگر آپ نے بھی مجھ پر مقدمہ ٹھوک دیا تو میں تو کہیں کا نہیں رہوں گا۔''
تم سُناؤ۔ منٹو۔ بے جھجک۔ وزیر آغا نے ہمت بندھائی۔ یہاں ملک راج آنند بیٹھے ہیں جنھوں نے کچہری میں کہا تھا کہ یہ کہانی کلاسک ہے۔''
''جی میری کہانی ہے۔ اُوپر نیچے درمیان'' بات صرف اتنی سی ہے کہ دل کے مریض بوڑھا بوڑھی

اپنی جیسی خواہش کی تکمیل کے لیے سانسوں کا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں۔ مرنے سے بھی ڈرتے ہیں۔ اس لیے جانچ کرا کے ڈاکٹروں سے بھی اجازت لے لی ہے۔ اُن کی اس بھوک کو بیان کر رہی ہے میری کہانی ۔یوں اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو حضرت وارث شاہ جیسے عظیم شاعر کے ہاں بھی ایسے لوگوں کا ذکر آیا ہے۔

وارث شاہ نہ رہیں چین سے یہ   جن نروں کو شوق ہیں ناریوں کے

جنسی خواہش کے بھوکے یہ لوگ اس عظیم شاعر کی نصیحت پر بھی دھیان نہیں دیتے:

وارث شاہ یہ حرص بے فائدہ ہے   آخر جہان سے ہے لے جاونا کیا؟

اب رہی بات کہانی 'بو' اور 'کالی شلوار' کی۔ ان کہانیوں کو عقل کے اندھوں نے جنسی کہانیاں کہہ دیا ہے۔ اگر آپ مجھے انگریزی شاعر گرے کے لب و لہجے میں کہنے کی اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ بو کی گھاٹن اور کالی شلوار کی سلطانہ مختار اور خدا بخش کو زندگی نے اگر موقعہ دیا ہوتا تو وہ بھی سماج کے عزت دار رکن بن سکتے تھے۔ اصل میں یہ لوگ مالی بدحالی کا شکار ہیں۔ سُلطانہ مختار اور گھاٹن کی پکار۔ میری کہانیوں میں ''دودھ پیتے پیاسے بچے کے رونے جیسی پکار ہے۔ ہمارا سماج اُن کو بلکتا تو دیکھتا ہے لیکن ان کو زندگی دینے والا دودھ نہیں پلاتا، اور نتیجے کے طور پر یہ اپنا جسم ''تہذیب یافتہ درندوں'' کو پیش کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ منٹو کے قہقہے سے ''تہذیب یافتہ درندوں'' کے الفاظ سنتے ہی رب کے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ دیوتاؤں کے پسینے چھوٹ گئے ماحول گیلا گیلا ہو گیا۔

اس سناٹے کو رب نے توڑا...

میں نے سُنا ہے کہ پاکستان ۔ ہندوستان کی تقسیم پر تم نے بڑھیا کہانی لکھی ہے۔ وہ سناؤ۔ تبھی بشن سنگھ بول پڑا۔

''گڑ گڑ دی۔ آف دی بے دھیانہ دی۔ وال آف دی لالٹین ۔ آف پاکستان ۔ آف ٹوبہ ٹیک سنگھ ۔ پاکستان ۔ ہندوستان ۔ آف دی دُر پھٹے مُنہ۔''

''لو جی یہ کہانی تو ہر کے بردار نے خود ہی آپ کو سُنا دی۔ یہ پاکستان ہندوستان کو نہیں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ہونے کو مانتا ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ اس کا جنم استھان ہے۔ اس نے دُر پھٹے منہ میں سب کچھ کہہ دیا۔ منکر ہے بہ واگھے کی لکیر سے۔

رب گڑ گڑ دی۔ آف دی کی گردان کرتے بشن سنگھ کی طرف بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا تبھی اُس نے منٹو کی طرف مُنہ گھمایا اور کہا۔ ''منٹو صاحب دل کرتا ہے یہ کہانی پوری کی پوری کی پوری سُنی جائے''

''میں ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟'' منٹو نے کہا۔

''پوچھو''۔ رب نے اجازت دی۔

''میں جب سے آپ کے دربار میں آیا یوں آپ کو یہی کہتے سُنا۔ ''میں نے سُنا۔ میں نے سُنا۔ اس

وقت بھی آپ نے کہانی سُنانے کے لیے کہا۔ میں پُوچھتا ہوں۔ آپ پڑھتے نہیں کچھ؟

رب نے نہ میں سر ہلا دیا۔

اس کا مطلب ہے آپ بھی ہمارے ملکوں کے لوگوں جیسے ہی ہو۔ وہ بھی کتابیں نہیں پڑھتے، کھاتے پیتے پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں پڑھتے۔

اگر آپ پڑھتے ہوتے یا مجھے کوئی شاہ محمد مل جاتا تو وہ کہتا:

''آج ہوتی سرکار تو قدر کرتی　　　　　کبھی منٹو نے لکھی کہانیاں تھیں۔''

آپ کو کیا بتاؤں بادشاہو۔ ادیبوں شاعروں کو کچھ نہیں ملتا ان ملکوں میں بجھے بجھے لہجے میں منٹو کی یہ بات سن کر سنتوکھ سنگھ دھیر اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا۔۔:

''جی منٹو صاحب کی بات سولہ آنے ٹھیک ہے۔ ہندوستان میں لیکھکوں کو کچھ نہیں ملتا وہ حاشیے میں پڑے ہوئے ہیں۔ سات آٹھ دہائیاں پہلے ٹوٹی ہوئی جوتی سے جھانکتا منشی پریم چند کا انگوٹھا آج بھی ملک کے حاکموں کو کہہ رہا ہے کہ یہ لکھنے والے اُن رشیوں مُنیوں کی نسل میں سے ہیں جنھوں نے کبھی ویدوں کی رچنا کی تھی۔ 'روشنی کے ان میناروں کو پہچانو۔ اور ان کی قدر کرو ہو سکتا ہے ان میں کوئی وارث شاہ، کوئی غالب کوئی ٹیگور کوئی شرت چندر مل جائے۔''

اتنے میں ملک الموت نے پھر سوالیہ نظروں سے رب کی طرف دیکھا۔

رب کو کچھ نہ سُوجھا تو اُس نے منٹو کی طرف دیکھا۔

''میں کچھ عرض کروں۔'' منٹو نے کہا

''جی مجھے تو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے بشن سنگھ کی طرح واگھے کی سرحد پر ہی کھڑا رہنے دو۔ مجھے اپنے کردار سے ہمدردی ہے۔ جب تک بشن سنگھ کو ٹوبہ ٹیک سنگھ نہیں ملتا۔ میں اُس کے ساتھ ہی رہنا پسند کروں گا۔

یوں بھی وہاں سے امرتسر نزدیک ہے۔ وہاں میرا بچپن آج بھی کھیل رہا ہے۔ میری جنم بھومی بھی نزدیک ہے سمرالے کے پاس۔ وہاں سے ہوا آئے گی اور واگھے کی سرحد پر مجھے لوریاں دے کر سُلائے گی۔''

.........☆.........

منٹو_ تکنیک اور بیانیہ

(بے ریا ضمیر کا سفر)

● قدوس جاوید

ادبی جلوہ گری کی وہ صورت جسے اصطلاحی معنوں میں مختصر افسانہ کہا جاتا ہے۔صرف افسانہ نہیں ہوتا، زندگی اور زمانہ سے کشید کیا ہوا ایک ''تخلیقی سچ'' ہوتا ہے۔افسانہ نگار اس سچ کو اپنے تخیلی تجربہ اور منفرد تخلیقیت کی آمیزش کے ساتھ، کسی خاص لمحہ، وقت یا عہد کے تناظر میں مخصوص سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی عمل یا ردِ عمل کے حوالے سے بیان (Narrate) کرتا ہے۔منٹو کے افسانوں کی نئی قرأت، منٹو کے فن کے بارے میں پہلا تاثر یہی قائم کرتی ہے۔

ادب سے متعلق تعمیری سوچ ، افسانہ کے منصب کی آگہی، سیکولر اقدار و روایات سے عشق اور معاشرے کے حاشیے پر پڑے لوگوں کے تئیں کھری ہمدردی کی بنا پر منٹو نے اپنے ''بے ریا ضمیر'' کے ساتھ جتنے بھی عمدہ افسانے لکھے ہیں۔مثلاً ''ہتک''، ''نیا قانون''، ''کالی شلوار''، ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''دھواں'' اور ''سہائے'' وغیرہ ان میں منٹو کا بیانیہ غیر ضروری آرائش و زیبائش سے پاک ایک سیدھا سادہ راست اور بے باک بیانیہ ہے۔اس بیانیہ کا ہر جز و افسانہ کی ساخت کی رگوں میں اس طرح رواں دواں ہے کہ افسانہ کی معنویت اور افسانہ کی ساخت باہم مل کر تاثر و کیفیت کی ایک انوکھی ڈرامائی وحدت پیدا کرتی ہیں۔یہی منٹو کی تکنیک ہے اور یہی منٹو کے بیانیہ کا انفراد جس کی وجہ سے ہر آنے والا وقت منٹو کو کہیں زیادہ سچا، کھرا اور عظیم افسانہ نگار ثابت کر رہا ہے۔ذرا اور آگے بڑھیں تو یہ بھی محسوس ہوگا کہ منٹو کا ''جہانِ افسانہ''_ اعلیٰ اور ادنیٰ تخلیقی سچائیوں High and low Creative Realities کا ایک ایسا بحرِ بے کنار ہے جس میں سنجیدہ قرأت کا پتھر مارتے ہی معنی و مفہوم، تاثر و کیفیت کے نت نئے دائرے بنتے اور پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ان سبھی بنتے بکھرتے دائروں کا شمار ممکن نہیں لیکن چند ایک

دائروں کو ذہن میں رکھ کر کچھ کہنا چاہیں تو پھر یہ فیصلہ کرنا بھی کم دُشوار نہیں ہوتا کہ گفتگو شروع کہاں سے ہو اور اختتام کس پہلو پر ہو۔ سبب یہ ہے کہ منٹو کی تفہیم وتنقید کے لیے افسانے کی تنقید کے وہ مروجہ اصول اور رویّے ناکام ثابت ہوتے ہیں جن اصولوں اور رویّوں سے پریم چند حتیٰ کہ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کو بھی سمجھایا سمجھا یا جاتا رہا ہے۔ منٹو کی تنقید کے لیے منٹو کا رسمی مطالعہ بھی کافی نہیں۔ منٹو سے مکالمہ بھی کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ منٹو نے اپنے افسانوں سے متعلق ہر ''کلام'' اور ''دُشنام'' کا جواب اپنے مضامین، خطوط اور دیباچوں میں پہلے ہی دے رکھا ہے۔ لہٰذا منٹو کی تشفی بخش تفہیم وتعبیر کے لیے منٹو کی حدیثِ زندگی کے تجزیے کے علاوہ فکشن کی شعریات سے متعلق نئی بصیرتوں کے ساتھ منٹو سے ''معانقہ'' ضروری ہے تاکہ منٹو کے سارے سماجی، اخلاقی اور جمالیاتی تجربے، اپنے اندھیروں اُجالوں کے ساتھ عامل (قاری، ناقد) کے دانشورانہ وجود میں منتقل ہو جائیں۔

ظاہر ہے منٹو کی شخصیت اور تصنیفات اور پپروڈی سمرالہ سے لے کر امرت سر تک اور دِلّی بمبئی سے لے کر کراچی لاہور تک منٹو کی جدوجہد کی ساری تفصیلات تو اوپندر ناتھ اشک، حسن عسکری اور وارث علوی سے لے کر برج پریمی ایما خالد اشرف اور علی ثنا بخاری تک کھول کھول کر بیان کر چکے ہیں۔ تو پھر کہنے کو بچتا کیا ہے۔؟۔ کچھ نہیں۔؟۔ نہیں۔ ایسی بات بھی نہیں۔ دراصل وہ ادیب ہی کیا جس کے بارے میں ہر نئے دور میں کچھ نیا کہنے کی گنجائش نہ نکلے۔ اور منٹو عام نہیں سب سے الگ ایک عظیم ادیب/افسانہ نگار تھا۔ اس لیے آج کی تکثیری ثقافتی صورت حال (Plural Cultural Condition) میں سوسئیر کے ''نظریۂ لسان'' اور بیانیہ (Narrative) سے متعلق ساختیاتی اور ہیئت پسند مفکرین ولادمیر پروپ (Viladimir Propp) لیوی سٹراس اور نارتھروپ فرائی Northrop Frye وغیرہ کے نظریات کی زائیدہ فکشن کی نئی شعریات کی رُو سے منٹو کے فن کی معنویت کہیں زیادہ اہم اور مستحکم ہوگئی ہے۔ لیکن کیوں اور کیسے؟ آیئے جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

منٹو شناسی کے قریب ترین حوالے کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ منٹو کو کرشن چندر اور بیدی پر فوقیت دینا سہل نہیں بالکل اُسی طرح جس طرح میر تقی میر کو غالب اور اقبال پر ترجیح دینا آسان نہیں۔ پھر بھی منٹو کا ادبی قد کرشن چندر اور بیدی سے اک ذرا سا نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گرچہ منٹو، کرشن چندر اور بیدی تینوں ہی حقیقت نگار ہیں اور ہر ایک کی انفرادیت مسلّم ہے۔ یہ تینوں جانتے تھے کہ خوبصورت ادب پارے خالص حقیقت نہیں ہوتے۔ پھر بھی تکنیک اور بیانیہ کے حوالے سے منٹو کا افسانہ بُننے کا اپنا ہی انداز ہے جو کرشن چندر اور بیدی سے الگ جہات رکھتا ہے۔ منٹو جانتا ہے کہ:

> ''ادب سونا نہیں جو اس کے گھٹتے بڑھتے بھاؤ بتائے جائیں۔ ادب زیور ہے اور جس طرح خوبصورت زیور خالص سونا نہیں ہوتے اسی طرح خوبصورت ادب پارے بھی خالص حقیقت نہیں ہوتے۔ ان کو سونے کی طرح گھس گھس کر پرکھنا بہت بڑی بے ذوقی ہے''۔

(مضمون: 'کسوٹی' از منٹو)

لیکن منٹو "سچ" کے سونے میں کرشن چندر کی طرح رومانیت اور بیدی کی طرح اساطیر کی آمیزش کر کے زیور نہیں بناتا۔ بلکہ انسانی دردمندی، سماجی وابستگی اور تعمیری مقصدیت جیسے عناصر منٹو کے افسانوں کو خوبصورت اور نادرونایاب بناتے ہیں۔ منٹو نے واضح لفظوں میں کہا ہے:

> "ہر ادب پارہ ایک خاص فضا، ایک خاص اثر، ایک خاص مقصد کے لیے پیدا ہوتا ہے۔
> اگر اس میں وہ خاص فضا، وہ خاص اثر اور خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو وہ ایک بے
> جان لاش رہ جائے گی۔" (کسوٹی)

دراصل منٹو کے اسی ادبی نظریہ یا تھیوری کا اعجاز ہے کہ منٹو کے افسانے بطور افسانہ، کرشن چندر اور بیدی کے افسانوں سے کہیں زیادہ خود کفیل اور پر از امکان ہیں۔ اس امکان کی تہیں جیسے جیسے کھلتی جاتی ہیں منٹو کی معنویت اور مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

منٹو کے افسانوں کی تکنیک اور بیانیہ کے انفراد کی جڑیں اُس کی شخصیت کے تشکیلی عناصر میں بھی پیوست ہیں۔ دراصل ہر ادیب لازمی طور پر اپنے ماحول اپنی ثقافت اور اپنی اُفتادِ طبع کی رُو سے ہی تخلیق فن کرتا ہے اور اس زاویے سے چونکہ منٹو اور کرشن چندر اور بیدی میں فرق ہے اس لیے ان تینوں کے تخلیقی رویّوں میں بھی فرق ہے۔

کرشن چندر کی پرورش ایک تعلیم یافتہ اور آسودہ حال خاندان میں ہوئی تھی اسی لیے کرشن چندر کے یہاں زندگی جینے اور ادب لکھنے میں نفاست اور نظم وضبط بھی تھا اور Sofistication بھی۔ اور چونکہ کرشن چندر کو اوائل عمری میں حسن فطرت سے مالا مال ماحول (جموں وکشمیر کا علاقہ پونچھ) بھی ملا تھا۔ جہاں کی برف پوش پہاڑیوں، فردوسی نہروں اور سبزہ زاروں نے کرشن چندر کے مزاج میں فطرت پسندی، رومانیت اور غنائیت کے جو عناصر بھر دیئے تھے آخر کار وہی ان کی فکشن نگاری کے امتیازات بھی قرار پائے۔

راجندر سنگھ بیدی کا معاملہ مختلف ہے۔ سکھوں میں بیدی، عالی نسب تصور کیے جاتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کو اپنی اعلیٰ نسبی کا پتہ تھا۔ شاید فخر بھی ہو لیکن وہ متوسط طبقہ کے ایک عام سادگی پسند خاندان کے فرد تھے۔ پرورش عامیانہ اور سپاٹ ماحول میں ہوئی۔ آسودہ طبقہ کی آسائشیں ان کی سوچ اور فکر کے دائروں سے باہر تھیں لیکن نچلے اور متوسط طبقہ کے بچوں (بھولا) بوڑھوں (وہ بڈھا) عورتوں (ایک عورت، کوکھ جلی، گرہن) اور مردوں (زین العابدین، مادھو) کی نفسیات، جذبات اور بنیادی مسائل کی بیدی کو بھرپور آگہی تھی۔ عام آدمیوں کی محبتوں اور نفرتوں، خودغرضیوں اور قربانیوں کے شب وروز کے مشاہدے نے ان کی تخلیقیت میں بھی عام آدمی کی زندگی کے اندھیرے اُجالے بھر دیئے تھے۔ اور بیدی کے افسانوں میں اسی عام آدمی کی کہانیاں، کہیں مقامی رسوم ورواج، لوک کتھا اور ضرب الامثال کے ساتھ سامنے آئی ہیں تو کہیں ضرورت کے مطابق اساطیر وعلائم اور جنس (Sex) اور مذہبی عقائد وتوہمات کے حوالے سے بیانیہ کی تشکیل کی گئی ہے۔ بیدی نے کرشن چندر اور منٹو کے برعکس تقسیم ملک کے عذاب کو خود جھیلا تھا لیکن بیدی نے "لاجونتی" جیسے ایک آدھ افسانوں کے سوا عام طور پر

تقسیم ملک، فسادات اور ہجرت کے موضوع پر لکھنے سے پرہیز ہی کیا ہے۔

کرشن چندر اور بیدی کے مقابلے میں منٹو کی افتادِ طبع بچپن سے ہی ''ٹیڑھی لکیر'' رہی ہے۔ امرت سر کے کوچہ وکیلاں میں اپنے باپ کی دوسری بیوی کا ان چاہا بیٹا، سوتیلے بھائیوں کا جھوٹن باپ کی شفقت سے محروم سعادت حسن منٹو کو کبھی ''سعادت مند'' بننے کا موقع ہی نہ ملا۔ منٹو نے خود لکھا ہے کہ ''بچپن اور لڑکپن میں میں نے جو کچھ چاہا وہ پورا نہ ہوتے دیا گیا۔ یوں کہو کہ میری خواہشات کچھ اس طرح پوری کی گئیں کہ ان کی تکمیل میرے آنسوؤں اور میری ہچکیوں میں لپٹی ہوئی تھی'' اور شاید یہی وجہ تھی کہ (بقول اوپندر ناتھ اشک) وہ ''لڑکپن ہی سے دینو یا فضلو کمہار کی دکانوں کے اوپر چوباروں میں جمنے والی جوئے کی محفلوں میں شامل ہوتا......اردو کے پرچے میں فیل ہونے کی وجہ سے منٹو نے بہ مشکل تھرڈ ڈویژن میں دسویں پاس کیا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن والد کے انتقال (۱۹۳۲ء) خستہ مالی حالت، بیوہ ماں اور بہن ناصرہ سے دوری، اور شراب خوری نے منٹو کو ٹی۔بی میں مبتلا کر دیا۔ یونیورسٹی سے نکال دیئے گئے تو صحت کی بحالی کی خاطر بٹوت (کشمیر) چلے گئے۔ بٹوت میں بیماری سے تو نجات نہیں ملی البتہ ایک خوبصورت چرواہی وزیرن عرف بیگو سے عشق کا مرض ضرور پال لیا۔ لیکن بیگو نے بے وفائی کی۔ منٹو واپس چلے آئے۔ منٹو نے غلام باری کی انگلی پکڑ کر کٹڑہ گھونیاں، ہیرا منڈی اور فارس روڈ کی خوب سیر کی، طوائفوں کی زندگی کے نشیب و فراز، ان کی نفسیات اور بشری ضرورتوں کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا۔ ریڈیو کی ملازمت کے دنوں میں اور تو اور کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور اوپندر ناتھ اشک تک کی منافقانہ اور حاسدانہ دوستی کو بڑی معصومیت کے ساتھ جھیلا۔ ممبئی گیا تو ایک شیام کے علاوہ اور کوئی ہمدرد نہ ملا۔ منٹو ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ میں وطن پرستوں کا قتل عام دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ جب ملک تقسیم ہوا۔ فسادات ہوئے تو منٹو ممبئی میں ہی تھے مشترکہ تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد کے پرستار منٹو کے حساس وجود کو تقسیم ملک، فسادات اور ہجرت نے بہت اندر سے گویا توڑ کر رکھ دیا۔ دراصل منٹو کے افسانوں میں سرکشی، کٹیلا پن، احتجاج بت شکنی، طوائف اور جنس، دردمندی اور انسان دوستی کے بیان اور برتاؤ کے اسباب یہی ہیں۔ خاص طور پر تقسیم ملک اور فسادات کے المیہ نے منٹو کی شخصیت اور فن کو ایک اہم شناختی موڑ دیا، ٹوبہ ٹیک سنگھ، گورمکھ سنگھ کی وصیت، کھول دو، ٹیٹوال کا کتا، خدا کی قسم، یزید، سہائے، شریفن، آخری سلیوٹ اور ''سیاہ حاشیے'' کی مختصر کہانیاں اصلاً منٹو کے آنسو ہیں جو کاغذ پر لفظ لفظ اتر آئے ہیں اور ان آنسو کے قطروں میں ۱۹۴۷ء کے لہولہان ہندوستان میں انسان اور انسانیت کے زوال کی المناک تصویریں رقصاں ہیں۔

منٹو نے کرشن چندر کی طرح زندگی اور فطرت کے لطیف اور رومان پرور پہلوؤں کو گرفت میں لینے کی زحمت کم ہی کی ہے۔ البتہ منٹو کے افسانوں میں عشق و محبت کے نازک مرحلے جہاں آئے ہیں وہاں وہ پر تکلف فضا بندی کی بجائے سیدھے مدعے پر آ کر ''فطری، بشری، معاملاتی عمل اور ردِ عمل'' کو بڑی ایمانداری سے پیش کر دیا گیا ہے پوری فن کاری کے ساتھ اپنے مخصوص اسلوب میں۔ ''ٹھنڈا گوشت''، ''دھواں'' اور ''بو'' اس کی مثالیں ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ منٹو کے بارے میں کوئی بھی گفتگو، طوائف، جنس (Sex) اور فحش

نگاری کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ ممتاز شیریں، گوپی چند نارنگ اور وارث علوی سے لے کر وہاب اشرفی اور ابوالکلام قاسمی تک اکثر و بیشتر ناقدین نے اور خود منٹو نے اپنے مضمون ''افسانہ نگار اور جنسی مسائل'' میں جنسی اور نفسیاتی حقیقت نگاری، الہامی کتابوں میں ذکرِ جنس، ادب اور ادیب کی آزادی، اور قاری کی متن سے لذت آگیں مفہوم کی کشید کے حوالے سے، فحش نگاری کے الزامات کا دفاع کیا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ منٹو کے معتوب افسانوں ''بلاوز'' (۱۹۴۰ء) ''دھواں'' (۱۹۴۱ء) ''کالی شلوار'' (۱۹۴۲ء) اور ''بو'' (۱۹۴۴ء) وغیرہ میں بعض مقامات پر ایسے وضاحتی ساچیتے ہیں جنھیں کلاسیکی اخلاقی اور تہذیبی اقدار کے تناظر میں عریانیت ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں حالانکہ منٹو کے دو تین افسانوں میں جتنی عریانیت ہے اس سے کہیں زیادہ شہوت خیز عریاں اور فحش نظارے آج زندہ اور متحرک صورتوں میں، ''عام مقامات'' پر نظر آتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب مجرا کرتی طوائفوں کو شریف گھرانوں کی لڑکیاں پردوں کے پیچھے سے دیکھا کرتی تھیں۔ آج انھیں شریف گھرانوں کی لڑکیاں بزرگ اور نوجوان مرد رشتہ داروں کے ساتھ بیٹھ کر نیم عریاں اداکاراؤں کے فحش آئٹم ڈانس دیکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتیں۔ اقداری نظام Value System، معاشی تقاضوں اور اپنی پہچان کے ساتھ آزادانہ زندگی گزارنے کی خواہش اور ضرورت کے سبب لڑکیاں اپنے گھروں سے نکل کر اپنا مقدر خود لکھ رہی ہیں۔ جنس (Sex) کی قدرے ارزانی بھی ہے لیکن کنوارپن بچائے رکھنے کا شدید احساس بھی ابھی زندہ ہے۔ منٹو یہ مانتا ہے کہ ''اگر عورت نہ چاہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا جنسی استحصال نہیں کر سکتی''۔ بہر حال عریانیت کا ہونا یا نہ ہونا منٹو کے ایسے افسانوں کے فنی منصب کو نہ تو بلند کرتا ہے اور نہ پست۔ جنس اور طوائف منٹو کے فن کے بنیادی شناختی امتیازات نہیں ہیں۔ نہ تو منٹو کی ذات میں کوئی پرورژن تھا اور نہ اس کے افسانے قارئین کو جنسی بے راہ روی کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ موپاساں کی تقلید میں جب منٹو کلونت کور کی شعلہ بداماں شہوانیت کی وضاحت کرتا ہے تو افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' کا کاغذ تازا ''گرم گوشت'' کی طرح پھڑکنے لگتا ہے لیکن پھر بھی منٹو بحیثیت مجموعی جنسی لذتیت یا ترغیب گناہ کا افسانہ نگار نہیں ہے۔ بنیادی طور پر وہ انسانی نفسیات کی بوالعجبیوں کا ترجمان ہے۔ اسے جسموں کے اختلاط سے نہیں بلکہ ان نفسیاتی محرکات سے دلچسپی تھی جو آدمی کے جنسی طرزِ عمل کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں۔ دراصل منٹو نے اپنے بعض افسانوں میں جنسیت (Sexuality) کی چیچپاہٹ محض فیشن کے طور پر داخل کی ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں عصری سیاسی اور معاشی نظام کے ساتھ ساتھ مسلّمہ اخلاقی اقدار کی خلاف ورزی بھی فیشن بن گئی تھی۔ اخلاقی اور ادبی روایات کی خلاف ورزی کے نام پر جنسی معاملات کا بے باکانہ اظہار اس دور میں اُردو فکشن کا عام رجحان بن گیا تھا۔ انگارے کے بعض افسانوں کے علاوہ عزیز احمد کے ناولوں ''ہوس''، ''مرمر اور خون'' اور ''گریز'' میں جنس نگاری کے نمونے بکھرے پڑے ہیں۔

عصمت چغتائی نے بھی اسی باغیانہ روش کے تحت ''لحاف'' لکھا، چنانچہ سعادت حسن منٹو سے بھی ان کی ترقی پسندی نے ایک طرف جہاں، نیا قانون، سہائے اور ''۱۹۱۹ء کی ایک بات'' جیسے عمدہ افسانے لکھوائے

وہیں مروجہ فیشن پرستانہ جنس نگاری کے زیرِ اثر منٹو کے ''کالی شلوار''، ''بو'' اور ''دھواں'' جیسے افسانوں میں جنسیت در آئی ہے اور جن میں فحاشی کی حدوں کو چھونے والی وضاحتیں بہر حال ہیں۔ منٹو پر جن دنوں فحاشی کا مقدمہ چلا وہ بمبئی میں تھے۔ اور سردار جعفری نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے اخبار ''قومی جنگ'' میں عصمت اور منٹو پر لگائے گئے فحاشی کے الزامات کے خلاف ''ادب اور تہذیب پر حملہ'' کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ کیونکہ سردار جعفری کی طرح عصمت اور منٹو بھی ترقی پسند ادیبوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ منٹو کے قریبی دوست اوپندر ناتھ اشک نے اس ضمن میں لکھا ہے:

''ان دنوں عریاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، عصمت اور منٹو اس کے علم بردار تھے کرشن (چندر) کھل کر نہ کھیلتے تھے لیکن انھوں نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک فارمولا بنا رکھا تھا۔ جس میں وہ رومان انگیزی اور ترقی پسندانہ طنز میں تھوڑی سی عریانی بھی ملا دیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی عصمت فروشی اور آبروریزی کے علاوہ بھی بیسیوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں اس وقت ترقی پسندوں کو عریاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طوائفوں کے چوباروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مارا مارا پھرنا ہی واحد موضوع سوجھتا تھا''۔

''منٹو میرا دشمن''۔ اوپندر ناتھ اشک، ص ۲۸

احمد ندیم قاسمی نے بھی اپنے مضمون ''منٹو کی چند یادیں'' میں لکھا ہے کہ انھوں نے منٹو کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے فن کو عریاں نگاری کی قربان گاہ پر بھینٹ نہ چڑھائے۔ احمد ندیم قاسمی کے مطابق:

''ایک روز میں نے منٹو سے کہا کہ ''ٹالسٹائے نے موپاساں'' کے کسی افسانے کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر موپاساں کو اپنی ہیروئن کو نہاتے ہوئے دکھانا تھا تو کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں تھا کہ ''وہ نہا رہی تھی''۔ یا چلیے یہ بھی کہہ دیجیے کہ جب وہ نہا چکی تو اس کے جسم پر پانی کے بے شمار قطرے تھے رہ گئے۔ لیکن موپاساں کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ پانی کے ان قطروں کا رنگ ہیروئن کے جسم کی رنگت کی طرح ہلکا سنہرا یا ہلکا گلابی تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ادب میں لذتیت کی ابتدا ہوتی ہے''۔

دراصل تیسری چوتھی دہائی میں ترقی پسندی اور حقیقت نگاری کے نام پر اُردو افسانہ میں عریاں نگاری کے رجحان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسی عرصہ میں اسپنڈر (Spender) اوڈین (Odean) اور لوئی میکنیز (Loie Maknees) وغیرہ برطانوی دانشوروں کی ایک جماعت اپنے آپ کو انقلاب پسند ثابت کرنے کے لیے اخلاقی، تہذیبی اور ادبی اقدار و روایات کی خلاف ورزی میں مصروف تھی غالباً اسی کی تحریک پر یا تقلید میں احمد علی، سجاد ظہیر (انگارے) عصمت چغتائی (لحاف) منٹو (دھواں، بو وغیرہ) اور عزیز احمد (ہوس)، وغیرہ مسلمہ اخلاقی تہذیبی اور ادبی اقدار کی شکست و ریخت اور ایک ''آزاد'' نئے معاشرے کی تشکیل کے جوش میں عریانیت، اور لذتیت کے بہاؤ میں اک ذرا

سابہہ گئے ورنہ ان میں سے کوئی بھی اپنی اصل کے اعتبار سے عریانیت پسند ہے نہ فحش نگار۔

منٹو کے افسانوں میں طوائف کی پیشکش کو اب تک یکطرفہ طور پر ہی دیکھا اور دکھایا گیا ہے منٹو کی طوائفوں، سوگندھی (ہتک) سلطانہ (کالی شلوار) کلونت کور (ٹھنڈا گوشت) جانکی (جانکی) شکیلا اور شاردا (شاردا) مسز اسٹیلا جیکسن (ممی) زینت (بابو گوپی ناتھ) کانتا (خوشیا) وغیرہ کے عادات واطوار ضرورتوں اور رویوں کی طرفوں اور تہوں کو کھول کر اور پھیلا کر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اصلاً یہ بھی ایک ہی عورت کے مختلف روپ ہیں۔ بھرت مُنی نے "ناٹیہ شاشتر" میں عورت کے جتنے روپ اور ان کی جتنی صفات بیان کی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی ترجمانی ان طوائف عورتوں کے رویوں سے بخوبی ہوتی ہے۔ یہ طوائفیں محض جسم فروش، جنس زدہ فاحشہ نہیں ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں، جنس کی مشقت اُٹھانے والی ان عورتوں ان Sex workers کے باطن میں خودداری، انسانیت، ایثار اور کھرا پن کی جو خوبیاں ہیں ان کا اپنا ایک الگ حسن ہے، خودداری، جذبات اور فطری نسائی خواہشات کا گلا گھونٹ کر، "بدن" کو "جینے" کا وسیلہ بنانے پر مجبور ایسی عورتیں زمانۂ قدیم سے ہمارے معاشرے کا حصہ رہی ہیں۔ منٹو کی منفرد "نگاہِ حسن" نے ایسی عورتوں (طوائفوں) کے اندر کے اُجالوں کو سامنے لاکر حقیقتاً اس سیاسی وسماجی ومعاشی نظام کے خلاف بغاوت کی ہے جس نظام میں کوئی سلطانہ ایک شلوار، سوگندھی محبت کی ایک نگاہ، کلونت کور مرد کی وفاداری اور جانکی اور شاردا ایک ذریعۂ معاش کے لیے ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔ دراصل ترقی پسند منٹو نے ایسی عورتوں کے حوالے سے پریم چند کے "نظریۂ حسن" کی توثیق وتوسیع کی ہے۔ ہر شخص واقف ہے کہ پریم چند نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس (۱۹۳۶ء لکھنؤ) میں اپنے صدارتی خطبے میں ادیبوں سے کہا تھا کہ:

> "عوام کی زندگی اور ان کی کشمکش حیات میں "حسن کی معراج" دیکھنے کی کوشش کریں اور یہ نہ سمجھیں کہ "حسن صرف رنگے ہونٹوں والی معطر عورتوں کے رخساروں اور ابروؤں میں ہے .... اگر تمھیں اس غریب عورت میں حسن نظر نہیں آتا جو بچے کو کھیت کی مینڈھ پر سلائے پسینہ بہا رہی ہے، تو یہ تمھاری تنگ نظری کا قصور ہے۔ اس لیے کہ ان مرجھائے ہوئے ہونٹوں اور کمھلائے ہوئے رخساروں کی آڑ میں ایثار، عقیدت اور مشکل پسندی ہے"۔

اور کون کہہ سکتا ہے کہ سلطانہ، شاردا، زینت اور کانتا میں عقیدت، ایثار اور مشکل پسندی نہیں ہے۔؟

> "جب وہ (سوگندھی) بوہنی کرتی تھی، دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے سے لگا کر انھیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔"

افسانہ۔ "ہتک"

> "ممی اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ شفقت کا مجسمہ تھی، جڑے کے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا: "میرے بیٹے میرے غریب بیٹے۔"

(افسانہ، ممی)

"..... تین مہینے میں ..... سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے ہیں۔ بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرائے میں چلے جاتے تھے۔ پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا تھا اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچے تھے۔ کھانا پینا، کپڑے لتے، دوادارو، اور آمدنی کچھ بھی نہیں .... ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں ..... آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اُتر گئی .... پر کہا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔" [افسانہ۔ کالی شلوار]

"اس نے سوچا ماں بننا کتنا اچھا ہے ..... اور یہ دودھ ..... مردوں میں کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں۔ عورتیں کھاتی ہیں اور کھلاتی ہیں .... کسی کو پالنا .... اپنے ہی بچے کو ہی، کتنی شاندار چیز ہے یہ دودھ یہ سفید آبِ حیات ہے۔" [افسانہ۔ شاردا]

"اس کا پاؤں پھسلا .... اوپر کی سیڑھی سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلی سیڑھی کے ساتھ ٹکراتی لوہے کے جنگلے کے ساتھ اُلجھتی نیچے آ رہی پتھریلے فرش پر .... موذیل کی ناک سے خون بہہ رہا ہے۔ منہ سے خون بہہ رہا ہے، اور کانوں کے رستے بھی خون نکل آیا ہے ..... ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔ موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی ..... "لے جاؤ اس کو .... اپنے اس مذہب کو ..... اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔" [افسانہ۔ موذیل]

ایسی ساری مثالیں طوائف کے "طوائف پن" کو نہیں۔ عورت کے فطری "عورت پن" کو نمایاں کرتی ہیں۔ منٹو نے اپنے ایک مضمون "عصمت فروشی" میں لکھا ہے:

"ہر عورت ویشیا نہیں ہوتی لیکن ہر ویشیا عورت ہوتی ہے۔ کوئی وقت ایسا بھی آتا ہوگا جب ویشیا اپنے پہننے کا لباس اُتار کر صرف عورت رہ جاتی ہوگی"۔

اب اگر طوائف کے موضوع پر منٹو کے افسانوں کی داخلی ساخت، تکنیک اور بیانیہ کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ منٹو نے اصلاً ویشیاؤں کی کہانیاں نہیں لکھی ہیں بلکہ ان کے اندر کی عورتوں کے اُن لمحوں، اُن دورانیوں کی سچائیاں پیش کی ہیں جب وہ ویشیاؤں کے لبادے اُتار کر صرف "عورت" رہ جاتی ہیں۔ یوں بھی منٹو کو طوائف سے اور جنسی بے راہ روی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ عصمت چغتائی نے اس کی گواہی دی ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ بدن کی مشقتیں جھیلنے والی عورتوں کے اس معتوب طبقہ کے نفسیاتی، سماجی اور معاشی مسائل کو تمام تر فنی و جمالیاتی دروبست کے ساتھ پیش کر کے ایک طرف تو منٹو نے اپنے انسان دوست ترقی پسند سماجی شعور کا مظاہرہ کیا ہے وہیں دوسری جانب منٹو اپنے اس طرح کے افسانوں میں ایک Feminist افسانہ نگار بھی ثابت ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہاں بحث منٹو اور "عورت" سے نہیں، یہ موضوع عورت کی ذات کی طرح ہی انتہائی پیچیدہ موضوع

ہے۔ ممتاز شیریں اور وارث علوی اس پر بہت کچھ لکھ گئے ہیں۔ ویسے منٹو کے اور چند افسانوں مثلاً ''میرا نام رادھا ہے''، ''نگی''، ''پڑھیے کلمہ''، ''موچنا''، ''سرکنڈوں کے پیچھے''، ''میرا اور اس کا انتقام''، ''شوشو''، ''دس روپے''، ''شریفن''، ''شانتی''، ''سڑک کے کنارے'' اور ''خدا کی قسم'' وغیرہ نسبتاً کم معروف افسانوں کے نسائی کرداروں کے اندرون میں جھانک کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ منٹو 'احترامِ عورت' کا بھی افسانہ نگار ہے۔ منٹو عورت کے بارے میں ایک مثالی نظریہ رکھتا تھا۔ اس کے خیال میں عورت لاکھ پڑھی لکھی ہو کماؤ ہو، مغرب زدہ ہو۔ عورت، عورت ہے۔ اس کا اپنا حسن ہے، اپنا منصب ہے اور اپنا ایک کردار ہے اور اگر وہ اپنے منصب سے گر جاتی ہے تو وہ عورت نہیں۔ اور خاص طور پر جب منٹو ہندوستانی عورت کی بات کرتا تھا تب اس کی تحریر میں مشرق کی خوشبو اور (غیر منقسم) ہندوستان کے عظیم کلچر کی مہک آجاتی تھی (برج پریمی) منٹو نے گنجے فرشتے میں لکھا ہے:

> ''عورت جنگ کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش لڑے، پہاڑ کاٹے، افسانہ نگاری کرتے کرتے عصمت چغتائی بن جائے لیکن اس کے ہاتھوں میں کبھی کبھی مہندی رچنی ہی چاہیے اس کی بانہوں سے چوڑی کی کھنک آنی ہی چاہیے۔''

منٹو کا فن اپنی Totality میں اس اعلیٰ مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں حقیقت اور افسانہ کا فرق مٹ جاتا ہے اور افسانہ ___ افسانہ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے منٹو کا بیانیہ اپنے اندر اور باہر اور آس پاس کی سچائیوں کو سمیٹ کر سیدھے سبھاؤ بیان کرنے سے عبارت ہے۔ منٹو نے سوگندھی (ہتک) سلطانہ (کالی شلوار) منگو کوچوان (نیا قانون) سکینہ اور سراج الدین (کھول دو) موذیل اور جانکی سے لے کر خوشیا، بابو گوپی ناتھ اور ''پھوجا حرام دا'' تک سے جزی سچائیوں کو بڑی بے باکی سے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ منٹو جس طرح اپنے کرداروں کے درد میں شریک نظر آتا ہے اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مذہب، اور طبقہ سے قطع نظر انسان اور انسانیت کے تئیں دردمندی بھی منٹو کے فن کا بنیادی وظیفہ ہے۔ مثالیں کئی ہیں۔ مثلاً دکھاوے کے دھرم پر طنز کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے:

> ''انسان جیسا ہے اسے ویسا ہی رہنا چاہیے ___ نیک کام کرنے کے لیے کیا یہ ضروری ہے کہ انسان اپنا سر منڈائے، گیروے کپڑے پہنے یا بدن پر راکھ ملے...... اس طرح کی نرالی چیز ہی سے گمراہی پھیلتی ہے۔ یہ لوگ اونچے ہو کر انسان کی فطری کمزوریوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان کے کردار، ان کے خیالات اور عقیدے ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ لیکن ان کے منڈے ہوئے سر، ان کے بدن کی راکھ اور ان کے گیروے کپڑے سادہ لوح انسانوں کے دماغ میں رہ جائیں گے۔
> ''غلام علی زیادہ جوش میں آ گیا'' ، ''دنیا میں اتنے مصلح پیدا ہوئے ہیں ان کی تعلیم تو لوگ بھول چکے ہیں لیکن صلیبیں، دھاگے، کڑے اور بغلوں کے بال رہ گئے ہیں'' [افسانہ ''سوراج کے لیے'']

منٹو کے سیکولر ذہن کا اندازہ اس اقتباس سے بھی لگایا جا سکتا ہے:

''میں بے حد خوف زدہ ہو گیا۔
اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بے جوڑ الفاظ میں ان سے گفتگو شروع کر دی
رام کھلاون ہندو ہے
ہم پوچھتا ہے وہ کدھر رہتا ہے۔؟
...اس کی کھولی کہاں ہے؟....دس برس سے وہ ہمارا دھوبی ہے
......بہت بیمار تھا۔ ہم نے اس کا علاج کرایا تھا....ہماری بیگم....یہاں موٹر لے کر آئی تھی۔
یہاں تک جب میں نے کہا تو مجھے اپنے اوپر بہت ترس آیا۔ دل میں بہت خفیف ہوا کہ انسان اپنی جان بچانے کے لیے کتنی نیچی سطح پر اُتر آتا ہے''۔ [افسانہ ''رام کھلاون'']

منٹو۔ مذہب کے نام پر جذبۂ محبت کی تذلیل کی شدید مذمت کرتا ہے۔ افسانہ ''دو قومیں'' میں مختار اور شاردا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن شادی نہیں کر سکتے۔

''شاردا پوچھتی ہے۔ کیسے ہو سکتی ہے ہماری شادی؟
مختار مسکراتا ہے۔ اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ تم مسلمان ہو جانا۔
شاردا کے ہونٹ شاید کسی نے سی دیئے۔ شاردا نے بہ مشکل اتنا کہا۔ ''تم ہندو ہو جاؤ''۔
''میں ہندو ہو جاؤں؟'' مختار کے لہجے میں حیرت تھی۔ وہ ہنسا: ''میں ہندو کیسے ہو سکتا ہوں۔''
''میں مسلمان کیسے ہو سکتی ہوں؟'' شاردا کی آواز مدھم تھی۔
مختار اپنے مذہب کی تعریف اور ہندو مذہب کی برائی کرتا ہے۔ اور شاردا تنگ آ کر کہتی ہے:
''جاؤ۔ چلے جاؤ۔ ہمارا ہندو مذہب بہت بڑا ہے۔ تم مسلمان بہت اچھے ہو۔'' شاردا کے لہجے میں نفرت تھی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ مختار اپنا اسلام دبائے وہاں سے چلا گیا۔ [افسانہ۔ ''دو قومیں'']

منٹو۔ مذہب مخالف نہیں تھا۔ اس کی '' ہر تحریر ۷۸۶ کے عدد سے شروع ہوئی۔ اگر غلطی سے کہیں یہ عدد لکھنا بھول جاتے اور اس کے بغیر ہی ان کا کوئی مضمون، افسانہ یا ڈرامہ مکمل ہو جاتا تو وہ ضائع کر دیتے اور اکثر اوقات وہ چیز کبھی تخلیق ہی نہ ہوتی۔ اس بات سے بعض اوقات لوگ انھیں ضعیف الاعتقاد سمجھنے لگتے تھے'' (برج پریمی۔ منٹو کتھا) ایک بار فلم ایکٹریس پارو دیوی کے ہاں محفلِ رقص و سرور لگی ہوئی تھی۔ اشوک کمار، ایس واچا، این دتہ پائی، منٹو اور دوسرے لوگ شریکِ محفل تھے، سب لوگ ہوش و حواس کھوئے ہوئے پی رہے تھے۔ پارو نے ٹھمریاں، غزلیں اور گیت پیش کیے اور آخر میں ایک نعت شروع کی لیکن منٹو نے اس حالت میں بھی کہ جب وہ مدہوش تھے کہا:
''پارو دیوی! یہ محفلِ نشاط ہے، شراب کے دور چل رہے ہیں۔ یہاں کالی کملی والے

کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔"

اسلام کے ساتھ انھیں والہانہ عشق تھا کرشن چندر نے کہا ہے:

"منٹو نماز وغیرہ کے پابند نہ تھے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں کچھ سن نہیں سکتے تھے۔"

لیکن منٹو نے ہمیشہ مذہب کے نام پر کیے گئے مظالم کے خلاف احتجاج کیا۔ فسادات پر ان کا جتنا بھی ادب شائع ہوا ہے۔ شاید ہی کسی اور ہندوستانی یا پاکستانی ادیب نے اتنا ادب تخلیق کیا ہو۔ اس کی ہر تحریر فرقہ وارانہ منافرت، تنگ نظری، تعصب اور قتل وغارت کے خلاف ہے۔ منٹو کے افسانہ "سہائے" کا یہ اقتباس بے حد اہم ہے:

"یہ مت کہو کہ ایک لاکھ مسلمان اور ایک لاکھ ہندو مرے، یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا۔ مگر اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہ آئی۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کیا جا سکتا ہے۔ مذہب، دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں روح میں ہوتا ہے۔ چھرے، چاقو یا گولی سے فنا نہیں ہو سکتا"۔

منٹو نے تقسیم ملک اور دو قومی نظریہ کو کبھی تسلیم نہیں کیا اسی لیے منٹو نے اس تاریخی غلطی پر بار بار طنز کیا ہے۔ افسانہ "آخری سیلوٹ" میں لکھتا ہے:

"اب وہ خود دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ پہلے سب "ہندوستانی فوجی" کہلاتے تھے۔ اب ایک پاکستانی تھا اور دوسرا ہندوستانی۔ اُدھر ہندوستان میں مسلمان ہندوستانی فوجی بھی تھے۔ رب نواز جب ان کے متعلق سوچتا تو اس کے دماغ میں ایک عجیب گڑبڑی پیدا ہو جاتی۔ اور جب وہ کشمیر کے متعلق سوچتا تو اس کا دماغ بالکل جواب دے جاتا ___ پاکستانی فوجی کشمیر کے لیے لڑ رہے تھے یا کشمیر کے مسلمانوں کے لیے ___ اگر انھیں کشمیر کے مسلمانوں کے لیے بھیجا جاتا تھا تو حیدرآباد اور جونا گڑھ کے مسلمانوں کے لیے کیوں انھیں لڑنے کے لیے نہیں کہا جاتا؟۔ اور اگر یہ ٹھیٹ اسلامی جنگ تھی تو دنیا میں دوسرے کئی اسلامی ممالک ہیں وہ اس میں حصہ کیوں نہیں لیتے"۔ [افسانہ۔ "آخری سیلوٹ"]

منٹو نے کشمیر کے سوال پر پہلی ہند پاک جنگ کے حوالے سے اپنے سیکولر سیاسی شعور کا اظہار اپنے مضمون "شاعر کشمیر مہجور کشمیری" میں اس طرح کیا ہے:

"اگر وہ (مہجور) زندہ ہوتا تو میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر گراہم کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ اپنے قلندرانہ انداز میں جواہر لعل نہرو اور خواجہ ناظم الدین کو (یہ بھی کشمیری ہیں) سمجھا دیتا کہ دیکھو

انسان کا خون پانی سے ارزاں نہیں ہے۔ کشمیری خواہ مسلمان ہو یا ہندو، ہر حالت میں کشمیری ہے۔ تم جواہر لعل ہو۔ یہ ناظم الدین ہے۔ دونوں کشمیری ہو۔ تم گوگجی (شلغم) اور بھتہ (چاول) کو اپنے دستر خوان سے کبھی نکال نہیں سکتے ہو، پھر تم کیوں لڑتے ہو شلغم اور بھات کی قسم کھاؤ .....کیا تم ایک دوسرے کے گریبان میں ہاتھ ڈال سکتے ہو۔''

منٹو اگر اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں سے زیادہ ممتاز اور منفرد ہے تو اسکی ایک بڑی وجہ اس کے افسانہ لکھنے کی اپنی مخصوص تکنیک ہے جو منٹو سے شروع ہو کر منٹو پر ہی ختم ہوتی ہے۔ منٹو کے افسانوں کی تکنیک وہ نہیں ہے جو ایچ ای بیٹس (H.E.Beats) اور الزبتھ بوون وغیرہ کے افسانوں میں یا پھر آج کے اُردو افسانہ نگاروں حسین الحق مشرف عالم ذوقی، بیگ احساس، شوکت حیات، ترنم ریاض اور خالد جاوید وغیرہ کے بعض افسانوں میں ملتی ہے ۔ان کے افسانوں میں واقعات کے بجائے محسوسات کا بیان زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے افسانے اکثر کہانی سے قدرے دور اور نظم سے قریب ہو جاتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں (بابو گوپی ناتھ جیسے چند افسانوں سے قطع نظر) واقعات بھی ہیں اور محسوسات بھی اور منٹو انھیں اپنی منفرد نظریاتی ترجیحات کے ساتھ کرداروں کے حوالے سے Non-Conventional اسلوب میں بیان کرتا ہے اسی لیے منٹو کا افسانہ اوّل و آخر افسانہ ہی رہتا ہے۔ نظم یا کچھ اور نہیں ہو جاتا۔ منٹو کی تکنیک کی تہوں کو اور کھولیے تو معلوم ہوگا کہ منٹو کی تکنیک کی خوبی یہ ہے کہ پلاٹ پر منٹو کی گرفت عموماً مضبوط رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے واقعات میں گہرا منطقی ربط ہوتا ہے اور تخیلات و تصورات، جذبات و محسوسات کی کارفرمائی سے افسانہ میں معنوی اور تاثراتی تہہ داری اور وسعت بھی پیدا ہوتی ہے۔ منٹو اپنے آس پاس کی زندگی کے جیتے جاگتے کرداروں کو اپنی بے پناہ تخلیقیت اور قوت اظہار و بیان کی مدد سے اسطرح پیش کرتا ہے کہ ''انسان'' کی فطرت منکشف اور افسانہ کے فنی و جمالیاتی امکانات روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہی منٹو کی تکنیک کا خاصہ ہے۔ ''کھول دو'' ''کالی شلوار''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''ہتک'' اور ''شاردا'' وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ منٹو کی تکنیک جامد اور اسٹیریو ٹائپ ہے بلکہ بقول وارث علوی ''منٹو کے افسانوں میں موضوع چاہے طوائف اور جنس ہو یا فسادات''.....کسی ایک کہانی میں بھی تکنیک۔ جذباتی یا نفسیاتی تجربہ، دوسرے کے مماثل نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ منٹو کے افسانوں میں بھی کلاسیکی افسانہ کے پانچوں عناصر پلاٹ، کردار، واقعات، مکالمہ اور نظریہ حیات کا التزام ہوتا ہے لیکن بہ اندازِ دگر''۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کی تکنیک افسانے کی تکنیک میں توسیع ثابت ہوتی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ منٹو کے بھی شاہکار افسانے مثلاً ''نیا قانون''، ''ہتک''، ''بو''، ''کالی شلوار''، ''دھواں''، ''مسز ڈی کوسٹا'' وغیرہ موضوع، کردار واقعات، اور نظریہ کے بیان کی تکنیک کے اعتبار سے قابل فخر افسانے ہیں۔ لیکن منٹو کے کسی ایک افسانے کو تکنیک کی معراج قرار دینا مشکل ہے ۔جیسا کہ منٹو کے دوست دشمن اوپندر ناتھ اشک نے افسانہ ''بو'' کی تکنیک کو سراہتے ہوئے کہا ہے:

''ہر مبتدی افسانہ نگار کو میرا مشورہ ہے کہ افسانہ کی تکنیک کو جاننے کے لیے

وہ ''بو'' ضرور پڑھے''۔

حالانکہ اس افسانہ ''بو'' میں جہاں منٹو نے رندھیر اور گھاٹن لڑکی کے وصل کی تفصیل بیان کی ہے وہاں افسانے کی تکنیک پر منٹو کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے اور منٹو لذتیت کے بہاؤ میں بہتے نظر آتے ہیں۔ ممتاز شیرین نے تکنیک کے اعتبار سے افسانہ ''ہتک'' کو افسانہ نگاری کا معیار قرار دیتے ہوئے اسے منٹو کا سب سے بہترین افسانہ قرار دیا ہے۔ جبکہ کرشن چندر نے ''ہتک'' کو اپنے دور تک کا سب سے بہترین افسانہ مانا ہے۔ حسن عسکری ''نیا قانون'' کو غیر معمولی افسانہ قرار دیتے ہیں۔ منٹو نے احمد ندیم قاسمی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ مجھے خود یہ افسانہ ''ہتک'' پسند ہے۔ میں ایسے بہت سے افسانے لکھ سکتا ہوں''۔ منٹو کے فن کی عظمت اور انفرادیت کے تجزیے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور کہی ہوئی باتوں کی تردید بھی ہو رہی ہے اور تصدیق بھی۔ دراصل منٹو کے یہاں اپنے افسانوں میں عام مروّجہ سماجی و ثقافتی، اخلاقی اور سیاسی نظام کو زیروزبر کرنے والے تیکھے، کھرے اور بے باک لب و لہجے میں افسانہ بننے کا جو مخصوص و منفرد آرٹ ہے وہی منٹو کے افسانوں کی تکنیک ہے۔ منٹو کی تکنیک یک رُخی نہیں کثیر رُخی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ بھی یہ مانتے ہیں کہ '' منٹو کا فن یک فکری Monologic نہیں بلکہ دستوو سکی کی طرح صد رُخی اور تکثیری Dialogic یا Polyphonic ہے جس میں سوچ کی کئی تہیں یا کئی آوازیں ایک ساتھ اُبھرتی ہیں اور مصنف کرداروں کے مختلف نقطۂ نظر کو آزادانہ اُبھرنے دیتا ہے اور انھیں اپنی فکر کے تابع لا کر زبردستی ان میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا''۔ منٹو کی اس تکنیک سے ہی آج کی تاریخ میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ نظریہ کے بوجھ اور زبان کی بازیگری سے ماورا ہونے کے باوجود افسانے کا فن، محض قصہ کہانی کے بیان اور قرأت یا سننے اور سنانے کا فن نہیں بلکہ زندگی کو اس کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ جینے کا فن ہے۔ منٹو کے افسانوں کی داخلی ساخت سے ہی اس بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ '' جہاں پر جاننا کافی نہیں ہوتا وہیں سے افسانے کی شروعات ہوتی ہے''۔ گویا منٹو کا فن حقیقت سے اصل حقیقت کی جانب تخلیقی سفر کا نام ہے۔ جسے ہم منٹو کے '' بے ریا ضمیر'' کا سفر بھی کہہ سکتے ہیں۔ منٹو کے یہاں '' حقیقت کی اصل حقیقت'' کی جستجو کے اس تخلیقی عمل کا اندازہ ان کے افسانوں کے ان دو اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔ پہلا اقتباس ''ہتک'' سے ماخوذ ہے۔ سیٹھ جب ''اونہہ'' کی آواز نکال کر، سوگندھی کو ریجیکٹ کر کے چلا جاتا ہے۔ تو اس کے بعد سوگندھی جس کیفیت سے گذرتی ہے اسے منٹو نے اس طرح پیش کیا ہے:

> '' وہ (سوگندھی) سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے اس سے پہلے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی ۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں '' ماں'' بن رہا تھا... وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی؟۔ اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد

لو ہے پر اپنے گال رکھ دے .... اپنے گرم گرم گال ..... اور اس کی ساری سردی
چوس لے"۔ افسانہ "ہتک"

سوگندھی تنہا ہے اس تنہائی کے عالم میں طوائف سوگندھی کے اندر کی "ماں" اس کے وجود پر چھا جاتی ہے اور وہ اپنے کتے کو گود میں لے کر سینے سے چمٹا کر لیٹ جاتی ہے۔ دوسری مثال منٹو کے مشہور افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" سے ہے تقسیم ملک ایک حقیقت ہے لیکن اس کی اصل حقیقت منٹو اپنی چشم تخیل سے اس طرح دیکھتا ہے۔

"افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک پاگل سیانا کہتا ہے

"سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتہ ہے کہ لاہور، جواب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے گا۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے گا اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب نہیں ہو جائینگے"۔ افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ

ٹوبہ ٹیک سنگھ منٹو کا ہی نہیں اُردو کا شاہکار افسانہ ہے۔ تقسیم ملک اور اسکے نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان کی بنیاد پرست قوتوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے پیش نظر ٹوبہ ٹیک سنگھ کی معنویت میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمن نے دُرست کہا ہے کہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ ایک ایسا افسانہ ہے جو قاری کے ذہن کو باطنی زندگی کے کرب اور سائکی (Psyche) میں بے اختیار اُتار دیتا ہے۔ اس افسانے کی تخلیقی سطح اتنی بلند ہے کہ تقسیم ملک کے المیے پر لکھے ہوئے بیشتر افسانے اور چند ضخیم ناولوں کے وہ حصے بھی پھیکے پھیکے دکھائی دیتے ہیں جن میں اس المیہ کے واقعات و مناظر تو پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن سائکی میں اُترنے کی کوئی کوشش نہیں ملتی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ "وقت" Time کا ایک معنی خیز استعارہ ہے جو اتنا انوکھا اور حیرت انگیز ہے کہ روح یا باطن میں کپکپی سی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ایک عہد کے کرب کا بڑا اعلامیہ ہے"۔ یہ افسانہ برصغیر کا ایسا آشوب نامہ ہے، جس میں منٹو نے ہر طرح کے تعصبات سے آزاد صرف ایک "انسان" ایک کردار "بشن سنگھ" کے حوالے سے ایک عظیم تہذیبی وحدت کے ٹوٹنے کا ماتم کیا ہے ایسا ماتم کہ لگتا ہے جیسے زمانے کا کلیجہ اچانک پھٹ گیا ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے برصغیر کا ایک پورا دور پاگل خانے میں تبدیل ہو گیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی جاگتا ہے کہ زمین سے محبت اور انسان دوستی اور انسان اور انسان کے رشتے زندہ ہیں"۔

شکیل الرحمن کی یہ بات بھی غلط نہیں کہ:

"اُردو فکشن میں ٹوبہ ٹیک سنگھ ٹریجڈی اور اس کی جمالیات کی ایک کلاسیکی مثال ہے۔ تجربے کی مجموعیت (Totality of Experience) اور ایک کربناک دور کے پورے شعور کے ساتھ ایسی کہانی لکھی نہیں گئی ہے"۔

تقسیم ملک کے دنوں میں مذہب کے غیر مذہبی جنون میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا کیا

کیا۔ یہ بھی جانتے ہیں لیکن تقسیم ملک کے بعد خود مسلمان رضا کاروں نے مہاجر مسلمان لڑکیوں کے ساتھ کیا کیا۔ سکینہ اس کی گواہ ہے۔ افسانہ ''کھول دو'' میں رضا کاروں کے ہاتھوں سکینہ کے ''گینگ ریپ'' کے بعد کے ایک سچ کے تخلیقی بیان کے بطن سے افسانہ اس طرح سامنے آتا ہے:

''ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا۔ پھر لاش کی نبض ٹٹولی اور کہا
کھڑکی ''کھول دو''
مردہ جسم میں جنبش ہوئی۔
بے جان ہاتھوں نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔
بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلّایا ''زندہ ہے۔ میری بیٹی زندہ ہے''
ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو چکا تھا''۔

تکنیکی اعتبار سے ''کھول دو'' کا یہ ڈرامائی انجام اُن ہولناک واقعات کو زندہ کر دیتا ہے جن سے سکینہ گزری ہے لیکن جن کا بیان افسانہ میں نہیں ہوا ہے۔ پھر بھی قاری کے تصور میں وہ واقعات متحرک ہو جاتے ہیں۔ ''گورمکھ سنگھ کی وصیت'' میں بھی ایسا ہی بیانیہ ہے اور یہی منٹو کے افسانوں کی تکنیک کا انفراد ہے۔

منٹو کے افسانوں کے ایسے اقتباسات کی بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ منٹو کے افسانے صرف منٹو نے نہیں بلکہ اس کے عہد کے حالات اور ضرورتوں نے لکھوائے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح جوگندر پال سے ''بازیافت'' اقبال مجید سے ''پیٹ کا کیچوا''، ''بیگ احساس سے ''حنظل'' ساجد رشید سے ''بانکا'' ترنم ریاض سے ''شہر'' اور خالد حسین سے ''ستی سر کا سورج'' اور شوکت حیات سے ''گنبد کے کبوتر'' ان کے عہد کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی حقائق اور حالات نے لکھوائے ہیں۔ کوئی بھی شاہکار فن پارہ مصنف نہیں لکھتا۔ وقت لکھواتا ہے۔

منٹو کی تکنیک سے متعلق ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ کرشن چندر اور بیدی کی طرح منٹو بھی پہلو بدل بدل کر حقیقت نگاری کرتا ہے۔ لیکن منٹو کے بیانیہ اور تکنیک کی جڑیں ''حقائق'' کے اندر بہت گہرائی میں پیوست ہوتی ہیں۔ اسی لیے بیدی اور کرشن کے مقابلے میں منٹو کا اسلوب بلکہ پورا افسانہ کہیں زیادہ ''حاضراتی'' ہوتا ہے، منٹو، بیدی اور کرشن چندر تینوں ہی افسانوی حقیقت نگاری کے نت نئے جلوے بکھیرنے میں ماہر ہیں۔ لیکن منٹو کی ہر افسانوی حقیقت کی معنویت، کردار، واقعات اور نقطۂ نظر کو سمیٹتی ہوئی قاری کے ذہن اور ضمیر کی طرف رُخ کرتی ہے اور اگر قاری ادب کی ادبیت (Literaryness of literature) کا حساس اور باذوق Recipient ہے تو پھر منٹو کے افسانے میں پیش کردہ حقیقت کی معنویت قاری کے اندرون میں کیفیت و تاثر کے جھماکے پیدا کرتی ہے اور تب قاری اس افسانہ کے بارے میں آزادانہ اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ ''نیا قانون''، ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''موذیل'' کے حوالے سے، منٹو کے افسانوں کی اس تکنیک کو زیادہ اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ منٹو کی افسانوی حقیقت کو کسی مخصوص یا ذاتی طے شدہ بندھے ٹکے زاویے سے نہیں دیکھا جا سکتا ہے منٹو نے اپنے ایک مضمون

''کسوٹی'' میں خود بھی کہا ہے:

''اس کی (فن کار کی) قلمی تصویروں میں بہت ممکن ہے آنسو اس کی بہن کے ہوں، مسکراہٹیں آپ کی ہوں، قہقہے ایک خستہ حال مزدور کے ___ اس لیے ''اپنے'' آنسوؤں، اپنی مسکراہٹوں اور اپنے قہقہوں کی ترازو میں ان تصویروں کو تولنا بہت بڑی غلطی ہے''

منٹو کی تکنیک کی ایک خاص بات اس کے افسانوں کی ڈرامائیت بھی ہے۔ منٹو کے اندر فی البدیہہ ڈرامے لکھنے کی خدا داد صلاحیت سے ہر شخص واقف ہے۔ منٹو پیدائشی ڈراما نگار تھا ''منٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ اُردو کا ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جاتا اور کرشن چندر سے پوچھتا۔ بولو بھئی۔ کس موضوع پر ڈرامہ لکھا جائے۔ موضوع سنتے ہی فوراً ٹائپ کرنا شروع کر دیتا اور شام تک مسودہ کرشن کو دے دیتا''۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں بھی اس سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ منٹو نے اکثر و بیشتر افسانوں کا اختتام ڈرامائی انداز میں کیا ہے۔ ''کھول دو''، ''ہتک'' اور ''پھوجا حرام دا'' اسکی عمدہ مثالیں ہیں۔

تکنیکی اعتبار سے منٹو کے اکثر افسانوں میں ٹھوس اور مطلق خیالات سے زیادہ زندہ اور متحرک تخیلی تصویریں ملتی ہیں۔ افسانہ اس طرح بیان ہوا ہے جیسے فلم چل رہی ہو۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ''منٹو صرف دماغ سے نہیں اپنے پورے حسیاتی نظام سے سوچتا ہے۔ اسی لیے منٹو کے افسانوں میں ایسی تشبیہیں ملتی ہیں جو صرف چونکاتی نہیں ہیں بلکہ مختلف و متضاد تجربوں کو منطقی اور حسیاتی دونوں اعتبار سے ایک دوسرے میں پیوست بھی کرتی ہیں۔ منٹو کی نادر و نایاب تشبیہ نگاری کی یہ مثالیں دیکھیے۔

۱۔ ''سردار بیگم دونوں کی نگاہ بازیوں کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے خلیفے اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ دیکھتے ہیں۔ (افسانہ۔ بابو گوپی ناتھ)

۲۔ ''کلثوم کے کولھوں پر گوشت زیادہ تھا۔ جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اُس نے قصائی کی دوکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا''۔ [افسانہ۔ ''دھواں'']

۳۔ ''اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ، وہی جاذبیت، وہی دھڑکن، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے کچے برتنوں میں ہوتی ہے''۔ [افسانہ۔ ''دھواں'']

۴۔ ''وہ رات کے اندھیرے میں چلنے والی ریل گاڑی ہے جو مسافروں کو اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا کر ایک آہنی چھت کے نیچے کھڑی رہتی ہے۔ بالکل خالی۔ دھوئیں اور گرد سے اٹی ہوئی''۔ [افسانہ۔ ''کالی شلوار'']

لیکن منٹو کے یہاں تشبیہ نگاری کی ایسی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں۔ کیونکہ منٹو بنیادی طور پر راست بیانیہ کو برتنے والا فنکار ہے۔ منٹو کے یہاں بیدی کی طرح استعارات اور اسطور کی نادیدہ گہرائیاں نہیں اور نہ وہ کرشن

چندر کی طرح تشبیہات سے مزین نثر لکھنے پر ہی یقین رکھتا ہے۔ منٹو کے یہاں بیانیہ کا امتیاز و انفرادیہ ہے کہ جو باتیں اس کے مشاہدے میں آتی ہیں۔ انھیں وہ عام روزمرہ کے الفاظ میں اپنی مخصوص تکنیک کے ساتھ اس طرح پیش کر دیتا ہے کہ ہر منظر ہر کردار زندہ، متحرک اور سہج انداز میں سامنے آکر قاری کے قلب ونظر اور ہوش وخرد و شکار کر جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثالیں، بلاوز، بابو گوپی ناتھ، موذیل، اور ممد بھائی وغیرہ میں ملتی ہیں۔ اور اسی بنا پر ماننا پڑتا ہے کہ منٹو کا بیانیہ۔ بیدی اور کرشن چندر کے بیانیہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ روح کو تڑپانے والا بیانیہ ہے کیونکہ منٹو کے یہاں عصری حالات سے فن کی سطح پر نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بیدی اور کرشن چندر سے کہیں زیادہ تھا۔

اور اب منٹو کے افسانوں کی تکنیک اور بیانیہ کے بارے میں ایک اور اضافی بات ___ یوں تو منٹو کا بیانیہ اپنے سیاق وسباق کے اعتبار سے ایک بے حد پر تاثیر سماجی وثقافتی بیانیہ Socio-Cultural Narration ہے، اسے طنزیہ اور آپریشنل بیانیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بیانیہ کی بھی کئی ذیلی صورتیں ہیں۔ سوسئیر کے نظریۂ لسان اور ساختیاتی اور ہیئت پسند مفکرین فرائی اور پروپ نے فکشن کی شعریات کے حوالے سے جو نظریات پیش کیے ہیں۔ ان سے بیانیہ یا (Narration) کے دو پہلو سامنے آرہے ہیں۔ (۱) ڈسکورس بیانیہ Discourse Narration اور (۲) افسانوی بیانیہ Story Narration ۔ ڈسکورس بیانیہ کا تعلق ماحول اور معاشرہ میں رونما ہونے والے اُتار چڑھاو، رواج اور طرز عمل سے ہوتا ہے بعض نمایاں تبدیلیوں کے باوجود ماحول اور معاشرہ تو وہی رہتا ہے لیکن سماجی، ثقافتی اور لسانی اقداری نظام (Value System) کی تبدیلیاں نا محسوس طور پر انسانی نفسیات کو متاثر کرتی رہتی ہیں اور اس وجہ سے ڈسکورس یعنی زندگی جینے، برتنے کے انداز، رواجات اور طور طریقے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ناول یا افسانہ میں ڈسکورس بیانیہ کا تعلق ناول یا افسانہ کی انھیں فکری، نظریاتی، مقصدی اور اطواری (Behavioural) تبدیلیوں سے ہوتا ہے اور اسی پر ناول یا افسانہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ دوسری طرف Story-Narration کا تعلق ناول یا افسانہ کے ان کرداروں، واقعات محسوسات اور تصورات وکیفیات سے ہوتا ہے۔ جن کو لے کر فکشن نگار تخیل وتصور کی مدد سے صنفی تقاضوں کے مطابق کرداروں کے حوالے سے کہانی بیان کرتا ہے۔ آسان الفاظ میں کہیں تو وہ بنیادی حقیقت یا تجربہ اور اس کے لوازمات جسے فکشن نگار ناول یا افسانہ کی بنیاد بناتا ہے اور جو ناول یا افسانہ کے اندر اور باہر ہر جگہ موجود ہو، ڈسکورس بیانیہ ہے اور اس بنیاد پر فکشن نگار جو ''کہانی'' بیان کرتا ہے اُسے افسانوی بیانیہ (Story Narration) کہتے ہیں مثال کے طور پر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تقسیم ملک کا المیہ، ''کھول دو'' میں، مذہب کے نام پر لامذہبیت کا مظاہرہ، ''ہتک''، ''کالی شلوار'' اور ''شاردا'' میں طوائفوں کا درد اور ان کی نفسیات، افسانہ ''سہائے''، ''آخری سلیوٹ'' اور ''ٹیٹوال کا کتا'' میں انسان دوستی، اور ہندو مسلم اتحاد وغیرہ ڈسکورس بیانیہ (Discourse Narrtion) کی مثالیں ہیں جو افسانہ کی بیانیہ سطح پر چھائے رہتے ہیں۔ لیکن جب انھیں حقائق، تجربات، تصورات، کیفیات اور محرکات کو فنی اور جمالیاتی تار و پود کے ساتھ افسانہ نگار افسانہ کے طور پر اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کا آغاز ارتقا اختتام اور تاثر

سب کچھ سامنے جاتا ہے تو وہ افسانوی بیانیہ Story-Narration کہلاتا ہے (یہ دوسری بات ہے کہ آج کے افسانہ میں آغاز ارتقا اور انجام کا تصور بدل چکا ہے)۔ مثلاً ٹوبہ ٹیک سنگھ میں دو قومی نظریہ سے ناواقف، تقسیم ہند کو قبول نہ کرنے والے بشن سنگھ کے دوبارہ اُجڑنے کے خوف اس کی بیٹی روپ کور کے ہندوستان چلے جانے کے کرب اس کا فضل دین سے بار بار پوچھنا کہ اس کا آبائی گاؤں ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے ہندوستان میں یا پاکستان میں۔ اور پھر بشن سنگھ کا Noman's Land میں گر کر مرجانا۔ ان ساری باتوں کا افسانہ کی شعریات کے حوالے سے بیان، افسانوی بیانیہ ہے۔

افسانوی بیانیہ کی کامیابی کا انحصار محض تراشے ہوئے مانوس یا غیر مانوس Defamiliar کرداروں پر نہیں ہوتا، ان کے ذہنی و جذباتی تحرک اور ان کے تفاعل پر بھی ہوتا ہے کیونکہ کرداروں کے تفاعل سے ہی پلاٹ اور کہانی میں جان پیدا ہوتی ہے۔ بیان ایک خوبصورت موڑ پر پہنچتا ہے۔ اور افسانہ کے اختتام پر واضح ہو جاتا ہے کہ جو افسانہ پڑھا گیا مثلاً ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''کھول دو''، ''ہتک'' یا ''نیا قانون'' اس میں منٹو نے جس آئیڈیالوجی یا ڈسکورس بیانیہ کا انتخاب کیا ہے آج اس کی معنویت کیا ہے اور کیوں ہے اور یہ بھی کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں افسانوی بیانیہ کو جس طرح مخصوص زبان اور محاورے میں قائم کیا ہے۔ وہ دوسروں سے منفرد کیوں ہے۔ ہے بھی یا نہیں۔ منٹو کا بیانیہ کبھی تو سیدھے سیدھا اور راست انداز میں سامنے آتا ہے۔ مثلاً ''ہتک''، ''شاردا''، ''پھوجا حرام دا'' اور ''ٹیٹوال کا کتا'' وغیرہ میں لیکن منٹو اکثر کسی کردار واقعہ، جذبہ احساس یا نظریہ کے حوالے سے بیانیہ کو تیکھا طنزیہ استعاراتی رنگ بھی دے دیتا ہے۔ مثلاً ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''موذیل'' وغیرہ میں۔ لیکن منٹو نے اکثر و بیشتر افسانوں میں سادہ اور استعاراتی دونوں طرح کے بیانیہ کو برتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو بیانیہ کا یہ انداز کرشن چندر، عصمت اور بیدی سب کے یہاں ملتا ہے۔ لیکن ایک چیز جو کرشن چندر اور بیدی یا کسی اور افسانہ نگار کے بیانیہ میں نہیں یا بہت کم ملتی ہے۔ جو صرف اور صرف منٹو سے ہی مخصوص ہے وہ ہے منٹو کی زبان کی کاٹ کبھی ایک لفظ (اونھ —— ہتک) کبھی ایک فقرہ (لے جاؤ اپنے اس مذہب کو۔ موذیل) افسانوی بیانیہ کی کلید ہی نہیں بن جاتا ہے بلکہ افسانہ کی ساری افسانویت اس ایک لفظ یا فقرے میں سمٹ آتی ہے اور قرأت کے تفاعل کے نتیجے میں افسانہ کے معنی و مفہوم تاثر اور کیفیت کے سارے دَر وا ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ منٹو کی معنویت کو برقرار رکھنے کے لیے، فکشن کی نئی شعریات کی رُو سے منٹو کے افسانوں کی تکنیک اور بیانیہ پر نئے سرے سے غور کرنا ضروری ہے۔ اس لیے بھی کہ آج برصغیر ہندو پاک کے حالات، منٹو کے عہد اور تقسیم ملک کے دنوں کے حالات سے زیادہ بدتر ہو چکے ہیں۔ بعض علمی سائنسی، تجارتی اور دفاعی ترقیوں سے قطع نظر سیاست، سماجیات اور اخلاقیات کے شعبوں میں کوئی پائدار تعمیری اقداری نظام (Value System) باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اگر ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''کھول دو''، ''آخری سیلوٹ'' اور ''ٹیٹوال کا کتا'' جیسے افسانوں کے ڈسکورس اور بیانیہ کی تہوں کو کھول کر دیکھیں تو محسوس ہوگا جیسے ہم آج بھی ۱۹۴۷ء کے آس پاس کے ماحول اور ذہنیت کے اندر ہی ہیں، منٹو کے افسانوں کی سچائیاں آج کہیں

زیادہ ننگی ہو چکی ہیں۔ مذہبی جنون، تہذیبی قومیت Cultural Nationalism، فرقہ واریت، فساد، مندوروں مسجدوں پر حملے، لوٹ، اغوا، عصمت دری اور ہندوؤں مسلمانوں کے بیچ بڑھتی ہوئی خلیج کے باوجود کوئی بشن سنگھ آج بھی اپنی جڑوں سے اُکھڑنا نہیں چاہتا۔ آج بھی کئی سراج الدینوں کو اپنی گم شدہ بیٹیوں کی تلاش ہے، سکینائیں آج بھی رضا کاروں اور کار یہ کرتاؤں کی وحشت کا شکار ہو رہی ہیں۔ منٹو ایسے سارے ڈسکورس اور متون کی جراحی کر چکا لیکن تعفن ابھی بھی باقی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ مختلف زاویوں سے منٹو کے افسانوں کی تکنیک اور بیانیہ پر غور و فکر کرنے کے ساتھ ساتھ کیا یہ بھی ضروری نہیں کہ منٹو کے افسانوں میں بین السطور موجود، انسان، انسانیت اور انسانی سماج کے اتھاہ درد، مشترکہ تہذیب اور فرقہ وارانہ اتحاد کے صادق جذبوں کی عصری معنویت پر سنجیدہ غور و فکر کی جائے۔ اس لیے بھی کہ آج ہندوستان اور پاکستان میں چھوٹی بڑی کالونیاں اور آبادیاں تو بہت ہیں لیکن ''سماج'' جیسے کہیں گم ہو گیا ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ منٹو نے'' آبادیوں کو نہیں 'متحدہ انسانی سماج'' کے اندھیروں اُجالوں کو اپنے بیانیہ کی بنیاد بنایا ہے اور ہمارے اقداری نظام، ڈسکورس اور بیانیہ کی تشکیل کے کم و بیش سارے مرحلے منٹو کے افسانوں میں موجود سماج میں ہی طے ہو چکے تھے۔ بہت ساری ترقیوں کے باوجود یہ ''متحدہ سماج'' آج بھی ہمارا آدرش ہے لہٰذا افسانے کی مروجہ شعریات کا احترام اپنی جگہ لیکن منٹو کے افسانوں کے سماج، ڈسکورس اور متون کے پیش نظر یہ لازم ہے کہ منٹو کے افسانوں کی تکنیک اور بیانیہ کا کل اور آج کی سماجی و ثقافتی صورت حال کے تناظر میں نئے زاویوں سے جائزہ لیا جائے اور منٹو کے فن کی عصری معنویت کی بازیافت نئی بستیوں کے ترجمان آج کے افسانہ نگاروں، سلام بن رزاق، مشرف الم ذوقی، بیگ احساس، ساجد رشید، ترنم ریاض، لالی چودھری، حسین الحق، شوکت حیات اور خالد جاوید کے افسانوں کے سماجی و ثقافتی سروکاروں کے حوالے سے کی جائے۔ ایسا کر کے ہی ہم منٹو کے افسانوں کی تکنیک اور بیانیہ کی تشفی بخش قدر شناسی کر پائینگے اور منٹو کی ہی زبان میں سمجھ پائیں گے کہ:

> ''ادب درجۂ حرارت ہے اپنے ملک کا، اپنی قوم کا ___ ادب اپنے ملک اپنی قوم، اس کی صحت اور علالت کی خبر دیتا رہتا ہے۔ پرانی الماری کے کسی خانے سے ہاتھ بڑھا کر کوئی گرد آلود کتاب اُٹھایئے ___ بیتے ہوئے زمانے کی نبض آپ کی انگلیوں کے نیچے دھڑکنے لگے گی۔ (مضمون: 'کسوٹی' ___ سعادت حسن منٹو)

Prof.Quddus Jawaid, BAITUL-ZEHRA,27,
Green Hills Colony, Near Govt. Sec. School Bhatindi,
JAMMU- 181152, (M) 9419010472

........☆........

منٹو کا سیاسی شعور

● علی احمد فاطمی

نفسیات کے ماہر فرائڈ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بچپن میں اگر معصوم ذہن کو مناسب شفقت اور توجہ نہ ملے اور وہ قدم قدم پر مایوسی ،محرومی اور سختی کا شکار ہو جائے تو نفسیاتی طور پر آگے بڑھ کر اس کے اندر دو طرح کے جذبے رونما ہوتے ہیں ۔خودکشی کرنے کا جذبہ یا انتقام لینے کا جذبہ۔

اردو کے ممتاز اور مقبول افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی شخصیت اور حیات کا بغور جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ کم و بیش کچھ ایسے ہی حالات تھے جو منٹو کی شخصیت و ذہنیت کو متزلزل کر گئے ۔گھر کا ماحول سخت اور والد اس سے زیادہ سخت ۔دوسری بیوی کی چھوٹی اولاد ہونا، شفقتوں اور محبتوں سے محروم ہونا۔سوتیلے بھائیوں کا اچھا سلوک نہ ہونا اور پھر کچھ منٹو کی اپنی افتادِ طبع ، ملک و معاشرہ کے سنگین ماحول نے بھی ایک پرت چڑھائی ۔ایک عجیب سی بے چینی و بے کلی عود کر آئی ۔ پڑھائی میں جی نہ لگتا۔ بار بار فیل ہوتے ۔آوارہ گردی کرتے ۔جوا کھیلتے اور بعد میں شراب بھی پینے لگے ۔ایک جگہ منٹو لکھتے ہیں ۔

> ''یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے آوارہ گردی شروع کر رکھی تھی ۔طبیعت ہر وقت اُچاٹ اُچاٹ سی رہتی تھی ۔ایک عجیب قسم کی کھدبُد ہر وقت دل و دماغ میں ہوتی رہتی تھی ۔ جی چاہتا تھا کہ جو چیز بھی سامنے آئے اسے چکھوں ،خواہ وہ انتہا درجے کی کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔تکیوں میں جاتا ۔قبرستانوں میں گھومتا تھا۔ جلیانوالا باغ میں گھنٹوں کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر کسی ایسے انقلاب کے خواب دیکھتا جو چشم زدن میں انگریزوں کی حکومت کا تختہ الٹ دے ۔''

انقلاب کے اسی خواب نے منٹو کو باری علیگ کے پاس پہنچادیا۔ باری علیگ ایک سمجھدار کمیونسٹ مفکر اور دانشور تھے۔ باری نے منٹو کے اس انتشار کو پڑھ لیا اور انھیں راستے پر لانے میں لگ گئے۔ انھیں بُری صحبتوں سے نکال کر کتابوں کی صحبت میں لا کھڑا کیا اور صرف مطالعہ ہی نہیں ایک نظریہ بھی دینے کی کوشش کی۔ باری صاحب اشتراکی تھے اور سُرخ انقلاب کے حامی۔ مارکس، لینن، ہیگل وغیرہ کی کتابیں منٹو نے انھیں کے توسط سے پڑھیں اور اشتراکیت کو قریب سے سمجھنے کی کوشش کی۔ باری علیگ 'مساوات' نام کا ایک رسالہ بھی نکالتے تھے۔ اب منٹو کا وقت مساوات کے دفتر میں گزرتا۔ انھیں دنوں باری صاحب کے کہنے پر منٹو نے وکٹر ہیوگو کی ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا اور 'مساوات' میں لکھنے بھی لگے۔ اس طرح افسانہ نگار منٹو پہلے ایک مترجم اور صحافی کے طور پر روشناس ہوا۔ منٹو باری صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "آج کل میں جو کچھ بھی ہوں اس کو بنانے میں سب سے پہلا ہاتھ باری صاحب کا ہے۔ امرتسر میں اُن سے ملاقات نہ ہوتی اور متواتر تین مہینے میں نے اُن کی صحبت میں نہ گزارے ہوتے تو یقیناً میں کسی اور ہی راستے پر گامزن ہوتا۔"

باری صاحب نے بھی منٹو کے بارے میں لکھا۔

> {'اگلے دن اس کتاب (ہیوگو کا ناول) کو بغل میں دبائے میرے دفتر پہنچ گئے۔ اپریل ۳۳ء مساوات کے فلمی کالم میں منٹو نمودار ہوا۔ منٹو کی ادبی زندگی کا یہ پہلا قدم تھا۔ جس پر وہ بہت شاد تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان سطروں کی اشاعت نے ہی سعادت کے اندر چھپے ہوئے افسانہ نگار کو بیدار کیا تھا۔ "

باری علیگ سے ملاقاتوں اور صحبتوں نے منٹو کے اندر صرف پڑھنے لکھنے کا شعور ہی نہیں بلکہ ترقی پسند شعور، سماجی شعور اور سیاسی شعور بھی بیدار کیا۔ اس پر منٹو کی بے چین طبیعت اور ملک کی بدتر حالت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اب اس کے گھر کا نام دارالاحمر تھا یعنی سُرخ گھر۔ کمرے کی دیواروں پر مارکس لینن وغیرہ کی تصویریں اور ایک کونے میں بھگت سنگھ کا مجسمہ۔ یہ سب تو منٹو کے کمرے میں تھا لیکن سینے میں انقلاب کی خواہش۔ آنکھ میں انقلاب کے خواب۔ منٹو کے بچپن کے دوست ابوسعید قریشی نے لکھا ہے۔

> "بھگت سنگھ کے بُت کے سامنے آویزاں تصویر کی آنکھیں پھر مری چشم تصور میں اُبھر رہی ہیں۔ ان خشمگیں نگاہوں کے سایہ میں پھر بڑی مصروفیت کا پتہ چلتا ہے۔ مگر موضوع گفتگو بدل چکا ہے فلمی ستاروں کے ادب و انقلاب زیر بحث ہیں۔ کمرے کی فضا ایکٹروں کے قصیدوں کے بجائے والیٹر۔ روسو۔ مارکس لینن اسٹالن اور گورکی کے تذکروں سے گونج رہی ہے۔"

باری علیگ نے ہی منٹو کے اندر اشتراکی ادب پڑھنے کا جذبہ پیدا کیا اور انھوں نے ہیوگو کے ناول

کا ترجمہ 'سرگذشت اسیر' کے نام سے کیا۔ اس کے بعد منٹو نے آسکر وائلڈ کے ڈراما کا ترجمہ 'ویرا' کے نام سے کیا جو ایک سیاسی ڈرامہ تھا اور روس کے دہشت پسندوں اور نراجیوں کی سرگرمیوں سے متعلق تھا۔ اس طرح ادب اور سیاست دونوں منٹو کے ذہن میں اپنی جگہ بنانے لگے۔ وہ گورکی، چیخوف، پشکن، گوگول، دوستوسکی، موپاساں وغیرہ کو پڑھ کر گرما گرم بحثیں کرنے لگا۔"

منٹو اور ان کے دوست حسن عباس نے مل جُل کر کئی کام کیے۔ باری صاحب پر مضمون لکھتے ہوئے منٹو نے خود لکھا ہے :

"کہاں ماسکو کہاں امرتسر۔ مگر میں اور حسن عباس نئے نئے باغی تھے دسویں جماعت میں دنیا کا نقشہ نکال کر ہم کئی بار خشکی کے رستے روس پہنچنے کی اسکیمیں بنا چکے تھے۔ حالانکہ ان دنوں فیروز الدین منصور بھی کامریڈ ایف۔ ڈی منصور نہیں بنے تھے۔ اور کامریڈ سجاد ظہیر بنے میاں تھے۔ ہم نے امرتسر ہی کو ماسکو تصور کرلیا تھا اور اسی کے گلی کوچوں میں مستبد اور جابر حکمرانوں کا عبرت ناک انجام دیکھنا چاہتے تھے۔"

یہ سب تو منٹو نہیں کر پائے لیکن گورکی پر مضامین لکھے اور افسانوں کے ترجمے بھی کیے۔ 'عالمگیر' کا روسی ادب نمبر ترتیب دیا۔ اشتراکی شاعری اور روسی ادب پر مضامین لکھے۔ اس زمانے وہ اپنے نام کے ساتھ مُفکّر اور کامریڈ بھی لکھتے تھے۔

اچانک گرفتاری کے خوف سے باری علیگ نے مساوات بند کردیا اور لاہور چلے گئے۔ منٹو کے سامنے دقتیں آئیں۔ باری نے لاہور سے خلق نکالنا شروع کیا اور منٹو سے لکھنے کو کہا۔ منٹو نے اسی رسالہ میں اپنا پہلا طبع زاد افسانہ 'تماشہ' لکھا۔

اس زمانے میں اختر شیرانی کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ "اے عشق کہیں لے چل" کا مصرعہ نعرہ بن کر ادبی دنیا میں بالعموم اور پنجاب کے ادبی ماحول میں بالخصوص گونج رہا تھا۔ افسانوی مجموعہ 'انگارے' کی اشاعت (۱۹۳۲) اور پابندی کی ہنگامیت بھی اسی کے آس پاس ہوتی ہے۔ آزادی اور غلامی کی آوازیں چاروں طرف گونج رہی تھیں۔ انقلاب کے نعرے بلند ہورہے تھے۔ منٹو اس ماحول میں نہ ڈھلے ہوں یہ ممکن ہی نہ تھا۔ اس وقت کا منٹو کا ذہن بقول وارث علوی۔۔۔

"منٹو کا فنکارانہ تخیل حقیقت پسند اور شہری تھا۔ اس کے فکری، اخلاقی، سماجی رویے بھی بڑی حد تک ریڈیکل۔ لبرل اور جدید تھے۔"

اب میں ان کے چند ان افسانوں پر گفتگو کروں گا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس عہد کی سیاست سے متاثر ہوکر لکھے گئے یا جن میں منٹو کا گہرا یا ہلکا سیاسی شعور جھلکتا نظر آتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا منٹو کا پہلا طبع زاد افسانہ 'تماشہ' ہے جو محض بائیس تیئس سال کی عمر میں لکھا گیا

جوان کے پہلے مجموعہ 'آتش پارے' میں شامل ہے۔اس افسانے کو سمجھنے کے لیے اس زمانے کی سیاست اور انگارے کی اشاعت کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔

کم عمر خالد آسمان میں اُڑتے اور چیختے ہوئے طیاروں سے خوفزدہ ہے پھر اپنے کھلونے والی بندوق سے اسے مار گرانے اور انتقام لینے کی بات اپنے والد سے کرتا ہے۔والد اس کی اس جسارت پر حیران ہے۔ اسی مقام پر مصنف نے یہ جملہ بھی لکھا ہے ــــ ''کاش انتقام کا یہی جذبہ ہر شخص میں تقسیم ہو جائے ــــ ''اس جملہ سے وطن پرستی کے جذبہ کا اظہار تو ہوتا ہی ہے نیز منٹو کے اُس سیاسی شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے،اس کیفیت کا بھی جہاں انتقام سے نیچے کوئی سمجھوتہ نہیں ــــ پریم چند نے دنیا کا سب سے انمول رتن میں وطن پرستی کے جذبہ کو شریفانہ انداز سے پیش کیا تھا لیکن منٹو انتقام کے علاوہ کچھ اور نہیں سوچتا جس سے اس کی ذہنی کیفیت اور شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔جس کو دیکھ کر والدین فکر مند ہوتے ہیں اور احتیاط کی ہدایت دیتے ہیں۔شام کہیں جلسہ ہوتا ہے جسے تماشا کہا گیا ہے لیکن اس سے قبل گولی سے ایک لڑکے کا زخمی ہونا،مر جانا اور پھر یہ جملہ ــــ ''آہ موت بھیانک ہے ــــ مگر ظلم اس سے کہیں زیادہ خوفناک اور بھیانک ہے۔''اس جملے میں منٹو کا انسانی،سماجی اور ترقی پسند شعور تو جھلکتا ہے ساتھ ہی وہ سیاسی شعور بھی جو اس عہد کی سیاست کو،تصادم کو سمجھے بغیر ممکن نہ تھا۔یوں بھی تخلیق میں سیاسی شعور،انسانی شعور میں ڈھل کر دردمندی اور کہیں کہیں فکرمندی کے حوالے سے ظاہر ہوا کرتا ہے جیسے خالد میں ہوا کہ وہ اس لڑکے کی موت پر رونے لگتا ہے۔ماں باپ پریشان ہوتے ہیں تو وہ سوال کرتا ہے ــــ ''امّی اس لڑکے کو کس نے مارا؟'' دل بہلانے والے جواب پر کہانی ختم تو ہوتی ہے لیکن معصوم خالد خدا سے دُعا کرتا ہے کہ......''جس نے یہ گولی چلائی ہے خدا اس کو سزا دے۔''کم عمری میں ناپختہ ذہن سے لکھی جانے والی پہلی کہانی فکری اعتبار سے بہت مضبوط تو نہیں لیکن اس عہد کے ماحول اور اس سے زیادہ منٹو کی سوچ اور جذبہ کی عمدہ ترجمانی کرتی ہے۔خالد کوئی اور نہیں خود منٹو ہے۔جو نئی نسل کا نمائندہ ہے اور قدم قدم پر سوال کرتا ہے۔معصوم ذہن کھلونے کی بندوقوں سے ظلم کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے اور جب بس نہیں چلتا تو سوتے سوتے اور روتے روتے خدا سے دُعا کرتا ہے کہ تو ہی ظلم کا خاتمہ کر دے۔

یوں تو منٹو کے پہلے افسانوی مجموعہ آتش پارے کے زیادہ تر افسانے قلی،مزدور،ملازم اور عام لوگوں کے مسائل و مصائب پر لکھے گئے ہیں اور ان افسانوں میں اس طرح کے جملے ملتے ہیں ـ

''قلیوں کی زندگی بھی گدھوں سے بدتر ہے ــــ '' (خونی تھوک)

''اتنا وزن تو شہر کا فاقہ زدہ مزدور گھنٹوں پشت پر اُٹھائے پھرتا ہے۔'' (طاقت کی امتحان)

''میں آہوں کا بیوپاری ہوں
لہو کی شاعری میرا کام ہے '' (دیوانہ شاعر)

''ہر وہ چیز جو تم سے چھین لی گئی تمھیں حق حاصل ہے کہ اُسے ہر ممکن طریقہ سے اپنے قبضہ میں لے آؤ۔'' (چوری)

ان افسانوں کے بارے میں خود منٹو نے کہا تھا

''یہ افسانے دبی ہوئی چنگاریاں ہیں۔ ان کو شعلوں میں تبدیل کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے ـــــ'' ۱۹۳۵ء

'آتش پارے' عنوان کو بھی ہم 'انگارے' اور 'سوزِ وطن' سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ افسانے اگر چہ معمولی ہیں لیکن نوجوان منٹو کے اشتراکی وانقلابی ذہن اور سماجی وسیاسی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ امرت سر میں گزرنے والے یہ وہ دن تھے جب باری علیگ کی ذہنی تربیت نے انھیں کمیونسٹ بننے پر مجبور کیا اور وہ شدت پسند کمیونسٹوں کی طرح نہ صرف اشتراکی سماج کے خواب دیکھ رہے تھے بلکہ سُرخ انقلاب کے بھی حامی تھے۔ بقول شکیل صدیقی :

''منٹو کی تخلیقی شخصیت کا ارتقا سماجی بدلاو کے انقلابی خیالات کے تئیں جھکاو کے ساتھ ہوا۔ اتفاق سے یہ دونوں عمل امرت سر میں ہوئے۔ ان کی غیر معمولی دلچسپی پہلے کمیونسٹ بننے میں ہوئی۔''

خود منٹو نے ایک جگہ لکھا ہے :

''میں اور حسن عباس نئے نئے باغی تھے۔ دسویں جماعت میں دنیا کا نقشہ نکال کر کئی بار خشکی کے راستے روس پہنچنے کی اسکیمیں بنا چکے تھے۔''

اسی دور میں اپنے ایک مضمون ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ میں لکھتے ہیں :

''یاد رکھیے وطن کی خدمت شکم سیر لوگ کبھی نہ کر سکیں گے۔ وزنی معدے کے ساتھ جو شخص وطن کی خدمت کے لیے آگے بڑھے اسے لات مار کر باہر نکال دیجیے۔ اگر کوئی ریشمی کپڑے پہن کر آپ کی غربت کا حال بتانے کی جرأت کرے تو اسے اُٹھا کر وہیں پھینک دیجیے جہاں سے نکل کر وہ آپ لوگوں میں آیا تھا۔''

کارل مارکس پر مضمون لکھتے ہوئے بھی انھوں نے کہا :

''سوویت روس اب خواب نہیں ہے خیالِ خام نہیں، دیوانہ پن نہیں۔ ایک ٹھوس حقیقت ہے ـــــ وہ اشتراکیت جو کبھی سر پھرے لونڈوں کا کھیل سمجھا جاتا تھا ـــــ وہی اشتراکیت جو ننگِ دین اور ننگِ انسانیت سمجھی جاتی تھی آج روس کے وسیع ''عریض میدانوں میں بیمار انسانیت کے لیے امید کی ایک کرن بن کر چمک رہی ہے۔''

امرت سر کے ٹھیک اسی دور میں منٹو کے انھیں انقلابی نظریات کے تحت ان کے قلم سے نیا قانون

(۴۷ء) جیسا غیر معمولی افسانہ وجود میں آتا ہے جو منٹو کے دوسرے مجموعہ منٹو کے افسانے میں شامل ہے۔ اس مجموعہ میں منٹو کا پیش لفظ بھی شامل ہے جو در اصل وہ مقالہ تھا جو ''ادب جدید'' کے عنوان سے جوگیشوری کالج ممبئی میں پڑھا گیا تھا جو شروع ہی ہوتا ہے گاندھی جی کے حوالے سے۔ یہ مقالہ ممبئی میں پہنچے ہوئے منٹو کو سمجھنے کے لیے معاون ہے۔ لیکن نیا قانون، امرت سر میں ہی لکھا گیا جب وہ اشترا کی تھے اور سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ہر چند کہ ترقی پسند تنظیم کی بنیاد پڑ چکی تھی اور چاروں طرف احتجاج و مزاحمت کی فضا بنی ہوئی تھی لیکن منٹو کے احتجاج کا انداز الگ سا تھا جو منگو کوچوان کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے جو عام انسانوں کی طرح انگریزوں سے نفرت کرتا ہے اور انتقام بھی لیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں منگو روز روز کے فرقہ وارانہ فسادات کو بھی لے کر عاجز و پریشان ہے کیونکہ اسے پتہ ہے کہ یہ فسادات تحریک آزادی اور اتحادِ وطن کو بُری طرح متاثر کر رہے تھے۔ منگو اس سے بھی معصومانہ طور پر واقف ہے کہ انگریز حکومت ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر چل رہی ہے لیکن منگو کو کانگریس کا رویہ بھی پسند نہیں ہے اسی لیے ایک جگہ کہتا ہے :

> ''یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں ___ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں گے تو بھی کچھ نہ ہوگا ___ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا یا وہ روس والا ___ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔''

منگو کی زبان سے منٹو بول رہے ہیں۔ منگو انگریز کو مار کر انتقام لیتا ہے۔ یہ منٹو کے شدت پسند جذبات و احساسات ہیں۔ انھیں جذبات کے تحت وہ کانگریس کو ناپسند کرتے ہیں اور بمبئی پہنچ کر ایک نئے منٹو کا جنم ہوتا ہے۔ سیاسی نظریہ گہرے سماجی شعور میں بدل جاتا ہے اور وہ ترقی پسندوں سے بھی اختلاف کرنے لگتے ہیں۔ اس لیے ان کے زیادہ تر سیاسی ذہن کے افسانے امرت سر کے قیام کے دنوں میں لکھے گئے، بعد میں چند پاکستان جانے پر۔ امرت سر کے قیام کے دوران انھوں نے ایک اور سیاسی نوعیت کا افسانہ ''1919 کی ایک بات'' لکھا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سیاسی اور آزادی کی تاریخ میں جلیاں والا باغ ایک المناک حادثہ کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ منٹو نے اس حادثہ سے متعلق بیحد عمدہ اور اثر انگیز کہانی لکھی ہے جو شروع ہوتی ہے بالکل سیاسی انداز سے۔ ایک چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی کو آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے۔ کہانی کے انداز میں صورتِ حال کا بیان۔ بھیڑ میں منٹو نے ایک عام کردار کو پیدا کیا جو ایک طوائف کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کچلو اور ستیہ پال کی جلاوطنی کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ کئی انگریز ہلاک ہوئے تو جواباً جلیاں والا باغ کا حادثہ ہو گیا۔ تھیلا کنجر نے کئی انگریزوں کو مارا اور پھر خود شہید ہو گیا۔ منٹو کی سیاست یا حقیقت کا یہ ایک وصفِ خاص ہے کہ وہ افسانہ میں سیاست کو سماج اور سماج کے عام اور معمولی انسانوں کے حوالے سے دیکھتے اور پیش کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں انقلاب برپا کرنے اور جان دینے والوں میں پہلے عام انسان ہی سینے پر گولی

کھاتے ہیں لیکن سرخرو ہوتے ہیں خاص سیاست داں۔ اسی کہانی میں ایک جگہ کہتے ہیں :

''بھائی جان میں نے کہیں پڑھا تھا کہ فرانس کے انقلاب میں پہلی گولی وہاں کی ایک نکھیائی کے لگی تھی۔ مرحوم تھیلا یعنی محمد طفیل ایک طوائف کا لڑکا تھا۔ انقلاب کی اس جدوجہد میں اس کے جو پہلی گولی لگی تھی دسویں تھی یا پچاسویں، اس کے متعلق کسی نے بھی تحقیق نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ اس غریب کا کوئی رتبہ نہیں تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ پنجاب کے اس خونیں غسل میں نہانے والوں کی فہرست میں کنجر کا نام ونشان تک بھی نہ ہوگا۔ اور یہ بھی کون جانتا ہے کہ ایسی کوئی فہرست تیار بھی ہوئی تھی۔''

براہِ راست سیاسی حادثے پر کہانی لکھنا، امرت سر اور ہندوستان کا سیاسی ماحول پیش کرنا اور اسے کنجر کے ذریعہ معنی خیز بنانا یہ منٹو کا گہرا سماجی وسیاسی شعور تو ہے ہی فنی شعور بھی ہے۔ کیونکہ اسے علم ہے کہ وہ کوئی سیاسی واقعہ نہیں لکھ رہا ہے بلکہ کہانی لکھ رہا ہے اور کہانی کے اپنے تقاضے ہوا کرتے ہیں جو اس کہانی میں عمدہ طریقہ سے پیش ہوئے ہیں۔ بقول خالد اشرف :

''۱۹۱۹ء کی ایک بات کو منٹو کے ترقی پسند افسانوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ افسانہ صرف اردو فکشن میں ایک اہم مقام رکھتا ہے بلکہ اپنے عصر کی سیاسی اور سماجی تاریخ کے بطور بھی قابلِ توجہ ہے۔''

منٹو کی ایک اور کہانی ہے سوراج کے لیے ۔ اس کہانی کی اشاعت اگرچہ ۱۹۵۰ء کے آس پاس کی ہے لیکن یہ ۱۹۴۲ء کی تحریک کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ اس میں ایک طرف تحریک آزادی کے زیروبم کو دکھایا گیا ہے تو دوسری طرف سیاسی بدلاو کے کیف وکم کو بھی جن پر منٹو گہری نظر رکھتا ہے۔ یوں بھی امرت سر کا خونی حادثہ جب ہوا تھا تو اس وقت وہ صرف سات سال کے تھے اور امرت سر میں تھے۔ بچپن کا یہ حادثہ زندگی بھر ان کے اعصاب پر سوار رہا۔ ایک مخصوص تلملاہٹ یا چھٹپٹاہٹ ہمیشہ ان کے ذہن پر سوار رہی۔ نوجوانی کے ان دنوں میں بطور خاص بعد میں اس کی شکلیں بدلتی گئیں۔ ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں :

''میرا حال بھی ان دنوں دگرگوں تھا، جی چاہتا تھا کہ کہیں سے پستول ہاتھ آجائے تو ایک دہشت گرد پارٹی بنائی جائے۔ باپ گورمنٹ کا پنشن خوار تھا۔ اس کا مجھے کبھی خیال نہ آیا۔ بس دل ودماغ میں ایک عجیب سی کھد بد رہتی تھی۔''

اس بے چین اور انتقامی طبیعت نے منٹو کو معقول سیاسی اور انقلابی شخصیت تو نہیں بننے دیا لیکن انھوں نے اس دہشت یا وحشت کو شکلیں بدل بدل کر اپنے افسانوں میں ضرور انڈیل دیا___ اس کہانی میں بھی دہشت ہے، نعرے ہیں، طرح طرح کے سوالات ہیں جو منٹو کے تیکھے اور گہرے سیاسی شعور کا پتہ دیتے ہیں لیکن ان میں ایک خاص قسم کی جذباتیت ہے اور معصومیت بھی۔ اسی سے اس میں گاندھی جی کے صوفیانہ نوع کی

سیاست سے اختلاف کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں افسانہ غیر فطری سا ہو گیا ہے۔ اس لیے اس کو منٹو کے عمدہ افسانوں میں شامل کرنا مشکل ہے لیکن اب میں ان کی شہرۂ آفاق کہانی ٹوبہ ٹیک سنگھ جو ایک پاگل خانے کی کہانی ضرور ہے لیکن اس کو کسی بھی طرح تقسیم کی سیاست اور ہندو و مسلم فرقہ واریت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

۱۹۴۸ء میں جب منٹو پوری کشمکش اور تذبذب کے عالم میں پاکستان چلے گئے تو وہاں بھی ان کی زندگی بے چین و بیقرار رہی۔ وہ تقسیم کو دل سے قبول نہ کر سکے۔ اس انتشار و عذاب میں ان کا ذہنی توازن بھی بگڑا اور وہ پاگل بھی قرار دیے گئے۔ پاگلوں کو لے کر لکھی گئی کہانی یونہی نہیں ہے بلکہ اس کہانی میں جہاں تقسیم کے بعد کے سماجی المیے ہیں وہیں دوسری طرف خود منٹو کا ذاتی غم اور کرب کچھ اس انداز سے جھلک پڑا ہے کہ بعضوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ بشن سنگھ کوئی اور نہیں خود منٹو ہے۔ بہر حال خالد اشرف کا یہ خیال صدفی صد دُرست ہے:

> ''منٹو خود لاہور کے ذہنی معالج خانے میں داخل ہوئے تھے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ شاید اسی ذاتی تجربہ کی دین ہے۔''

یوں تو کہانی مٹی اور زمین کی تقسیم کی بنا پر انسان کے داخلی انتشار کو پیش کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ جو سیاست ہے اور اقتدار کی سازش ہے اور صدیوں کے اتحاد اور تہذیب پر جو ضرب ہے وہ خارجی سیاست کے عوامل اور منٹو کی سماجی اور سیاسی سوچ کو پیش کرتی ہے۔ منٹو نے اس سیاست کو انسانی دردمندی، وطن سے محبت، زمین سے پیار کی شکل میں پیش کیا ہے، وہ لاجواب ہے اور جو کردار گڑھے ہیں وہ لازوال ہیں۔ پاگلوں کے کردار کے ذریعہ منٹو نے کئی طرح کے بلیغ اشارے کیے ہیں۔ اوّل تو باہوش سیاست دانوں کے احمقانہ فیصلوں کا پاگل مذاق اُڑاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اقتدار، طاقت، حکومت کے نشہ میں یہ دنیا پاگل خانہ ہو گئی ہے اور سیاست داں پاگل اور یہ بھی کہ مذہب کے نام پر تقسیم پاگلوں تک کو منظور نہیں لیکن سیاست دانوں کو منظور ہے۔ ایک اور اشارہ وارث علوی یوں کرتے ہیں:

> ''تاریخی اُتھل پتھل کے زمانے میں آدمی آدمی نہیں رہتا۔ ایک ہیجان، ایک اشتعال، ایک اضطراب بن جاتا ہے۔''

آخر میں یہ بھی کہتے ہیں:

> ''بڑے سیاسی فیصلوں اور تاریخی حادثات کا اثر انسان کے ذہن، اس کے عمل، اس کے قرینۂ حیات اور اس کے پورے وجود کو متاثر کرتا ہے ____ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اکثر ہمیں ہمارے سیاسی سوالوں کے جواب ہماری لاشوں پر ہی لکھے جاتے ہیں۔''

منٹو نے تقسیم اور اس سے متعلق فسادات پر متعدد متاثر کن افسانے لکھے ہیں۔ ہر چند کہ اس کے پس منظر میں اس عہد کی سیاست کام کر رہی ہے تاہم منٹو نے اسے زیادہ تر سماجی اور انسانی مسائل بنا کر پیش کیا

ہے۔ کچھ اور ایسے افسانے ضرور ہیں جو براہ راست سیاست کو موضوع بنا کر لکھے گئے ہیں مثلاً نعرہ ، سہانے ، سوراج کے لیے وغیرہ لیکن یہ سب معمولی افسانے ہیں۔ کچھ مضامین، تبصرے بھی ایسے ہیں جن میں عجیب و غریب قسم کی باتیں اور وضاحتیں ہیں۔ دراصل منٹو براہ راست سیاسی انسان نہ تھے۔ ایک خاص پُر انتشار عہد اور امرت سر میں آنکھ کھولنے اور باری علیگ کے زیر سایہ غور وفکر کا آغاز کرنے کی وجہ سے وہ اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات سے آنکھیں نہیں چُرا سکتے تھے اس لیے اندر کے فنکار نے ایسا سوچنے اور لکھنے پر مجبور کیا ورنہ زیادہ تر نچلے طبقہ کے کرداروں پر سوچتے رہے اور ان کے اندر کی پوشیدہ و پیچیدہ حقیقتوں کو چونکا دینے اور کبھی کبھی لرزا دینے والی کیفیت پیش کرتے رہے حالانکہ ان سب کے پیچھے بھی اگرچہ ان کا سیاسی اور سماجی شعور ہی کام کر رہا ہے لیکن بمبئی پہنچ کر اس نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی جن میں منٹو کی اپنی افتادطبیعت، اندر کی شراری کیفیت بلکہ کبھی کبھی شرارت بھی داخل ہو گئی تھی۔

میں یہاں ان کی ایک اور کہانی کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا، جس میں بڑی حد تک اصل منٹو کو سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ کہانی ہے انقلاب پسند جو اگرچہ ان کے ابتدائی دور کی کہانی ہے لیکن منٹو کھڑے رہے اس بنیاد پر۔ یہ کہانی دو دوستوں کی ہے اور اس جملہ سے شروع ہوتی ہے ـــــ

''میری اور سلیم کی دوستی کو پانچ سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔''

ان میں سلیم منٹو ہے اور میں حسن عباس جو واقعی منٹو کے بچپن کا دوست رہا ہے۔ پوری کہانی سلیم یعنی منٹو کی لاابالی، بے چین اور باغی شخصیت پر لکھی گئی ہے۔ بار بار اس قسم کے جملے آتے ہیں ـــــ

''والد کی ناگہانی موت نے اس کے متبسم چہرے پر غم کی نقاب اُڑھا دی، اب کھیل کود کی جگہ غور وفکر نے لے لی۔''

سوال یہ ہے کہ اس غور وفکر کو کوئی نظریہ ملا ـــــ یہ ضرور ہوا کہ اُس کے اندر کا فنکار ضرور بیدار ہوا لیکن اپنی عجیب وغریب عادتوں اور حرکتوں کی وجہ سے ہمیشہ یہ سوال قائم رہا بقول دوست ـــــ ''میں نے سلیم کی نفسیات سمجھنے کی بہت کوشش کی۔ مگر مجھے اس کی منقلب عادات کے ہوتے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کن گہرائیوں میں غوطہ زن ہے۔'' لیکن ساتھ ہی وہ سلیم کے ذریعہ یہ جملے بھی لکھتے ہیں:

''تم نہیں جانتے میں انقلاب پسند ہوں
تمہاری قسم بہت بڑا انقلاب پسند ''

منٹو واقعی انقلاب پسند تھا' یہ الگ بات ہے کہ اس کی انقلابیت میں جذباتیت و رومانیت زیادہ تھی۔ اپنے دوسرے مجموعے ''منٹو کے افسانے'' کے پیش لفظ میں وہ صاف طور پر کہتے ہیں:

'' جب سے جنگ شروع ہوئی ہے۔ ادب سے ایک نئے زاویے سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ ہر روز ہزاروں انسانوں کا خون مٹی میں مل رہا ہے تو لکھنے والے خاموش کیوں

ہیں ـــــ دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے۔ ہر لحظہ، ہر گھڑی ایک نئے طوفان کا پیغام لا رہی ہے مگر ان کے دل و دماغ پر ایسا جمود طاری ہے کہ دور ہی نہیں ہوتا۔''

اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں :

''ہندو و مسلم فساد میں اگر کوئی میرا سر پھوڑ دے تو میرے خون کی ہر بوند روتی رہے گی۔ میں آرٹسٹ ہوں۔ اوچھے زخم اور بھدے گھاؤ مجھے پسند نہیں ـــــ''

''میں انھیں غریبوں کے ننگے بچے دکھا دکھا کر یہ پوچھتا ہوں کہ اس بڑھتی غربت کا علاج کیا ہے۔''

اس سے زیادہ انقلاب پسندی اور ترقی پسندی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود وہ آگے بڑھ کر اپنے کو ترقی پسند کہلانے میں تکلف برتتا ہے بلکہ کبھی کبھی ترقی پسندی کا مذاق بھی اُڑاتا ہے۔ حد یہ کہ سجاد ظہیر کو مسخرہ اور ترقی پسندوں کو بے سُرا کہتا ہے۔ غالباً یہ سب کچھ اگر ایک طرف منٹو کی شدت پسند طبیعت کی وجہ سے ہوا تو دوسری طرف ترقی پسند ادیبوں و نقادوں کی ہدایت، جارحیت وغیرہ کی وجہ سے بھی ہوا۔ درمیان میں معاصرانہ چشمک بھی تھی۔ منٹو کی خود دار و بے باک شخصیت کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ تخلیق کاروں میں بیدی، کرشن، اشک، ندیم وغیرہ اس کے ہم عصر تھے اور دوست بھی لیکن منٹو کی چونکا دینے والی مقبولیت اور لرزا دینے والی بے باکی ان سب کے لیے کہیں نہ کہیں نفسیاتی مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ انھیں سب صورتوں کے پیش نظر اپنے پیش لفظ میں ترقی پسند ادب کے بارے میں منٹو نے یہ کہا :

''سب سے بڑا الجھاؤ اس ترقی پسند ادب کے بارے میں پیدا ہوا ہے حالانکہ پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ادب یا تو ادب ہے ورنہ ادب نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے ـــــ کہا جاتا ہے کہ منٹو ترقی پسند انسان ہے۔ یہ کیا بے ہودگی ہے۔ سعادت حسن منٹو انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔ میں زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کا خواہش مند رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب ترقی کریں آج آپ طالب علم ہیں ترقی کرتے کرتے کل آپ بھی اپنے آئیڈیل تک پہنچ جائیں۔''

منٹو کی تمام تر عظمتوں کے اعتراف کے باوجود شاید کہیں دبا دبا سا یہ سوال اُٹھتا ہے کہ کیا غیر معمولی افسانے لکھنے کے باوجود منٹو اپنے آئیڈیل کو پہنچ پائے اور ان کا آئیڈیل کیا تھا؟ ادب کی وہ عظمت جس میں انسان کی حقیقت کے متوازی رومان اور تخیل کے عناصر بھی کام کرتے رہتے ہیں۔ منٹو اپنے افسانوں میں ترقی پسندی اور اشتراکیت کی اُس کلپنا کو برت پائے جس کے بغیر۔ تھارتھ ادھورا ہوتا ہے۔ یہ ایک طالب علمانہ سوال ہو سکتا ہے لیکن بہر حال جنم لیتا ہے منٹو کی عظمت کے بطن سے کہ ہر بڑا ادیب و ادب اپنے پیچھے جلال و جمال تو

چھوڑتا ہی ہے سوال بھی چھوڑتا ہے۔ منٹو نے تو اور آگے بڑھ کر سوال ہی نہیں نجانے کتنے تازے اور جھگڑے بھی چھوڑے ہیں۔ کیا ایک صحیح معنوں میں ترقی پسند قاری یا ناقد منٹو کے اس جملے سے صد فی صد متفق ہوسکتا ہے :

''زندگی کو ایسے رنگ میں پیش کرنا چاہیے جیسی کہ وہ ہے نہ کہ وہ جیسی تھی یا جیسے ہوگی اور جیسی ہونی چاہیے۔''

''اگر ہونی چاہیے'' کا تصور ایک سرے سے غائب کردیا جائے تو اس رومانی تصور کا کیا ہوگا جو فنکارانہ حقیقت کا لازمی جزو ہوا کرتا ہے ایک جگہ منٹو اور لکھتے ہیں ''ادب اپنے ملک اپنی قوم اس کی صحت اور علامت کی خبر دیتا رہتا ہے۔'' کیا ادب کا کام صرف خبر دینا ہوتا ہے پھر اس خواب کا کیا ہوگا جو ہر معقول حساس اور سنجیدہ ادیب و فنکار بیدار آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اپنے تخیل و تصور اور فن کے ذریعہ اپنے فن پارے میں جذب کردیتا ہے۔ اگر ایسا ضروری نہیں ہے تو منٹو اپنے دیباچہ میں یہ کیوں کہتے ہیں ——— ''میں زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کا خواہش مند ہوں۔'' اور یہ بھی ——— :

''آج کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کی کتابیں ایم۔ اسلم، تیرتھ رام فیروز پوری، امتیاز علی تاج، عابد علی عابد کے مقابلے زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ کرشن چندر اور اس کے ہم عصر نوجوانوں نے زندگی کے نئے تجربے بیان کیے ہیں ——— نئے خواب دیکھتے ہیں ———''

کرشن چندر نے عابد سہیل سے کہا تھا ——— ''سہیل خواب دیکھنا بند مت کرنا۔''

کہ خوابوں سے ہی حقیقت کا سفر طے ہوتا ہے اور ایک نئے انسان اور انسانی معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ کہنا تو غلط ہے کہ منٹو کے پاس خواب تھے ہی نہیں کہ جس نے ابتدائی اسٹیج پر ہی اشتراکیت کو سمجھ لیا ہو اور دنیا پر نظر گڑا دی ہو وہ خوابوں سے الگ کیسے ہوسکتا ہے لیکن اس کی مخصوص انا گیر طبیعت جو بمبئی پہنچکر کچھ زیادہ ہی سخت گیر ہوگئی ——— بمبئی کی کھولی اور کھو کھلی زندگی نے اسے ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا تھا جہاں کڑوی اور ننگی حقیقتیں منھ پھیلائے کھڑی تھیں ——— جس کو دیکھ کر منٹو کی انا نے غصہ اور انتقام کا روپ لے لیا تبھی تو سلیم کے کردار میں وہ صاف کہتا ہے :

''میں ایک دبی ہوئی آواز ہوں۔ انسانیت ایک منھ ہے اور میں اس کی ایک چیخ۔ میں اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں مگر وہ میرے خیالات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر اسی لیے کہہ نہیں سکتا کہ مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ میں اپنا پیغام کہاں سے شروع کروں یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں اپنی آواز کے بکھرے ہوئے ٹکڑے فراہم کرتا ہوں۔ ذہنی اذیت کے دھندلے غبار میں چند

خیالات تمہید کے طور پر پیش کرنے کی سعی کرتا ہوں۔"

یہ ابتدائی دور کے جملے ہیں۔علی سردار جعفری نے ایک جگہ لکھا ہے :

"اس نے چکلوں سے، بازاروں سے، شراب خانوں سے سماج کے تمام نہاں خانوں سے انسانی لاشوں کو باہر نکالا اور منظر عام پر کھڑے ہوکر کہا۔" .... "دیکھو یہ وہ جانور ہیں جو کبھی انسان تھے" لیکن منٹو کی ٹریجڈی اس میں تھی کہ وہ ان شکلوں کو دیکھ نہ سکا تا کہ وہ یہ کہہ سکتا ___ "" "دیکھو یہ وہ انسان ہیں جو کبھی جانور تھے" وہ حقیقت کو اس کی مکمل اور اصلی شکل میں نہ دیکھ سکا بلکہ صرف مسخ شدہ پہلو کو دیکھ کر احتجاج کر کے رہ گیا اور یہ چیز آدمی کو تھوڑا سا سنگدل بنا دیتی ہے۔" اسی لیئے اس مضمون میں ایک جگہ اور لکھا ہے ___ :

"منٹو اپنے سماج کے چیتھڑے اُڑا سکتا تھا اس کی دھجیاں بکھیر سکتا تھا لیکن نہ تو اُس کی تعمیر نو کر سکتا تھا اور نہ اس کی عُریانی کو لباس دے سکتا تھا۔"

بعد کے دور میں جب کچھ الزامات لگے تو عجیب وغریب جواب دیئے.....

مثلاً : "میں تہذیب وتمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاردوں گا جو ہے ہی ننگی"

"ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے۔مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیئے۔"

"عورت کی چھاتی کو چھاتی نہ لکھوں تو کیا مونگ پھلی لکھوں۔"

"ایسی موت سے تو یہی بہتر ہے کہ لکھنا وکھنا چھوڑ کر ڈیری فارم کھول لوں اور پانی ملا کر دودھ بیچنا شروع کردوں ___ "

ایسے سنجیدہ اور غیر سنجیدہ جملوں سے بحث کے بہت سے دروازے کھلتے ہیں اور ترقی پسندوں کے درمیان کھلے بھی۔اسی لیے منٹو زندگی بھر ترقی پسندوں کا مذاق اُڑاتے رہے اور ترقی پسند بھی مخمصے میں رہے کہ وہ منٹو کا کیا کریں، کہاں رکھیں، اسی لیے کبھی دوست کہا تو کبھی دشمن۔کبھی بدزبان اور بے لگام تو کبھی سچا حقیقت نگار اور ایماندار افسانہ نگار۔یہ سب باتیں اپنی جگہ پر اور اس کے شاہکار افسانے اپنے بلند مقام پر کہ وہ دنیا کے بڑے سے بڑے فکشن سے آنکھیں ملا رہے ہیں ___ لیکن سوال تو عظمتوں کی کوکھ سے ہی پھوٹتے ہیں کہ عمدہ اردو نہ جاننے والا اردو کا بڑا افسانہ نگار، کفایت لفظی پر یقین کرنے والا فنکار ایک ایک لفظ نگینے کی طرح جڑنے والا اسلوب نگار ایسے بے تکے، مسخرے الفاظ کیونکر استعمال کرتا ہے۔سنجیدہ تنقید کا مذاق کیوں اُڑاتا ہے۔اپنی گرفت پر شدید ردِ عمل ظاہر کیوں کرتا ہے۔ان تضادات کے پیچھے جو ذہنی تصادمات ہیں انھیں بار بار سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسے پھر سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔اس کے ابتدائی حالات، اس کی محرومیاں،

مایوسیاں، ضد، خود پسندی حالات کا جبر و قہر اور دنیا کے حالات کو نئے سرے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی نوجوانی کے دوست حسن عباس نے بہت پہلے ہی کہا تھا :

"اگر وہ اپنی غیر مربوط تقریر و تحریر کے ذریعہ لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانا چاہتا ہے تو کیا ان کا فرض نہیں کہ وہ اس کے ہر لفظ کو غور سے سنیں ___ اس کے افکار نے اسے بے خود ضرور بنا رکھا ہے دراصل وہ دنیا کو جو پیغام دینا چاہتا ہے مگر دے نہیں سکا ___"

یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ وہ پیغام نہیں دے سکا البتہ اس کے پیغامات اس کی چیرہ دستی و نشتر زنی اور سفاک و واشگاف حقیقت نگاری کے نیچے کہیں دب سے گئے۔ اس کی بدنامی اور بے لگامی بھی مسائل کھڑی کرتی رہی۔ منٹو کی عظمت، شہرت، فنکاری اور افسانہ نگاری کے ہم بھی قائل ہیں لیکن وقت آ گیا ہے کہ اندھی تقلید کرنے، اسے دنیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار ثابت کرنے یا بدنامی و بے لگامی کو اجاگر کرنے کے بجائے ادب کی اس سچائی کو تلاش کریں، اس معنویت اور افادیت کو جو ان سب کے درمیان کہیں بھٹک گئی ہے اور جس کی آج بڑی ضرورت ہے اور جس میں منٹو کا گہرا انسانی، سماجی اور سیاسی شعور جذب و پیوست ہے۔

☆

ہلاکت کے بطن سے زندگی کی نمود

منٹو کا ایک غیر مقبول افسانہ ''یزید''

● محمد اسلم پرویز

منٹو نے کہیں لکھا تھا کہ مجھے سیاست سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی گاندھی جی کو سینما سے رہی ہے۔ سیاست اور سیاسی موضوعات سے منٹو کی عدم دلچسپی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے دو ڈھائی سو افسانوں پر محیط کل سرمائے میں مشکل سے آٹھ دس افسانے ایسے ہوں گے جنہیں ہم سیاسی موضوعات کی فہرست میں ڈال سکتے ہیں۔ بقول شخصے سیاست منٹو کے لیے نہ کبھی 'شجر ممنوعہ' رہی اور نہ ہی سر پر چڑھا ہوا بھوت، لیکن اس کے باوجود انتظار حسین اپنے ایک مضمون میں ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ٹھیٹ سماجی اور سیاسی افسانوں کے ساتھ منٹو کی تحریروں کو بھی صحافت کی ڈسٹ بین میں ڈالتے ہوئے نہایت تمسخرانہ انداز میں کہتے ہیں:

> ''سعادت حسن کا یہ حال ہے کہ بمبئی کے اس دفتر کے روز آنہ چکر کاٹتے تھے جہاں جنگ کے واقعات کی تفصیلات کے ریکارڈ رہتے تھے اور مختلف عورتوں کی بے حرمتی اور قتل و غارت گیری کے قصے پوچھتے پھرتے تھے۔''

تخلیق کے لیے مواد کو جمع کرنا تخلیقی عمل کا پہلا قدم ہو سکتا ہے آخری سیڑھی نہیں۔ مجھے نہیں پتہ جنگِ عظیم کو موضوع بنا کر منٹو نے کون سے افسانے تحریر کئے یا ان دفتروں سے حاصل ہونے والی جنگ کی تفصیلات منٹو نے کن افسانوں میں کھپائیں؟ سب جانتے ہیں کہ منٹو کے فن کی حقیقت صرف وہ نہیں تھی جو وہ جنگ کے دفتروں سے حاصل کر رہا تھا بلکہ اس کے آرٹ کی دنیا تو سرکاری ریکارڈ روم اور milatary geneolgy کی نظروں سے اوجھل رہنے والی صداقتوں پر محیط ہے۔ ویسے منٹو نے مختلف عورتوں کی بے حرمتی اور قتل و غارت گیری کی بہیمانہ تصویریں اپنے بیسیوں افسانوں میں جنگ کے بجائے تقسیم اور فسادات کے پس منظر میں ضرور پیش کیں۔ چونکہ

ہنگامی اور سیاسی ادب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ جہاں سے وہ جنم لیتا ہے وہیں اس کا دسرجن ہو جاتا ہے لیکن ٹھنڈا گوشت، ٹوبا ٹیک سنگھ، کھول دو، موذیل، موتری ٹیٹوال کا کتا اور سیاہ حاشیے کے افسانے ان سے مستثنیٰ ہیں اگر انتظار حسین ان افسانوں کو بھی صحافت کی بدلی یا بگڑی ہوئی شکل کہنے پر مصر ہیں تو اس سے قبل ہمیں ادب اور صحافت کی اصطلاحوں کو re-define کرنا ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ انتظار حسین محولہ بالا اقتباس میں منٹو کو ان افسانہ نگاروں کے ساتھ بریکٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اپنے تجربات کو نہایت معصومیت کے ساتھ اطلاعاتی انداز میں اگل دینے کو ہی افسانہ نگاری تصور کرتے تھے۔ ہر بڑے فنکار کی طرح منٹو کے یہاں بھی سیاسی مواد انسانی اقدار کے کھیل تماشے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہی وہ صفت ہے جو اس کے تحریر کردہ ادب کو آج بھی شاداب رکھے ہوئے ہے۔

برطانیہ کی سیاسی غلامی سے آزاد ہوتے ہی نئے ابھرتے ہندوستان کا ابھی سفر شروع ہی ہوا تھا اور پاکستان کی سیاست ابھی بسم اللہ کے مراحل ہی میں تھی کہ کشمیر کو لے کر دونوں ملکوں میں پہلی جنگ ستمبر 1947ء میں ہوئی اور تب سے لے کر آج تک کشمیر نام کی یہ گتھی سلجھنے کے بجائے نہ صرف الجھتی جا رہی ہے بلکہ وقت کے بدلتے محور نے اس مسئلے کو زیادہ دھاردار، کاٹ دار اور پیچ دار بنا دیا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں منٹو نے تو ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کے نام ایک کھلا خط لکھتے ہوئے ہندوستانی پبلشروں کو اس کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن چھاپنے اور سیاست دانوں کو پاکستانی دریاؤں کا پانی بند کرنے سے باز رہنے کی ہدایت دی تھی۔ منٹو کا زیر تجزیہ افسانہ "یزید" بھی دریا کا پانی بند کر دینے والی ہندوستان کی اسی مبینہ دھمکی کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے۔ وقت کے تناظر میں دیکھیں تو "یزید" سن 1951ء کے آس پاس لکھا گیا وہ افسانہ ہے جو منٹو کی زندگی میں شائع ہونے والے آخری افسانوی مجموعہ کا سرنامہ بھی ہے۔ اس مجموعہ میں یزید، آخری سلیوٹ اور ٹیٹوال کا کتا ایسے افسانے ہیں جن کا محرک ہند و پاک کی جنگ اور ان کا focus of inspiration سیاسی ہے لیکن انہیں ہم کورے سیاسی افسانے کہہ کر ٹال نہیں سکتے۔ بے شک منٹو کے یہ افسانے اپنی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے ایسے نہیں کہ ہم ان کا نام ٹوبا ٹیک سنگھ، ٹھنڈا گوشت، موذیل اور کھول دو کے ساتھ لے سکیں لیکن اتنے غیر اہم نہیں ہیں کہ کماحقہ ناقدانہ تجسس سے بھی محروم رہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ لکھنے والوں نے منٹو کے فنی شعور کے حوالے ان افسانوں کا ذکر تو بار بار کیا لیکن ان کی معنویت کے اصل محرکات کی نہ تو نشاندہی کی نہ ہی ان کا تعین کیا۔ البتہ پاکستانی ناقد فتح محمد ملک نے ان افسانوں پر جی کھول کر خامہ فرسائی کی مگر منٹو کی تخلیقی انفرادیت اور فنی ہنرمندی کی شناخت کرنے کے بجائے انہوں نے منٹو کی کھری اور سچی پاکستانیت کی تعبیریں تلاش کرنے کی متعصبانہ کوشش ان افسانوں کے حوالے سے کی اور منٹو کی روشن ضمیری، حق گوئی اور انصاف پسندی کو ایک خاص سیاسی منشور کا ضمیمہ بنا کر رکھ دیا۔ منٹو کے پاکستانی موقف کی وکالت کا جلوہ محض فتح محمد ملک جیسے ناقدوں کے تجزیوں میں ہی نہیں منٹو کے افسانوں کے انگریزی ترجموں میں دکھائی دیتا ہے۔ اصل متن سے چھیڑ چھاڑ کر کے اسے مجروح کرنے کی کوشش خالد حسین نے "یزید" کے ترجمے میں کی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ محض اتنا

کہہ کر میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں "یزید" کو "The great divide" کا عنوان عطا کر کے خالد حسین نے متن میں جو ڈنڈیاں ماری ہیں وہ اس حقیقت کو آشکار کر دیتی ہے کہ انھوں نے افسانے کا ترجمہ establishment کے غیر سرکاری کلچرل پر چارک کے قلم سے کیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مذہب کے نام پر ہونے والی تقسیم پر "یزید" اور منٹو کے دوسرے افسانے نہ صرف واضح stand لیتے ہیں بلکہ بجائے خود تقسیم کے فیصلے کو ہی کٹہرے میں کھڑا کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک ہی ماضی، ایک ہی ثقافتی اور معاشرتی پس منظر، ایک ہی ادبی و لسانی قدر اور طبعی و مادی حوالوں اور ایک ہی سوکھے، غربت، بے کاری، رشوت ستانی، مہنگائی، سیاسی انحطاط، استحصال اور استبداد کے زیر سایہ پرورش پانے والے عام آدمی کے خواب خوف اور ہزیموں پر محیط منٹو کے یہ افسانے ایک ہی تجربے کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں۔ منٹو نے یہ افسانے ساٹھ ستر سال قبل لکھے تھے اور اب جبکہ دونوں ملکوں کے سربراہوں اور پالیسی سازوں نے اپنی اپنی سیاسی تاریخ کے screenplay کا ورکنگ ڈرافٹ لکھ کر تیار کر لیا ہے منٹو کے یہ افسانے راستہ روک کر ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ آدھی صدی کا جو یہ سفر آپ نے اب تک طے کیا ہے کیا اس کا road map درست تھا....؟

دلچسپ بات یہ ہے کہ منٹو کا یہ افسانہ جسے اس نے "یزید" کے عنوان سے تحریر کیا ہے، اپنے باطن میں افادی و اصلاحی مقصدیت کا وہی بوجھ لئے ہوئے ہے جس کے باعث ترقی پسند ادیب بدنام رہے۔ لیکن یہ مماثلت سطحی مشابہت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ بحیثیت story teller منٹو کا سارا فوکس اپنے سروکاروں کو پرونے کے بجائے کہانی کو دلچسپ ڈھنگ سے قاری تک پہنچانے پر ہے۔ افسانے کے سروکار تو فن پارے کے اندر سے grow ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں ترقی پسندوں اور منٹو کے فنی رویے میں جو بنیادی فرق ہے وہ اسی نکتہ میں مضمر ہے۔ "یزید" ہندو پاک کی جنگ سے متعلق منٹو کا نسبتاً ایک غیر مقبول افسانہ ہے اور موضوعیت کے باوجود تخلیقی حسن اور فنکارانہ قوت کا مظہر ہے۔ افسانے کا locale ہند سرحد کے پاس کا ایک چھوٹا سا پاکستانی گاؤں ہے۔ گاؤں کے لوگ ابھی فسادات کی خوں ریزی بھگت کر چین کی سانس بھی نہیں لے پائے تھے کہ ہندوستانی حملے کا خطرہ ان کے سروں پر منڈلانے لگا۔ نفرت، دکھ اور خوف کے احساس میں جینے والے سیدھے سادے لوگوں کی یہ سیدھی سادی حقیقت پسندانہ کہانی ہے، تاہم منٹو نے مختلف events کی مدد سے کردار کی تشکیل اور کرداروں کے وسیلے سے happenings کے بیان میں منطقی ربط کو ملحوظ رکھتے ہوئے افسانے کی اسپرٹ اور مرکزی خیال کو فنی ڈھانچے میں زندہ رکھا ہے۔ افسانے کا ہر فقرہ اور ماجرا اپنا ایک الگ وجود، عمل اور معنی رکھتے ہوئے افسانوی ڈیزائن کا حصہ ہے۔ افسانے کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے:

> "سن سینتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح موسم میں خلاف معمول چند دن خراب آئیں اور چلے جائیں۔"

پہلے جملے میں ہی فسادات و ہنگاموں اور موسم کی خرابی میں مماثلت پیدا کر کے ایک طرف افسانہ نگار

نے آدمی کی جبلت کو قدرت کے وسیع پس منظر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف افسانے کے بنیادی موٹف کو بھی بیان کر دیا ہے۔ خوں ریزی اور درندگی یعنی انسانی جبلت کے dis-balance کو موسم کے خراب دنوں سے مربوط کرنا محض فضول کا تکلف نہیں اور نہ ہی اوپر سے لادا گیا ہے بلکہ انسانی معاشرے کی اتھل پتھل کو منٹو نے فطرت کے قوانین کا ہی جز گردانا ہے۔ غور کریں تو ابتدائی فقرہ افسانے کے اصل تھیم تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

افسانے کے پہلے پیراگراف میں کریم داد کے ساتھ جس کردار سے قاری متعارف ہوتا ہے وہ ہے غائب راوی کا کردار جو افسانوی متن میں ناظر اور ایک متحرک روح کی حیثیت سے موجود ہے۔ کریم داد کے تعلق سے راوی کہتا ہے:

''اس کو معلوم تھا کہ دشمنوں کی طاقت بہت زیادہ ہے مگر ہتھیار ڈال دینا وہ اپنی ہی نہیں ہر مرد کی توہین سمجھتا تھا۔ سچ پوچھئے تو یہ صرف دوسروں کا خیال تھا، ان کا جنہوں نے اسے وحشی نما انسانوں سے بڑی جانبازی سے لڑتے دیکھا تھا، ورنہ اگر کریم داد سے اس بارے میں پوچھا جاتا کہ مخالف قوتوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈالنا کیا وہ اپنی یا ہر مرد کی توہین سمجھتا ہے تو وہ یقیناً سوچ میں پڑ جاتا۔ جیسے آپ نے اس سے حساب کا کوئی بہت ہی مشکل سوال پوچھ لیا ہو۔ کریم داد جمع تفریق اور ضرب تقسیم سے بالکل بے نیاز تھا۔''

غائب راوی کا شروع میں یہ کہنا کہ کریم داد دشمنوں کی طاقت کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ہر مرد کی توہین سمجھتا تھا لیکن پھر فوراً اپنی تصحیح یہ کہہ کر کر لینا کہ ایسا اس کا نہیں اس کے بارے میں ان لوگوں کا خیال تھا جنہوں نے اسے جانبازی سے لڑتے دیکھا تھا، سے غائب راوی نہ صرف کریم داد کے کردار کے بنیادی پہلو کو بے نقاب کرتا ہے بلکہ اپنی شخصیت کے خدوخال بھی اجاگر کر دیتا ہے۔ پورے افسانے میں سوچ کی دو روئیں بیک وقت چلتی رہتی ہیں۔ ایک راوی کی دوسری کریم داد کی۔ یہ دونوں روئیں کبھی ایک دوسرے کے متوازی چلتی ہیں تو کبھی ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے تو کبھی ایکدوسرے کو overlap کرتے آگے بڑھتی ہیں۔ اس طرح حقیقت اور تخیل کی آنکھ مچولی میں ہم افسانے کو پھیلتے اور پروان چڑھتے دیکھتے ہیں۔ جس طرح ابتدائی فقرہ افسانے کے مرکزی نقطے سے ایک لطیف رشتہ قائم کرتا ہے اسی طرح جانبازی سے لڑنے کے باوجود دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کے سوال پر کریم داد کا یوں خاموش رہ جانا جیسے کسی نے اس سے حساب کا کوئی سوال پوچھ لیا ہے۔ کریم داد کے کردار کے key-note کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

''ہتھیار ڈال دینا کیا مرد کی توہین ہے؟''

اس سوال کے نشان زد ہونے کے بعد جو صورتحال پیدا ہوتی ہے منٹو نے اس کی قرأت فنکارانہ نقطہ نظر سے کی ہے۔ یہ بقول انتظار حسین محض جنگ کے واقعات کی تفصیلات کے ریکارڈ اور قتل و غارت گری کے

قصوں کی پوچھ تاچھ بھر نہیں ہے۔ بلکہ حساس دل اور عمیق نظر سے اس متن کو اپنی روح میں محسوس کرنا اور اسے فنکارانہ حقیقت اور جمالیاتی تجربے میں مبدل کر دینا بھی ہے۔ افسانے کے بالکل ابتدائی حصے میں ہی قاری کو احساس ہو جاتا ہے کہ جس سیدھے سادے دکھائی دینے والے کریم داد سے اس کی ملاقات ہوئی ہے وہ اصل میں ایک گہری حسیت، اقدار کی گہری آگہی، غم و غصے کے ساتھ سرفگندہ مفاہمت، زندگی کی بہمیت کے ادراک کے باوجود انسانی دردمندی میں شرابور ایک غیر معمولی کردار ہے۔

گاؤں میں قتل وخون اور آبروریزی کی کئی شرمناک وارداتیں ہوئیں۔ خود کریم داد کی کھڑی فصل تباہ کر دی گئی دکان جل کر راکھ ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس کا باپ رحیم داد بھی قاتلوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن گاؤں والوں کی طرح کریم داد نے نہ تو قاتلوں کو گالیاں دیں اور نہ ہی دشمنوں کو کوسا۔ اس نے صرف اپنے گاؤں والوں سے اتنا کہا "جو کچھ ہوا ہماری اپنی غلطی سے ہوا۔"

یہ کون سی غلطی ہے جس کی طرف کریم داد اشارہ تو کرتا ہے مگر استفسار کرنے پر خاموش رہ جاتا ہے؟ جمع تفریق اور ضرب تقسیم سے بے نیاز کریم داد نے اپنے باپ کی موت پر سوگ نہیں کیا، اس کی لاش کنویں کے پاس دفنائی اور قبر کے پاس یہ چند الفاظ کہے۔ "گناہ ثواب کا حساب خدا جانتا ہے۔ اچھا تجھے بہشت نصیب ہو۔"

کریم داد کی مٹی کی سچائی یہ ہے کہ وہ جو گزر گیا ہے اس لکیر کو پیٹنے کے بجائے آنے والے اچھے وقت کا خیر مقدم اور برے وقت کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو وہ ہمہ وقت تیار رکھتا ہے۔ اپنے باپ کی موت پر کریم داد کا ردِ عمل اس کے کردار کے خدوخال کو متعین کرنے کے علاوہ افسانے کی ماجرائی پرتوں کو متحرک بھی کرتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اس کا ایک استعارتی پہلو بھی ہے۔ باپ کی موت بیتے ہوئے کل کی موت ہے اور بیتے ہوئے کل کو دفنانے کے بعد "اچھا تجھے بہشت نصیب ہو" کہہ کر بھولنا ہی آج کے لیے بہتر ہوتا ہے۔

جب گاؤں کے لوگ غصے، سوگ اور خوف میں ڈوبے اپنے زخموں کو گن اور چاٹ رہے تھے اور دشمن پر گالیوں، بددعاؤں کی بوچھار کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے کریم داد کے دل و دماغ میں جیناں سے شادی کی خواہش کروٹیں لے رہی تھیں:

> "گاؤں کے لوگ ابھی سوگ میں مصروف تھے کہ کریم داد نے شادی کر لی، اسی مُیار جیناں کے ساتھ، جس پر ایک عرصے سے اس کی نگاہ تھی۔"

ایک ایسے وقت جب فسادات کے پے در پے واقعات نے گاؤں والوں کو نڈھال کر کے رکھ دیا ہو اور پورا گاؤں قبرستان بن گیا ہو کریم داد نہ صرف گاؤں والوں کی مخالفت کے باوجود جیناں سے شادی کرتا ہے بلکہ بڑے دھوم دھڑاکے سے کرتا ہے۔ وہ چاہتا تو نہایت خاموشی سے نکاح پڑھا کر عورت اور گرہستی کی آسودگی حاصل کر سکتا تھا لیکن ازدواجی زندگی بھرپور طمطراق سے شروع کرنے کے پیچھے کریم داد اپنے کس complex کو مطمئن کرنا چاہ رہا تھا۔ اپنے آپ کو بھوت اور سور کہہ دینے والا کریم داد کیا کسی پروَرژن کا شکار یا کسی خود فریبی میں

مبتلا ہے؟ یا پھر اس میں گورمکھ سنگھ کے بیٹے کی روح حلول کر گئی ہے۔ جس نے اس کے لیے سارے رشتوں کو بے توقیر ٹھہرا دیا ہے؟ یا پھر وہ محض میکانکی طرزِ فکر کا کردار ہے جس کا ضمیر مر چکا ہے اور روح مسخ ہو چکی ہے اور جو صرف اپنے مقصد کا حصول اور تکمیل چاہتا ہے؟ بظاہر کریم داد سماجی فرائض کا مجرم معلوم پڑتا ہے۔ اس کے پورے رویے میں معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے تئیں ایک عجیب سی بے پروائی دکھائی دیتی ہے۔ جیناں سے جب کریم داد اس کے بھائی کی موت کا غم بھلانے کی بات کرتا ہے تو اسے یہ بات بہت ہی ناگوار لگتی ہے کچھ دکھ یاد رہتے ہیں اور کچھ کو بھول پانا ممکن نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ بھرے بادلوں کی طرح روح پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ جیناں کے لیے اس کے بھائی فضل الٰہی کی موت کا دکھ بھی اسی نوع کا تھا۔ ماں باپ کی موت کے بعد بھائی نے ہی اس کی پرورش کی تھی۔ جیناں کی خوشی کے لیے اس نے خود شادی نہیں کی اور فسادات میں اس کی عصمت کی حفاظت کرتے ہوئے وہ دنگائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس لیے جب کریم داد سوگوار جیناں کو کہتا ہے۔ ''مردوں کو کفنانے دفنائے پورا ایک سال ہو گیا ہے... اب تو وہ بھی اس سوگ سے گھبرا گئے ہوں گے..'' تو اسے بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن بعد میں کریم داد کے ساتھ ازدواجی زندگی کے مسرت اور انبساط کے سرسبز لمحات میں جب کبھی جیناں سوچتی تو خود متعجب ہوتی کہ اپنی زندگی کا اتنا بڑا صدمہ وہ کیسے بھول گئی۔ اپنے دکھ سے یہ دوری ظاہر ہے کریم داد جیسے شخص کی وجہ سے ہی ممکن ہو پائی تھی۔ جس کی ہر بات میں لہو اور زندگی کی رمق موجود تھی اور زندگی کی حرارت سے شرابور یہی رمق کریم داد نے افسانے کے متن اور جیناں کے بطن کو بھی عطا کی تھی۔ جیناں اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ کریم داد کا جیناں کی طرف جھکاو ایک مفہوم میں زندگی اور اس کے متعلقات سے ازسرِنو وابستگی کا اشارہ ہے۔

منٹو نے کریم داد اور جیناں کی ازدواجی زندگی کی چھوٹی چھوٹی تصویروں کو گاؤں میں پھیلنے والی افواہوں کے back drop میں پیش کرتے ہوئے افسانے کے Peculiar image کو ابھارنے کی فنکارانہ کوشش کی ہے۔ جیسے جیناں کے حاملہ ہونے پر کریم داد کا اسے چھیڑنا، جیناں کا محرّم کا تعزیہ اور گھوڑے دیکھنے کی فرمائش کرنا، بختو دائی کا جیناں کے پیٹ کی مالش کرنا وغیرہ وغیرہ زندگی سے معمور ان واقعات کے پس منظر میں دشمن کسی سیال آسیب کی طرح موجود ہے۔ انسانی تاریخ سے لے کر انسانی تقدیر تک ایروز اور تھاناٹوز کا جو رول رہا ہے اس کی معنی خیز تصویریں افسانے میں جا بجا فریم ہوئی ہیں:

''جیناں نے کچھ دیر تک سوچا پھر ہنس کر کہا۔ ''موسی! تم بھی کیا پاگلوں سی باتیں کرتی ہو۔ دریا کون بند کر سکتا ہے، وہ بھی کوئی موریاں ہیں۔''

بختو نے جیناں کے پیٹ پر ہولے ہولے مالش کرتے ہوئے کہا۔ ''بی بی مجھے معلوم نہیں...... جو کچھ میں نے سنا۔ تمہیں بتا دیا۔ گاؤں والے کہتے ہیں کہ یہ بات تو اخباروں بھی آ گئی ہے۔''

''کون سی بات؟'' جیناں کو یقین نہیں آیا۔

بختو نے اپنے جھریوں والے ہاتھ سے جیناں کا پیٹ ہلکے سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
"یہی دریا بند کرنے والی..... "پھر اس نے جیناں کے پیٹ پر قمیض کھینچی اور اٹھ کر بڑے
ماہرانہ انداز سے کہا۔ "اللہ خیر رکھے تو بچہ آج سے پورے دس روز کے بعد ہو جانا چاہیے۔"

جنگ و غارت گیری کے ماحول میں بختو دائی کا جیناں کے بچے کی پیدائش کو Pin point کرتے ہوئے منٹو نے تاریکی سے رجائیت کی کے طلوع ہونے کا اشارہ دیا ہے۔ غور کریں تو منٹو نے پر فریب بیانیہ کے ذریعے ایروز اور تھاناٹوز کو ایکدوسرے میں جذب ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ یہ انجذاب حیات و موت کی کشمکش کی صورت میں پورے افسانے میں موجود اور افسانے کے اصل تھم کی پہرے داری پر مامور ہے۔ جیناں ایک طرف کھیتوں کے پانی بند ہونے کے خطرے سے ڈری سہمی ہوئی ہے اور کریم داد آنے والے دنوں کی ہولناکی سے بے پروا اپنے متوقع بچے کی خوشی میں نعرے لگا رہا ہے جو جیناں کی پریشانی کا سبب ہے۔ "تمھیں خوشی سوجھتی ہے... جانے یہاں کیسی کربلا آنے والی ہے۔" کریم داد دشمن کے متوقع حملے سے نہ بے خبر ہے اور نہ ہی آنے والی کربلائی صورتحال سے بے پروا...... دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کے لیے بندوق خرید کر مشق سے اپنا نشانہ پکا کرنے والے کریم داد کو گاؤں والوں کا دشمن کو گالیاں دینا الٹے پڑے تل چٹے کی طرح ہوا میں ہاتھ پاؤں مارنے سے زیادہ اہم نہیں لگتا۔

جنگ صرف سرحدوں پر ہی نہیں لڑی جاتی۔ سرحد کے دونوں طرف عوام کے باطن میں بھی جاری رہتی ہے۔ یہ جنگ ایک طرف دونوں فریقین کے لوگوں کے دلوں کو جہاں جوش و جذبے سے بھر دیتی ہے تو دوسری طرف اس کے ممکنہ نتائج کی فکر میں بھی الجھائے رکھتی ہے۔ کریم داد کے گاؤں کے لوگ بھی آپسی اختلاف بھول کر جنگ کی خبروں اور افواہوں کی اوپری سطح پر جینے پر مجبور ہیں۔ چونکہ تشدد اور بزدلی کے پاؤں نہیں ہوتے لہذا یہ نہایت غیر محسوس طریقے سے خوف اور خوف کے بطن سے برآمد ہونے والی نفرت اور حقارت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ زندگی کتنی بے رحم اور دشمن کس قدر بے درد ہو سکتا ہے اس کا ادراک کریم داد کو قدرے بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چوپال میں ہونے والی بحث میں جب نتھو چودھری دریا کے پانی بند کرنے والے دشمن کو برا بھلا کہتے ہوئے اسے ماں کی گالی دینے لگتا ہے تو کریم داد اسے روک دیتا ہے:

> "کریم داد کچھ اس طرح بار بار بار اپنی نشست بدل رہا تھا جیسے اسے بہت کوفت ہو رہی ہو۔ وہ دو تین بار اس طرح کھانسا جیسے کچھ کہنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہو۔
> چودھری نتھو چودھری، کسی کو۔"
>
> ماں کی ایک بہت بڑی گالی چودھری کے منہ میں پھنسی کہ پھنسی رہ گئی۔ اس نے پلٹ کر ایک عجیب انداز سے کریم داد کی طرف دیکھا جو سر پر اپنا صافہ ٹھیک کر رہا تھا۔ "کیا کہا؟"
> کریم داد نے آہستہ سے مگر مضبوط آواز میں کہا۔ "میں نے کہا گالی نہ دے کسی کو۔"

ہندوستان کو گالی نہ دینے کے پیچھے کریم داد کی بھلمنساہٹ، شرافت یا نمائش کا جذبہ نہیں تھا۔ وہ کوئی

انساواوی کردار بھی نہیں۔ اس اندرونی تشدد کسی محرومی کا زائیدہ نہیں بلکہ اپنی ذات کے اثبات کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے تھو چودھری کے پوچھنے پر کہ دشمن اس کے کیا لگتے ہیں وہ بہت صاف اور واضح الفاظ میں لیکن بڑے تحمل سے جواب دیتا ہے۔ ''میرے کیا لگتے ہیں.... میرے دشمن لگتے ہیں''۔ دشمن کے لیے تھو چودھری اور دوسرے گاؤں والوں کے جذبات کا کوئی مرکزِ ثقل نہیں ہے۔ اسی لیے وہ لمحاتی، عارضی اور ابھرے ہیں۔ جبکہ کریم داد کا احساس نظام مرکزیت کی تلاش میں ہے، اور اس کے لیے وہ ان اصولوں کو بھی تہہ و بالا کر دینا چاہتا ہے جو معاشرہ اور سسٹم اپنی بقا، اور استحکام کے لیے وضع اور مقرر کرتا ہے۔ کریم داد زندگی کو زندہ بیٹو کے اندر ہی دیکھ سکتا ہے، زندگی سے باہر نہیں۔ دریا کا پانی بند کر دینے جیسے ایک غیر انسانی عمل اور پاگل پن کی حالت میں ایک انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان پر کیا بیتتی ہے، کریم داد کا سروکار اسی سے ہے:

> ''کریم داد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔ ''میں جب بھی یہی کہوں گا چودھری.... تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ صرف وہ ہمارا دشمن نہیں، ہم بھی اس کے دشمن ہیں...... اگر ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم نے بھی اس کا دانہ پانی بند کر دیا ہوتا.... اب جب کہ وہ ایسا کر سکتا ہے، اور کرنے والا ہے تو ہم ضرور اس کا کوئی توڑ سوچیں گے..... اس سے اگر ہو سکا تو وہ تمھارے پانی کی ہر بوند میں زہر ملا دے گا..... تم اسے ظلم کہو گے، وحشیانہ پن کہو گے، اس لیے کہ مارنے کا یہ طریقہ تمھیں پسند نہیں..... عجیب سی بات ہے کہ لڑائی شروع کرنے سے پہلے دشمن سے نکاح کی سی شرطیں بندھائی جائیں.... اس سے کہا جائے کہ دیکھو، مجھے بھوکا پیاسا نہ مارنا.... بندوق سے اور وہ اتنے بور کی بندوق سے، البتہ تم مجھے شوق سے ہلاک کر سکتے ہو.... اصل بکواس تو یہ ہے کہ..... ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔''

جنگ کے اطوار کو زندہ تجربے کے طور قبول کرنے کے باوجود کریم داد اسے منطقی اور اکیڈمک گفتگو کے ذریعے بیان کرتا ہے اور دریا کے پانی کو بند کرنے والی غیر انسانی کاروائی کو جیسے justify کر رہا ہے۔ دھیان رہے کہ کریم داد منگو کو چوان نہیں، جو اپنی آدھی ادھوری معلومات اور کچی پکی رائے پر اڑے کے دوسرے کو چوانوں پر اپنی سمجھداری کا دھاک بٹھائے۔ اس کی دنیا منگو سے زیادہ ارضی اور زیادہ ٹھوس ہے۔

منٹو نے زیرِ مطالعہ افسانے کا تانا بانا کریم داد کے کردار کو مرکز میں رکھ کر بنا ہے اور اس کی شخصیت سے تمام تر ذہنی و جذباتی رابطے کے باوجود اس سے ایک فنکارانہ دوری برقرار رکھی ہے۔ کریم داد کی داخلی کشمکش، کیفیات و تصادم اور ردِ عمل کو بیان کرنے کے بجائے منٹو کی توجہ معروضی واقعہ نگاری پر ہے جو اس کی فنی تدبیر کا ایک سوچا سمجھا حصہ ہے۔ افسانے کا قاری کریم داد کی ذہنی الجھنوں کو پہچانتا تو ہے لیکن اس میں شریک نہیں ہوتا۔ شاید منٹو ہمارے دل میں کریم داد کے تئیں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کا خواہشمند بھی نہیں۔ افسانے کا موقف انسانی رشتوں کی حدود میں رہ کر کریم داد کے کردار کو طشت از بام کرنا نہیں بلکہ اس کے ذریعے ایک نئی حقیقت کو منکشف کرنا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چوپال سے لوٹنے کے بعد کریم داد جب گھر پہنچتا ہے تو بختو دائی اسے بچہ پیدا ہونے کی خوشخبری سناتی ہے اور ایک اچھا سا نام سوچنے کے لیے بھی کہتی ہے:

> ''کریم داد گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ اندر بختو دائی باہر نکلی۔
> کریم داد کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پوپلی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ''مبارک ہو کیمے... چاند سا بیٹا ہوا ہے.... اب کوئی اچھا سا نام سوچ اس کا۔''
> ''نام...؟'' کریم داد نے ایک لحظے کے لیے سوچا۔ ''یزید... یزید'' بختو دادائی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

سوال یہ ہے کہ کریم داد اپنے بچے کا نام یزید کیوں رکھنا چاہتا ہے؟ ایم جے اکبر نے اپنی کتاب Riot against riot میں نہایت صاف اور واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ ہندوستانی فوج صرف پاکستانیوں سے لڑسکتی ہے اور اس میں لڑنے کا جوش مسلمانوں کو قتل کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ لگ بھگ یہی نفرت سرحد پر تعینات پاکستانی فوجی اپنے بنکروں میں لئے بیٹھے ہیں۔ نفرت..... جو تاریخ نے انہیں عطا کی ہے۔

مجھے شک ہے یزید نام تجویز کرنے میں کریم داد کہیں یزید اور حسینؓ کی destiny کو سا جھا کرنے کا خواہشمند تو نہیں؟ یہی موڑ ہے جب افسانہ ہندو پاک کی آپسی جنگ کے تناظر سے نکل کر ایک ہمہ گیر انسانی صورتحال میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یزید جو منفیت اور عدم وفنا کا استعارہ ہے، اس افسانے میں حیات و تجدید کا سبب بن رہا ہے۔ منٹو یہاں ہلاکت کے بطن سے زندگی کے جنم کی بشارت دے رہا ہے۔ یہ واقعی حیران کر دینے والی بات ہے کہ ممتاز شیریں نے منٹو کے نظریہ حیات اور انسان کے تصور میں تغیر کا تجزیہ بابو گوپی ناتھ، سڑک کے کنارے، باسط، حامد کا بچہ، بادشاہت کا خاتمہ جیسے افسانوں کے حوالے سے کیا لیکن ''یزید'' کا ذکر کرنا بھول گئیں (؟)۔ جبکہ سماج و زندگی کی بے رحم صداقت کو بیان کرنے میں جو اثباتی اقدار منٹو کے یہاں بعد میں پیدا ہوئی تھی میرے خیال میں ''یزید'' اس کی جگمگاتی مثال ہے:

> ''جیناں کی آواز بہت نحیف ہوگئی۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو کیمے.... یزید.....؟'' کریم داد مسکرایا۔ ''کیا ہے اس میں.... نام ہی تو ہے۔''
> کریم داد نے سنجیدگی سے جواب دیا ''ضروری نہیں کہ یہ بھی وہی یزید ہو..... اس نے دریا کا پانی بند کیا تھا یہ کھولے گا۔''

اس اختتام کے بعد اگر افسانے کے ابتدائی فقرے کو دوبارہ پڑھا جائے تو افسانے کا بنیادی تھیم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ یزید کے غیر انسانی اور غیر اخلاقی کرتوت کو دھندلا یا blur کرنا بجائے خود دیوانگی کی ایک morbid جہت ہے۔ یہاں ہونے والے بچے کے نام پر یزید tag کرنے کا مطلب اسے معاف کرنا ہرگز نہیں بلکہ وہ نام جو علامت اور استعاروں میں ڈھل کر ایک خاص معنی دینے لگتے ہیں معنی کے اس جبر کو توڑ کر زندگی کے معنی خیز امکانات سے روبرو ہونا ہے۔ خاطر نشان رہے یہ دنیا کو جنت بنانے والی ترقی پسندانہ خواہش اور کوشش

سے مختلف ہے۔ تقدیر کی بدنصیبیوں سے آزاد ہونے کے لیے تاریخ کے زندان سے نکلنا ضروری ہے۔ بقول وارث علوی منٹو کو humanism کی نہیں زندگی کی نئی تفسیر کی تلاش تھی اور ظاہر ہے جب کافر اور مومن دونوں ہی یکساں عصبیت کا شکار ہوں تو نظری تشدد کا جواب دردمندی اور کریم النفسی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایک ایسا یزید جو دریا کا پانی بند نہیں کرے گا کھولے گا۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کو اس میں منٹو کی چونکاو ذہنیت کا کرشمہ دکھائی دے اور کچھ اس کی دانشورانہ دہشت گردی یا فکری بازیگری سے تعبیر کریں۔ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو افسانے کے اس اختتام میں جارحانہ وہابیت کے عناصر تلاش کرنے لگیں۔ لیکن یہ سارے الزامات اتنے ہی جھوٹے اور باطل ہیں جتنا منٹو کا فحش نگار ہونا۔ افسانے کا اختتام چونکاتا ضرور ہے لیکن یہ انجام محض اتفاقات کے اندھے ارتقائی عمل سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ افسانے کے ہر موڑ، کرداروں کے ہر عمل افسانے کی جس اکائی سے مربوط ہے وہ اختتام میں تکمیل پذیر ہوتی ہے۔

افسانے کے آغاز میں منٹو نے لکھا تھا کہ سینتالیس کے ہنگامے بے موسم ایام کی طرح آئے اور آ کر گزر گئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سینتالیس کے بعد سیاست کی خرابیِ صحت کی وجہ سے کشمیر کا موسم معمول پر آنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے گو کہ افسانے کا بنیادی تناظر وجودی ہے اس لیے عصر اور تاریخی توجیہیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آج جبکہ ہندو پاک کے سفارتی رشتوں کا کارڈیوگرام مسلسل بگڑتا جا رہا ہے۔ ایک طرف ہندوستان کے لیڈران، عوام اور اخبارات دن رات پاکستانی اسپانسرڈ دہشت گردی پر دن رات دہاڑتے رہتے ہیں دوسری طرف پاکستانی اخبارات اور میڈیا کا ''بھارتی آبی جارحیت'' پر چھاتی پیٹ سیاپا جاری ہے۔ گزشتہ سال پاکستانی واٹر کاؤنسل کے چیئرمین اور عالمی پانی اسمبلی کے co-ordinator حافظ ظہور الحسن ڈاہر نے کہا تھا آنے والے برسوں میں پاکستان کی طرف بہنے والے تمام دریاؤں کا رخ بھارت اپنے کھیتوں کی طرف موڑ لے گا۔ اور پاکستان کی طرف ایک گھونٹ پانی نہیں آ سکے گا۔ حافظ ظہور الحسن کی بات پر یقین کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ ساٹھ ستر سال پہلے ''یزید'' میں جس صورتحال کی طرف منٹو نے اشارہ کیا تھا آج بھی ہم نفرت کے اسی نقشے پر قدم تال کر رہے ہیں۔

آخر میں بس اتنا ہی یہ بات تو انتظار حسین بھی بہتر جانتے ہیں کہ منٹو جیسے جینیس اور جینوئن لکھنے والے کے لیے تخلیقی عمل گیہوں ڈال کر آٹا نکالنے جیسا میکانکی اور اکہرا نہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اپنے ادبی و نظریاتی پوزیشن کے دفاع کے لیے وہ اپنے مضامین اور کالموں میں جو کہتے ہیں ان کا رویہ ترقی پسند ناقدوں جیسا fanitical ہو جاتا ہے، جسے شمیم حنفی ان کی معصومانہ شرارت سے تعبیر دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں منٹو نے سیاسی افسانے کم لکھے مگر ایک سوال تو یہاں پر یہ بھی قائم ہوتا ہے کہ اس نے سیاسی افسانے کب نہیں لکھے؟

........☆........

Mohammed Aslam Parvez, 16/3, Sanober Apartment, Hall Road, Halov Pull, Kurla, (W), Mumbai-400 070, Mob. : 07738940046

منٹو شناسی کی تازہ ترین مثال--- چند وضاحتیں

● صغیر افراہیم

اکثر تخلیقی فن کار گہرے تنقیدی شعور سے متصف ہوتے ہیں مگر بسا اوقات وہ معاصرین کے فن پاروں کی تعینِ قدر میں معروضیت کی پاسداری نہیں کر پاتے ہیں۔ اس کی تفصیل کے ثبوت کے طور پر مارچ ۲۰۱۰ء کے 'کسوٹی جدید' (سمستی پور، بہار) میں شائع ریوتی سرن شرما کا مضمون "مہاجر منٹو کے فسادات سے متعلق افسانے اور نوجوان نقادوں سے چند سوال" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اعتراض عنوان سے ہی شروع ہو جاتا ہے کہ امرتا پریتم، بلراج ساہنی، بھیشم ساہنی یا بیدی کو کبھی کسی نے مہاجر آرٹسٹ نہیں کہا۔ بنگال بھی تقسیم ہوا مگر نذرالاسلام کو کسی نے مہاجر شاعر نہیں لکھا۔ تو پھر یہ بدعت منٹو کے ضمن میں کیوں روا رکھی گئی؟ ریوتی سرن کا کہنا ہے کہ:

> "جنوری ۱۹۴۸ء میں مہاجر بن کر اور پاکستان پہنچ کر منٹو نے خود کو دو حصوں میں بانٹ لیا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے کا ادیب اور تقسیم کے بعد پاکستان کا وفادار ادیب۔"

کہیں لفظ 'وفادار' کے اضافے سے 'غدار' کی طرف قاری کے ذہن کو تو منتقل نہیں کرتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو بھی یہ لفظ منٹو کے لیے ہتک آمیز ہے۔

اُن کے خیال میں پاکستان پہنچ کر جن وسوسوں اور خدشوں نے منٹو کو ستایا اُن میں ایک یہ ہوگا:

> "کیا ہم اسٹیٹ کے ہر حالت میں وفادار رہیں گے؟ اور کیا اسٹیٹ پر نکتہ چینی کی اجازت ہوگی؟"

اس سلسلے میں مصنف نے ایک ضمنی عنوان قائم کیا ہے "وفاداری کا حلف نامہ" غور کریں تو کتنے نامور ادیب مثلاً سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، مولانا حسرت موہانی وغیرہ پاکستان جا کر لوٹ آئے کیوں؟ کیا محض وفاداری کے شرطیہ

حلف نامہ کی وجہ سے؟ کہ ہم تو وفادار رہیں گے لیکن کیا ہمیں اسٹیٹ میں حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت ملے گی۔ ظاہر ہے ہر نئے ملک کی تشکیل پر کئی طرح کے سوالات اُٹھتے ہیں۔ منٹو کے ذہن میں بھی سوالات اُبھرے ہوں گے مگر ذاتی خوشحالی یا ترقی کے لیے نہیں بلکہ زبان وادب کے امکانات اور فنکار کی آزادی اظہار کو لے کر۔ کسی بھی آمر یا مذہبی ریاست میں ادیب کے اظہار کی آزادی کی گارنٹی نہیں ہوتی ہے، اس سے ہم سب واقف ہیں۔

ریوتی سرن شرما نے پہلا بھرپور وار منٹو کی کہانی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' پر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ٹوبہ ٹیک سنگھ' لاہور کے ایک پاگل خانہ کی کہانی ہے۔ جہاں ہندو مسلم اور سکھ پاگل داخل ہیں جو الزائمرز (Alzhimars) نام کے مرض کی وجہ سے اپنی یادداشت کھو بیٹھے ہیں۔''

گویا ریوتی سرن صاحب علامتی کردار بشن سنگھ کو ہی نہیں بلکہ کہانی کے دیگر ثانوی کرداروں کو پاگل اور الزائمرز کے مرض میں مبتلا سمجھتے ہیں جبکہ کہانی میں کہیں بھی منٹو نے اس بیماری کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ طبّی ماہرین کا کہنا ہے کہ الزائمرز کے مریض پاگل پن میں مبتلا نہیں ہوتے بلکہ رعشا آجانے سے جسم یا جسم کا کوئی عضو کانپنے لگتا ہے۔ مذکورہ کہانی ۱۹۵۴ء میں مجموعہ 'پھندنے' میں شائع ہوئی۔ اس وقت بٹوارے کے المیے اور ہجرت کے کرب پر ہی افسانے نہیں لکھے جارہے تھے بلکہ الگ الگ زاویے سے اسباب وعلل تلاش کرتے ہوئے کسی نہ کسی کو ذمہ دار ٹھہرایا جارہا تھا۔ منٹو کا یہ زاویۂ نگاہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو کہتا ہے کہ پاگلوں کی اکثریت بھی اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔ ان کی بھی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اُکھاڑ کر پھینکا جارہا ہے۔ ریوتی صاحب غور کیجیے اُس وقت تقریباً تمام ادیب ہندوؤں اور مسلمانوں کی اتھل پتھل کو فوکس کیے ہوئے تھے۔ لیکن منٹو لاہور کے تقدس کے پیشِ نظر سکھوں کو مرکزِ توجہ بناتے ہوئے ان کے کرب کو اجاگر کرتا ہے۔

موصوف یہ بھی فرماتے ہیں کہ منٹو 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، 'بابو گوپی ناتھ' اور 'کھول دو' میں لفظوں سے کھیلتا ہے، کئی باتوں کو دوہراتا ہے— کیا الفاظ یا جملوں کو فنی ضرورتوں کے تحت بار بار لانے کا مطلب یہ ہے کہ فنکار خود کو دوہرا رہا ہے! جیسے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کا یہ جملہ:

''اوپڑدی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا منگ دی دال آف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔''

کہانی میں پانچ بار آنے والے بظاہر اس بے سروپا جملے میں منٹو ''منگ دی دال'' برابر استعمال کرتا ہے۔ یہاں ایک ناموس فقرہ کو فنکارانہ شعور کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ مُونگ کے دانوں کا دال بن جانا یعنی ٹوٹ کر دو حصوں یا کئی ٹکڑوں میں بٹ جانا— ہندوستان کے ساتھ تقسیم یا تقسیمات نے بھی کیا ہے۔ تقسیم در تقسیم یہاں تک کہ چھوٹا سا گاؤں ٹوبہ ٹیک سنگھ بھی اس کا شکار ہوا بلکہ اب بھی یہ سب ہو رہا ہے۔ ''منگ دی دال'' ہمہ وقت دلی جا رہی ہے۔ ریوتی سرن ''بشن سنگھ'' کو پاگل بھی کہتے ہیں اور سیانا بھی۔ اُن کا اصرار ہے کہانی کو وہاں ختم ہو جانا

چاہیے جب بشن سنگھ چلا چلا کر کہتا ہے۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے۔ اوپڑ دی گڑ گڑ دی، بے دھیانا منگ دی وال آف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان''۔ وہ اسے فلمی انجام قرار دیتے ہوئے طنزیہ سوال کرتے ہیں کہ:

''اگر بشن سنگھ کو زبردستی ہندستان کی سرحد کی طرف نہ لے جایا جاتا تو بشن سنگھ پاکستان میں جیتا اور مرتا، لیکن زمین کے اُس ٹکڑے میں (نو مین لینڈ میں) اوندھے منھ لیٹا پڑا نہ پایا جاتا، جس کا کوئی نام نہ تھا، جو نہ ہندوستان میں تھا نہ پاکستان میں۔''

سعادت حسن منٹو فن افسانہ نگاری سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اگر بشن سنگھ کو No man's land میں مُردہ پڑا نہ دکھاتا تو افسانہ اپنی تاثیر کھو دیتا، دو کوڑی کا نہ رہ جاتا۔ مذکورہ افسانہ پر ریوتی سرن شرما بھی الزام عائد کرتے ہیں کہ:

''ٹوبہ ٹیک سنگھ عُرف بشن سنگھ وہاں (No man's land) خود نہ آیا تھا، اُسے منٹو زبردستی لایا تھا یا خود اُلجھن میں پڑ کر یا قارئین کو اُلجھن میں ڈالنے کی بد نیتی سے۔''

یہ الزام مصنف کے بیانیہ کی حرکیات سے یکسر لاعلمی کو آشکارا کرتا ہے کہ یہاں بشن سنگھ کی موت کی مثال اُس مچھلی سے دی جا سکتی ہے جسے پانی سے نکال کر سوکھی زمین پر رکھ دیا گیا ہو۔ ہمارے قومی اور اجتماعی شعور کا یہ حصہ رہا ہے کہ آدمی اپنی زمین سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنی جائے پیدائش، اپنے وطن کا اٹوٹ عضو ہے جو جسم سے جدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ دراصل منٹو اپنے خلق کردہ کردار میں ڈھل کر ہی بشن سنگھ کا روپ اختیار کر لیتا ہے جو کسی طور بٹوارے کے اس سنگین سیاسی اور غیر انسانی جُرم کو تسلیم نہیں کر پاتا، اور اس تقسیم کے کارندوں نے جو No man's land بنایا تھا اُسے رد کر دیتا ہے، جانِ عزیز تج کر۔ اسی کو لینڈ اوینگ نے Manto Persona کہا ہے۔

صاحب مضمون نے افسانہ ''کھول دو'' کے بارے میں لکھا ہے:

''عُجلت میں لکھے جانے اور ان نفسیاتی نا سمجھی کی وجہ سے افسانہ خام، ناقص، نا قابلِ یقین اور نا قابلِ قبول ہو کر رہ جاتا ہے۔''

لفظ عُجلت منٹو کے لیے یوں بے معنی ہے کہ اُس کی بیشتر تحریریں قلم برداشتہ ہیں۔ ذہن، لفظ اور جملے کی ترتیب و تنظیم میں اتنا گہرا تال میل، شاید ہی کسی اور فن کار کے یہاں نظر آتا ہو۔ ایک ہی نشست میں لکھے جانے والے اس 'فن پارہ' کی روداد احمد ندیم قاسمی 'نقوش' میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

محترم اس کے انجام پر بھی معترض ہیں:

جبکہ انجام ہی کہانی کی روح، جان ہے۔ منٹو نے لکھا ہے کہ:

''افسانے کی اختتامی سطور چونکہ بہت ہی اہم تھیں، اس لیے قاسمی صاحب کو کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ جب افسانہ مکمل ہو گیا تو میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا ـــــ پڑھ لیجیے، خدا کرے آپ کو پسند آ جائے۔''

اور احمد ندیم قاسمی اسے پڑھ کر سنانے میں آ گئے، منٹو کے فنی کمال کے اور بھی معترف ہو گئے۔ لیکن صاحب مضمون کا کہنا ہے:

> ''زنا کاروں نے باری باری ہر روز 'کھول دو' کہہ کر اتنی بار بدنصیب لڑکی سے اُس کا 'نچلا کپڑا' اُتروایا تھا کہ یہ لفظ سنتے ہی وہ اپنا نچلا کپڑا اُتارنے لگتی۔''

'نچلا کپڑا' بھی خوب ہے ریوتی صاحب۔ منٹو نے ایسا پھوہڑ لفظ استعمال نہیں کیا ہے اور نہ ہی کچھ اُتروایا ہے بلکہ کہانی کی بُنت میں کلائمکس پر پہنچتے ہوئے ڈاکٹر نے، سراج الدین سے کہا تھا ''کھڑکی کھول دو' جس پر نیم مُردہ سکینہ، بوڑھے باپ سراج الدین اور ڈاکٹر کے عمل کا اظہار ہی کہانی کا انتہائی کلائمکس، اُس کی جان ہے اور اس کے لیے اُس نے محض لفظ ہی نہیں ایکشن اور تاثر کا بھی سہارا لیا ہے۔

کسی اذیت ناک صورت حال میں اگر کسی لفظ یا آواز کو لگاتار دوہرایا جائے تو لاشعوری طور پر وہ عمل پذیر ہوسکتا ہے۔ علی بابا اور چالیس چور میں یا کبھی کبھی کسی جادوئی کہانی میں تین بار تالیاں بجانے سے دروازہ کھل جاتا ہے۔ سائنسی ایجادات نے قصہ کہانیوں کے ان ناقابلِ یقین اعمال کو اب حقیقت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ سارا معاملہ Sound wave کا ہے۔ مثلاً ریڈیو یا ٹی وی میں ٹرانسمیٹر آواز کو Eletrical signal میں متبدل کر دیتا ہے۔ اور اسے مقررہ فری کوئنسی پر نشریہ کے لیے کھلی فضا میں پھیلا دیتا ہے۔ پھر وہ صوتی ترنگیں یا برقی سگنل مقررہ Frequency کے مطابق فضا میں چہار طرف سفر کرنے لگتے ہیں۔ Receiving sets (ریڈیو اور ٹی وی) اِن ہی سگنل کو پکڑتے ہیں جو مقررہ Frequency پر Redial ہوتے ہیں۔ زائد سگنل اگر بوجوہ مخل ہوتا ہے تو Receiving Sets اُنھیں خارج کر کے مقصود سگنل کو آواز میں بدل دیتا ہے اور پھر سامع تک آواز کو پہنچا دیتا ہے۔ ''سکینہ'' ایک ایسی ہی Receiving Set ہے صرف اور صرف ''کھول دو'' کی آواز پر ہی Activate ہوتی ہے۔ بقیہ زائد الفاظ محض شور (Noise) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''اردو کا افسانوی ادب (تحقیقی اور تنقیدی مضامین)'' کے مصنف اور تمہید نگار پر بھی ریوتی سرن شرما کو اعتراض ہے کہ انھوں نے منٹو کے یہاں فنی جادوگری تلاش کی ہے۔ دراصل موصوف حرف یا جملے کے ذریعے واقعات کی طرف سفر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دو چار جملے ہی سب کچھ ہیں یا ان میں فن اور جادوگری بھری ہوئی ہے حالانکہ ایسے جملے تو کوئی بھی افسانہ نگار تھوڑی سی مشق سے لکھ سکتا ہے۔ وہ پورے منظر کے بیانیہ اور اس کی فضا بندی (Setting) پر نظر ہی نہیں کرتے جب کہ ہر فنکار کا تکنیک، ہیئت یا فارم کو برتنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔

کہانی کے مناظر میں کہانی کار تحریر سے پوری فضا تخلیق کرتا ہے۔ یہی کہانی کے بیانیہ (Narrative) کا حصہ بھی بنتا ہے اور یہی فضا بندی کہانی کو متحرک کرتی ہے۔ مرکزی کردار کو عمل اور دیگر کرداروں کے ساتھ تفاعل کی ترغیب دیتی ہے۔ منٹو کی فنی جادوگری اسی عمل میں پوشیدہ ہے۔ ''اردو کا افسانوی ادب'' کے تمہید نگار، انیس رفیع صاحب کے توسط سے ''ٹھنڈا گوشت'' کی بات نکلتی ہے تو بہتان تراشی کا سلسلہ آگے بڑھتا

ہے۔ اس افسانے میں بھی منٹو نے جملے کیا لکھے اور واقعہ کیا بیان کیا، موصوف حسب معمول سطح پر ہی اٹکے رہے۔ جب کسی غیر معمولی فعل یا حیرت میں ڈال دینے والا عمل قصہ میں وقوع پذیر ہوتا ہے تو قاری اپنے طور پر معنی اخذ کرتا ہے۔ ممکن ہے کچھ ناقدین یا مبصر اس سے متفق نہ ہوں۔ متفق نہ ہونا بھی قاری کا حق ہے اور یہ حق ترقی پسند ادیب ریوتی سرن کو بھی حاصل ہے۔ تبھی تو بڑی سادہ لوحی سے لکھتے ہیں:

> ''منٹو نے جو افسانہ لکھا ہے اُس کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ منٹو نے تو ایسی کوئی بات نہیں لکھی۔۔۔ جس کا نتیجہ افسانوی ادب کے مصنف یا تمہید نگار نے اخذ کیا ہے۔''

مطلب یہ ہوا کہ وہی سمجھو جو لکھا ہوا ہے بس!۔۔۔ وقت، مقام، منظر و پس منظر کی کوئی حیثیت نہیں۔ متن کی قرأت کا یہ تصور جس میں بین السطور، زیریں لہریں یا لاشعور کی کوئی تمیز و تخصیص نہیں۔ کیا منٹو کے مطالعے کے لیے مناسب ہے!!

''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''کھول دو''، ''ٹھنڈا گوشت'' کے بعد ریوتی صاحب ''گُرمکھ سنگھ کی وصیت''، ''وہ لڑکی'' اور ''یزید'' پر تبصرہ کرتے ہوئے منٹو کو متعصب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

> ''تقسیم اور فسادات کے موضوع پر لکھے گئے منٹو کے جن چھ افسانوں کا میں نے تجزیہ کیا ان کے منفی (Negative)، ظالم اور خطاوار کردار سب کے سب سکھ یا ہندو ہیں۔۔۔ یہ اتفاق نہیں ہے۔ ایسا ارادتاً کیا گیا ہے۔''

افسانہ ''کھول دو'' میں ظالم اور خطاوار کردار سکھ یا ہندو نہیں، آٹھ مسلم رضا کار ہیں جن کی کامیابی کی سراج الدین دعائیں مانگتا ہے۔ یہ 'آپ' بھی جانتے ہیں کہ کسی فنکار کے یہاں کردار کا مذہب اہم نہیں ہوتا ہے بلکہ کردار اپنے تمام صفات و کمالات کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی مذہب و مسلک کا ماننے والا ہو سکتا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے یہاں رحمت کا کردار سُود خور پٹھان، افغانی تاجر یا قاتل نہ رہ کر ہر دلعزیز کابلی والا ہو جاتا ہے۔ عصمت چغتائی کے بڑے بھائی مرزا عظیم بیگ چغتائی افسانوی کردار کی شکل میں لائق صد احترام نہ رہ کر دوزخی بن جاتے ہیں۔ ایسی درجنوں مثالیں ہیں لہٰذا یہ الزام بھی دُرست نہیں کہ منٹو نے سوچ سمجھ کر، قصداً ایسا کیا ہے۔

شرما جی معترض ہیں کہ منٹو کے کسی بھی افسانے (کالی شلوار کو چھوڑ کر) میں بھرپور عورت نظر نہیں آتی ہے۔ اسے یاد رہتی ہے تو بدبودار، سماج سے نکالی ہوئی عورت بلکہ وہ عورت کا نہیں سیکس اِن کاؤنٹر کا ذکر کرتا ہے اور وہ بھی لذت لے کر۔۔۔۔ حسن عسکری، ممتاز شیریں، وارث علوی وغیرہ اس پر متفق ہیں کہ منٹو جب جنس کو موضوع بناتا ہے تو اُس کے پیشِ نظر جنسی استحصال ہوتا ہے نہ کہ جنسی لذت۔ یہ حربہ اُس کے یہاں اشتہا انگیزی اور ترغیب آمیزی کے طور پر نہیں بلکہ حقیقت کو اُجاگر کرنے کے لیے ایک تصادمی موج کی طرح کہانی کی فضا میں تحلیل ہوتی ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون ''افسانہ اور جنسی مسائل'' میں لکھتا ہے:

> ''دنیا میں جتنی لعنتیں ہیں، بھوک ان کی ماں ہے۔۔۔ یہ بھوک گداگری سکھاتی ہے،

جرائم کی ترغیب دیتی ہے، عصمت فروشی پر مجبور کرتی ہے۔"

چونکہ منٹو نے ہمیشہ چیزوں کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے اس لیے وہ 'عصمت فروش' کو حقارت کی نظر سے نہیں بلکہ مشفقانہ طریقے سے دیکھتا ہے:

> "چکلوں میں جب کوئی نائکہائی اپنے کوٹھے پر سے کسی راہ گزر پر پان کی پیک تھوکتی ہے تو ہم دوسرے تماشائیوں کی طرح نا کبھی اس راہ گزر پر ہنستے ہیں اور نہ کبھی اُس نائکہائی کو گالیاں دیتے ہیں۔ ہم یہ واقعہ دیکھ کر رُک جائیں گے۔ ہماری نگاہیں اُس غلیظ پیشہ ور عورت کے نیم عریاں لباس کو چیرتی ہوئی اُس کے سیاہ عصیاں بھرے جسم کے اندر داخل ہوکر اُس کے دل تک پہنچ جائیں گی، اس کو ٹٹولیں گی اور ٹٹولتے ٹٹولتے ہم خود کچھ عرصے کے لیے تصور میں وہی کریہہ اور متعفن رنڈی بن جائیں گے، صرف اس لیے کہ ہم اس واقعے کی تصویر ہی نہیں بلکہ اُس کے اصل محرک کی وجہ بھی پیش کرسکیں۔"
>
> (افسانہ اور جنسی مسائل)

اس زاویۂ نگاہ کے تحت خلق کردہ صورتِ حال میں رومانی ماحول، آرائش و زیبائش، معطر فضا نہیں بلکہ سنگلاخ حقیقت میں جمنا، سوگندھی، جانکی، شاردا، کانتا یا کوئی بھی جسمانی مشقت کرنے والی لاچار عورت اس حد تک بے حد و بے جان ہو جاتی ہے کہ کبھی کبھی وہ لاش محسوس ہوتی ہے جسے بقول منٹو:

> "سماج اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے۔ وہ اُسے جب تک کہیں دفن نہیں کرے گا، اُس کے متعلق باتیں ہوتی رہیں گی۔ یہ لاش گلی سڑی سہی، بدبودار سہی، متعفن سہی، بھیانک سہی، گھناونی سہی لیکن اس کا منہ دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ کیا یہ ہماری کچھ نہیں لگتی؟ کیا ہم اس کے عزیز و اقارب نہیں؟ ہم کبھی کبھی کفن ہٹا کر اُس کا منہ دیکھتے رہیں گے اور دوسروں کو دکھاتے رہیں گے۔" (مضمون سفید جھوٹ)

الزامات کا سلسلہ طویل ہے۔ مصنف کے مطابق منٹو کے افسانوں میں مواد یکساں ہے، سنسنی ہے، چونکا دینے والا انجام ہے۔ پھیلاؤ یا گہرائی نہیں ہے۔ معاشرے سے کٹے ہوئے افسانے ہیں۔ کردار مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں۔ اس کا رویہ تن آسانی کا ہے۔ وہ اُلجھن میں نہیں پڑتا۔ جہاں تصادم ہوتا ہے وہاں وہ اچانک کہانی کو ختم کر دیتا ہے —— دراصل ریوتی سرن شرما کا یہ طویل مضمون متن کی سطحی اور سرسری قرأت کی چغلی کھاتا ہے۔ انھوں نے شروع سے ہی منٹو کو ایک مخصوص زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کی شخصیت کے تضاد کو تلاش کرنے کا جتن کیا ہے جو ادبی یا تنقیدی کسوٹی کے لیے مناسب نہیں ہے۔ وہ پاکستان جا کر بھی متعصب نہیں ہوا ہے کیوں کہ یہ اس کے خمیر میں ہی شامل نہیں تھا۔ اُس کی عظمت کا راز یہی ہے کہ وہ زمین سے جُڑا ہوا ہے۔ نئے اور اچھوتے موضوعات کے علاوہ ہنگامی واقعات کو بھی اُس نے مخصوص تناظر اور نقطۂ نظر

سے آفاقی صداقتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہ بے باک حقیقت پسند ہے اسی لیے حقائق کے پردے اُس کے یہاں خود بخود اُٹھتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی بھی تفصیل میں نہ جا کر اُس نے عیاش، اوباش اور معاشرے سے کٹے ہوئے لوگوں کو دوٹوک پیرائے میں پیش کیا ہے اور وہ بھی بڑی سادگی اور سادہ لوحی کے ساتھ۔ انسانی رشتوں خصوصاً جنسی نفسیات کے تعلق سے جتنی بھی پیچیدگیاں ہو سکتی ہیں، اُن پر اُس کی گرفت ہے۔ اپنے سیاسی، سماجی اور اقتصادی شعور کی بنا پر وہ رشتوں سے کردار نکالتا ہے۔ یہ پاکباز بھی ہو سکتے ہیں اور بازاری بھی۔ اُس کے افسانوں کے بیشتر عنوان کرداروں پر مشتمل ہیں۔ وہ اپنے معاصرین سے اس لیے بھی الگ ہے کہ بہت سے موضوعات ایک ساتھ قلم بند نہیں کرتا بلکہ اپنی تمام تر توجہ کسی ایک نکتہ پر مرتکز کرتے ہوئے سنگل فوکس افسانہ خلق کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے افسانوں میں ہم جس زندگی سے دوچار ہوتے ہیں اور جس سطح پر زندگی کی نیرنگیاں اپنے وجود کا اثبات کرتی ہیں وہ آس پاس ہونے کے باوجود ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ وہ اپنے فن پاروں میں ایسے سوالات قائم کرتا ہے کہ ہمارے مزعومات، خود ہماری نگاہوں میں از کار رفتہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ زندگی کو دیکھنے کا یہ نیا زاویہ اور صورتِ حال کی تعبیر کا منفرد اسلوب منٹو کا اختصاص ہے۔ اسی زاویے اور اسلوب کا تنقیدی محاکمہ منٹو تنقید کا اہم مسئلہ ہے اور اس پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ بہتان تراشی کی۔

ڈاکٹر صغیر افراہیم
پروفیسر شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
s.afraheim@yahoo.in

[1]: میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اٹھاسی سالہ ریوتی سرن شرما جی منٹو کے فنی نظام سے لاعلم ہیں۔ اُن کی تمام عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے۔ درجنوں کامیاب افسانے، ریڈیائی ڈرامے، تھری ایکٹ پلیز، ٹی وی سیریلس وغیرہ لکھ چکے ہیں۔ اُن کی بیوی سرلا دیوی خود افسانہ نگار ہیں۔ سرلا دیوی کے بھائی کرشن چندر، پھر کرشن چندر کی بیوی سلمیٰ صدیقی بھی معروف افسانہ نگار ہیں۔

........☆☆........

یکتائے فن منٹو کے نام

(۱)

معجزہ : اقبال مجید

(۲)

حصار : اقبال حسن آزاد

(۳)

مُہلک : شاہد اختر

(۴)

مکڑی : انور امام

معجزہ

● اقبال مجید

ڈاکٹر مہدی کاغذات میں درج مریض کی کیفیت کو الٹ پلٹ رہے تھے جن میں لکھا تھا:
معمول : دیر رات میں سونا، چند مہینوں سے کبھی کبھی نصف شب کے بعد کمرے میں ٹہلنا، بلڈ پریشر اکثر بڑھنا، فکر مند رہنا، خلافِ مزاج ہونے والی باتوں سے بہت جلدی اپنے آپ میں سہم جانا، خود کو غیر محفوظ محسوس کرنا۔ ڈاکٹر مہدی نے کاغذوں پر سے نظر ہٹائی، مریض رضا حیدر کے وہ پرانے دوست تھے۔ دونوں جس فرقے سے تعلق رکھتے تھے وہ مسلمانوں میں اقلیت میں تو تھا ہی، شہر میں بھی وہ جماعت گنتی میں مختصر ہی تھی۔
رضا میاں نے پوسٹ گریجویٹ کالج میں زندگی بھر فزکس پڑھائی تھی۔ اس لیے جانتے تھے کہ شہر کے مسلم طبقے کے بچے سائنس اور ٹکنالوجی سے تعلق رکھنے والے مضامین میں بہت پیچھے تھے اور اپنی خام تعلیم کے سبب زیادہ سے زیادہ عدالتوں میں منشی یا دکانوں پر اوپری کاموں کی ملازمت تک ہی پہنچ پاتے تھے۔ رضا میاں اپنے دو ایک ہم خیالوں کے ساتھ ایسا ادارہ قائم کرنے کی جگاڑ میں لگ گئے جو خاص طور پر ان کے فرقے کے ذہین اور محنتی نوجوانوں کو سائنس اور ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم میں قدم رکھنے کے لیے تیار کرے اور ان کی ضروری امداد بھی۔ ایسے نمایاں مگر بے وسیلہ طلبا کی مالی امداد کی بھی سبیل پیدا کرے جن کی صلاحیتیں غربت کی وجہ سے مرجایا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر مہدی کے کشادہ ڈرائنگ روم میں چائے ناشتے پر منعقد کی گئی کئی بیٹھکوں اور بحث مباحثوں کے بعد ادارے کا نام 'اقرا' رکھا گیا۔ رضا میاں اس کے صدر اور ڈاکٹر مہدی ٹریزرر مقرر ہوئے۔ مگر جس پیمانے تک ادارے کو لے جانا چاہیے تھا، اس کے لیے رضا میاں کے پاس نہ تو وہ وسائل تھے اور نہ گنے چنے عمر رسیدہ ارکان میں بھاگ دوڑ کی جسمانی طاقت، چھ آٹھ سال کے عرصے میں کچھوے کی چال چل کر ادارے نے ڈاکٹر مہدی کے آبائی مکان کے ایک حصے میں چھت کا پنکھا ٹانگ کر سائنس کے مضامین کا ایک کوچنگ سینٹر اور ستر ہزار کے سالانہ وظیفے اور انعامات تقسیم کرنے، ایک باتصویر رنگین سووینئر نکالنے، اور ادارے کے تقسیم انعامات اور

وظائف کے جلسوں میں شرکت کرنے والوں کو چھولے بھٹورے کھلانے کا شوق پورا ہونے لگا تھا اور اسی کے ساتھ ادھر کچھ عرصے سے اندر ہی اندر ادارے کو اپنے اپنے معمولی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کھینچا تانی کی کوششیں بھی کبھی کبھی سر اُٹھانے لگی تھیں۔

حیدر میاں دو چار روز پیشتر ہی کام چلاؤ نرسنگ ہوم میں یکا یک رات کے وقت لائے گئے تھے جبکہ وہ سارے بدن سے کانپ رہے تھے۔ اس کپکپی کے روز ان میں کھڑے ہونے کی بھی قوت نہ تھی۔ جب اُن کے دوست ڈاکٹر مہدی جو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے، رات واپس آئے تو بھاگے ہوئے رضا میاں کو دیکھنے بھی آئے تو بات یوں شروع کی:

''سنا ہے جلسہ دیر رات میں ختم ہوا تھا''۔

''ہاں'' رضا میاں نے دھیرے سے ٹالنے والی ہاں کی۔

''جلسے میں کچھ ہوا ہوگا۔ تمھیں سوچنے کا مسالہ مل گیا ہوگا اور تم بستر پر لیٹے لیٹے سوچتے رہے ہوگے۔ سوچتے رہے ہوگے۔''

''سوچنے کی بات ہی تھی۔'' مری سی آواز میں ڈاکٹر مہدی کو جواب ملا۔

''تمھاری مرضی اور پسند کے خلاف دنیا میں نہیں ہونا چاہیے ورنہ تمھاری دھڑکن بڑھ جائے گی۔ نیند غائب ہو جائے گی۔ جلدی جلدی ہچکیاں آنے لگیں گی، یہی ہے نا۔'' رضا میاں ڈاکٹر مہدی کی جلی کٹی باتوں کے عادی تھے۔ ہوا یہ تھا کہ ڈاکٹر مہدی بھی اس جلسے میں موجود تھے مگر وہ بیچ جلسے سے کسی مریض کو دیکھنے چلے گئے تھے۔ جلسے میں تمبوقنات والے للّے بھائی نے جو تقریر کی تھی، وہ ڈاکٹر مہدی نے نہیں سنی تھی۔ دراصل اُسی تقریر کے بعد رضا میاں پر ڈپریشن کا دورہ سا پڑ گیا تھا کیوں کہ وہ تقریر انتہائی بے موقع تھی۔ ڈاکٹر مہدی نے پھر ایک تیر پھینکا:

''تم چاہتے ہو کہ تمھاری اپنی دنیا میں کوئی ذرا سی چوں بھی کرے تو تم سے پوچھ کر کرے ورنہ تمہارا دم اکھڑ جاتا ہے، ایسے تو میرا خیال ہے کہ تم جلدی مر جاؤ گے۔''

رضا میاں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، جھنجھلا کر بولے:

''تمھیں معلوم ہے کہ ایسا مجمع جس میں آئی آئی ٹی کی تیاری کرنے والے نوجوان بھی موجود تھے۔ وہاں تقریر کرنے والوں میں زبردستی اپنا نام شامل کروا کر کیا تقریر کی تھی للّے بھائی نے؟۔''

''ٹھیک ہے بچّے تو ہیں نہیں، بچپن کی عمر ہوگی للّے بھائی کی، گالیاں تو بکی نہ ہوں گی۔'' یہ جواب سن کر رضا میاں آبدیدہ ہو گئے تو ڈاکٹر مہدی کچھ فکر مند ہو گئے تشویش کے ساتھ پوچھا:

''کیوں۔؟ ایسی کیا بات ہوئی''۔ تب رضا میاں نے بتایا کہ للّے بھائی تمبوقنات والے کی تقریر سے وہ اتنا پریشان نہیں ہوئے تھے۔ دھچکا تو انھیں تب لگا جب ایم ایس سی میں پڑھنے والی ان کی سمجھدار بیٹی پروین نے خاص طور پر اُس تقریر کی اس لیے تعریف کی کہ للّے کی تقریر سے اسے کچھ نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں جن کا اسے

پہلے علم نہ تھا۔ ڈاکٹر مہدی نے اُس وقت رضا میاں سے تفصیل معلوم کرنا مناسب نہ سمجھی۔ اسپتال نے رضا میاں کو Tranqulizer وغیرہ کھلا پلا کر اور ایک روز اپنی دیکھ ریکھ میں رکھ کر چھٹی دے دی۔ اسپتال میں للّے بھائی بھی اپنے حالی موالیوں کے ساتھ رضا میاں کی عیادت کو آئے تھے مگر رضا میاں نے اپنی کسی بھی بات سے اُن پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ للّے بھائی کی تقریر ہی انھیں اسپتال لے کر آئی ہے۔

یوں تو رضا میاں کی اعصابی بیماری پر لوگ کوئی خاص توجہ نہ دیتے تھے لیکن اس بار اسپتال سے آنے کے بعد رضا میاں جیسے گھر میں بند ہو کر رہ گئے۔ ملنے والوں کے آنے پر کوئی بہانہ کر کے انھیں ٹال دیا جاتا۔ ڈاکٹر مہدی کا فون اکثر آتا۔ ایک بار ڈاکٹر مہدی سے فون پر رضا میاں نے کہا تھا:

''ہم 'اقرا' کے ذریعے اچھے طلبا میں وظیفے ہی تقسیم نہیں کرنا چاہتے اور نہ ان کے پیشہ ورانہ نصابوں میں کامیابی کے لیے ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ درحقیقت ہم ان کی سوچ میں اس تبدیلی کے بھی خواہاں ہیں جو عقل واستدلال کو برت کر اُن میں روشن خیالی پیدا کر سکے اور ان کے دماغ میں ایسے دقیانوسی خیالات کا بیج پڑنے سے روکے جو انھیں اندھی تقلید کے لیے اکساتے ہوں۔ تم ڈاکٹر ہو، سوچو کہ اس کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔''

رضا میاں کو اپنے بے تکلف دوست ڈاکٹر مہدی سے جواب ملا تھا:

''تم ادارے کے صدر ہو، اگلی میٹنگ کے ایجنڈے میں اس مسئلے کو انتظامیہ کے سامنے اُٹھا سکتے ہو۔''

''ایک بار اُٹھایا تو تھا۔ تم بھی موجود تھے؛ کیا ہوا۔''

''پھر اُٹھاؤ'' روکھا سا جواب ملا۔

رضا میاں نے جھنجھلا کر فون رکھ دیا۔

رضا میاں کو جب بھی یہ بات یاد آتی کہ ان کی بیٹی نے خاص طور پر للّے بھائی کی تقریر کی تعریف کی تھی تو ان کے اندر ایک کھولن سی پیدا ہونے لگتی۔ آخر کو انھوں نے کچھ سوچ کر اپنی بیٹی کو اپنے کمرے میں طلب کیا، باتوں باتوں میں انھوں نے اس بات کو کریدا۔

''ایک بات بتاؤ۔ مجھے لگتا ہے کہ للّے بھائی نے تم سے ضرور کہا ہوگا کہ تم ان کی تقریر ضرور سنو۔''

''ہاں ابّا۔ للّے چچا نے خاص طور پر کہا تھا۔''

''کیوں۔ وہ تمھیں سننے کے لیے کیوں پابند کر رہے تھے؟'' پروین نے باپ کو جو جواب دیا اُسے سن کر رضا میاں کو پسینہ آ گیا۔ پروین کا جواب تھا:

''للّے چچا کہہ رہے تھے کہ تم زنانی مجلسوں کی ذاکرہ ہو جو باتیں میں تقریر میں بتاؤں، اُن باتوں کا ذکر محرم کی مجلسوں میں ضرور کرنا تاکہ مومنات کا علم بڑھے۔''

یہ سن کر رضا میاں پسینے پسینے تو ہوئے ہی، ان کی سانس پھولنا بھی شروع ہو گئی۔ خود پر قابو پاتے ہوئے انھوں نے بیٹی سے پوچھا:

''تمہیں یاد ہے للّے بھائی نے تقریر میں کیا کہا تھا۔''

''یاد ہے'' بٹی نے چہک کر جواب دیا۔ ''بتاؤں'' خوشی کے ساتھ اچھل کر اس نے دریافت کیا۔ اور جواب ملے بغیر شروع ہوگئی:

''سنیے، للّے چچا نے بتایا کہ عراق کے مجتہد محمد حسن شیرازی اعلیٰ مقام کے نزدیک فروغ دین چھ نہیں بلکہ دس ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس، حج اور جہاد کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو اچھی باتوں کی طرف لگایا جائے اور بری باتوں سے روکا جائے۔ پھر آتا ہے تولّا۔

رضا میاں تولّا کے مطلب جانتے تھے مگر بٹی کا امتحان لینے کے لیے سوال کیا:

''تولّا کے کیا مطلب ہیں''۔ جواب میں پروین پھٹ سے بولی:

''تولّا کے مطلب ہیں دوستی یعنی اہلِ بیت علیہم السلام اور ان کے دوستوں سے دوستی رکھنا اور دوسواں ہے تبرّہ۔ یعنی اہل بیت علیہم السلام کے دشمنوں سے اور ان دشمنوں کے دوستوں سے بھی دشمنی رکھنا۔''

یہ سن کر رضا میاں کپکپانے لگے۔ بٹی کو ہاتھ کے اشارے سے کمرے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ جب وہ گردن لٹکا کر کچھ فکرمندی کمرے سے چلی گئی تو رضا میاں اپنے کو سنبھالتے ہوئے آہستہ سے بستر پر اس طرح لیٹ گئے جیسے شیشے کے بنے ہوں۔

کچھ دنوں بعد جب للّے بھائی کے پاس یہ خبر پہنچی کہ 'اقرا' کے صدر محترم پر ان کی تقریر سن کر دورہ پڑ گیا تھا تو وہ یہ کہہ کر بگڑ گئے کہ انھوں نے تو وہی کہا جو تحفۃ العوام میں درج ہے، یہی نہیں بلکہ للّے بھائی نے اپنے ملنے والوں کے حلقے میں دبی زبان سے یہ شکایت بھی کی کہ رضا شاید یہ نہیں چاہتے کہ 'اقرا' پلیٹ فارم سے ان کے علاوہ دوسرا بھی کوئی بولے۔ للّے بھائی کا تعلق شہر کے مقبول تاجروں کے طبقے سے تھا، وہ پڑھے لکھے تو زیادہ نہ تھے لیکن ایسی تہذیبی اور خاص طور پر مذہبی سرگرمیوں میں آگے آگے رہا کرتے تھے اور پیسے بھی خرچ کردیا کرتے تھے جس میں عوام و خواص کے درمیان شہرت پانے اور واہ واہی لوٹنے کا امکان ہو۔ عشرے کے دن کربلا کے پاس کیوڑہ پڑی دودھ اور شہد کے شربت والی ان کی چاردوکی شاندار سبیل پر ہر سال ان کا کہا ہوا یہ شعر پانچ گز کے بینر پر ضرور لکھا ہوتا:

لَلّے کی ہے سبیل پھر اپنے مقام پر
شربت پلا رہی ہے شہیدوں کے نام پر

لوگوں کا کہنا تھا کہ دودھ کی قلت کی وجہ سے شہر کے حلوائی اس دن دودھ کی مٹھائی نہیں فروخت کرتے تھے۔

بٹی سے للّے بھائی کی تقریر کی تفصیل پوچھنے کے تین دن بعد رضا میاں نے پروین کو اپنے پاس بلایا اور اسے بڑے پیار سے بتایا کہ ایک بار ایک گدڑیا درخت کے نیچے بیٹھا آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے خدا سے یوں مخاطب تھا کہ اے اللہ میاں تم کتنے اکیلے ہو، تم کو چاہیے کہ میرے پاس آجاؤ۔ میں تم کو نہلاؤں دھلاؤں گا، بالوں میں کنگھی کروں گا، آنکھوں میں سرمہ لگاؤں گا، پاس ہی حضرت موسیٰ کھڑے ہوئے گدڑیے کی یہ باتیں سن

رہے تھے۔ ان کو گدڑیے کی جہالت پر بہت غصہ آیا۔ اور اس کو ڈانٹا کہ تو کیا کفر بک رہا ہے۔ اللہ کو تیرے ان کاموں کی ضرورت نہیں ہے توبہ کر نہیں تو دوزخ میں جائے گا۔ گدڑیا یہ سن کر سہم گیا، اسی وقت حضرت جبرئیل تشریف لائے اور موسیٰ سے بولے کہ اے موسیٰ تم نے یہ کیا کہا، اللہ سے محبت کرنے والے بندے کو ڈرا کر اس سے جدا کر دیا۔ یاد رکھو کہ تم دنیا میں لوگوں کو جوڑنے کے لیے آئے ہو نہ کہ توڑنے کے لیے۔ یہ کہہ کر رضا میاں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ بیٹی کے سر پر رکھا اور رندھے گلے سے اس کو تاکید کی:

''تم اگر میری بیٹی ہو تو تبرے والی بات کبھی مجلس میں نہ پڑھنا۔'' رضا میاں کو ان کی بیوی نے اشارتاً یہ بھی بتا دیا تھا کہ للّے بھائی اور ان کی بیوی چپکے چپکے اپنے انٹر پاس لڑکے کے لیے پروین پر ڈورے ڈال رہے تھے جو لڑکا تمبوقنات کی دُکان میں گدی پر آدھے دن بیٹھتا تھا اور باقی آدھے دن گاڑی میں دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر پٹرول پھونکتا تھا۔ ڈاکٹر مہدی کو ہر اس بات کی خبر ہو جایا کرتی تھی جن سے رضا میاں گزرتے تھے یعنی وہ کیوں کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوا کرتے تھے، کیوں ٹرنکولائزر کی گولیاں کھانی پڑتی تھیں، کیوں سب کے درمیان رہ کر خود کو یکہ و تنہا محسوس کر کے دانتوں سے ناخن نوچتے تھے، کیوں گھبرا کر تکیہ ہٹا کر خوف کے سانپ بچھو ڈھونڈتے تھے، کیوں انھیں کوئی بھی ذرا دیر میں دنیا سے اجنبی اور بیگانہ بنا دیا کرتا تھا۔ اُن کے آس پاس گھر باہر کبھی بیٹی تو کبھی بیوی کے حوالے سے تو کبھی پڑوسیوں کے حوالے سے کچھ ایسا ہو جایا کرتا تھا جو اُن کو دکھ دیتا، اُن کی بیوی کی کوئی مراد پوری ہو جانے پر جب عورتوں کو بٹھا کر جناب سیّدہ کی کہانی سنتیں تو وہ کئی دنوں تک پورے گھر بھر پر اپنی خاموش ناراضگی کا اظہار کرتے، اور ڈاکٹر مہدی سے پوچھتے ''ہم کب تک کہانیاں سن کر اور منتیں مان کر زندگی کرتے رہیں گے۔''

ڈاکٹر مہدی ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتے۔ جن دنوں رضا میاں کی بیوی اپنے شوہر پر پڑنے والے دوروں سے فکرمند رہنے لگی تھیں، انھیں دنوں اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں انھوں نے شوہر اور ڈاکٹر مہدی کے درمیان اونچی آواز میں ہونے والی کچھ باتیں سنیں:

''تم کیا چاہتے ہو، صاف صاف بتاؤ تم کیا چاہتے ہو'' ڈاکٹر مہدی پوچھ رہے تھے مگر ان کے شوہر عادت کے مطابق چپ رہے تو بار بار ڈاکٹر مہدی وہی سوال دہراتے رہے ''بولو تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں 'اقراء' کے پلیٹ فارم پر ہمارے طالب علموں کو معجزے نہ سنائے جائیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ سائنس اور عقل انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا قبول نہیں کر سکتی، فزکس کی نظروں میں جس دن چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے تو اس دن اس کرۂ ارض کی gravity کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر مہدی فوراً بول پڑے:

''تم 'اقراء' کے صدر ہو، لوگوں کو روکو کہ وہ اپنی تقریروں میں عقائد سے نہیں عقلی دلائل سے کام لیں۔ میں پوچھتا ہوں آج تک تم نے روکا کسی کو۔ کیا کسی کو بتایا کہ پیغمبر کا معجزہ منجانب اللہ ہے جو ہماری عقل سے بعید

ہے لیکن فزکس خود اپنے نظام پر قائم ہے۔ روکو انھیں کہ دونوں باتوں کو خلط ملط نہ کریں، گر دروکنے کی کوشش۔''
''کیسے روکوں۔ لوگ کچھ سننے سے پہلے ہی برامان جائیں گے۔'' یہ کہہ کر رضا میاں دوسرے کمرے میں چلے گئے، ڈاکٹر مہدی دراصل رضا میاں کو یہ بتانے آئے تھے کہ 'اقرا' کے تقسیم انعامات کے جلسے میں ڈھائی سو روپے کا انعام ایک طالب علم لینے کے لیے نہیں آیا تھا، اس کے باپ کو خبر بھیجی گئی کہ انعام کی رقم آکر لے جائے تو اس نے کہلوا دیا کہ وہ سائیکل چلا نہیں پاتا اور آٹو سے آنے جانے میں اسّی روپے خرچ ہو جائیں گے۔ اس لیے رقم گھر پہنچا دیں۔ پندرہ دن بعد لڑکے کے والد ڈاکٹر مہدی کو سول اسپتال میں دکھائی دیے تو ڈاکٹر نے ان سے پوچھا کہ تمھاری بیوی محرّم کی زنانی مجلسوں میں شرکت کے لیے سات آٹھ کلومیٹر پیدل گھومتی ہے مگر انعام کی رقم لینے ہمارے گھر نہیں آسکتی تھی تو لڑکے کے باپ نے جواب دیا:
''مجلسوں کا کسی چیز سے مقابلہ نہ کیا جائے۔ یہ مولا کے نام کی برکت ہی تو ہے کہ ہم غربت میں بھی چار لوگوں سے اچھا کھاتے اور پہنتے ہیں۔''
پروین باپ کو بہت چاہتی تھی، باپ کی اعصابی کیفیت کو سمجھتے ہوئے وہ ان سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ وہ اپنے دل کی بات دل میں چھپائے رہتے ہیں اور جہاں اسے نکالنا چاہیے، وہاں نکال کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کرتے۔ پھر کوئی سمجھے تو کیسے سمجھے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھتی تھی کہ اعصابی تناؤ کی حالت میں اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے ان کی زبان پر ان بڑے بڑے سائنسٹسٹوں کے نام آجایا کرتے تھے، جنھوں نے مروجہ حقیقتوں کے خلاف نئی حقیقتیں دریافت کی تھیں اور اس کی سزا بھی جھیلی تھی۔ رضا میاں کی طبیعت اس موقعے پر بھی بگڑی تھی جب انھوں نے گئے گزرے کاشتکار نقوی صاحب کے صاحبزادے کی فیس معاف کرا کے فزکس کوچنگ کلاس میں شامل ہونے کی اجازت دلوائی تھی لیکن نقوی صاحب کے صاحبزادے اکثر اتنی دیر میں تشریف لاتے کہ انھیں اندر آنے کی اجازت نہ ملتی۔ دیر میں آنے کا سبب یہ معلوم ہوا کہ صاحبزادے کا گلا اچھا تھا، انجمنوں میں نوحے پڑھنے اور مسالموں میں دوسروں کے لکھے سلام اور نعتیہ کلام پڑھنے کا شوق تھا جس کے سبب دیر رات میں سوتے اور دیر میں اٹھتے۔ ویسے بھی کاشتکار کے بیٹے تھے، شہر کے قدیمی زمیندارانہ مزاج کے مطابق گھر بھر کو مفلسی میں بھی رت جگا منانے کی عادت تھی، صاحبزادے سے رضا میاں نے سختی سے باز پرس کی تو انھوں نے برامان کر جواب دیا:
''پڑھنے کے پیچھے کوئی جان تھوڑی دے دیں گے۔''
ایک دن ڈاکٹر مہدی اپنے ساتھ ان خبروں کو لے کر رضا میاں سے ملنے آئے جو خبریں چپکے چپکے 'اقرا' کے حلقوں میں گشت کر رہی تھیں مثلاً رضا میاں نے ادارے کو خالہ جی کا گھر بنا رکھا ہے۔
رشتے داروں کو وظیفے اور انعامات دلواتے ہیں، باقی سفارشیں عین وقت پر فہرست سے غائب ہو جاتی ہیں۔ گلیلیو کی تعریف ہوتی ہے، معجزوں کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔
للّے بھائی کی زبانی یہ بات پھیل گئی کہ رضا میاں کے عہدے کی مدت دو ماہ اور ہے۔ اس کے بعد

'اقراٗ' کے ممبران اب کسی ایسے سائنس والے کو جو امام آخر کے ظہور کے بارے میں طالب علموں کو معلومات نہیں دینا چاہتا، 'اقراء' کا عہدہ دینے کو تیار نہیں۔

وہ رضا میاں سے کہنا چاہ رہے تھے کہ ادارے پر للّے میاں کے دانت لگے ہوئے ہیں اور چپکے چپکے 'اقراء' کی انتظامیہ کے خلاف مہم چلائی جارہی ہے، یہ تک کہا جارہا ہے۔ کہ ہم لوگ بے دینے ہیں۔

اسی شام حیدر میاں کے پاس للّے بھائی کا فون آیا:

''حیدر صاحب شام کو آپ کہیں باہر تو نہیں جارہے"

''جی نہیں'' حیدر نے جواب دیا۔

''میں اسلامیہ کالج کے اردو پروفیسر کاظم شبیر کے ساتھ آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ کاظم صاحب آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

پھر شام جب ہوئی تو للّے بھائی پوری تیاری کے ساتھ پروفیسر کاظم شبیر کی پیٹھ کے پیچھے کھڑے ہو کر اور اپنا منشا کاظم صاحب کے منہ میں ڈال کر میاں سے اپنی اندرونی لڑائی کے لیے دو دو ہاتھ آزمانے کے لیے وارد ہو گئے۔ پروفیسر کاظم شبیر مرثیے عمدہ کہتے تھے اور اقبال کی 'اسرار خودی' کے عقیدت مندوں سے تھے۔ انھوں نے رضا میاں کو سمجھایا:

''آپ نیوٹن اور گلیلیو سے کیے گئے اکتساب نور پر اچھل کود کر خود بھی گمراہ ہوں گے اور قوم کو بھی گمراہ کریں گے۔ سنا ہے، ہمارے گھر کی بی جب کوئی منت پوری ہونے پر جناب سیدہ کی کہانی سنتی ہیں یا کسی بات کو کرنے یا نہ کرنے کے لیے استخارہ دیکھا جاتا ہے تو آپ کے ابروؤں پر بل پڑتا ہے۔ آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہماری تہذیب روحانیت کے جس رس میں ڈوبی ہوئی ہے یہ روایتیں اسکی پہچان ہیں۔ یہ رس ہماری تہذیبی نم کی ضامن ہے۔ یہ پودا اسی رس کے سبب ہرا بھرا ہے۔''

رضا میاں کو کاظم شبیر صاحب سے اسی پند و نصائح کی امید تھی۔ وہ جل کر اس کے جواب میں اس مجہول بنیاد پرستی کے کیڑے کے بارے میں کچھ کہنا چاہ رہے تھے جو ہرے بھرے پودوں کو سکھا دیا کرتا تھا اور جس نے ان کی راتوں کی نیندیں چھین لی تھیں لیکن کاظم صاحب کی عبا قبا اور ٹخنوں سے اوپر پاجامہ دیکھ کر انھوں نے خود کو روک لیا۔ چلتے چلتے کاظم شبیر صاحب نے تابوت میں یہ کہہ کر آخری کیل ٹھونک دی:

''لوگ آپ کے ہم خیال نہیں ہیں...... وہ چاہتے ہیں 'اقرا' پہلے اس رس کو زندہ رکھے جس سے ان کا وجود قائم ہے۔'' کمرے سے باہر نکلتے وقت کاظم صاحب تو ٹھیک تھے مگر للّے بھائی کا سینہ اس قدر چوڑا ہو چکا تھا کہ دروازے سے باہر نکلنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

کچھ دنوں بعد ڈاکٹر مہدی رضا کے پاس یہ خبر لائے کہ جس ادارے کے قیام کے لیے رضا میاں نے ان کے ساتھ رات کو رات اور دن کو دن نہ سمجھا تھا اس پر للّے بھائی کے معتمد خاص پروفیسر کاظم شبیر کی کوششوں

سے للّے بھائی کا قبضہ ہو گیا تھا کیوں کہ حیدر میاں نے اپنی سبکدوشی کا پروانہ ادارے کو اس دن بھیج دیا تھا جس دن ان کے گھر پر کاظم شبیر ملنے آئے تھے۔ ڈاکٹر مہدی نے یہ خبر بھی دی کہ نئے صدر للّے بھائی نے ادارے کو چالیس ہزار روپے سالانہ دینے کا وعدہ کیا ہے پھر جیب سے ٹیپ رکارڈر نکال کر ان کی پہلی صدارتی تقریر بھی سنوائی جو کاظم شبیر نے انھیں ٹکنکل نصابوں میں کوچنگ لینے والے طالب علموں کو سنانے کے لیے لکھ کر دی تھی۔

تقریر اس طرح تھی:

''چونکہ احادیثِ معتبرہ میں وارد ہوا ہے کہ جس روز امام زمانہ کا ظہور ہوگا، وہ منگل کا دن اور محرم کی دسویں تاریخ ہوگی۔ پہلے حضرت جبرئیل ان کے ہاتھوں پر بیعت کریں گے۔ پھر ہر ایک مومن کو فرشتہ قبر میں جگا دے گا۔ پھر جس وقت مکہ معظمہ سے باہر تشریف لائیں گے اور مومنین جمع ہو جائیں گے تو اس وقت منجانب امام منادی ہوگی کہ کوئی شخص پانی اور خوراک ہمراہ نہ رکھے۔ صرف حضرت موسیٰ کا پتھر ایک اونٹ پر بار کیا جائے جس میں سے ہر منزل پر بارہ چشمے جاری ہو کر بھوکوں اور پیاسوں کو سیراب کر دیں گے۔ زمین وقتِ سفر کوتاہ ہوگی جلد نجف اشرف پہنچ جائیں گے تو اس پتھر سے دودھ شہد کی نہریں جاری ہوں گی۔''

ڈاکٹر مہدی نے ٹیپ بند کر دیا اور کڑوا منہ بنا کر بولے:

''اگر ہم یہ کہیں کہ امام زمانہ کے انتظار کے بغیر بھی یہ نہریں جاری کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ ذہن، تحقیق اور جستجو کے لیے تیار ہو۔ مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کسی کو کیا کہوں میں خود بھی ڈرتا رہا کہ اگر ہمارے اپنے ناراض ہو گئے تو میرے کلینک میں کتے لوٹیں گے۔ تم بھی ڈرپوک تھے جو مسلسل چلتے رہے۔ لگاتار چپ رہنے سے آواز کام کرنا بھول جائے تو تعجب کی کیا بات ہوگی۔'' پھر مہدی بڑی بڑی اور گول گول آنکھیں نکال کر بولے۔

''ہم کفر کے بارے میں کیا جانتے ہیں، بولو کیا جانتے ہیں۔''

رضا میاں نے سوال پر ایک بار گردن اُٹھائی اور ڈاکٹر مہدی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا، پھر کچھ بولے بغیر گردن جھکا کر گریبان میں دیکھنے لگے۔ شاید رضا میاں کی زندگی کو ایک گہرے تکلیف دہ سناٹے میں بدلتے دیکھ کر ڈاکٹر مہدی کی آواز اور لہجے میں کسی پھوڑے جیسی ٹپکن در آئی۔ تڑپ کر بولے: ''ہمارے حضور کے لیے جو بات ایمان تھی وہی بات اہلِ عرب کے لیے کفر تھی۔ اگر حضور یہ سوچتے کہ ان کی ناپسندیدہ باتوں سے لوگ ناراض ہو جائیں گے اور وہ اُٹھتے بیٹھتے بار بار اُس کفر کو چلّا کر دہرانے کی جرأت نہ کرتے تو وہ ایمان کیسے پھیلتا جسے کفر کہا جاتا تھا۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر مہدی کمرے سے چلے گئے۔ رضا میاں نڈھال اور اداس، چہرے پر آتی جاتی درد کی لہروں کے ساتھ مہدی کی خالی کی ہوئی کرسی کو جو تنہائی میں انھیں منہ چڑا رہی تھی، دیکھتے رہے۔ یکا یک ان کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ جی چاہا کہ وہ پوری طاقت سے چیخیں لیکن ان کے حلق سے آواز نہ نکلی، انھوں نے گھبرا کر بیٹی کو آواز دینا چاہی مگر وہ اسکو پکار نہ سکے۔ کانپتے قدموں سے بیوی کے پلنگ کی پٹی پکڑ کر بیٹھ گئے۔ بیوی کے لاکھ استفسار پر بھی ان کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ انھیں ڈاکٹر مہدی کا جملہ یاد آیا۔ لگاتار چپ رہنے سے آواز کام کرنا بھول جائے تو تعجب کی کیا بات ہوگی۔

پھر وہ اکیلے سارا سارا دن اپنے اندر تک اتری ہوئی خاموشی کے ویران سناٹے میں اکثر سوچا کرتے۔

"کیا وہ مذہب سے متنفر ہیں؟"

"کیا وہ خدا کے منکر ہیں؟"

"کیا بہت سے سائنس داں ایسے نہیں جو خدائی طاقت کے انکاری نہیں؟"

"کیا جہد و عمل کی ترغیب اور علم و دانش پر تکیہ معجزاتِ امام زمانہ کی نفی ہے؟"

وقت نے رضا میاں کی آواز چھین لی تھی۔ لیکن اس کی جگہ ان کی فکر تیز ہوگئی تھی۔

ایک دن انھوں نے سوچا کہ وہ اپنی بیٹی سے پوچھیں گے کہ ہم مذہب سے کب متنفر ہو جاتے ہیں۔ جو خیالات اس مسئلے کو لے کر انھوں نے اپنے دماغ میں جمع کیے، انھیں بیان کرنے کے لیے زبان کو زور دیتے رہے مگر انکے منہ سے آواز نہ نکلی۔ پھر انھوں نے اپنی تنہائی کی لمبی خاموشیوں میں سوچا کہ وہ پروین سے پوچھیں گے کہ انسان کو کب خدا سے منکر کر دیا جاتا ہے؟

وہ روز اس کے بارے میں سوچتے رہے۔ بہت سے دلائل ان کے ذہن میں آئے لیکن ان کی آواز واپس نہ آئی۔ پھر ایک دن انھوں نے طے کیا کہ وہ پروین کو جہد و عمل اور علم و دانش کی برکتوں سے آگاہ کریں گے۔ اور یہ بھی پوچھیں گے کہ ان برکتوں سے معجزاتِ امام زمانہ کی نفی کا خیال کن لوگوں کے دلوں میں آتا ہے۔ لاکھ کوشش کے بعد بھی ان کی آواز واپس نہ آئی۔ وہ اپنی بات دوسروں تک مدتوں سے لکھ کر کہہ دیا کرتے تھے۔ کبھی بیوی کو پرچہ لکھتے کبھی بیٹی کو۔ ڈاکٹر مہدی خیریت پوچھنے آتے تو ان سے بھی پرچہ لکھ کر اپنے دل کا اظہار کرتے۔

ایک دن انھوں نے طے کیا کہ وہ اپنی بیٹی سے جیسے بھی ہو بات کر کے رہیں گے۔ اس دن انھیں اپنے اندر کمزوری کا احساس ہوا۔ کوشش کے بعد وہ کرسی سے اٹھے۔ چند قدم وہ خود کو سنبھالتے ہوئے چلے، دیکھا بیٹی اپنے کمرے میں عشا کی نماز پڑھ رہی تھی۔ سجدے میں بیٹی کو دیکھ کر ایک بار انھیں پھر خیال آیا کہ اُن کی بیوی، بیٹی کو مذہبی رسوم کی جانب کچھ زیادہ ہی جھکا رہی ہے۔ وہ اس کمرے میں جا کر میز کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئے، پروین کو انھوں نے بڑی ناز و نعمت سے پالا تھا۔ اس کی تعلیم کے لیے اپنی نیندیں حرام کر ڈالی تھیں۔ سامنے رکھے کاغذوں سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر انھوں نے کچھ لکھنا شروع کر دیا کہ شاید وہ منہ سے اپنی بات نہ کہہ پائیں۔ لکھی ہوئی عبارت کو انھوں نے غور سے پڑھا تو ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ پروین مصلے پر سے اُٹھی تو باپ کو آبدیدہ دیکھا، ایک ہاتھ کی انگلیوں کو باپ کے بالوں میں پھیرتے ہوئے دھیرے سے پوچھا:

"کیا ہوا بابا"

رضا میاں کچھ نہ بولے، ان کی پُراسرار لمبی خاموشی نے گھر بھر میں سناٹے گھول دیے تھے۔ پروین نے پیار سے کہا:

"بابا آپ کی اس خاموشی سے میرا دم گھٹتا ہے، جی چاہتا ہے میں اپنی آواز آپ کے گلے میں ڈال دوں" پھر پروین کے جی میں آئی کہ وہ باپ سے اپنا وہ خواب بیان کرے جو اُس نے کل ہی دیکھا تھا، اس نے

دیکھا دریا کا کنارا ہے، آندھی طوفان کے جھکڑوں سے دور دور تک اُٹھنے والی دھند پھیلی ہوئی ہے، اس دھند میں ایک علم فضا میں بار بار اُبھرتا اور ڈوبتا ہے۔ اس علم کے پٹکے کا جاہ وجلال دیکھ کر وہ اپنی جگہ سہم سی گئی، یکا یک اس کے کانوں میں کسی غیبی آواز نے سرگوشی کی:

''بی دریا کے کنارے شہید ہونے والے حضرت عباس کا یہ علم ہے، دوڑ و اور اسے ہاتھوں سے تھام کر اپنے دل کی مراد مانگ لو۔ مگر اسی وقت اُس دھند کے اندر سے پروین کے باپ بھی نکل کر سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کا راستہ روک کر کہتے ہیں۔'' نہیں بیٹی۔ یہ علم نیکی اور پاکیزگی، وفا شعاری اور اعلیٰ روحانی قدروں کا علمبردار ہے، یہ مرادیں مانگنے کے لیے نہیں۔ بتاؤ کیا خود ان عظیم صاحبان کردار کی اپنی زندگی کی ساری مرادیں پوری ہوگئی تھیں۔'' مذہبی معاملات میں ماں کی تربیت میں رہنے والی بیٹی باپ کے روکنے سے علم کو دوڑ کر پکڑنے کا ارادہ بدل دیتی ہے مگر اپنی جگہ کھڑے کھڑے دعا مانگتی ہے:

''آپ خدا سے دعا کیجیے کہ میرے باپ کی آواز واپس آجائے۔ تو میں آپ کے نام کی مجلس برپا کروں گی۔''

پھر پروین کی آنکھ کھل گئی، اس نے اپنا خواب بیان کرنے کے لیے باپ کی طرف بڑھنا چاہا جو پاس ہی کھڑے تھے مگر اس نے دیکھا کہ اس کا باپ سارے بدن سے کانپ رہا ہے اور پیر تھر تھرا رہے ہیں۔ پروین خواب بیان کرنا بھول گئی اور باپ کے کمزور اور سوکھے بدن سے لپٹ گئی۔ خود کو سنبھالتے ہوئے رضا میاں اپنا لکھا پرچہ پروین کو تھمانا چاہ رہے تھے لیکن ان کے ہاتھ میں جنبش نہ ہوئی۔ چھاتی میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی اور سانسیں اب زیادہ پھولنے لگی تھیں۔ اس کے سبب سے وہ بے قابو ہوتے جا رہے تھے، وہ پرچے پر لکھی اپنی بات بیٹی تک کسی بھی حالت میں پہنچا دینا چاہ رہے تھے، مگر انھیں لگا کہ ان کے اُس ہاتھ میں جان نہیں رہ گئی ہے، وہ بار بار اپنے حلق پر آواز نکالنے کے لیے زور دے رہے تھے مگر پسینے پسینے ہوئے جا رہے تھے، یکا یک ان کے حلق کی نسوں میں سارے بدن کا لہو جیسے تیز رفتار سے دوڑنے لگا، انھیں محسوس ہوا کہ باوجود کوشش کے، پرچے والا ہاتھ پروین کی جانب نہیں بڑھ رہا ہے اور وہ بات اگر انھوں نے اپنی بیٹی تک نہیں پہنچائی تو ان کا دم نکل جائے گا۔ یکا یک ان کے ہونٹوں میں ایک تھرتھری سی پیدا ہوئی۔ حلق میں ٹیس سی اُٹھی اور اپنے کانوں میں اپنی ہی آواز جیسے غیب سے آتی ہوئی انھیں سنائی دی۔ آواز اُسی عبارت کو دہرا رہی تھی جو انہوں نے ابھی ابھی کاغذ پر لکھی تھی:

''جس پر لوگ کفر کا شبہ کر کے سہم جائیں ایسے ایمان کا حوصلہ اور ہمت بھی خدا سے مانگو بیٹی، نہیں تو میری طرح گونگی ہو جاؤ گی۔''

پسینے میں ڈوبے رضا میاں بیٹی سے لپٹے کھڑے تھے لیکن بیٹی اس معجزے پر خوش اور حیرت میں ڈوبی سوچ رہی تھی کہ اب اُسے اس مجلس کے برپا کرنے کا انتظام کرنا ہے جس کا وعدہ اس نے باپ کی آواز واپس آجانے پر خواب میں علم کو دیکھ کر کیا تھا۔

B-132, Housing Board Colony, Koh-e-Fiza, Bhopal-462001
Mob. : 09893764746

حصار

● اقبال حسن آزاد

جب وہ پہلے پہل اس کالونی میں بسنے کے لیے آیا تھا تب یہ کالونی بڑی کھلی کھلی اور صاف ستھری تھی۔ صبح اپنے گھر کا دروازہ کھول کر وہ جب زور زور سے سانسیں کھینچتا تو اس کی رگ رگ میں تازگی دوڑ جاتی۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے یہاں نئے نئے مکانات بننے لگے اور آس پاس کی فضا آلودہ ہونے لگی۔ کبھی کسی پڑوسی کے سیپٹک ٹینک سے بدبو آنے لگتی۔ کبھی گھر کے سامنے بہنے والا نالا جام ہو جاتا اور کبھی کوئی اور بات ہو جاتی۔ نالا تو تقریباً روز ہی جام رہتا۔ طرح طرح کے رنگ برنگے پولیتھین بیگ نالے میں بھرے رہتے۔ زیادہ دن ہونے پر نالے میں سے بدبو اُٹھنے لگتی۔ میونسپلٹی میں اکثر و بیشتر ہڑتال ہی رہتی۔ جب کبھی ہڑتال ٹوٹتی تو دو ایک بار اس کی صفائی ہو جاتی۔ مگر پھر جلد ہی ویسی ہی صورت حال پیدا ہو جاتی۔ لیکن محلے والوں کو اس کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ دراصل جب ہم ایک ہی منظر کو بار بار دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھیں اس کی عادی ہو جاتی ہیں اور ہمیں بری چیزوں میں بھی کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ البتہ جب وہ چیز ہمارے لیے تکلیف دہ ہو جاتی ہے تب ہمارا دھیان اس کی جانب جاتا ہے۔

اس کے گھر کے سامنے ایک خالی پلاٹ تھا جسے کسی صاحب زر نے اس خیال سے خرید کر رکھ چھوڑا تھا کہ مستقبل میں جب کبھی اسے یا اس کے بچوں کو یا بچوں کے بچوں کو اس کی ضرورت پڑے گی تو اسے فروخت کیا جائے گا۔ یہ پلاٹ کالونی میں ایسا ہی تھا جیسے چاند میں داغ۔ مگر پھر بھی یہ بڑے کام کی چیز تھا اور اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آس پاس کے گھروں کے مرد اس میں کوڑا ڈالتے تھے اور عورتیں اپنے پیکین پھینکتی تھیں۔ پھر میونسپلٹی کی ڈومنیں آتی تھیں اور وہ ان کوڑوں کو یکجا کر کے انہیں آگ دکھاتی تھیں۔ اور چونکہ اس کا گھر پورب رخ تھا اس لیے سارا دھواں اس کے گھر میں بھر جاتا تھا اور اس وقت گھر میں رکنا مشکل ہو جاتا

تھا۔ اسے چند چیزوں سے بڑی وحشت ہوتی تھی..... دھواں، ڈھول، بھیڑ، شور اور بدبو۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس پلاٹ سے نہ صرف دھواں اُٹھتا تھا بلکہ کتے بھی یہیں پر جمع ہو کر شور مچاتے تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہی وہ مقام تھا جہاں کتے جفت کرتے تھے، کتیاں بچے دیتی تھیں اور پلے اسی میں پل کر جوان ہوتے تھے۔ اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ کوئی کتا اس کے گھر کے سامنے خالی پڑے پلاٹ پر مر گیا تھا۔ دو دنوں تک تو کچھ خاص احساس نہیں ہوا مگر تیسرے روز اس میں سے بدبو کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ اس کے گھر کا کونہ کونہ بدبو سے بھر گیا تھا اور کھانا پینا تک دوبھر ہو گیا تھا۔ تب وہ پاس والی ڈوم کی بستی میں گیا تھا اور ایک ڈوم کو بہت منت سماجت اور اچھی خاصی رقم دینے کے بعد اس سڑے ہوئے جانور کو پھینکنے پر راضی کر پایا تھا۔ کتے کی لاش ہٹ جانے کے بعد اس نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ لیکن اسی شام ایک دوسری گلی سے گذرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ وہی مرا ہوا کتا ایک دوسرے آدمی کے مکان کے سامنے پڑا تھا اور وہی ڈوم مالک مکان سے کتے کو پھینکنے کے لیے ایک موٹی رقم کا مطالبہ کر رہا تھا۔ سالا کتا! اس کو تو پکڑ کر مارنا چاہیے۔ مرے ہوئے کتے کا کاروبار کرتا ہے۔ کمینہ کہیں کا۔ اس نے سوچا اور ناک پر رومال رکھ کر تیزی سے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

اس خالی پلاٹ کو دیکھ کر اس کی بیوی کے دل میں پتہ نہیں کیسے کیسے خیالات آتے تھے۔ ایک دن وہ نیک بخت کہنے لگی۔

''ابھی بھی کالونی میں کئی پلاٹ خالی پڑے ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی ایک پلاٹ خرید لیں۔ کل بچے بڑے ہونگے تو کام آئے گا۔'' بیوی کی بات سن کر اسے ہنسی آ گئی۔ کہنے لگا۔

''تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔ Loan لے کر تو یہ مکان بنوایا ہے۔ ابھی تک اس کی قسطیں ہی جمع کر رہا ہوں۔ نیا پلاٹ خریدنے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے؟''

وہ کہنے لگی۔

''پیسوں کا آنا کون سی بڑی بات ہے۔ لیکن آپ پیسے کمانا نہیں جانتے۔'' اس کی بیوی نے سچ ہی کہا تھا۔ وہ جس دفتر میں کام کرتا تھا وہاں یہاں سے وہاں تک پیسوں کا کھیل تھا۔ لیکن پتہ نہیں یہ اس کے شریف خون کا اثر تھا یا اس کے پرہیزگار والد کی تعلیمات کا نتیجہ کہ اسے اس قسم کے پیسوں سے وحشت ہوتی تھی۔ ایک دفعہ ایک client نے بغیر طلب کیے ہوئے اسے نوٹوں کی گڈی بڑھا دی تھی جسے اس نے ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ بات جب اس نے اپنی بیوی کو بتائی تو وہ بہت خفا ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

''جب کوئی خود اپنی مرضی سے کچھ دے رہا ہے تو اس میں برائی کیا ہے۔ آپ اس سے مانگنے تو نہیں گئے تھے۔ آئندہ ایسی بیوقوفی مت کیجیے گا۔''

بیوی کی بات سن کر اسے غصہ آ گیا تھا۔ وہ اسے بے وقوف کہہ رہی تھی۔ اس نے بیوی کو چند سخت اور سست باتیں سنا ڈالیں۔ حوا بار بار آدم کو شجر ممنوعہ کی جانب کیوں متوجہ کرتی ہے۔ آخر کتنی بار اسے جنت سے نکلنا

پڑے گا؟ پھر اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اسے ٹھنڈے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر بیوی کے دل میں ایک گانٹھ سی پڑ گئی تھی۔ عورت کا دل ایک بڑے گڈھے کی مانند ہوتا ہے۔ ایک بار کوئی بات اس کے دل میں جم جاتی ہے تو پھر وہاں سے نکلتی نہیں۔ بیوی کے دل میں بھی ایک نئے پلاٹ کو خریدنے کی بات جم گئی تھی۔ ہر دوسرے روز وہ اس کا تذکرہ چھیڑ دیتی۔ وہ جھنجھلانے لگا تھا۔ اور پھر یہ جھنجھلاہٹ غصے میں تبدیل ہوتی گئی تھی۔

گرچہ وہ بہت ٹھنڈے دماغ کا شخص تھا مگر ایک ہی بات کو بار بار سن کر اس کے ضبط کا دامن چھوٹتا جا رہا تھا۔ حالانکہ دونوں کے درمیان شروع دنوں ہی سے بڑی understanding رہی تھی۔ ابھی وہ جس مکان میں رہائش پذیر تھے وہ بھی دونوں کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ پلاننگ بیوی کی تھی۔ شہر سے دور سستی قیمتوں پر پلاٹ مل رہے تھے۔ بیوی نے اپنے زیور بیچ ڈالے۔ اس نے PF سے قرض لیا اور پھر دھیرے دھیرے مکان بننا شروع ہوا۔ اس دوران بچے بھی پیدا ہوتے رہے اور جب تک مکان بن کر تیار ہوا ان کے یہاں تین نفوس کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں اس کالونی میں چند اور مکانات تعمیر ہو چکے تھے اور آبادی سی ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی بھی کئی پلاٹ خالی پڑے تھے۔ اس نئے مکان میں shift ہونے کے بعد اس کی بیوی کی آنکھوں میں ایک فاخرانہ چمک آ گئی تھی۔ مالکانہ حقوق کا نشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ان کی زندگی مزے سے گذرنے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کو co-operate کیا کرتے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی روٹین کے مطابق وہ اپنا کام کرنا شروع کر دیتا۔ میاں بیوی دونوں مل کر بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرتے۔ وہ بچوں کے لیے ٹفن بناتی اور یہ انہیں کپڑے پہناتا اور جب اسکول کی بس بچوں کو لے کر چلی جاتی تب دونوں اطمینان کی سانس لیتے۔ بیوی پھر کچن میں گھس جاتی اور وہ نہا دھو کر تیار ہوتا، ناشتہ کرتا اور آفس کے لیے نکل جاتا۔ آفس میں کچھ کام، کچھ گپ شپ، تھوڑی کینٹین بازی یا اخبار بینی۔ اس طرح شام کے پانچ بج جاتے۔ آفس اور گھر کے راستے میں بازار تھا۔ وہ ضروری اشیاء کی خریداری کرتے ہوئے گھر پہنچتا تو رات سنولا چکی ہوتی۔ فریش ہو چکنے کے بعد تھوڑی دیر بچوں کو پڑھاتا۔ پھر سب مل کر رات کا کھانا کھاتے اور پھر آنے والے کل کے استقبال کے لیے بستر پر چلے جاتے۔ چھٹی کا دن کچھ الگ سا ہوتا۔ مگر اس روز بھی کوئی نہ کوئی مصروفیت سامنے آ جاتی۔ کبھی بیوی بچوں کو لے کر بازار جانا پڑتا یا گھر پر ہی رکے ہوئے چھوٹے موٹے کاموں کا نپٹارا کرتا۔ کبھی کبھی گھر کے سامنے بہتے ہوئے نالے کو بھی صاف کرنا پڑتا۔

جب سے اس کی بیوی کا دھیان ایک نئے پلاٹ کے خریدنے کی طرف گیا تھا تب سے دونوں کے درمیان تلخی کسی دوسری عورت کی طرح در آئی تھی۔ وہ اسے سمجھانے منانے کی کوشش کرتا مگر ٹیڑھی پسلی کی مخلوق کسی طور پر سیدھی ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ پھر ایک روز دونوں میں زبردست جھگڑا ہوا اور بیوی بچوں سمیت میکے چلی گئی تھی۔ بیوی بچوں کے چلے جانے کے بعد اول اول تو اسے سکون محسوس ہوا مگر جلد ہی بھائیں بھائیں کرتا گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ کھانے پینے کی تکلیف الگ ہونے لگی۔ اس نے سوچا کے بیوی کو منا کر لے آئے لیکن پھر خیال آیا کہ ابھی وہ بہت غصے میں ہے۔ جب دماغ ذرا ٹھنڈا ہو گا تو اسے جا لے آئے گا۔

اسی طرح کئی روز گذر گئے۔ اس نے ایک دو دفعہ بیوی کو فون لگایا مگر اس نے ریسیو ہی نہیں کیا۔ شاید اس نے آر پار کی لڑائی لڑنے کی ٹھان لی تھی۔ اس نے کافی دن صبر اور شکر کے ساتھ گذار دیے لیکن رفتہ رفتہ وہ ٹوٹنے لگا۔ بیوی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ پیسے کمانا کون سا مشکل ہے۔ صرف حرام حلال کا خیال دل سے نکال دینا ہوگا۔ آخر پوری دنیا یہی کر رہی ہے اور جو اس سے الگ ہیں وہ اسی کی طرح ایک کونے میں سکڑے سمٹے پڑے ہیں۔ اسے لگا جیسے وہ واقعی بے وقوف ہے۔ گھر آئی لکشمی کو ٹھکرا رہا ہے۔ اور شاید اسی لیے اس کے گھر کی لکشمی اس سے روٹھ کر میکے چلی گئی ہے۔ اس نے چاہا کہ قدم آگے بڑھائے مگر ہر بار اس کے ضمیر نے اس کے قدم روک لیے۔ اسے لگا جیسے وہ ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ ایک جانب اس کی بیوی بچے ہیں، خوشحالی ہے اور ایک روشن اور تابناک مستقبل ہے اور دوسری جانب ایک سیدھی سادی سنسان سڑک ہے جس پر وہ اپنے ضمیر کے ساتھ بس چلتے ہی چلا جا رہا ہے۔ آخر ایک روز اس نے اپنے ضمیر سے آنکھیں چرا کر ایک سنہرے موقع کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ایسا کرتے وقت اسے ایک عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا۔ مگر پھر اسے یہ سوچ کر راحت محسوس ہوئی کہ اب اس کی بیوی بچے واپس آجائیں گے۔ اسے خوشی سی محسوس ہوئی۔ آفس سے چھٹی کے بعد وہ کافی دیر تک بازار کی رونقیں دیکھتا رہا تھا۔ آج اسے پہلی بار بہت ساری ایسی چیزیں دکھائی دیں جو اب تک اس کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ شوکیس میں سجے ہوئے ایک سے ایک خوبصورت اور دیدہ زیب کپڑے، نئے نئے Home Appliances، گھر کو سجانے والی اشیاء اور بھی بہت کچھ۔ اسے لگا جیسے وہ اس بازار میں آج پہلی بار آیا ہے۔ جیب میں کڑکڑاتے نوٹوں کے آنے کے ساتھ ہی اس کی پیشانی پر شیو کی تیسری آنکھ اگ آئی تھی جس سے دنیا زیادہ خوبصورت، زیادہ دلکش اور زیادہ جاذب نظر آنے لگی تھی۔ اس رات ہوٹل میں کھانے کے بعد جب وہ ہلکے ہلکے قدموں سے ٹہلتا ہوا گھر کی جانب بڑھ رہا تھا تو ٹھنڈی ہوا کے ہلکوروں میں اسے اپنا آپ بڑا ہلکا ہلکا سا لگا۔ اسے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آ گیا جب وہ لاج میں رہا کرتا تھا اور اسی طرح ہوٹلوں میں کھانا کھاتا اور مٹر گشتی کیا کرتا۔ کیا آزادی کے دن تھے۔ پرانے دنوں کی یاد نے اس کی روح میں تازگی سی بھر دی اور وہ ہلکے ہلکے سروں میں گنگنانے لگا۔ اس کی آواز قدرے بھدی اور بھونڈی تھی مگر فلمی گانے اس کی کمزوری تھے اور وہ تنہائی میں اکثر اپنے پسندیدہ نغموں کو گایا کرتا یا پھر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دھیمے سروں میں اپنے آپ کو سنایا کرتا۔ ان دنوں اس کا کئی لڑکیوں سے ایک ساتھ رومانس چل رہا تھا۔ وہ جس لاج میں رہتا تھا اس کے آس پاس کے گھروں میں کئی ایسی لڑکیاں تھیں جو اسے میٹھی نظروں سے دیکھا کرتیں اور پھر کالج میں بھی بہت ساری حسینائیں اسے دیکھ کر شاید ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی تھیں۔ ایسا اس کا خیال تھا۔ براہ راست کسی لڑکی سے نہ تو اس کی کوئی بات چیت تھی نہ ہی خط و کتابت۔ موبائل تو بس خال خال لوگوں کے پاس تھا۔ وہ اکثر اپنی نام نہاد معشوقاؤں کی گنتی کیا کرتا اور ان کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتا۔ شاید یہ اس کی خوش فہمی تھی لیکن اگر کسی خوش فہمی سے خوشی حاصل ہو تو اس میں برائی بھی کیا ہے۔ یہ خوش فہمیاں خوشبوؤں کی طرح اسے اپنے گھیرے میں لیے رہتیں۔ گذری ہوئی

یادوں کی خوشبو میں میں رچا بسا جب وہ اپنے گھر پہنچا تو ایک عجیب سی بدبو نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اسے لگا جیسے پڑوسی کے سیپٹک ٹینک سے وقتاً فوقتاً اُبھرنے والی بدبو اس کی کھڑکی سے اندر گھس آئی ہے مگر اسے یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں بہتی ہوئی ہوائیں اس بدبو کو اپنے ساتھ اُڑا کر کہیں اور لے جائیں گی۔ اس نے اس جانب کی کھڑکی بند کر دی۔ اندر بیڈ روم میں جا کر پہلے اس نے جیب میں رکھی رقم کو الماری میں بند کیا اور پھر اس کے بعد ٹی وی آن کر کے بستر پر تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ پرانی فلموں کے گانے دکھائے جا رہے تھے۔ وہ ان پرانے گیتوں میں محو ہوتا گیا۔ اسے soap operas اور reality shows جیسے پروگراموں سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ اس کے خیال میں اصل dirty pictures یہ پروگرامس ہیں، ڈرٹی اور بدبودار۔ وہ یا تو گانے سنتا یا نیوز اور کبھی کبھار کرکٹ میچ دیکھ لیا کرتا مگر اب نیوز اور sports میں بھی اچھی خاصی گندگی در آئی ہے اس لیے وہ ٹی وی دیکھنے سے زیادہ تر اجتناب کیا کرتا اور ویسے بھی زندگی اب اس قدر مصروف ہو گئی ہے کہ گھر پر آرام سے بیٹھ کر اپنے مشغلوں اور شوق کو پورا کر پانا اب دشوار سا ہوتا جا رہا ہے۔

پروگرام کے دوران جب اینکر آیا تو اس نے ٹی وی آف کر دیا۔ اسے اینکرز کبھی پسند نہ آتے تھے..... خواہ مرد ہوں یا عورتیں۔ کیا ضرورت ہے ان کی۔ صرف گانے دکھاتے رہو بھائی۔ وہ اینکرس کی باتیں سن سن کر بور ہو جاتا۔ اور جب انسان بور ہونے لگتا ہے تو اسے نیند آنے لگتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں بھی نیند سمانے لگی لیکن کسی گاڑی کی آواز سے اس کی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے کھڑکی ذرا سی کھولی اور باہر جھانک کر دیکھا۔ سڑک پر ایک پک اپ وین کھڑی تھی۔ باہر نیم تاریکی تھی اور اس میں چند ہیولے حرکت کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ دبی زبان میں کچھ باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ اس کا تجسس جاگ اُٹھا۔ اس نے آوازوں کی جانب کان لگا دیے۔ اس نے دیکھا کہ پک اپ وین کا پچھلا دروازہ کھولا گیا اور پھر چند مزدور بوریاں اُتار اُتار کر آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دور پر ایک بنئے کا گودام تھا جلد ہی صورت حال اس پر واضح ہو گئی۔ یہ دراصل غریبوں کا نوالہ تھا جو چور دروازے سے بنئے کے گودام میں جا رہا تھا۔

"ہر جگہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔" اس نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کھڑکی بند کر دی۔ اس کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ رہا مگر اب اس کی نیند اُڑ چکی تھی اور ساتھ ہی ساتھ بدبو کا دائرہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ گھر میں اگر بتیاں ہیں اور air freshner بھی۔ اس نے اگر بتیاں جلائیں، air freshner کا spray کیا اور ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں سما چکا تھا۔

صبح آنکھ کھلی تو اس کے نیم خوابیدہ ذہن کو بدبو کے ایک بڑے ریلے نے فوراً بیدار کر دیا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ بیڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آیا تو بدبو کچھ زیادہ ہی شدید ہو گئی۔ کھڑکی تو بند تھی پھر یہ بدبو کہاں سے آ رہی ہے۔ شاید ventilator کے ذریعہ۔ مگر رات میں تو زیادہ بدبو نہیں تھی۔ اور یہ بدبو تو سیپٹک ٹینک والی

بدبو سے بھی کچھ مختلف تھی۔ پھر آخر یہ بدبو آ کہاں سے رہی ہے؟ اس نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بج رہے تھے۔ آج وہ زیادہ دیر تک سوتا رہا تھا، شاید بے فکری کی وجہ سے۔ اب اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ گھر میں گھر والی تو تھی نہیں جو اسے چائے بنا کر پلاتی۔ اسے تو چولہا جلانا تک نہیں آتا تھا۔ ماچس وہ صرف سگریٹ سلگانے کے لیے جلاتا تھا۔ وہ جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہوا، گھر کو تالا لگایا اور بڑی سڑک پر نکل آیا۔ سڑک کے کنارے والی چائے دکان سے چائے کے ساتھ دو بسکٹ کھا کر اور سگریٹ سلگا کر وہ گھر لوٹ آیا۔ نالے کے قریب رک کر اس نے کتوں کی طرح نتھنے پھلائے اور ہوا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کی۔ مگر اسے وہاں کسی بدبو کا سراغ نہیں ملا۔ سامنے والے پلاٹ پر نظریں دوڑائیں مگر وہاں پر بھی کسی مرے ہوئے جانور کی لاش نظر نہیں آئی۔ لیکن جیسے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا بدبو اس کے استقبال کو پر پھیلائے بیٹھی تھی اس نے سوچا کہ اس کا پتہ لگایا جائے مگر ابھی بہت سارے کام باقی تھے۔ نہانا دھونا تھا۔ تیار ہو کر بازار جانا تھا اور وہاں کچھ کھا پی کر آفس جانا تھا۔ اور آج وحید بھی اس سے ملنے والا تھا۔ اس کے بچپن کا ساتھی اور جگری یار۔ وحید کے والد ہائی اسکول میں ٹیچر تھے۔ ابھی حال ہی میں ان کا انتقال ہوا تھا اور وحید ان کی graduaty,pension اور دیگر بقایہ جات حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ اس نے وحید سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں اس کی مدد کرے گا۔ گیارہ بجے کے قریب وہ آفس پہنچا تو وحید اس کا منتظر تھا۔ اس نے چائے منگوائی۔ اس دوران وحید نے اپنے والد کی service book اور دیگر کاغذات اسے دکھائے جو اس نے اسکول کے ہیڈ کلرک کو خوش کرنے کے بعد حاصل کیے تھے۔ وہ وحید کو لے کر D.E.O کے آفس پہنچا۔ وہاں کا بڑا بابو اس کا شناسا تھا۔ وحید اس سے پہلے بھی مل چکا تھا اور اس نے وحید کو commission کا percentage بھی بتا رکھا تھا۔ اس کے ساتھ وحید کو دیکھ کر بڑا بابو کہنے لگا۔

''میں نے ان کو ساری بات بتا دی ہے۔ پھر یہ آپ کو لے کر کیوں چلے آئے؟''

اس نے کہا۔

''بڑا بابو! سمجھئے کہ یہ ان کا نہیں میرا کام ہے۔''

بڑا بابو بولا۔

''آپ سے میرے ویکتی گت سمبندھ ہیں۔ ٹھیک ہے۔ مگر میرا بھی ایک اصول ہے۔ میں بنا نوٹ لیے کبھی کوئی کام کرتا ہی نہیں ہوں۔ اور پھر یہ اسکول میں تو پیسہ دے ہی چکے ہیں۔''

''ہر جگہ ایک ہی حال ہے۔'' اس نے خود کو تسلی دی اور پھر وحید سے بولا۔

''بھائی! کہاں کہاں بچو گے؟ ابھی Treasurary کا چکر باقی ہے اور پھر اسکول میں بھی ابھی کئی بار جانا پڑے گا۔ جیسا یہ کہتے ہیں ویسا ہی کرو۔ نہیں تو اگر ایک بار کام پھنس گیا تو سمجھو پھر کبھی نہیں ہوگا۔''

وحید کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ کچھ بولا نہیں۔ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ اس نے وحید سے کہا۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ آفس میں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ تم بڑا بابو سے معاملات طے کر لو۔ انشاء

اللہ جلد ہی تمہارا کام ہو جائے گا۔"

آفس کے بعد جب وہ بازار ہوتے ہوئے گھر لوٹا تو ایک بار پھر بدبو اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ پریشان ہو اُٹھا۔ آخر یہ بدبو آ کہاں سے رہی ہے۔ اس کا موڈ بگڑنے لگا۔ اس کی بیوی بڑی عقل مند ہے۔ اگر وہ ہوتی تو اب تک اس بدبو سے چھٹکارا مل چکا ہوتا۔ کیا وہ اسے فون کر کے اس کے بارے میں اسے بتائے۔ نہیں، وہ تو بات بھی نہیں کر رہی۔ بدبو کا کیا ہے۔ ایک دو دن میں خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اس نے اگر بتیاں جلائیں۔ air freshner کا چھڑکاؤ کیا اور بیڈ روم میں جا کر سو رہا۔

اگلے روز بھی بدبو بدستور قائم تھی۔ اس نے جلدی جلدی منھ ہاتھ دھویا اور چائے پینے کے لیے سڑک پر نکل آیا۔ چائے کی دکان پر آج معمول سے کچھ زیادہ ہی بھیڑ تھی۔ کچھ لوگوں کے ہاتھ میں آج کا تازہ اخبار تھا اور وہ خبروں پر باآواز بلند تبصرہ فرما رہے تھے۔ اس نے سنا کہ کل کسی شخص کا سرِعام قتل ہو گیا ہے۔ اخبار میں مقتول کی خون میں سنی ہوئی لاش کی تصویر تھی اور ایک دوسری تصویر میں اس کے گھر والوں کو ولاپ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اخبار میں مقتول کی تصویر دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اگر کسی مردے کی آخری رسوم ادا نہ کی جائیں تو دو تین دنوں میں اس کی لاش سڑ جائے گی اور اس میں سے بدبو آنے لگے گی۔ ویسی ہی بدبو جیسی کسی جانور کی لاش سڑ جانے کے بعد نکلتی ہے۔

چائے پی چکنے کے بعد اس نے گھر کی جانب قدم بڑھائے ہی تھی کہ خیال آیا کہ اب گھر جا کر کرنا ہی کیا ہے۔ نو بجنے جا رہے ہیں۔ سیدھے بازار نکل چلتے ہیں۔ راستے میں ناشتہ کرتے ہوئے آفس پہنچا جائے۔ وہ آگے بڑھتا گیا لیکن ہر قدم پر اسے احساس ہوتا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں پھر بھی وہ چلتا ہی رہا۔ بازار میں ہوٹل کھلے تھے۔ وہ اپنے پسندیدہ ہوٹل میں داخل ہوا اور آرڈر دینے کے بعد لوگوں کی باتیں سننے لگا۔ ہر شخص بگڑتے ہوئے law and order کے خلاف کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ ناشتہ کرتا رہا اور پھر فارغ ہونے کے بعد ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ اب اس کے قدم آفس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی تو دس بھی نہیں بجے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تب تک وہ آفس کے باہر گھنے پیپل کے نیچے بنے سمنٹ کے بنچ پر بیٹھ رہے گا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ ہر موڑ پر اسے لوگوں کی بھیڑ ملی۔ زیادہ تر دکانیں بند تھیں۔ اور چند ایک جو کھلی تھیں، ان کے شٹر بھی آدھے گرے ہوئے تھے۔ ابھی وہ کچھ ہی دور آگے بڑھا تھا کہ سامنے ایک جلوس آتا دکھائی دیا۔ جو سرکار کے خلاف زور زور سے نعرے لگا رہا تھا۔ کھادی کے کرتے پائجامے میں ملبوس ایک شخص جلوس کی قیادت کر رہا تھا۔ اس نے جب اسے غور سے دیکھا تو پایا کہ یہ وہی آدمی ہے جس نے کل اسے پیسے دئے تھے۔ ایک لمحے کو اسے یہ سوچ کر کراہیت محسوس ہوئی کہ ایک سڑک چھاپ نیتا سے اس نے اپنا سودا کیا لیکن اگلے ہی لمحے ہرے ہرے نوٹوں کا تصور اس کی آنکھوں میں ٹھنڈک پہنچانے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں شرافت کی ایسی تیسی کی اور اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آفس پہنچ گیا۔ ابھی دفاتر نہیں کھلے تھے۔ وہ ایک گھنے پیڑ کے نیچے بنے سمنٹ کے بنچ پر

بیٹھ رہا۔ بینچ پر آرام سے بیٹھ چکنے کے بعد اس نے سوچنا شروع کیا۔ پہلے وارداتیں کم ہوتی تھیں لیکن اب تو یہ روز کا معمول ہو گیا ہے۔ ایک ہی دن میں کئی کئی قتل ہوتے ہیں۔ ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔ خوب خوب ہنگامے ہوتے ہیں۔ اخباروں میں سرخیاں لگائی جاتی ہیں۔ ٹی وی چینل والوں کو بھی مسالہ مل جاتا ہے۔ سڑک جام کیا جاتا ہے۔ بازار بند کیے جاتے ہیں۔ لیکن بند کسی مسئلے کا حل نہیں۔ یہ تو گلی کوچوں میں پیدا ہونے والے نیتاؤں کا ہتھکنڈا ہے، جو معاوضہ کے نام پر دی جانے والی رقم سے اپنا کمیشن وصولتے ہیں۔

یہ سب سوچتے سوچتے شاید وہ اونگھ گیا تھا۔ اچانک کسی گاڑی کی آواز سنائی دی تو وہ چونک پڑا۔ گیارہ بجنے جا رہے تھے۔ آس پاس کافی چہل پہل تھی۔ دفاتر کھل چکے تھے اور سڑک پر پولس کے جوان طعینات تھے۔ وہ آفس کے اندر داخل ہوا اور اپنی میز پر جا کر بیٹھ رہا۔ لیکن آج اس کا دل کسی بھی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ بقیہ لوگ بھی کام سے زیادہ باتوں میں مشغول تھے اور موضوع سخن تازہ حالات تھے۔ اس نے جیسے تیسے دن کاٹا اور چھٹی ہوتے ہی باہر نکل پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ آج بازار بند ہے۔ بینک اور اسکول بھی بند کرا دیے گئے تھے مگر سرکاری دفتروں میں کام ہوا تھا۔ اسے یہ فکر لاحق ہوگئی کہ اگر ہوٹل بھی بند ملے تو وہ کھانا کہاں کھائے گا۔ مگر خدا کا شکر تھا کہ ہوٹل کھلے تھے۔ پہلے اس نے ایک ہوٹل میں ہلکا پھلکا ناشتہ کیا، چائے پی اور پھر دوسرے ہوٹل سے رات کا کھانا پیک کروا کے گھر کے لیے روانہ ہوا۔ گلی سنسان پڑی تھی اور کہیں پر بدبو کے بھی آثار نہیں تھے۔ مگر گھر کا دروازہ کھول کر وہ جیوں ہی اندر داخل ہوا بدبو اس کے نتھنوں کے راستے حلق سے ہوتی ہوئی معدہ تک پہنچ گئی۔ اسے زور کی اُبکائی آئی۔ اس نے جھٹ جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھا اور گھر کی ساری کھڑکیوں کو کھول دیا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ بدبو کہیں باہر سے نہیں آرہی ہے بلکہ گھر ہی کے کسی کونے سے پھوٹ رہی ہے۔ اس نے رک کر، ٹھہر کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے۔ پھر اسے اپنے ہاتھ میں پکڑے پیکٹ کا خیال آیا۔ وہ کچن کی جانب بڑھ گیا۔ کھانے کے پیکٹ کو نعمت خانہ میں رکھنے کے بعد وہ بیڈ روم میں داخل ہوا اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد باتھ روم چلا گیا۔ خوشبودار صابن سے ہاتھ منھ دھونے کے بعد اسے بڑی راحت محسوس ہوئی۔ اس نے پھر اگر بتیاں جلائیں اور پورے گھر میں air freshner کا spray کیا۔ بدبو کم ضرور ہوئی مگر ختم نہیں ہوئی۔ اب یہ بات طے ہو چکی تھی کہ یہ بدبو کہیں باہر سے نہیں آرہی ہے بلکہ گھر کے اندر ہی سے پھوٹ رہی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کا منبع کہاں تھا؟ اس نے جگہ جگہ ناک لگا کر سونگھنا شروع کیا۔ باتھ روم سے لے کر کچن تک اور راہداری سے ہوتے ہوئے بیڈ روم تک اور پھر وہاں سے ڈرائنگ روم تک۔ اور تب اسے معلوم ہوا کہ یہ بدبو ڈرائنگ روم ہی سے نکل رہی ہے۔ اسے کچھ حیرانی ہوئی۔ بھلا ڈرائنگ ،روم میں بدبو پیدا کرنے والی چیز کہاں سے آگئی؟ پھر اس نے رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک چیز کو سونگھنا شروع کیا اور آخر کار اس مقام کا پتہ لگا ہی لیا جہاں سے یہ بدبو اُٹھ رہی تھی۔ یہ بدبو بڑے صوفے کی پشت سے آرہی تھی۔ اس نے صوفہ کھسکایا تو اس کے پیچھے کچھ بھی نہ تھا۔ صرف بدبو تھی اور وہ بھی زبردست۔ اس نے سانس روک لی اور ناک پر

رومال باندھ کر غور سے دیکھا تو پایا کہ صوفے کے پچھلے حصے کا ریکسن ایک جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور یہ بدبو اسی پھٹے ہوئے حصے سے آرہی تھی۔ اور جب اسے اپنی کھوج پر پختہ یقین ہو گیا تو وہ کچن سے ایک بڑا چاقو اٹھا لایا اور آناً فاناً پورے ریکسن کو کاٹ ڈالا۔ اندر صوفے کی باڈی سے ایک بہت موٹے تازے چوہے کی لاش چپکی تھی جو جگہ جگہ سے مسخ ہو چکی تھی اور تب اسے یاد آیا کہ چوہوں کے آتنک سے تنگ آ کر اس نے چند روز قبل ہی گھر میں چوہے مار دوا ڈالی تھی اور یہ موٹا چوہا جو شاید صوفے کے اندرونی حصے میں قیام پذیر تھا، وہ تلاش رزق میں باہر نکلا ہو اور انسان کی عیاری، مکاری اور اس کی خونی فطرت کا شکار ہو گیا ہو۔ اس معصوم بھولے بھالے بے زبان چوہے کو کیا معلوم کہ جس آٹے کی گولی کو وہ ذوق و شوق سے کھا رہا ہے اس میں اس کمینے انسان نے زہر ملا دیا ہے تا کہ وہ چوہا اسے کھا کر اس جہان فانی سے کوچ کر جائے اور اس کی کتابیں اور کپڑے اور کے تیز اور نوکیلے دانتوں سے محفوظ رہیں۔ بہر کیف! یہ مظلوم چوہا تو مر گیا مگر انتقاماً اپنی بدبودار لاش کو اس کے دل و دماغ میں ہیجان برپا کرنے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اور اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کی لاش کو ٹھکانے کیسے لگایا جائے۔ اس نے صوفے کو فرش پر اُلٹ دیا اور باقی بچے ہوئے ریکسن کو بھی کاٹ کر الگ کر دیا۔ اب چوہے کی لاش صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے بدقت تمام چھری اور لوہے کی راڈ کی مدد سے اسے باہر نکالا اور دروازہ کھول کر باہر پھینک دیا۔ مگر لاش کے چند ٹکڑے ابھی بھی صوفے کے اندر چپکے ہوئے تھے۔ وہ بالٹی بھر بھر کر پانی لانے لگا اور صوفے کو دھونے لگا۔ آخر کڑی مشقت کے بعد وہ صوفے کو پورے طور پر صاف کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس ساری کسرت سے وہ پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ اطمینان اور سکون کی سانس لے سکتا تھا۔ اس نے صوفے کو سیدھا کیا اور ایک بار پھر پورے ڈرائنگ روم کو دھو ڈالا۔ اس کے بعد اس نے غسل کیا، کھانا کھایا اور آرام کی نیند سو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو اسے اپنے سارے جسم میں درد کی ہلکی سی لہر دوڑتی سی محسوس ہوئی۔ شاید یہ رات کی مشقت کا اثر تھا۔ پھر اسے ساری بات یاد آتی گئی اور مرے ہوئے چوہے کی شبیہ اس کی آنکھوں کے آگے پھر گئی۔ اسے یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ اب کوئی بدبو اسے پریشان نہیں کرے گی۔ اس نے ایک زور کی سانس لی مگر یہ کیا۔۔۔۔۔ بدبو کا زبردست ریلا اس کے نتھنوں میں گھس پڑا۔ اور یہ ایک نئے قسم کی بدبو تھی جس نے اسے پورے کا پورا اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اور اس کا دائرہ مسلسل پھیلتا ہی جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!!!!!!!!!!!!!!!!!!!!!

Shah Colony, Shah Zubair Road, Munger - 811201 (Bihar)
Mob. : 09304330962

مُہلِک

● شاہد اختر

اس کا نام ربّو تھا اور وہ بازار کی دوسری لڑکیوں سے مختلف تھی شکلاً، عقلاً اور مزاجاً بھی۔ بازاری جیسے دیکھنے سے ہی بازاری نظر آتی ہے۔ اس کی چال، ڈھال، چہرہ غرضیکہ سب کچھ بازاری ہوتا ہے پر ربّو میں ایسا کچھ نہیں تھا، اچھے گھر کی کالج میں پڑھنے والی شریف زادیوں سے کہیں زیادہ بھولی اور معصوم نظر آتی۔ نہ بہت جدید طرز کے کپڑے پہنتی نہ ہی چہرے پر اوروں کی طرح رنگ و روغن ملتی۔ بس سادے سُودے سے کپڑے ہوتے۔ چہرے پر ہلکا سا پف پھیر لیتی۔ لپ اسٹک البتہ ہونٹوں کی گلابی رنگت سے مشابہ ہی لگاتی جس کی وجہ سے اکثر لوگ مغالطے میں رہتے۔ گھریلو لڑکیوں کی طرح مزاج تھا، بالوں کی بھی خاص پروا کبھی نہیں کی مگر وہ موئے بغیر معقول تیل پانی کے بھی عزیزوں سے اختلاف کی طرح بڑھتے ہی رہے۔ اب تو کمر سے نیچے تک آ گئے تھے۔ بڑے سلیقے سے گھنیرے بالوں کی لمبی سی چوٹی گوندھتی اور نہانے کے بعد کبھی کبھی ان کو شانوں پر یوں ہی کھلا چھوڑ دیتی۔ تھوڑی دیر میں جب بال سوکھ جاتے تو دو چوٹیاں باندھ کر سانپ کی طرح انھیں بھرے بھرے سینے کے پیالوں پر دودھ پینے کے لیے چھوڑ دیتی۔

ربّو کا پیشہ کرنے کا طریقہ بھی دوسروں سے مختلف تھا۔ چوکھٹ پر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے گاہک کبھی نہیں پھنسائے۔ اس کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ اُسے یہ طریقہ کار بہت معیوب لگتا۔ ایرے غیرے کو تو اندر آنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ چبوترے پر بیٹھا ہوا گوکل نئے چہروں کو دیکھتے ہی دروازے پر دھر لیتا۔ اصغری بائی نے جب اُسے اپنے یہاں بٹھایا تھا تو اسے نزاکت کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ربّو کے آنے سے دوسری لڑکیوں کا کام متاثر ہوگا۔ جسے دیکھو منہ اٹھائے ربّو کے پاس چلا آتا۔ جو گاہک دوسری لڑکیوں کے پاس برسوں سے بیٹھتے آئے تھے ربّو کو دیکھ لینے کے بعد کسی اور کی طرف رجوع نہیں ہوتے۔ ربّو کے یہاں یہ مسئلہ بھی تھا کہ وہ غیر شناسا کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتی۔ یہ معاملہ جب کسی طرح قابو میں آتا دکھائی نہیں دیا تو اصغری بائی نے یونین

میں اس کی شکایت کی۔ اقتصادی بحران جھیلتے رہنے کی وجہ سے ذہنی طور پر وہ بہت پریشان تھی۔ یونین سے یہ فیصلہ ہوا کہ فی الفور ریّو کو یہاں سے ہٹا دیا جائے۔ باقی لڑکیوں کی فلاح کے لیے یہی بہتر ہے۔ قبل اس کے کہ اُسے چکلہ بدر کیا جاتا ڈنگرو ریّو کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آگیا۔ اُس نے اصغری بائی کو دس ہزار روپے دیئے اور اُسے فوراً ایک الگ کمرے میں منتقل کر دیا جہاں سب کچھ اُسے اپنی مرضی سے کرنا تھا۔

یہ کمرہ پہلے والے سے زیادہ کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ سب سے زیادہ خوشی اُسے اس بات کی تھی کہ یہاں اسے اکیلے رہنا تھا۔ یہاں اصغری بائی کے کوٹھے کی طرح ایک کمرے میں آٹھ چارپائیاں نہیں بچھی تھیں جس میں اسپتال کے جنرل وارڈ کی طرح دیوار سے دیوار تک پلنگ پڑے ہوئے تھے۔ ان پر مچھردانیوں کی طرح ناریل کی سُتلیوں پر مختلف رنگ کے کپڑے ڈال کر پردے داری کا ڈھونگ نہیں رچایا گیا تھا۔ ساگوان کی ڈھیلی ڈھالی چارپائی جیسے بدن جب اس پر پھیلتے تو لڑکیاں ایک دوسرے سے اپنی علاقائی زبانوں میں پتہ نہیں کیا گپ چپ کرتی رہتیں۔ ریّو البتہ خاموش رہتی۔ چکلے میں اس کی طرف کی کوئی لڑکی نہیں تھی۔ آٹھ میں دو بنگالی، ایک گجراتی اور چار پہاڑی لڑکیاں تھیں۔ آٹھویں وہ خود تھی اور اس کا تعلق یوپی کے ایک قصبے سے تھا۔

شروع میں ریّو کو ان سبھوں کی باتیں بڑی عجیب معلوم ہوتیں۔ آخر جب اس سے نہ رہا گیا تو کانچھی سے پوچھ بیٹھی۔ کانچھی نے بتایا کہ عام طور سے وہ گاہکوں کے متعلق ہی گفتگو کیا کرتی ہیں جس میں ہم ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

نئے کمرے میں منتقل ہونے کے بعد پیچھے کی صرف یادیں باقی رہ گئیں۔ یہاں وہ ڈنگرو کی داشتہ ضرور تھی پر اس پر کسی طرح کی پابندی نہیں تھی۔ جہاں چاہے آئے جائے —— جب جی میں آئے دھندے پر بیٹھے یا نہ بیٹھے —— کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ وہ اس ساعت کا شکر ادا کرتی جب ڈنگرو کا اس پر دل آگیا تھا۔ ڈنگرو نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ آمدنی کا نصف حصہ وہ لے گا اور گاہے بگاہے اُسے خوش بھی کرنا ہوگا۔ ریّو کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ تو سڑک پر لگے اس سرکاری نل کی طرح تھی جہاں کوئی بھی راہ چلتا اپنی پیاس بجھا سکتا تھا۔

نئے کمرے میں سب سے زیادہ خوشی اور جوش اس بات کا تھا کہ اب وہ کسی کی ماتحتی میں دھندا نہیں کرے گی۔ نہ یہاں بائی کی جھاڑ پھٹکار —— نہ بھڑووں کی یا دوسری رانڈوں کی —— بک —— بک۔ ٹرٹر —— شور شرابے سے اسے شروع سے ہی وحشت ہوتی تھی۔ اب اُسے اس بات کی بھی فکر نہ تھی کہ شام تک تین سو روپے نہ دینے پر اسے بھوکا سونا پڑتا تھا۔ ساتھ میں دروازے کے پیچھے کھڑے شیشم کے ڈنڈے سے پٹائی الگ ہوتی۔ اس کی پشت پر اب تک نشان موجود تھے۔ حالاں کہ کئی بار بھاگنے کی کوشش کی مگر ہر بار پکڑی گئی۔ دھیرے دھیرے دل بری طرح اُچاٹ ہوگیا تھا۔ ایسے وقت میں اگر ڈنگرو نے اُسے زنداں سے آزاد نہ کرایا ہوتا تو شاید وہ کب کی مرکھپ گئی ہوتی۔ ڈنگرو کی وہ بہت احسان مند تھی۔ اسی لیے تو ڈنگرو جب جب اُس کے پاس آتا تب تب اُسے احساس ہوتا کہ عورت جب کسی پر نچھاور ہوتی ہے تو وہ ساعتیں کیسی ہوتی ہیں؟

تین سو روپے سارا دن میں کما لینا ریّو کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ ایک رات بلکہ رات کے نصف حصے

میں ہزاروں کماتی۔ وہ گاؤں سے شہر زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کی وجہ سے ہی آئی تھی مگر اب اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔ یہاں اس نے بیس بائیس برس کی بڑھیوں کو دیکھا تھا وہ لرز گئی۔ خوف و ہراس ہڈیوں کے اندر تک اُتر گیا۔ آغاز میں یہی لڑکیاں چالیس پچاس مردوں کو رات بھر بدن کی کشتی میں بٹھا کر پار اُتار آیا کرتیں۔ اب وہی جسم ٹوٹے پتوار اور پھٹے بادبان سے ایک ایک آدمی کی باٹ جوہ رہے تھے۔ غوّاصی اور سیاحت کے عوض مطالبہ بھی صرف دو روٹیوں کا ہوتا۔ سادی لڑکی مجھی جاتی تھی۔ اس کی ماں پارو کو تو ہر وقت یہی کوفت ہوتی کہ کس طرح وہ اس کام کو سنبھال پائے گی گو کہ دھیرے دھیرے اس کے رویّوں میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں پر نتھ اترائی کے بعد تک وہ اتنی تیز نہیں تھی جتنی شہر آنے کے بعد ہو گئی تھی۔

نئی جگہ آنے کے بعد اُس نے گاہکوں کی تعداد کم کر دی مگر پیسے وہ اب بھی سب سے زیادہ لے رہی تھی۔ اس کے مستقل گاہکوں میں کچھ تو روز آتے، کچھ ہفتے میں، چند ایسے بھی تھے جو مہینے میں صرف ایک بار آتے۔ گوکل سب کی شکل اور اہمیت سے واقف تھا۔ دروازہ کھلا ہونے پر وہ بے دھڑک اندر آ جاتے پر جب بھی دروازہ بند ہوتا تب بھی انھیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ لڑکے پان والے کی دُکان پر کھڑے ہو کر سگریٹ پھونکتے، اندر پلنگ پر لیٹ کر رگو اپنے گاہک کو ـــ

کبھی کبھی غیر متوقع پولس کی آمد پر گلی میں بھگدڑ مچ جاتی۔ بڑی تعداد جو بھاگنے میں کامیاب نہ ہو پاتی پولس کی گرفت میں ہوتی۔ وہ لوگ جو سورج کی طرح یہاں ہر روز طلوع ہوتے تھے۔ ان کی پسندیدہ لڑکیاں شام کا دھندلکا بن کر انھیں اپنی وسعتوں میں کہیں روپوش کر دیتیں۔ کچھ لوگ جن کی جیبوں میں پولس کو خرید لینے کی استطاعت ہوتی۔ وہ پیسے نکال کر پولس کو ٹھونس لیتے۔ گرفتار کیے ہوئے لوگ تھانے لائے جاتے سڑک کے وسط میں انھیں مرغا بنایا جاتا۔ اُٹھک بیٹھک کرائی جاتی۔ بہت سے کان پکڑنے کے بجائے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپانے کی کوششیں کرتے۔ چلتا ہوا ٹرافک رُک کر یہ تماشا دیکھنے لگتا۔ کچھ جو صورتِ حال کا اندازہ نہ لگا پاتے آگے کھڑے ہوئے شخص سے پوچھتے ـــ ''کیا ـــ ہوا ـــ ہے ـــ؟''

''کچھ نہیں ـــ اندر گلی میں پکڑے گئے ہیں ـــ''

ہر چند کہ پولس کو یہ سب کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں تھا، ہفتہ تو چھاپے کے بغیر بھی ان کے پاس پہنچ جاتا۔ اصل مقصد تو بات اُوپر تک پہنچانا ہوتا کہ پولس ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھی ہے۔ وہ باقاعدہ وشیا وِرتی کے خلاف مہم چلا رہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب باقی ماندہ چکلے بھی مقفل کر دیے جائیں گے۔ چکلے والا کام اسی اہتمام اور طمطراق سے کسی تھانے میں نہیں ہوگا اس کی ذمے داری البتہ انھوں نے کبھی نہیں لی شاید یہی وجہ ہے کہ ایسے تھانوں، چوکیوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

دو سال پہلے کی بات ہے حنیظ نے مجھے بتایا تھا کہ شکلا جی اسٹریٹ میں کوئی نئی لڑکی آئی ہے۔ رگو نام ہے ـــ بڑے چرچے ہو رہے ہیں ملنے کی خواہش تو بہت ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ اندر تک چلنا پڑے گا۔ حنیظ کا ایک ملنے والا تھا جس کے رگو سے بڑے بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ اتنی معلومات بہت تھی۔ اگلے ہی روز ہم تینوں پہنچ گئے۔

جاوید نے میرا اور حفیظ کا تعارف اپنے اچھے دوستوں کے طور پر کروایا۔ اس کے بعد وہاں جانے کا سلسلہ ہی چل نکلا۔ کبھی جاوید کے ساتھ تو کبھی حفیظ کے اور آگے پھر وہ وقت بھی آیا جب میں اکیلے ہی جانے لگا۔ بڑی خندہ پیشانی سے وہ خیر مقدم کرتی۔ گوکل کو آواز دے کر کولڈ ڈرنک لانے کا حکم دیتی اور پھر چلا کر سگریٹ یاد دلاتی۔ پھر جب تک ہم خود اُٹھ کر نہ آنا چاہیں ساتھ میں بیٹھ کر دھوئیں کے مرغولے چھوڑتی رہتی۔ شروع میں اس کی منگائی ہوئی چیزیں کھانے پینے میں مجھے کچھ تکلف ہوا جس طرح اس نے مجھے دیکھا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ سمجھ گئی ہے۔ مزید کچھ سوچنے کا وقت دیئے بغیر میں اشیاء خورد ونوش پر ٹوٹ پڑا تھا۔

جاوید پر وہ دل وجان سے عاشق تھی۔ ہم لوگوں کی موجودگی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ جاوید کو چھیڑتی، شرارتیں کرتی۔ انھی لمحوں میں اس کے رنڈی ہونے کا احساس ہوتا۔ اپنی زبان کار کی طرح اس کے ہونٹوں، گالوں اور گردن پر چلا کر کان میں پارک کر دیتی۔ جاوید ہم لوگوں کی وجہ سے کچھ خجل —— کچھ شرمندہ ہوتا مگر ساری باتوں سے بے پروا رتو اس کے اندر دہکتے شعلوں کو ہوا دیتی رہتی۔ اختتام سے پہلے ایک سکّہ جاوید کے پیچھے پتلون میں ڈال دیتی۔ پھر بہت دیر تک اس کا ایک ہاتھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں اور حفیظ ادھر اُدھر نظریں چراتے پھرتے۔ دیوار پر ٹنگے ہوئے فلمی ہیرو ہیروئن کی نیم عریاں تصویریں، کونے میں نل کے نیچے رکھی ہوئی پلاسٹک کی بالٹی، اسی رنگ کا مگ پانی کی سطح پر تیرتا ہوا، ٹونٹی سے پتلی سی دھار گرتی ہوئی جس کا شور کمرے کے اندر تک آتا۔ موری کے پاس سے عجیب طرح کی بو جیسے باسی مچھلی میں سے آتی ہے۔ طاق پر ڈ ٹال کی شیشی کچھ اور چیزیں بھی تھیں جو دور ہونے کی وجہ سے صاف نظر نہیں آرہی تھیں۔

ایک دن جاوید نے رتو سے کہا کہ ''یہ تمھارے اوپر کوئی کہانی لکھنے کے موڈ میں ہیں —— '' آنکھیں اُٹھا کر اس نے میری طرف دیکھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اس سے خوف کھانے لگا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا بولوں اُسی وقت، وہ گویا ہوئی —— ''منٹو بننا چاہتے ہیں —— '' جملہ سن کر مجھے بے پناہ ندامت کا احساس ہوا۔ سوچنے لگا یہ کارزیاں ایسے بھی ذلیل کروا سکتا ہے۔ ''ہم لوگوں میں ایسی کون سی خاص بات ہوتی ہے جو آپ حضرات گھریلو لڑکیوں کے مقابلے ہم لوگوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ شاعر، شاعری کرنا چاہتا ہے۔ مصور تصویر بنانا چاہتا ہے۔ آپ کہانی لکھنا چاہتے ہیں —— ایک ایسی تخلیق جو شاہکار کہلائے مرنے کے بعد بھی شناخت قائم رکھے۔ ویسے شناخت کا مسئلہ اتنا آسان بھی تو نہیں۔'' میں حیرت سے اُسے دیکھے جارہا تھا یہ وہی رتو ہے —— جس سے اتنے دنوں ہم ملتے آرہے ہیں۔

''آپ جاوید کے ساتھ نہ آئے ہوتے تو یقیناً میرا رویّہ کچھ اور ہوتا لیکن اب جو صاحب عالم چاہیں —— '' وہ ہولے سے مسکرائی تو جان میں جان آئی۔ اسی دن یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ جاوید سے مجذوبوں کی طرح محبت کرتی ہے۔

رتو نے اپنے، اور پیشے کے بارے میں ڈھیروں انکشافات کیے۔ بہت سی باتیں بتا کر بھی نہیں بتائیں —— مگر لبِ لباب میں سمجھ گیا تھا۔

رنّو اس دھندے میں اور لڑکیوں کی طرح دھوکے یا سازش کا شکار ہو کر نہیں آئی تھی۔ یہ تو اس کا خاندانی کام تھا۔ رنّو کی نانی ڈیرے دار طوائف تھی۔ دروپد بہت اچھا گاتی تھی۔ اس وقت ہزاروں کمائے۔ رات کے پہلے حصے میں سازندوں کے ساتھ راگ الاپتی۔ دوسرے حصے میں وہ اپنا تام جھام اٹھا لے جاتے۔ باقی رات نانی رئیسوں اور نواب زادوں کو گوشت بیچتی۔ رنّو کی ماں تک آتے آتے قدریں بہت بدل چکی تھیں ہر چند کہ پارو کی آواز بہت شناکے دار تھی مگر اُسے راگ کی زیادہ معلومات نہیں تھی، مزاج میں تنوع اور خود سری بھی بہت تھی۔ پارو نے گانے بجانے کی آڑ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ جو کچھ کرنا ہے ڈنکے کی چوٹ پر کرنا ہے۔ خوا مخواہ ڈھولک، ہارمونیم میں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ شاید یہ حوصلہ اسے وقت کے تغیر نے عطا کیا تھا۔

جوان ہونے سے پہلے پارو کی آنکھیں کسی داروغہ سے چار ہو گئیں۔ نانی کی ہزار مخالفت کے باوجود اماں نے داروغہ سے بیاہ رچا ہی لیا پھر اسی نے پارو کو ہر طرح سے بالغ کیا اور جب آلۂ افزائش نسل پر رنّو کو رکھ کر پارو کے بطن میں گرا دیا تو اُسے احساس ہوا کہ اس کا کام ختم اور پھر وہ سیاہ فام داروغہ اپنا منہ کہیں اور کالا کر گیا۔ پارو کو پتا نہیں کیا سوجھی وہ صاف کرانے کی سوچنے لگی۔ یہ بات جب پارو کی ماں کے کانوں میں پڑی تو وہ بہت ناراض ہوئی۔ خوب کھری کھوٹی سنائی۔ غصہ ٹھنڈا ہوا تو پیار سے سمجھایا پر پارو کے ایک نہ اُتری۔ وہ بچہ پیدا کرنے کے حق میں بالکل نہیں تھی۔ نانی کا ہی دم تھا کہ کسی طرح دن اُوپر کروا دیئے تب کہیں جا کر چین کا سانس لیا۔ ورنہ رات رات بھر جاگ کر ٹوہ لیے پھرتی۔ یہ ساری باتیں جب رنّو سے بتائی تھیں، وہ کچھ نہیں سمجھتی تھی، مشکل سے چھ سات برس کی رہی ہوگی اور تبھی رنّو کی نانی داغِ مفارقت دے گئی۔ اپنے پیچھے بہت زمین جائیداد چھوڑ گئی تھی جسے بعد از مرگ سرکار نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ وہ پرانا دَر اور محرابوں والا مکان جس کا صحن چلتے ختم نہیں ہوتا تھا۔ چند سالوں بعد حکومت نے وہاں کچہری بنانے کا اعلان کر دیا۔ بوڑھوں کو آج بھی معلوم ہے کہ کچہری کی عمارت کس کی بنیادوں پر کھڑی ہے۔

مہنگائی کے ساتھ جب رنّو بھی بڑھنے لگی تو نانی کی تمام باتوں کا مطلب اس کی سمجھ میں آنا شروع ہوا۔ اماں کے بارے میں اکی رائے بدلنے لگی تھی مگر ذہنی شکست و ریخت کا کسی پر اظہار نہ ہونے دیا۔ بیٹھے بیٹھے اکثر اُداس ہو جاتی۔ ذرا میں منڈیروں پر اُچھلتی کودتی نظر آتی۔ پارو کو بھی اس کے مزاج اور ہاو بھاو میں تبدیلی نظر آ رہی تھی پر رنّو کے تغیرات کو اس نے عمر کے تقاضے پر محمول کیا۔ ادھر رنّو کے دل دماغ میں اماں کے خلاف جاری سرد جنگ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

رنّو نے جب ہوش سنبھالا تھا اپنی ماں کو گاؤں میں ہی دھندا کرتے ہوئے دیکھا۔ اس سے پہلے تک وہ یہی سمجھتی رہی تھی کہ چکیا چولھے کے علاوہ عورت کی گھر داری میں یہ سب بھی شامل ہوتا ہوگا۔ ہر رات اندر والی کوٹھری میں پارو کسی نئے آدمی کے ساتھ چلی جاتی۔ رنّو دالان میں پھوس کی چٹائی پر لیٹی عجیب ہیبت ناک آوازیں سنتی رہتی۔ پو پھٹنے سے پہلے پارو دروازہ کھولتی۔ چوکھٹ پر آ کر ایک بھرپور انگڑائی لیتی پھر ادھر اُدھر جھانکتی اور بولتی—"جا نکل—جا—"

ادھیڑ ہونے کے باوجود پارو کا بدن بہت سڈول تھا۔ پتہ نہیں اس کے پیچھے اس کی محنت کارفرما تھی یا

اوپر والا اس طرح پارو کی اعانت کر رہا تھا۔ رجّو جب تک بستر چھوڑتی پارو گھر کا آدھا کام نمٹا چکی ہوتی۔ دن میں پارو تان کر سوتی، رجّو یاں واں مٹر گشتیاں کرتی پھرتی۔ ایک دن ایسا آیا جب پارو کو باہر رکنا تھا۔ اس روز رجّو کو اندر جانا تھا، پارو نے جب اُسے بتایا کہ پورے پانچ سو روپے ملیں گے۔ اماں کی بات کی وہ نفی کرنا چاہتی تھی مگر پانچ سو روپے کے لالچ میں آ گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہ پیسے اماں کو چھونے بھی نہیں دے گی۔ وہ سوچنے لگی کہ میلے سے شیشہ، کنگھی، سرخی، چوٹی، پھندنے وغیرہ اپنی کمائی کے پیسوں سے خریدے گی۔ اُسے کپڑے کا قفس بھی لینا تھا جو دن بہ دن اُس کے صحت مند ہوتے کبوتروں کو قابو میں رکھ سکے، اس کے بغیر رجّو کو بہت دشواریاں ہو رہی تھیں۔ آئے دن سہیلیوں میں اس کی ہنسائی ہوتی تھی۔ خاص طور سے اس وقت جب بارہ دری میں کنڑ کو کھیلتی۔ خانوں میں قدم رکھتی، اُچھلتی پھاندتی رہتی۔ ساتھ کی تمام لڑکیاں کنارے کھڑی زور زور سے قہقہے لگاتیں۔ کئی بار بے ایمانی سے گھر بسانے پر بھی جب کسی نے نوٹس نہیں لیا تو اس کے کان کھڑے ہوئے ورنہ اس سے پہلے کسی کے گھر میں ذرا سا پیر بھی چھو جاتا تو وہ سب آفت کر دیتیں۔ کھیل سے اس درجہ بے اعتنائی کی اُسے توقع نہ تھی۔ اگلے ہی پل وہ سارا ماجرا سمجھ گئی۔ اس کے بعد منفعل ہونے کے بجائے اور تیزی سے قلانچیں بھرنے لگتی اور اس بار ہنسی میں سب سے تیز آواز رجّو کی ہوتی۔

پانچ سو روپے اس کے حواس پر ایسے طاری ہوئے کہ پھر اُسے کچھ سجھائی نہ دیا۔ مستقبل کی تابناکی میں ایسی کھوئی کہ پتہ بھی نہ چلا کب اُس کی لہلہاتی ہری بھری فصل کٹ گئی۔ برآمدے میں جہاں پہلے وہ خود لیٹا کرتی تھی اب پارو سونے لگی تھی۔ پارو نے رجّو سے بتایا تھا کہ جب پہلی بار وہ کوٹھری میں گئی تھی تو وہ وسوسوں اور اندیشوں سے گھری ہوئی تھی۔ خوف زدہ بھی تھی جب رجّو کی چیخ اس کے کانوں میں پڑی تھی تب کہیں جا کر اطمینان کی سانس لی تھی۔

وہ دن تھا اور آج کا دن رجّو کی دکان ایسی چلی کہ پھر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ کچھ سال بعد اچانک بھیڑ کم ہوگئی۔ معلوم یہ ہوا کہ پیچھے والی گلی میں کوئی نئی لڑکی دھندے پر بیٹھی ہے۔ رجّو کے اخراجات بہت بڑھ چکے تھے۔ اسی لیے اسے معاشی پریشانی اٹھانی پڑ رہی تھی۔ اماں سے بھی بے بات جھگڑتی رہتی۔ پارو جو بھی کہتی وہ اس کا الٹا ہی کرتی خواہ اس میں اس کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ پارو اس کے رویّوں سے ٹوٹتی جا رہی تھی۔ گاؤں کی بہت ساری لڑکیاں جو رجّو کے ساتھ کی تھیں، مختلف شہروں کو ہجرت کر رہی تھیں۔

ایک دن صبح سو کر اٹھی اور دو ٹوک لفظوں میں پارو کو اپنا فیصلہ سنایا کہ وہ بمبئی جا رہی ہے۔ پارو دم بخود تھی۔ اس نے کہا "میں یہاں اکیلے کیسے رہوں گی ــــ؟"

"جیسے میرے اسقاط کے بعد رہتی۔ سمجھ لے میں پیدا ہی نہیں ہوئی۔ گروا دیا تو نے"۔ رجّو کے جواب پر پارو کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے بعد وہ ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ رجّو نے اُسی جھونک میں ٹین کے بکس میں کپڑے اور اپنے پیسوں سے خریدی چیزیں رکھیں اور بمبئی والی ٹرین میں سوار ہوگئی۔

شہر اور گاؤں کی قدروں کا تھوڑا بہت فرق وہ جانتی تھی لیکن چوں کہ گاؤں میں اُسے خاصہ تجربہ تھا۔ علاوہ ازیں وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں پر بھی مطمئن تھی۔ شروع میں جب فاقوں کی نوبت آ گئی تو وہ ماتحتی میں بھی بردہ

فروشی کے لیے تیار ہوگئی بلکہ ساری اکڑفوں بھول گئی۔ وہ خواب جس نے گاؤں چھوڑنے کے لیے مجبور کیا۔ یہاں اصغری بائی کے کوٹھے میں رہ کر شرمندۂ تعبیر ہوتے نظر نہیں آرہے تھے کیوں کہ یہاں اگنت لوگوں کو ہر روز جسم کے تاریک غار میں اتارنا ہوتا اور پیسے اُس کے بعد بھی ہاتھ میں نہیں آتے۔ اصغری بائی سانپ کی طرح تجوری پر کنڈلی مارے بیٹھی تھی لیکن ڈنگرو اُس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا۔ جسم کے خالی حصوں پر گوشت چڑھ رہا تھا اور اب پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آنے لگی تھی وہ۔ کچھ ہی دنوں کی آمد و رفت کے بعد مجھے ربّو کی ذہانت کا اندازہ ہوگیا تھا بلکہ ربّو جیسی لڑکی سے میں اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ چلتے وقت وہ کوئی ایسی بات ضرور کہتی کہ راستے بھر میں مغز ماری کرتا رہتا۔ فلسفیانہ گفتگو تو کبھی بھول بھی جاتی مگر جاوید کی جیب میں روپئے ڈالنا نہیں بھولتی جسے جاوید اپنے دوستوں پر بڑے افتخار سے خرچ کیا کرتا۔ احباب کو کیا معلوم کہ جاوید انھیں کون سی کمائی کھلا رہا ہے۔

کئی روز بعد ربّو کے پاس پہنچا تو وہ شکوے شکایت لے کر بیٹھ گئی اور پھر کچھ دیر بعد سگریٹ سلگائی اور باتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ جانے کہاں کہاں کی باتیں —؟

بازار سے روز سبزی، گوشت خریدنے وہ خود جاتی۔ مقصد سیر و تفریح بھی ہوتا۔ بازار اس کے کمرے سے کوئی خاص دور نہیں تھا۔ ایک دن لوٹ رہی تھی تو یوں ہی غیر ارادی طور پر سڑک کے پار والے میدان کے پاس ٹھہر کے لوگوں کو کرکٹ کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ تاہم اُسے کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر وہاں سے گزرتے ہوئے قدم آپ ہی آپ رُک گئے۔ وہ جانے کیا سوچ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ قدرے توقف کے بعد وہ سوچنے لگی کہ وہ بھی تو اس ہرے بھرے میدان کی طرح ہے۔ اُس کے وسط میں بھی تو ایک پچ (Pitch) ہے جہاں ہر طرح کے کھلاڑی زور آزمائش کرتے ہیں۔ کبھی ایسے بلّے باز سے سابقہ پڑ جاتا جو جارحانہ بیٹنگ کے حق میں ہوتا اور پہلی ہی گیند سے چوا چھکا مارنے کی کوشش کرتا مگر زیادہ تیز بیٹنگ کی وجہ سے اوٹ پٹانگ ڈھنگ سے آؤٹ ہوتا۔ کوئی ایسا ہوتا جسے سنگلز میں زیادہ لطف آتا۔ بال کو باؤنڈری کے باہر پہنچانے میں اُسے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ دیر تک کریز پر کھڑے رہنا ہی اُس کا نصب العین ہوتا۔ کھیل اور وقت خراب کرنے والے کھلاڑیوں سے ربّو کو بڑی وحشت ہوتی۔ ایسے لوگوں پر وہ اپنی ہنسی نہ روک پاتی جو باریکی سے فیلڈ کا معائنہ کرتے۔ حرکات و سکنات سے لگتا کہ وہ کوئی اہم کھلاڑی ہے مگر پہلی ہی گیند پر وکٹ دور پڑا ہوتا۔ ربّو کے سامنے ماہرین کی بھی مشکل سے چلتی۔ کوئی ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کرتا تو چند ثانیوں میں اُس کی تمام ہوشیاری اور چالاکی پھول دار چادر پر دھری ہوتی۔ اس کے لیے ہزار گالیاں اُوپر سے سناتی۔ کئی بار جھاڑو یا جالا پونچھنے والے ڈنڈے سے دھنائی تک ہو جاتی۔ اس کے برعکس جو اس کے سامنے بھول پن کا مظاہرہ کرتا، فائدے میں رہتا۔ ہر اپیل پر وہ بلّے باز کے حق میں فیصلہ کرتی اور جب تک وہ کلین بولڈ نہ ہو جاتا کھیلتے رہنے کا موقع دیے رہتی۔ چکلے میں ایک اور بات بڑی عجیب و غریب تھی۔ ہر گاہک رنڈی سے اُس کا نام ضرور پوچھتا۔ ربّو سے بھی لوگ اُس کا نام دریافت کرتے۔ وہ تو تھی ہی اوّل درجہ کی شعبدہ باز۔ پوچھنے والا اگر مسلمان ہوتا تو اپنا نام لکشمی، سیتا یا پاروتی بتاتی۔ گاہک

ہندو ہوتا تو اُسے کلثوم، نسرین یا رُخسانہ بتاتی۔ دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھتی۔ پتہ نہیں کیسے اُسے معلوم ہو جاتا تھا؟

مسلمان بے چارہ پھول کر کپّا ہو جاتا۔ اب اُسے یہ خیال بھی ہوتا کہ وہ ایک رنڈی کے ساتھ ہم بستر نہیں ہو رہا۔ ہندو سنسکرتی پر اپنی فتح کا پرچم بھی گاڑ رہا ہے۔ ہندو کو یہ خوش فہمی ہوتی کہ وہ مسلم تہذیب و تمدن پر بھگوا پھہرا رہا ہے۔ ربّو ملک کی سب سے بڑی سیکولر ٹانگیں پھیلائے جانے کیا سوچ سوچ کر مسکراتی رہتی۔ ایک شخص کو دو نام بتانے کی غلطی بھی کبھی نہیں کی۔ پتہ نہیں کیسے ذہن میں سارا حساب محفوظ رکھتی۔ گوشت کا بہت شوق تھا — کھانے میں بھی — اور لڑانے میں بھی —"

دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ گوکل کھانا رکھ گیا تھا۔ وہ نہا کر نکلی۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئی۔ میں کھا کر آیا تھا اس لیے میں نے معذرت کر لی۔ گوکل موری کی نالی صاف کر رہا تھا جس میں کوڑا پھنسا ہونے کی وجہ سے پانی موری کے اندر بھر رہا تھا۔ اُس نے الماری سے کوئی کتاب نکالی اور کھلے ہوئے بالوں کو تکیہ کے پیچھے لٹکا کر بستر پر سیدھی ہو گئی۔ میں نکلنے کے موڈ میں تھا مگر اس نے روک لیا۔ اسی وقت ڈاکیے نے اُس کا نام پکارا۔ قبل اس کے کہ وہ دروازے تک جست لگاتی نیچے کی دراز سے ایک پوسٹ کارڈ اندر سرک آیا۔ اُسے معلوم تھا کہ اماں کے علاوہ اُسے کوئی خط نہیں لکھتا۔ اُس کے باوجود بھیجنے والے کا نام پہلے پڑھا۔ خط پورا پڑھنے کے بعد اُس کے چہرے پر مایوسی اور ناگواری کے تاثرات اُبھر آئے۔ اس کی وجہ حسبِ معمول اماں کا پیسوں کا مطالبہ نہیں تھا بلکہ اتنے سالوں کے بعد اماں پھر پیٹ سے تھی۔ ڈاکٹر کو دکھانے اور دوا دارو پر پانچ سو روپے خرچ ہونے کا تخمینہ لگایا گیا تھا۔ معاً اس کی جبیں پر شکنیں ابھر آئیں۔ جھٹ پلنگ کے نیچے سے سوٹ کیس نکالا۔ پیتانوں کے بیچ رکھی ہوئی چابی نکالی۔ تالا کھولا اور گوکل کو آواز دی۔ گوکل جھاڑو پھینک کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ ربّو نے پانچ سو روپے اُس کی طرف بڑھائے۔ "جا کر منی آرڈر کر دے —" گوکل نے روپے گنے، "اس بار پانچ سو بھیجے گی —"

"تجھے جو کہا ہے وہ کر، زیادہ بکواس مت کیا کر۔" اُس نے گوکل کو جھڑک دیا۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ "ٹھہر میں دو لائن لکھ کر دیتی ہوں۔ یہ بھی چٹّی میں ڈالتا آ۔ اُس نے لکھا" تیری عمر اب بچّے پیدا کرنے کی نہیں ہے۔ پانچ سو بھیج رہی ہوں۔ فوراً صاف کروا لے۔ ورنہ آئندہ پھوٹی کوڑی بھی نہ ملے گی۔"

گوکل کے چلے جانے کے بعد اُس نے راحت کی سانس لی۔ میری طرف بڑے غور سے دیکھا پھر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا اور پھر میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس بار اُس نے بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔

ایک ہفتہ بعد میں ربّو کے کمرے میں داخل ہوا تو اندر سے ایک ڈاکٹر کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ مجھے تشویش ہوئی۔ گھبراہٹ میں اس سے پوچھ بیٹھا — "کیا — ہوا —؟" میرے سوال پر ڈاکٹر مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ میں تیزی سے اندر کی طرف بھاگا۔ پردہ ہٹایا تو ربّو لیٹی ہوئی نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے منع کر دیا تو وہ پھر لیٹ گئی۔

''خیریت تو ہے— یہ ڈاکٹر— کیوں— آیا تھا—؟''

''اس کا کیا ہے یہ تو ہر مہینے خون کی طرح آتا ہے—''

''خون— کی طرح—'' نہ سمجھتے ہوئے میں نے دہرایا۔ وہ مسکرائی— تب تک خون کا عقدہ میری سمجھ میں آ چکا تھا۔ اُس نے لبوں کو جنبش دی۔ ''دراصل یہاں ہر مہینے سب کا میڈیکل چیک اَپ ہوتا ہے۔ کیسی کیسی مہلک بیماریاں پھیلتی جا رہی ہیں۔ بہت ساری تو سرکاری اسپتال میں دکھانے جاتی ہیں۔ پر میں اُن خیراتی اسپتالوں کے ڈاکٹروں کو اپنے جسم پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتی۔ حرامی پن کے علاوہ انھیں کچھ آتا نہیں۔ گھر پر یہ ایک بار کے دوسو روپے لیتا ہے پر دل کو اطمینان ہو جاتا ہے۔ اور میرے خیال میں دنیا کی ساری جدوجہد اسی اطمینان اور بے اطمینانی کے بیچ لٹکی ہے۔ اُس کی باتوں پر اب میں چونکتا نہیں تھا۔ ''آج مجھ سے اسپتال میں آکر دکھانے کو بولا۔ کہہ رہا تھا مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے''۔ اُس کی آواز میں محرومی اور اداسی شامل تھی لیکن چند لمحوں بعد ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ جاوید کا ذکر نکلا۔ کہنے لگی ''ایک ہفتہ کے وعدے سے پانچ ہزار روپے لے گیا تھا، ایک مہینے سے اوپر ہو رہا ہے پلٹ کر نہیں آیا۔ اب شاید آئے گا بھی نہیں مگر دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ مجھ سے جھوٹ بولا— وہ بھی پیسے کے لیے جو روز میں بنا مانگے دیتی تھی۔ جاوید سے اچھا تو یہ گوکل ہے۔'' میں خاموش بیٹھا رہا تو اس نے ٹوکا۔ ''آپ کچھ نہیں بول رہے۔''

''تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اگر تمھیں بری نہ لگے— تو—''

''ضرور پوچھیے— میں وعدہ کرتی ہوں کہ بُرا نہیں مانوں گی۔''

''ایک دن تم نے منٹو کا نام لیا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ منٹو کو کیسے جانتی ہو؟'' میرے سوال پر اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر مسکرائی۔ بڑی پُراسرار مسکراہٹ تھی۔

''سوگندھی— سلطانہ— موذیل— وغیرہ کی وجہ سے۔'' کہہ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ میں چاہ کر بھی آگے اس سے کچھ نہ پوچھ سکا۔ پتہ نہیں کیوں میں اس سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے چہرے کی طمانیت سے لگ رہا تھا وہ میری جز بز ہوتی کیفیت سے واقف ہے۔ مجھ سے کچھ نہ بن پڑا تو میں کھڑا ہو گیا۔ ''جا رہے ہیں—؟'' اُس نے پوچھا میں نے آہستہ سے کہا— ''ہاں—'' اور میں باہر آ گیا۔

اس دن کے بعد پندرہ دن تک کچھ ایسی مصروفیت آ گئی کہ ربو کے پاس نہ جا سکا۔ دو چار دن شاید اور نہ جا پاتا کہ ربو کا پیغام ملا۔ ''بہت ضروری کام ہے فوراً بلایا ہے۔'' اُسی وقت پہنچ گیا۔ وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کر میں حیرت زدہ تھا۔ پندرہ دن میں وہ بہت نحیف اور کمزور نظر آ رہی تھی۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ یہ وقت تو اس کا ویڈیو پر فلم دیکھنے کا تھا۔ کمرے میں کھڑکی وغیرہ بند ہونے کی وجہ سے اندھیرا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھنے والا تھا کہ اُس کی آواز سنائی دی۔ ''بتی جلا دو—'' میں نے لائٹ آن کر دی بلب کی ملگجی روشنی میں اُس کا چہرہ کچھ اور واضح ہوا۔ وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ کم وولٹیج میں ٹیوب لائٹ کی طرح بار بار جی اُٹھنے کی ایک ناکام کوشش اُس کے زرد چہرے پر گرد کی طرح جمتی جا رہی تھی۔ قبل اس کے کہ میں کچھ بول پاتا وہ گویا ہوئی

''آج میں آپ سے ایک بات پوچھوں ـــ؟'' ''ـــ ہوں ـــ'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے زمین پر طوفان یا زلزلہ آنے کی خبر چرند، پرند کیڑے مکوڑوں کو کون دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ وہاں سے نکل بھاگتے ہیں۔ ایسے معاملوں کی اطلاع بس آدمی کو ہی نہیں ہو پاتی۔ ربّو کے سوال پر میں حیرت زدہ نہیں تھا۔'' تم نے یہی پوچھنے کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے۔'' میں بات کا رخ موڑنا چاہتا تھا۔

''آپ کو تو میں نے کچھ اور بتانے لیے بلایا ہے ـــ'' ''ـــ کیا ـــ؟'' میں متجسس تھا۔

''وہ حرامی کا پلا ـــ ڈاکٹر بنا پھرتا ہے ـــ بہن ـــ چو ـــ'' میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''سالا بولتا ہے میرے کو ایڈز ہے اور میں سال بھر سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔'' کہتے کہتے اُس کی آواز بھرا گئی۔ ضبط کے باوجود اُس کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔ آج پہلی بار وہ مجھے افسردہ نظر آئی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جھوٹی تسلّیاں کس طرح دوں۔ چاہ کر بھی کچھ نہ بول سکا۔ روتے روتے وہ بھی تھک گئی۔ کچھ دیر تک خاموشی سے چھت کو گھورتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔ چند ثانیوں تک میں بغور اُسے دیکھتا رہا۔ اور پھر میں باہر آ گیا۔ سڑک کے شور شرابے میں ربّو کی سسکیوں کی آواز بہت دور تک میرا تعاقب کرتی رہی۔

ربّو سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اگلی بار جب میں وہاں گیا تو صرف گوکل ملا۔ گوکل کی زبانی جو کچھ مجھے معلوم ہوا وہ کچھ اس طرح ہے: میرے جانے کے بعد اُسی دن شام کو جب وہ سو کر اٹھی تو اس نے گوکل سے کہا کہ وہ اُسے گاؤں چھوڑ آئے۔ گوکل جھٹ تیار ہو گیا۔ ٹیکسی پکڑ کر دونوں اسٹیشن آئے۔ ٹرین کے آنے میں کچھ وقت تھا۔ کمزوری کی وجہ سے ربّو سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر کوئی خالی سیٹ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گوکل کو لے کر وہ ویٹنگ روم میں آ گئی۔ یہاں ایک بینچ خالی تھی۔ وہ اُسی پر بیٹھ گئی۔ مشکل سے پانچ سات منٹ گزرے ہوں گے کہ دو گشتی سپاہی وہاں آدھمکے پولیس کو دیکھ کر گوکل خوف زدہ ہوا۔ سپاہی نے اُسے ڈنڈے سے ٹہلتے ہوئے ٹہوکا دیا۔ ''کہاں جا رہا ہے ـــ؟'' یہ چھوکری ـــ تیری ـــ کون ـــ ہے ـــ؟''

''جی ـــ جی ـــ وہ ـــ''

''جی جی ـــ ہے تیری ـــ صاف صاف کیوں نہیں بتا رہا کہ ـــ'' ربّو جو اب تک خاموشی سے سارا تماشا دیکھ رہی تھی اچانک برانگیختہ ہو گئی۔

''اٹھ ـــ تھانے چل ـــ ابھی دماغ ٹھکانے آ جائیں گے ـــ'' پتہ نہیں اتنی دیر میں ربّو نے کیا سوچا۔ وہ بڑی نرمی اور شائستگی سے مخاطب ہوئی: ''تھانے کے علاوہ کہیں اور چلنا چاہیں تو بھی مجھے کوئی شکایت نہیں۔'' سپاہیوں کو من مانگی مراد ملتی نظر آئی۔ خوشی سے دونوں کے چہرے کھل اُٹھے۔ ''سچ بول رہی ہے ـــ یا ـــ کوئی لفڑا ـــ؟'' ایک نے اندیشہ ظاہر کیا۔ ربّو زیرِ لب مسکرائی!!

Shahid Akhtar, Post Box No. 1067, Head Post Office,
Nawab Ganj, Kanpur- 208 002 (India), Mob. : 09450143117.

مکڑی

● انورامام

وہ اکثر و بیشتر اپنی بالکونی میں کھڑی کے سامنے سردار کے ڈھابے کے باہر کٹی ہوئی خون میں لت پت تڑپتی ہوئی مرغیوں کو دیکھا کرتی، اور اس عمل کے دوران اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آتی اور اس کے سارے وجود کو اپنے آپ میں باندھ لیتی، اس کی آنکھیں اس منظر کو دیکھ کر ایسی چڑھ جاتیں جیسے نشے میں چور شرابی۔ اور پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے آپ میں لوٹ آتی، اور یہ سلسلہ اس کی زندگی سے جڑ گیا تھا۔ ہائی اسکول کے بعد اس کا داخلہ کالج میں ہو گیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے گریجویشن کر لیا۔ پڑھنے کے شوق نے اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا اور وہ فضا کے دوش پہ لہراتی ہوئی ایم۔ اے کی دہلیز بھی پار کر گئی۔ اور پھر اس کے رشتے کی بات چلی۔ ماں کی بے حد زور زبردستی کے بعد اس کے باپ نے ایک اچھے گھرانے میں لڑکا تلاش کر ہی لیا۔ لڑکا انجینئر تھا۔ اس نے یہ خبر سنی اور عجیب نگاہوں سے اپنی ماں کی جانب دیکھا اور پھر بپھری ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ ماں باپ اسے آوازیں دیتے رہ گئے۔

وہ اکیلے اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ جانے کس سوچ میں گم رہتی۔ جبکہ اس کی بڑی بہنیں بیاہی جا چکی تھیں۔ بڑے دو بھائی اپنے اپنے روزگار سے لگے ہوئے تھے۔ وہ اس عمر میں جب لڑکیاں اپنی آئندہ زندگی کے حسین خواب کے تانے بانے بننے میں مبتلا رہتی ہیں۔ رومانی ناول کی دنیا میں غرق رہتی ہیں۔ لیکن اس کی ادا ہی کچھ نرالی تھی۔ اس کے کھیل، اس کی سوچیں، اس کا ہر انداز اسے ایک الگ ہستی بنا کر پیش کرتا۔ گھر کے لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔

ایک روز ماں اس کے کمرے میں دبے قدموں سے داخل ہوئی اور اس سے گویا ہوئی:

''ساوتری..... اری او ساوتری.....؟'' وہ بستر پر اوندھی پڑی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ماں اسے

جھنجھوڑتی ہوئی بولی۔ ''اری او پگلی... یہ اکیلے اکیلے کمرے میں پڑی کیا کرتی رہتی ہے۔ ارے تجھے لڑکے والے دیکھنے آرہے ہیں...... سُنا ہے لڑکا انجینئر ہے.... اور خوبصورت بھی...؟

''اس سے پہلے والا بھی انجینئر تھا نا.....؟ پھر..... اس میں ایسا کیا ہے......؟'' وہ مڑی اور اس کی نگاہیں اپنی ماں کی نگاہوں سے ٹکرائیں، جانے ان آنکھوں میں کیا تھا کہ اس کی ماں ایک عجیب خوف کے زیر اثر اس کمرے سے تقریباً دوڑتی ہوئی، بدحواس سی واپس لوٹ آئی۔

وہ اپنے کمرے میں پاگلوں کی مانند ہنستی رہی.... اس کے ہنسنے کی آوازیں درو دیوار سے ٹکرا کر چاروں طرف پھیلتی رہی۔

وہ اپنے قد سے روز بروز بڑی ہوتی گئی، اتنی بڑی کہ اسے سارے مرد بونے نظر آنے لگے۔ اور ان کے لیے روز و شب اس کے اندر حقارت بڑھتی گئی۔

اور پھر وقت پرواز کرتا گیا۔ وہ اپنے انداز سے سوچنے لگی اور اپنی خواہشوں کے پیڑ کی شاخوں سے لپٹی رہی۔ گھر کے لوگوں میں اس کی حیثیت ثانوی ہوگئی۔ ایک غیر ضروری سامان کی مانند۔ اس دوران کئی رشتے آئے اور سب یوں ہی ختم ہوگئے۔

اس روز اس کے کمرے سے ہلکی ہلکی کراہنے کی آوازیں ابھریں۔ حالانکہ رمنا ماں اس کے کمرے کے پاس خاص کر نہیں جاتی تھی۔ لیکن جانے کیوں خلافِ توقع اس کے کمرے کے پاس سے وہ گزری۔ کراہنے کی آواز سن کر اس کے قدم رک گئے۔ اس نے کی ہول سے کمرے میں جھانکا۔ دیکھا وہ برہنہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے جسم کو دیکھ رہی تھی۔ اپنے جسم کے کچھ مخصوص حصّوں کو سہلا رہی تھی۔ اور اس کے منہ سے طرح طرح کی آوازیں آزاد ہو رہی تھیں۔ اور پھر وہ اسی حالت میں پلنگ پر جا کر ڈھیر ہوگئی۔ اس کی آنکھیں چڑھ سی گئیں، اس نے اپنے دانت بھینچ لیے۔ ایک تکیہ اپنی جانگھوں کے درمیان اور دوسرا تکیہ اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اور پھر پورے پلنگ پر ادھر سے اُدھر لڑھکتی رہی۔ سارا جسم تن گیا، چہرے پر ایک عجیب سی وحشت چھائی ہوئی تھی۔ جانے وہ کون سے عمل میں مبتلا تھی۔ رمنا ماں سمجھنے سے قاصر تھی۔ لیکن پھر بھی اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اس بات کے غماز تھے کہ اس کی بیٹی جو کر رہی ہے وہ غیر فطری اور غلط ہے۔

بہت دیر تک وہ کی ہول سے اپنی نگاہیں جمائے کھڑی رہی۔ ساوتری کی کراہیں رفتہ رفتہ مدھم ہوتی چلی گئیں۔ اس کے چہرے پر چھائی وحشت بھی کہیں کھو گئی۔ اور آنکھوں کی چمک بھی معدوم ہوگئی۔ وہ مرجھائی ہوئی سی پلنگ پر چت پڑی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اور پھر دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتی گئیں اور آنسو گالوں پہ ڈھلک آئے۔ اور اس کی سسکیاں کمرے میں پھیل گئیں۔ بیٹی کی حالت دیکھ کر رمنا ماں تڑپ اٹھی، چاہا کہ آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دے، لیکن اس عجیب و غریب سچویشن نے اسے اس کی اجازت نہیں دی۔ وہ مرے قدموں سے واپس لوٹ آئیں۔ اور یہ رات انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی:

دوسری صبح ناشتے کی میز پر وہ ساوتری کو بڑی پیاری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔
''بیٹی.............؟''
''ہوں.........؟'' توس پہ مکھن لگاتی ہوئی وہ ماں کی طرف مڑی۔
''بیٹی آخر کب تک تو یوں ہی......؟ میرا مطلب......کئی اچھے رشتوں کو تو نے بنا سوچے سمجھے یوں ہی رد کر دیا......''
''ماں رشتے کی بات رہنے ہی دو......'' اس نے گہری نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔
''بیٹی یہ دنیا کا دستور ہے...تو کب تک بے معنی سی زندگی گزارتی رہے گی......؟''
رمنا ماں نے عاجزی سے بیٹی کو سمجھانا چاہا۔
''ماں اگر میں نے شادی کر لی تو غضب ہو جائے گا۔ وہ مجھے نہیں سمجھ پائے گا۔ اور مجھے پا کر سوچے گا کہ اس نے کچھ کھو دیا ہے اور بالکل یہی کیفیت میری بھی ہو گی۔ ماں میں ایک ایسی بنجر دھرتی ہوں جسے سیراب کرتے کرتے وہ مر جائے گا، لیکن میری پیاس پھر بھی نہیں بجھے گی۔ ماں تو یہ شادی کی ضد چھوڑ دے ورنہ......''
اس نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
رمنا ماں اپنے کمرے میں آ کر پلنگ پر لڑھک گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ جیسے اپنی بیٹی کے ان حالات کی وہ خود ذمے دار ہو......مجرم ہو......
راونا نے اپنی مالکن کو زندگی میں آج پہلی مرتبہ ایسی حالت میں دیکھا تھا، اس نے حیرت بھری نگاہوں سے رمنا ماں کی جانب دیکھا اور سوالیہ انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
رمنا ماں نے تمام باتیں تفصیل سے اسے بتائیں، وہ اس دوران خاموشی سے ان باتوں کو بغور سنتی رہی اور پھر مسکرا کر اپنی مالکن کی جانب دیکھا اور بولی :
''اماں اتنا پریشان ہونے کی بات نہیں......؟ میں رام مندر کے بابا اودھ ناتھ جی سے بات کروں گی۔ بڑے پہنچے ہوئے بابا ہیں......پچھلے برس ہماری بڑی بھتیجی بچھی کو بابا نے ہی ٹھیک کیا تھا۔ ہفتہ بھر بند کمرے میں اسے جھاڑتے رہے......بڑی مشکل سے ٹھیک ہوئی......اماں یہ سب بُری پریت آتما کا اثر ہے جو اسے ایسی ایسی حرکتیں کرنے پر مجبور کر رہی ہے......وہ بیچاری تو اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔'' رمنا ماں نے اسے مشکور نگاہوں سے دیکھا۔
دوسرے ہی دن بابا اودھ ناتھ اپنے دو مشٹنڈے چیلوں کے ہمراہ وہاں پدھارے۔ ان کی آمد سے رمنا ماں اور راونا دونوں بے حد خوش ہوئیں کہ چلو بیٹی کے سر سے بُری آتما کا اثر ختم ہو جائے گا اور وہ شادی کے لیے حامی بھرے گی۔
بابا نے بڑے طمطراق سے اپنی اوجھا گری شروع کی......زور زور سے منتر پڑھتے ہوئے ساوتری کے

کمرے میں داخل ہوئے.... کسی غیر مرد کو بغیر اجازت اپنے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ ساوتری غصّے سے کانپ اٹھی۔

"کون ہیں آپ......؟ بلا اجازت میرے کمرے میں داخل ہونے کی ہمت کیسے کی آپ نے.........؟"

"ارے بیٹی میں ہوں بابا اودھ ناتھ..... اس رام مندر کا پجاری...... سنا ہے تمھاری طبعیت خراب ہے اس لیے......" بابا نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ اور اپنے زعم میں اس کے بے حد قریب سَٹ گئے۔ اس دوران ان کے چیلوں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

بابا نے اپنے کمنڈل سے دیسی ٹھرے کی بوتل نکالی، ڈھکن کھولا اور پوری بوتل ایک ہی سانس میں اپنے اندر انڈیل گئے۔ آنکھیں نشے کے زیرِ اثر سُرخ ہو اٹھیں تب انہوں نے آگے بڑھ کر ساوتری کو اپنی بانہوں میں بھرنا چاہا۔ وہ چونک کر ان سے دور ہٹ گئی اور پھر نہایت ہوشیاری سے بابا کی بڑی توند پر ایک ایسی بھرپور لات ماری کہ وہ بلبلا کر دروازے سے جا ٹکرایا۔ چیلوں نے ہڑبڑا کر دروازہ کھول دیا، وہ گرتا پڑتا باہر بھاگا، اور زور سے چیخا۔

"بہت خطرناک پریت آتما ہے..... میرے بس سے باہر ہے....." اس کے پیچھے پیچھے چیلے بھی بے تحاشا بھاگے۔

اپنا پلان ناکام ہوتا دیکھ وہ دونوں جھنجھلا گئیں اور بے حد مایوسی سے اپنا سامنہ لے کر اندر باورچی خانے کی جانب بڑھ گئیں۔

وہ ایک خوش گوار صبح تھی۔

اس روز ساوتری علی الصباح جاگ اٹھی، اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے مکان کے لان میں ٹہلنے لگی۔ وہ ٹہلتی رہی اور پھر اس کی نگاہیں اس کالی سی شئے پر پڑی جو پھولوں کے پودوں کے جھنڈ میں متحرک نظر آ رہی تھی۔ وہ لپک کر اس کے قریب جا پہنچی اور ہوشیاری سے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا، وہ ایک چھوٹا سا گتے کا پلا تھا۔ خوف سے وہ "ٹیاؤں ٹیاؤں" کرنے لگا۔ اسے ایک پرانی ٹوکری لا کر ڈھک دیا اور واپس اپنے کمرے کی جانب دوڑی۔ پلا اس دوران چیختا رہا۔ ساوتری کی واپسی ایک تیز دھار دار چھرے کے ساتھ ہوئی۔ وہ نظریں بچاتی، چھپتی چھپاتی نہایت ہوشیاری سے اس ٹوکرے کے قریب پہنچی۔ ٹوکری سرکا کر پلے کو باہر نکالا۔ وہ خوف زدہ، بھوکا پیاسا چیخے چلا جا رہا تھا۔

پلے کی چیخ و پکار سن کر رمنا ماں باورچی خانے سے نکل کر بھاگتی ہوئی لان میں پہنچی۔ وہاں اس نے ایک عجیب دلدوز منظر دیکھا۔ خوف سے اس کا سارا جسم لرز اٹھا۔

ساوتری نے تیز دھار چھرے سے پلے کی گردن کاٹ ڈالی تھی۔ زمین پر سرخ سرخ خون چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ خون میں لت پت تڑپتے ہوئے پلے کو وہ بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی

وحشیانہ چمک چھائی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی تمازت تھی۔

رمناماں کی نگاہیں اس کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ وہ چاہ کر بھی اس سے کچھ نہ پوچھ پائی۔ بلکہ خوف زدہ سی کسی ہپناٹائز کیے گئے فرد کی مانند مکان کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے کمرے میں جا کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی آنکھیں خوف کے زیر اثر پھٹ سی گئی تھیں۔ وہ کافی دیر تک گم صم سی اسی کیفیت میں مبتلا رہی۔

"ممّا... ممّا... او ممّا... کیا بات ہے تم اتنی گم صم سی کن خیالوں میں کھوئی ہوئی ہو۔؟ دہلی سے بڑے بھیا کا فون ہے۔"

رمناماں کسی حد تک اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی فون کی میز پر گئی۔ ماؤتھ پیس اٹھا کر بیٹے سے بات کرنے لگی۔ اب وہ نارمل ہو چکی تھی۔ ساوتری کمرے سے جا چکی تھی۔

رات بے حد تاریک تھی۔ ایسی راتیں شاذ و نادر ہی نمودار ہوتیں‘ اور جب اس رات کہیں آس پاس کسی کتے کے رونے کی آواز فضا میں دردناک کریہہ چیخ بن کر ابھرے تو یقیناً رات ڈراونی اور خوفناک ہو جاتی ہے۔ رمناماں نے وحشت زدہ نگاہوں سے ہبرامنیم بابو کی جانب دیکھا‘ جیسے ان سے پوچھ رہی‘ آخر ماجرا کیا ہے؟ اور پھر وہ خود سے بڑبڑائیں۔ "یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے..." اور پھر ایک لمبی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولیں۔

"ارے وہی تمھاری دلاری..." رمناماں پر کھانسی کا ایک زوردار دورہ پڑا۔ ان کی آنکھیں اُبل پڑیں‘ آنکھوں میں آنسوؤں کی بدلیاں رقص کرنے لگیں۔

ہبرامنیم بابو نے چونک کر اپنی بیوی کے چہرے کی جانب دیکھا‘ جیسے پوچھ رہی ہوں "کیا بات ہے ...؟" ان کے چہرے پر فکر و تردد کی لکیریں ابھر آئیں اور اسی تگ و دو میں کافی وقت گزر گیا۔ وہ چونک اٹھے‘ گھر کا بڑا دروازہ کھول کر تنہا لان میں نکل آئے۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں دیکھا‘ بنگلے کے سامنے سے گزرتی سڑک دور تک سنسان پڑی تھی۔ یکا یک پھر کسی کتے کے رونے کی دردناک آواز ابھری۔ اور ان کی بھٹکتی ہوئی نگاہیں لان سے گزرتی ہوئی سامنے بڑے پھاٹک کے پاس جا کر رک گئیں۔ کسی جانور کے پنجوں سے پھاٹک کو کھکھورنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ انھیں اپنے کندھوں پہ کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ مڑ کر دیکھا رمناماں ان کی بیوی پیچھے کھڑی تھیں۔ انھیں اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ واپس اندر جاتے ہوئے مڑ مڑ کر پیچھے پھاٹک کی جانب دیکھ رہے تھے۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے سوالیہ نگاہوں سے رمناماں کی جانب دیکھا۔ رمناماں نے صبح کی ساری واردات ان کے گوش گزار کر دی۔ وہ تڑپ اٹھے‘ کتے کے رونے کی آواز اب بھی ان کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ اور پھر اسی ادھیڑ بن میں سوتے جاگتے صبح ہو گئی۔

آج اتوار کا دن تھا۔ ہفتے کا سب سے اہم دن یعنی چھٹی کا دن گھر کے تمام افراد ناشتے سے فارغ ہو کر ڈرائینگ روم میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ہبرامنیم بابو آج بے حد خوش تھے۔ ان کا بڑا بیٹا راموکل ہی دہلی سے آیا تھا وہ وہاں ایک بڑی فرم میں

کمپیوٹر انجینیر تھا۔ ان کی دونوں بڑی بیٹیاں مدراس سے معہ اپنے بچوں کے کل رات ہی آئی تھیں۔ ایک مدت بعد گھر کے اس ویران خاموش ماحول میں جیسے زندگی لوٹ آئی تھی۔ بچوں کی دھما چوکڑی نے گھر کو رونق بخش دی تھی۔

''ماں ساوتری... ساوتری دکھائی نہیں دے رہی ہے..... ؟ کہیں گئی ہے کیا.....؟'' بڑی بیٹی نے پوچھا۔

''رامو ادھر اُدھر دیکھتا ہوا ماں سے مخاطب۔'' ماں اسے تمیز سکھاؤ..... ہم سب اتنی دور سے آئے ہیں اور شاہزادی کو ہماری فکر ہی نہیں...... ارے ہم اس کے بھائی ہیں کوئی غیر نہیں.....''

''تو تو جانتا ہے بیٹے کہ وہ کتنی سنجیدہ اور تنہائی پسند ہے۔ یہ فطرت بچپن سے اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ پھر آج بھلا وہ کیسے.....؟'' رمنا ماں نے خاموش ہو کر بیٹے کی جانب دیکھا۔

''ماں وہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن اروِن کے گھر والوں کے سامنے.... میرا مطلب ان کے سامنے اتنی سنجیدگی اور لاپرواہی اچھی نہیں...... وہ لوگ رشتے کے لیے آرہے ہیں..... کوئی بے جان گڑیا خریدنے نہیں ...'' رامو نے اپنی ماں کو بغور دیکھا۔

''بیٹے مانا کہ ساوتری کی فطرت الگ سی ہے.... لیکن ہے تو کوالی فائڈ..... حالات کے مطابق وہ خود بخود ڈھل جائے گی.....'' سبرامنیم بابو نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''پپا بڑے بھیا کا مطلب.....'' سبرامنیم بابو نے مڑ کر اپنی دوسری بیٹی کی جانب گھور کر دیکھا۔ اس نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ساوتری کو ان کے سامنے اپنی خوش مزاجی اور فری ہونے کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔'' بڑی بیٹی اپنی باتوں پر زور دیتی ہوئی بولی۔

اور عین اسی وقت جب یہ باتیں ہو رہی تھیں ڈرائنگ روم میں ساوتری داخل ہوئی۔ تمام افراد پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتی ہوئی ماں کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتی ہوئی دھیمی آواز میں بولی:

''میں نے تمھیں صاف صاف بتا دیا ہے..... اگر اس کے بعد بھی تم سب اپنی ضد پر اڑے رہے تو.....؟''

''کیوں بیٹی کیا خیال ہے...؟ رامو نے تیرے رشتے کے لیے بات کی ہے۔ لڑکا ڈاکٹر ہے..... اعلیٰ خاندان سے ہے..... وہ لوگ آج ہی آرہے ہیں۔ ان کے سامنے ذرا خوش مزاجی کا مظاہرہ کرنا..... بس اور کیا..... باقی سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' سبرامنیم بابو نہایت خلوص بھرے انداز میں بیٹی سے مخاطب ہوئے۔

''پپا بھیا سے کہیے وہ اپنی فکر کریں... مجھے شادی وادی قطعی نہیں کرنی..... میں نے دوسرے شہر کے ایک گرلز کالج میں نوکری کے لیے اپلائی کیا تھا... انٹرویو بھی اچھا گیا ہے... زیادہ امید ہے نوکری ہو جائے گی۔'' وہ غصیلی آواز میں بولی۔

ساوتری لڑکا اچھا ہے... نوکری میں کیا رکھا ہے... سنا ہے سال دو سال میں امریکہ چلا جائے گا... ساتھ میں تجھے بھی لے جائے گا... ارے تیری زندگی بن جائے گی پگلی...'' وہ پیار سے بولا۔

''میں اپنی زندگی بناؤں گی... مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں...'' وہ پیر پٹکتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ تمام لوگ بھونچکے سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

اسے نوکری Join کرنے کے لیے Apointment Letter موصول ہوا تھا۔ وہ اس دن بے حد خوش تھی۔ ماں کو گلے لگایا۔ پتا کو چہک کر یہ خوش خبری دی۔

''بیٹی یہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن تو پردیس میں اکیلی کیسے رہے گی....؟'' سبرانیم بابو نے فکر مندانہ انداز میں اس سے پوچھا۔

رمنا ماں نے اسے بغور دیکھا' ان کی نگاہوں کے سامنے گزشتہ دنوں کے وہ واقعات گھوم گئے۔

''بیٹی دوسرے شہر میں بیماری، پریشانی...... بہت ساری باتیں ہوتی ہیں..... ایسے حالات میں یہ چودہ پندرہ سالہ سینو بھلا تیری کیا مدد کرے گا۔؟ اور پھر اس کے میٹرک کا امتحان سر پر ہے...؟''

''میں خود اسے اپنی دیکھ ریکھ میں میٹرک کروا دونگی۔'' ساوتری نے اپنی بات کو وزن دیتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی بیٹی پردیس.... پردیس ہی ہوتا ہے...'' رمنا ماں غم گین لہجے میں بولی۔

''ماں کیوں پریشان ہوتی ہو...؟ جس کا کوئی نہیں' اس کا بھگوان ہوتا ہے...'' وہ اچھلتی کودتی سرونٹس کوارٹر کی جانب دوڑی۔

اس روز وہ بے حد خوش تھی۔ وہ اپنے آپ میں نہ تھی۔ گھر کے تمام افراد کی بات ٹھکرا کر وہ دوسرے شہر کے لیے روانہ ہوگئی' اپنے ہمراہ سینو کو بھی لیتی گئی۔ دو دنوں بعد اس نے نوکری جوائن کر لی۔

وقت اپنے پر پھیلائے پرواز کرتا رہا۔ اور ساوتری کی حرکتیں اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ اس کی عجیب و غریب حرکتوں نے وقت سے قبل ہی نوعمر سینو کو جوان کر دیا۔ وہ کالج جاتی اور سینو دن بھر ٹی۔ وی میں غرق رہتا۔ کھانا کھا کر فرصت کے اوقات میں جنسیاتی رسائل کی ورق گردانی کرتا اور محظوظ ہوتا۔

ساوتری ہر ماہ پابندی سے جنسیاتی رسائل خرید کر لاتی اسے دکھاتی۔ اور اسے Sex کی باریکیوں سے روشناس کراتی۔ ہفتے کا روز ان دونوں کے جشن کا ہوتا۔ وہ دن بھر کھانا کھا کر آرام کرتے اور رات کی تاریکی میں کینڈل لائٹ جلا کر عجیب تماشے میں ڈوب جاتے۔ سینو کے ہاتھ میں ہنٹر ہوتا اور ساوتری برہنہ کمرے میں ادھر سے اُدھر دوڑنے لگتی۔ وہ نہایت ہوشیاری سے ہنٹر اس کے جسم پر برسانے لگتا۔ ہنٹر کے ہر ضرب کے ساتھ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سسکیاں آزاد ہوتیں۔ اس کی آنکھیں کسی شرابی کی مانند چڑھ جاتیں۔ جسم کا ہر عضو پھڑ کنے لگتا اور تب اس لمحہ سینو بھوکے بھیڑیے کی مانند اس کے برہنہ جسم پر ٹوٹ پڑتا۔ جذبات سے مغلوب ساوتری کے منہ سے جوش بھری سسکیاں آزاد ہوتیں۔ وہ اس کی باہوں میں بن پانی کی مچھلی کی مانند تڑپنے لگتی اور پھر چند لمحوں بعد نڈھال سی پلنگ پر لڑھک جاتی اور منہ سے تھکی ہوئی کراہیں نکلتی رہتیں۔ دوسری طرف سینو بھی مردہ چھپکلی کی مانند پلنگ پر اوندھا جاتا۔ اس کے منہ سے بھی لمبی لمبی تھکی ہوئی سی آوازیں اور اکھڑی سانسیں آزاد

ہوتیں۔ ساری رات وہ دونوں اپنی دنیا میں گم رہتے' جانے کب وہ نیند کی وادیوں میں کھو جاتے۔ صبح کی سفیدی پھیلتے ہی وہ دونوں اپنے روز مرہ کے کاموں میں مشغول ہو جاتے۔

یہ باتیں ان کی زندگی کے معمول میں شامل ہو گئیں۔

ادھر چند دنوں سے ساوتری سینو کے اندر ایک نئی تبدیلی محسوس کرنے لگی تھی۔ اب اس میں وہ جوش و خروش نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اکثر خاموش خاموش سا جانے کون سی سوچ میں غرق رہتا۔ ایک روز اس نے سینو کو پڑوس کی ایک نوجوان لڑکی سے بات کرتے دیکھ لیا۔ وہ بے حد ناراض ہوئی اسے خوب تخت و ست سنایا۔

دوسری صبح جب اس نے آنکھیں کھولی تو دیکھا اس کی بغل سے سینو غائب ہے۔ وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ نگاہیں ادھر اُدھر دوڑ ائیں۔ اور پھر نگاہیں اس کے سرہانے ایک تہہ کی ہوئی چٹھی پر آ کر مرکوز ہو گئیں۔ اس نے لپک کر چٹھی اُٹھائی۔ وہ سینو کی تھی۔ اسے کھول کر وہ پڑھنے لگی۔

"ڈیڈی !

میں آپ کو چھوڑ کر بغل والی روزی کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ باسی کھانا کھاتے کھاتے میں اوب گیا تھا۔ تازہ کھانے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔" "سینو"

اسے سینو پر بے حد غصہ آیا۔ چٹھی پڑھ کر کھڑکی سے باہر پھینک دی، بے چینی و پریشانی کے عالم میں وہ کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگی، ٹہلتے ٹہلتے اچانک اس کی نگاہ دیوار کے ایک کونے میں لٹکے ہوئے مکڑی کے جالے میں اُلجھ گئی۔ اس نے دیکھا اس جالے میں ایک پھنسی ہوئی مکھی اپنی جان کی امان کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور مکڑی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھری اور ذہن کے نہاں خانے میں ایک کوندا لپکا۔ اور اس کے ہونٹوں پہ ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے قدم ٹیلی فون کی طرف بڑھے، اس نے کریڈل سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کسی نے ریسیور اٹھا کر کہا "ہیلو......پولیس اسٹیشن.........؟"

........☆........

ANWAR IMAM, Road No. 10, Holding No. 89
Jawaharnagar, P.O. Azadnagar, Jamshedpur - 832110
JHARKHAND. Mob. : 09931163152

شہرِ اشتراک

حیرت انگیز واقعات سے لبریز ایک اطالوی کہانی

اُونچے خواب بنے عذاب

● مسیمو بونیٹم پیلی

ترجمہ: رفیق شاہین

پتہ نہیں مجھے دنیا میں لاتے وقت خالق کائنات نے میرے سینے میں ایک غیر معمولی حساس دل (Super Sensitive Heart) کیوں نصب کرنا ضروری خیال کیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج میرا شمار اطالیہ کے اَرب پتیوں میں ہوتا۔ اور اس بات میں کوئی مبالغہ بھی نہیں کہ چند روز دولت مجھ پر خوب مہربان رہی تھی مگر جس شے کی بدولت یہ میرے قدموں میں آئی تھی اسی شے کے سبب ہاتھ سے نکل بھی گئی اور مجھے اس سے محروم ہونا پڑا۔ دراصل میری فلم ''مقتول کا انتقام'' کی باکس آفس پر حیرت انگیز اور غیر معمولی کامیابی نے اچانک ہی مجھ پر دولت کے دروازے کھول دیئے تھے۔ میری اوقات سے بڑھ کر دولت میرے ہاتھ لگی تھی اور میں راتوں رات امیر وکبیر بن گیا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ ''اولمپس آف موو ی لینڈ'' کے بینر تلے بننے والی اس ایک ہی فلم کے ذریعے میں ایک ہی چھلانگ میں کامیابی کی سب سے بُلند چوٹی پر بیٹھ گیا۔ اب قسمت ہی آڑے آجائے تو انسان کیا کرسکتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اور میں اپنی بدنصیبی کے سبب پھر سے وہیں جا پہنچا جہاں سے کہ میں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

یہ بات تب کی ہے جب میں اطالیہ کے معروف قصبے ''کلابریا'' میں مقیم تھا۔ ایک دن کی بات ہے میں قصبے کے ایک کیفے میں کسی بے ادب ویٹر کو ڈانٹ پلا رہا تھا کہ تبھی میز پر بیٹھا ایک اجنبی میرے قریب آکر مجھ سے مخاطب ہوگیا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے خالص امریکی لب ولہجے میں کہا:

''میں ڈمب ہے ''کلیسٹیل فلم کمپنی'' کا ڈائریکٹر ہوں۔ میں نے آپکو ویٹر کو ڈانٹتے بہ غور سُنا اور دیکھا ہے۔

آپ کی آواز کی خوش آہنگی اور چہرے کے قوی تاثرات سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ ایک سپر اسٹار فلمی ہیرو ثابت ہو سکتے ہیں۔" اس نے مزید کہا۔۔۔ "اپنی فلم "مقتول کا انتقام" کے لیے مجھے ہیرو میں جن صلاحیتوں اور خوبیوں کی تلاش تھی وہ سب کی سب آپ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔" اس نے یہ بھی وضاحت کی کہ فلم کی کہانی ایک ناول سے مستعار لی گئی ہے اور وہ خود بھی کہانی سے میل کھاتے ماحول اور موزوں مناظر (Location) کی تلاش میں یہاں آیا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے مجھے فلم کا کلیدی اور مرکزی کردار ادا کرنے کی پیشکش کی اور معقول معاوضہ پیش کرنے کا وعدہ بھی کیا تو بنا کسی پس وپیش کے میں نے فلم میں کام کرنا قبول کر لیا۔

پھر کچھ ہی دن کے بعد جب کام شروع کرنے کی غرض سے ہم لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور کہانی مجھے پڑھنے کے لیے پیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ مجھے کہانی کے ہیرو مسٹر "کاریڈو" کا رول پلے کرنا ہوگا۔ کاریڈو جزیرہ "سسلی" سے تعلق رکھنے والا معصوم تو تھا ہی ساتھ ہی وہ بڑا وجیہ اور جاذب نظر نوجوان بھی تھا جس میں موجود اس کے دل کا ہر جذبہ اور ہر طرح کا جذبہ اپنے اندر ایک انتہا لیے ہوئے تھا۔ محبوب سے رومان کے موقعے پر وہ جوشِ جنوں سے بھڑکتا ہوا خوفناک پاگل اور ایک جنسی وحشی جیسا بن جاتا تھا اور محبوبہ کے بھائی کی مخالفت میں آتشِ انتقام میں جلتا سلگتا ہوا ایک خونخوار درندہ اور ایک بے درد قاتل جیسا نظر آنے لگتا تھا۔

کاریڈو کے مزاج کی یہی انتہا پسندی، یہی آتشِ غضب، یہی وحشت، یہی درندگی اور یہی سنگ دلی میں اپنے وجود میں اپنی ذات میں اور رگ رگ میں پوری طرح پیوست کر چکا تھا اور آپ میں، میں نہیں رہا تھا اب میں صرف اور صرف کاکوریڈو تھا۔ ناول اور کہانی کا وہ کاریڈو جو فرضی کردار تھا مگر اب وہ میرے اندر اتر کر ایک جیتی جاگتی حقیقت میں ڈھل چکا تھا۔

کہانی میں کاریڈو متضاد تجربات واحساسات سے گزرتا ہے۔ کبھی محبت، کبھی نفرت، کبھی قتل، کبھی قید، کبھی قید سے فرار۔ کبھی ازدواجی زندگی کی الجھنیں، تو کبھی والدین کا غم اور آخر میں دماغی انتشار و خلفشار کے ناقابلِ برداشت حالات میں اقدامِ خودکشی اور نتیجتاً حاصل ہونے والی اذیت ناک موت۔

افتتاحی مہورت کے بعد فلم کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ فلم کے سین فلم بند ہوتے وقت مجھے شدت سے محسوس ہوتا تھا کہ میں ہی حقیقی ہوں۔ یہ کہانی کے ہیرو کے نہیں بلکہ میرے اپنے حقیقی جذبات ہیں اور میں یہ سب کچھ فلم کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کر رہا ہوں۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ فرضی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ فلم کا ایک منظر فلم بند ہو جانے کے بعد بھی میں اپنے جذبات کے طوفان سے آزاد نہ ہو پاتا تھا جس سے اگلا سین کرنا میرے لیے ناممکن ہو جاتا لہٰذا میرے اعصاب سے پہلے سین کے تاثرات صاف ہونے کے انتظار میں شوٹنگ رد کر دی جاتی تھی۔ اس طرح کام میں حاصل ہونے والے وقفوں کے سبب کام میں تاخیر تو ضرور ہوتی تھی لیکن کام کا معیار اپنی بلندی پر نظر آتا تھا۔ کاریڈو کے لیے کی گئی میری اداکاری پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ میری شاندار اور معیاری اداکاری کا کمال دیکھ کر نہ صرف ہدایت کار اور کیمرہ مین نے میری تعریف کی بلکہ اسٹاف میں موجود ایک ایک شخص

نے میری طرزِ اداکاری کو دل کھول کر سراہا۔

اب تک کارڈیو کا ایزل پر منظر پینٹ کرنا اور اُس کی محبوبہ "روزالی" سے اُس کی پہلی ملاقات کے منظر ہی عکس بند کیے گئے تھے۔

اگلا منظر روزالی کے بھائی کا تھا جو ہیرو ہیروئن کی آپسی محبت کے حوالے سے کارڈیو کا مخالف بن کر سامنے آتا ہے۔ جیسے ہی مجھے اس کے مخالفانہ رویے کا علم ہوا قہر و غضب، شدید نفرت اور غصّے کی آگ میں جل کر اور ایک خونخوار وحشی درندے میں ڈھل کر میں اس کردار پر بری طرح ٹوٹ پڑا جو روزالی کے بھائی کا کردار نبھا رہا تھا۔ میرا قہر و غضب اور کھولتا ہوا غصہ دکھاوٹی اور فرضی نہیں بلکہ حقیقی تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ سین مکمل ہو گیا اور کوئی ناخوشگوار واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔

اگلا منظر روزالی کے اغوا کا تھا جسے مجھے انجام دینا تھا۔ "اسٹارٹ" کی آواز کانوں میں پڑتے ہی میں نے روزالی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹا اور اُسے اُٹھائے ہوئے کیمرے کے لینس کے سامنے سے گذرا اور بھاگنے لگا۔ مجھ میں عجیب سا جوش بھرا ہوا تھا۔ طبیعت میں ہیجان تھا اور جذبات پوری طرح برانگیختہ ہو چکے تھے۔ کیمرے کی نظر کے حصار کو توڑ کر میں بہت دور نکل آیا تھا اور اب بھی دیوانہ وار بھاگے ہی چلا جا رہا تھا۔ میرے پیچھے اب فلم کا اسٹاف بھی دوڑ لگا رہا تھا۔ میری گرفت میں بے بس اداکارہ جو روزالی کا رول کر رہی تھی خوفزدہ ہو کر اب بری طرح چیخ چلا رہی تھی۔ میں نے اس کی چیخوں اور تعاقب میں لگے اسٹاف کی ہائے توبہ پر ذرا بھی دھیان نہ دیا۔ میں ہیروئن کو گود میں اُٹھائے ایک بلند ٹیلے پر چڑھ گیا اور وہاں موجود اُسے ایک جھاڑی میں پٹک دیا۔ اب وہاں اسٹاف والے بھی پہنچ گئے جنھوں نے مجھے تہذیب و شائستگی کے اصولوں کی یاددہانی کرا کے معاملے کو رفع دفع کر دیا۔

اگلے منظر میں مجھے روزالی کے بھائی کا خون کرنا تھا۔ یہ بڑا وقت طلب منظر تھا۔ میرے اندر شدید نفرت اور بے لگام غصّے کا جہنم بھڑکا ہوا تھا۔ میری آنکھوں سے چنگاریاں اور منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ میرے سر پر پوری طرح خون سوار تھا۔ میں اپنی محبت کے دشمن کو فنا کے گھاٹ اُتار دینے پر تُلا ہوا تھا۔ اس کا قتل ہی جیسے میری زندگی کا اصل مقصد بن چکا تھا۔ شیشم کی تیل پی ہوئی موٹی لمبی لاٹھی جس کے سرے پر لوہے کا مُٹھ جڑا ہوا تھا میرے دونوں ہاتھوں میں تنی ہوئی تھی اس سے پہلے کہ لاٹھی کی ضرب سے میں اس کی کھوپڑی کے ٹکڑے بکھیر دوں اسٹاف کے لوگوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ مجھ پر قابو حاصل کرنے میں بڑی مشکل سے کامیاب ہوئے۔

انھوں نے مجھے ایک نرسنگ ہوم میں داخل کر دیا۔ وہاں بستر پر دراز غصّے اور نفرت کے بھڑکتے شعلوں میں گھرا میں ہفتوں جلتا رہا۔ ایسا بھی نہیں کہ میں واقعی پاگل ہو گیا ہوں۔ میں اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ وہ اداکار جو روزالی کے بھائی کا کردار نبھا رہا تھا وہ "مالادی ایالا" (وہ ہیروئن جو روزالی کا کردار نبھا رہی تھی) کا حقیقی بھائی نہیں تھا اور اگر میں "مالادی ایالا" سے دن میں دو بار بھی شادی کرتا تو اس کی صحت میں کوئی فرق نہ

پڑتا۔اس کے باوجود بھی کارڈیو کی اس سے نفرت اور شدید غصہ میرے دل ودماغ اور رگ وپے میں بڑی طرح سرایت کیے ہوئے تھا۔میں کارڈیو نہیں ہوں یہ بات کسی طرح بھی میرے دماغ میں نہیں بیٹھ پا رہی تھی۔

بہرکیف نرسنگ ہوم سے شفایاب ہوکر میں پھر شوٹنگ پر پہنچ گیا۔وہاں روزالی کے بھائی کا خون کرنے والا منظر اب مجھے نہیں کرنا پڑا۔جتنا سین میں کر چکا تھا اس سے اگلا سین لاٹھی کا ولن کے سر کو چھونا،سر سے خون بہنا،ولن کا چکرا کر اور لہرا کر فرش پر گرنا،تڑپنا اور مر جانا جیسے سین انھوں نے فلمی تکنیک اور کیمرے کی ٹرک کی مدد سے خود ہی عکس بند کر لیے تھے۔اب اگلا سین فلمایا جانا تھا۔سین تھا پولس کا مجھے گھیر کر گرفت میں لینا۔ڈنڈوں سے پیٹنا،گھسیٹنا اور جیل میں لے جا کر مجھے کال کوٹھری میں ڈھکیل دینا وغیرہ۔یہ سارے منظر میں نے بہ حُسن وخوبی عکس بند کرا دیئے تھے۔

کارڈیو کی قید بامشقت کی سزا کا تیرہ سالہ طویل عرصہ ہفتے کے دن کی ایک صبح میں ہی فلم میں پورا کر کے دکھا دیا گیا تھا۔

اب لمبے آرام اور خوب کھائے پیے ہونے کے سبب میں جسم میں بڑی فرحت اور تروتازگی محسوس کر رہا تھا۔اب مجھے قید سے فرار ہونے والا منظر عکس بند کرانا تھا۔میں چوکنا ہوکر بڑے پُراسرار ڈھنگ سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے قید خانے کے ایک پرانے ٹاور پر چڑھ گیا۔وہاں میں نے ایک ہُک میں بل کھائی چادر کی گانٹھ باندھی اور بٹی ہوئی چادر کو دیوار کی دوسری جانب اچھال دیا۔اور پھر خود بھی اسی چادر پر پھسلتا ہوا قید خانے کے باہر پہنچ گیا۔وہاں زمین پر قدم پڑتے ہی میرا دل خوشی سے بلّیوں اُچھلنے لگا۔جوشِ مسرّت کے عالم میں میں نے اپنے دونوں بازو کیمرے کے سامنے پھیلا دیئے پھر زور زور سے سانس لے کر پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھری۔آسمان پر نظریں جمائیں اور آزادی کے خوشگوار احساس سے جھومتا ہوا صحرائے بے کنار کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

رُک جاؤ—''میرے ہدایت کار نے چلّا کر کہا:

''اب اپنے اوپر تھکن طاری کرنے کی کوشش کرو۔''

اتنا سنتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے دھوپ میں تپتے صحرا کا نہ جانے کتنا لمبا سفر طے کر چکا ہوں۔میں تھکن سے بُری طرح نڈھال تھا۔بے جان اعضا میرا ساتھ نہ دے سکے۔یکا یک بے جان ہو میری ٹانگیں بری طرح لڑکھڑا گئیں اور میں وہیں زمین بوس ہو گیا۔

''بہت خوب!قابلِ تعریف اور شاندار۔''تعریف کرنے کے بعد ہدایت کار نے مجھے پھر ہدایت کی:

''فاقہ زدگی کی حالت میں آجاؤ—''

ایکا ایکی میں کسی فاقہ زدہ انسان کی طرح بھوک سے تڑپنے لگا۔میری آنتیں میرے پیٹ میں بری طرح اینٹھ رہی تھیں۔مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کوئی سوراخ زدہ غبارہ ہوں۔اندر سے اک دم خالی اور میرے ہاتھ پیروں سے جان نکل رہی ہے۔میں نے اپنا پیٹ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور منہ کے بل زمین پر ڈھیر

ہو گیا۔ اس پر کوئی بھاگا بھاگا میرے نزدیک آیا اور میرے بازو تھام کر مجھے اٹھانے کی کوشش کی مگر اپنے پیروں پر مجھ سے کھڑا نہ ہوا گیا۔ میں نحیف سی بے جان آواز میں بڑبڑایا:

''کھانا لاؤ۔ جلدی لاؤ۔ میں بھوک سے مرنے والا ہوں۔''

وہ لوگ بھاگے بھاگے کینٹین پہنچے اور بہت سارا کھانا میرے آگے چُن دیا۔ میں کھانے پر پاگلوں کی طرح جھپٹ پڑا۔ کھانے پر میرے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے۔ اور کھانے پر میں جلدی جلدی منہ مار رہا تھا۔ میں کھاتو کم ہی رہا تھا۔ کھانا نگل زیادہ رہا تھا۔ آخر میں جیسے تیسے میری بھوک مٹی۔ دراصل قید سے رہا ہونے کے بعد تپتے صحرا میں میری زبوں حالی اور فاقہ کشی کے منظر فلمائے جاتے رہے تھے۔ میرے ڈائریکٹر نے میری اداکاری کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو تم نے فاقہ کشی اور بھوک کے تاثرات پیش کیے بڑے حقیقی تھے۔ میں اس منظر سے تمھارے چہرے کے کچھ کلوزاپ لینا چاہتا ہوں۔ کیا تم دوبارہ یہ سین کرنا پسند کرو گے؟''

میں نے جلدی سے آخری لقمہ حلق کے نیچے اُتارا اور کیمرے کے سامنے تین فٹ کی دوری پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اب میرے چہرے سے کچھ نیچے دو گلیزنگ شیٹس (Glazing Sheets) لگا دی گئیں جس کی چمک سے میرا چہرا اک دم دمک اُٹھا۔

ناگاہ مجھ پر پھر سے بھوک طاری ہوگئی۔ پیٹ میں آنتیں بل کھانے اور اینٹھنے لگیں اور میری وہی حالت ہوگئی جو اس سے پہلے ہوئی تھی۔

''بہت اچھے...... بہت اچھے'' ڈائریکٹر نے تعریف کی۔ ''اچھے اِفیکٹس (Effects) دیے ہیں۔''

مجھے ڈائریکٹر کی تعریف سنائی نہیں پڑی۔ میرے لیے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بھوک سے میرا جسم قطعاً بے جان ہو چکا تھا۔ میں زمین پر پڑا اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا پیٹ تھامے بری طرح تڑپ رہا تھا۔

''کھانا............ کھانا'' بہ دِقت میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ انھوں نے اس بار پھر کھانا میرے آگے رکھ دیا اور میں پھر فاقہ زدوں کی طرح اس پر بُری طرح ٹوٹ پڑا اور وحشی کتوں کی طرح کھانے کو بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔

اب میں کارڈیو کی مصیبتوں کے مزید واقعات بیان کر کے آپ کو بور نہیں کروں گا۔ اس کا زہریلی گولیاں نگل کر خودکشی کرنا اور تڑپ تڑپ کر کرب انگیز اور اذیت ناک موت مرنا ایسا بھیانک منظر پیش کرتے ہیں جن کو تصور میں لا کر مجھے خود ہی اپنی حالت تباہ کرنا گوارا نہیں ہے کیونکہ یہ سین کرتے وقت مجھے خود بھی کارڈیو کی اذیت ناک موت کا دردناک عذاب جھیلنا پڑا اور میں جیسا کہ جاں کنی کی ناقابلِ بیان تکلیف سے دوچار ہوا تھا۔ اس کے برعکس اب میں ان حیرت انگیز واقعات کو بیان کرنا زیادہ پسند کروں گا جو فلم بن چکنے اور خاص طور پر فلم ریلیز ہونے کے بعد ظہور پذیر ہوئے۔ یہ ایسے حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین واقعات ہیں کہ یہ عجیب وغریب

واقعات اگر کسی دوسرے نے مجھے بتائے ہوتے تو غالباً ان پر میں کبھی یقین نہ کرتا مگر اب اس لیے یقین کرنے پر مجبور ہوں کہ ان واقعات کا میں خود بھی ایک حصہ ہوں اور یہ واقعات میری آپ بیتی میں شامل ہیں۔

فلم بن چکنے کے بعد تھکن تو مجھ پر مطلق بھی طاری نہیں ہوئی البتہ میں ڈپریشن (Depression) میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کہ میں اندر سے اک دم خالی خالی سا ہو گیا ہوں۔ میرے اندر خلا ہی خلا ہے۔ فلم تکمیل کو پہنچتے ہی جس طرح فنکار لوگ یہاں آئے تھے اُسی طرح رخصت بھی ہو گئے۔ امریکن ڈائریکٹر بھی اپنے سازوسامان کے ساتھ چلا گیا تھا لیکن جاتے وقت وہ مجھے ایک بڑی رقم کی تھیلی دینا نہیں بھولا۔ تھا اس نے وعدہ کیا تھا کہ فلم کی پہلی کاپی کے حقوق فروخت ہونے پر وہ مجھے اور بھی بہت کچھ پیش کرے گا۔ اُس نے اس فلم سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔

وقت گزرتا رہا اور میں سبھی کچھ بھول گیا مگر میرے اندر کا خالی خالی پن ہنوز برقرار تھا۔ نہ مجھ میں اَب کوئی احساس تھا اور نہ ہی کوئی خواہش۔ اِدھر کچھ دنوں سے میرے اعصاب میں اینٹھن ہونے لگی تھی اور لگتا تھا بس مجھے دورہ پڑنے ہی والا ہے۔ پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد جیسے سب کچھ ٹھیک ہو جاتا تھا۔ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ یہ جاننا میری عقل و فہم سے بالاتر تھا۔

پھر ماہ ستمبر کے پہلے ہفتے میں مجھے ڈاک سے امریکی ڈائریکٹر کا نامہ مخلوص موصول ہوا۔ اُس نے لکھا تھا کہ اس وقت وہ اٹلی کے شہر ''روم'' میں ہے۔ اس فلم کے متعلق بھی لکھا تھا کہ ایڈٹ ہونے کے بعد یہ توقع سے بھی بڑھ چڑھ کر شاندار اور جاندار فلم ثابت ہوئی ہے اور اب اس کا صرف تماش بینوں تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا ہے۔

آخر میں اس نے یہ بھی مطلع کیا تھا کہ ''اسی مہینے کی پندرہ تاریخ کو ڈسٹری بیوٹرس (Distributers) کو فلم کا ٹرائل شو دکھایا جائے گا چنانچہ میں بھی وہاں پہنچ کر اس تقریب میں شامل ہو جاؤں تاکہ فلم کی کامیابی کا خوشگوار منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔''

خط پڑھ کر نہ مجھے خوشی محسوس ہوئی اور نہ غم کیونکہ میرے اندر کے خالی پن نے مجھے ہر طرح کے احساس سے محروم کیا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں کسی کی پیدائش یا موت کی خبر بھی میرے لیے ایک ہی جیسی تھی۔ چند دن کے بعد خط لکھ کر میں نے وہاں پہنچنے سے معذرت کر لی کہ میں بہ امر مجبوری اس تقریب میں شرکت نہ کر سکوں گا لیکن اپنے اس خط کے برعکس میں چودہ تاریخ کو ٹرین میں سوار ہو گیا اور پانچ سو میل کا فاصلہ عبور کر کے شہر روم پہنچ گیا۔ ڈائریکٹر نے مجھے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔ میں نے بہت چاہا بہت کوشش کی کہ اس بے حسی اور لاتعلقی کے نادیدہ حصار کو توڑ کر مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دوں مگر ناکام ہو کر اس کی طرف ایسے ہی دیکھتا رہا جیسے کہ ایک اجنبی دوسرے اجنبی کی طرف دیکھتا ہے۔ اتنا ہی نہیں میں نے بڑے کھردرے اور خشک لہجے میں اُس سے یہ بھی کہا کہ وہ یہاں کسی سے بھی میرا تعارف کرانے کی کوشش نہ کرے۔

ہم لوگ ایک ساتھ ایک بڑے ہال میں داخل ہو گئے۔ میں دَور دیوار سے لگ کر چپ چاپ ایک

تاریک گوشے میں بیٹھ گیا۔ ہال میں ہمارے علاوہ بیس فلم کے تقسیم کار موجود تھے جو ڈائریکٹر کی دعوت پر یہاں تشریف لائے ہوئے تھے اور اس وقت ہال کی وسطی نشستوں پر دراز تھے۔

بتی گُل کردی گئی اور اس کے ساتھ اچانک ہی فلم ''مقتول کا انتقام'' سے پردۂ سیمیں جلوہ بار ہو اٹھا۔ اب کاریڈو کی کہانی کا آغاز ہو چکا تھا جسے دلچسپی نہ ہونے کے سبب میں نے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ پھر ابتدائی چند منظر پردے سے گزرنے کے بعد جیسے ہی کاریڈو پردے پر جلوہ گر ہوا کوئی شے ایکا ایکی میرے وجود میں اُتر کر اچھل کود کرنے لگی اور جو خلا کی کیفیت میں اپنے اندر بہت دنوں سے محسوس کر رہا تھا وہ اچانک ہی دور ہو گئی۔ اس وقت میری حالت ایک ایسے انسان کی سی تھی جو لمبے عرصے بیہوش رہ کر اچانک ہی ہوش میں آ گیا ہو۔ لیکن ایسا احساس مجھے لمحے بھر کے لیے ہی ہوا تھا اور یہ اس وقت ہوا جب کاریڈو ایزل پر بیٹھا سامنے کے منظر کو کاغذ پر منتقل کرنے میں مصروف تھا اور یہ کاریڈو میں خود تھا۔ پھر جب وہ روزالی کے حسن و شباب کی رعنائیوں میں گم رومانی جذبات سے سرشار سا نظر آیا تو وہی سارے جذبات، حسن کا نشہ، خماری و سرشاری اور مستی و بدمستی جیسی ساری کیفیتیں اپنی بھرپور قوت کے ساتھ میرے اندر متحرک ہو اٹھی تھیں اور میری یہ حیرت اس وقت تو اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب جوشِ جذبات سے مغلوب ہو کر روزالی کو اپنی بانہوں میں باندھنے اور اس کے شفق گلگوں رخساروں کو چومنے کے لیے میرے بے قرار بازو آپ ہی آپ ہوا میں دراز ہو گئے۔ میرے پیاسے ہونٹ بری طرح پھڑک رہے تھے مگر یہ کیفیت بھی عارضی ثابت ہوئی۔ مجھے لگا چڑیا پنجرے سے اُڑ چکی ہے اور پھر سے میں پہلے کی طرح خالی ڈبہ خالی بوتل بن گیا ہوں۔ ایک دم خالی خالی۔

اور پھر جیسے ہی کاریڈو کا روزالی کے بھائی سے نفرت والا سین پردے پر نمودار ہوا میرے دل میں شدید غصّے اور ہیجان خیز نفرت کا کھولتا ہوا لاوا سا بھڑک اُٹھا اور اس طرح کاریڈو کی بیس سالہ زندگی کے تمام دکھ سکھ اور تمام کلفتیں اور اذیتیں جو دو مہینے کی شوٹنگ کے دوران فلم کی شکل میں محفوظ ہو چکی تھیں، وہ سب کی سب کاریڈو کے وسیلے سے متحرک ہو کر اب مجھے ہال میں بیٹھ کر جھیلنی پڑ رہی تھیں۔ پھر فلم کے آخری حصّے میں جب کاریڈو کا زہر کی گولیاں نگل کر تڑپ تڑپ اٹھنے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والا انتہائی اذیت ناک سین پردے پر جلوہ گر ہوا تو میں کرسی سے گر پڑا۔ میں زمین پر پڑا بری طرح تڑپ رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے میرے ہونٹ اور گلا خشک تھے۔ آنکھیں حلقوں سے باہر نکل پڑی تھیں اور جیسے ہزاروں بچھو میری آنتوں میں اور سارے جسم میں اپنے زہریلے ڈنک پیوست کر کے مجھے ناقابلِ بیان اذیت میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔ جاں کنی کا عالم تھا اور بس میری جان ہی نکلنا اب باقی رہ گیا تھا۔ آنکھوں میں اندھیرا تھا۔ سر چکرا رہا تھا اور بری طرح دم گھٹ رہا تھا۔ ہچکیوں پر ہچکیاں آ رہی تھیں۔

پھر اچانک ہی ہال میں قمقمے روشن ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی میں پہلے جیسا ہو گیا ایک دم سپاٹ اور خالی خالی۔ فلم ختم ہوتے ہی فلم کے تقسیم کاروں نے ڈائریکٹر کو چاروں طرف سے محاصرے میں لے لیا اور اسے

بڑی گرمجوشی کے ساتھ مبارکباد پیش کرنے لگے۔ موقعہ غنیمت جان کر میں ہال کے بغلی دروازے سے باہر نکل آیا اور ٹیکسی کر کے اپنے اسی ہوٹل میں پہنچ گیا جہاں کہ میں مقیم تھا۔

اسی شام مجھے تلاش کرتا ہوا ڈائریکٹر میرے ہوٹل پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ تقسیم کار فلم سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور "ملان"، "روم" اور "پیرس" کے لیے تین پرنٹ ہاتھ کے ہاتھ فروخت ہو چکے ہیں۔ آنے والے پیر کے دن سے فلم روم کے شاندار تھیٹر "اسپلینڈر" (Splendor) میں ریلیز ہونے جا رہی ہے۔ یہ چند ہی روز میں ملان شہر میں بھی دکھائی جائے گی۔

پھر اس نے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی میرے کوٹ کی جیب میں ٹھونس دی اور فوراً ہی سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ دوسرے دن وہ پھر حاضر ہوا اور دو نئی فلموں کے کنٹریکٹ مجھ سے سائن کرائے اور ڈالرس کی شکل میں بھاری رقم میرے آگے رکھ دی۔

دوسرے دن علی الصبح میں روم کے ریلوے پلیٹ فارم پر کھڑی ٹرین میں سوار ہو کر واپس گھر کے لیے چل دیا۔ میری جسمانی حالت ابھی بھی ویسی کی ویسی ہی تھی یعنی وہی خالی ڈبہ اور خالی بوتل جیسی اور صحتیاب ہونے کے فی الحال کوئی آثار بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔

گھر آکر میں نے اپنی بیماری کی نوعیت پر بڑے غور و خوض سے کام لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میری قوت حس میرے جذبات و احساسات اور زندگی کی تمام حرکت اور ہلچل جیسی ساری توانائی میرے اندر سے نکل کر فلم کی دو کلومیٹر لمبی ریل (Reel) میں منتقل ہو چکی ہے۔ قید ہو چکی ہے۔ اب جب بھی فلم پردے پر آئے گی میرا غیر معمولی حساس دل فلم میں پیش کیے جذبات و احساسات کو جو کہ میرے اپنے ہیں، محسوس کرنا شروع کر دے گا اور فلم میں جو کچھ کارڈیو پر گزری ہے فلم کے چلنے پر وہی سب کچھ مجھ پر بھی گزرنی شروع ہو جائے گی اور ہوا بھی یہی۔

ایک دن جبکہ میں اپنی مطالعہ گاہ میں بیٹھا ہوا تھا ایکا ایکی مجھے محسوس ہوا جیسے کسی پُر فضا اور خوشگوار ماحول میں ایزل پر میں کسی فطری منظر کو نقل کر رہا ہوں اور یہ اس لیے ہوا کہ یہاں سے پانچ سو کلومیٹر دور شہر روم میں تھیٹر "اسپلینڈر" (Splendor) کے اسکرین پر اس وقت کارڈیو سینری پینٹ کر رہا تھا۔ پھر اچانک ہی روزالی کے حسن و شباب سے جذباتی مسرت، نشہ، مستی، برانگیختگی، غصہ و نفرت، قہر و غضب قید اور قید سے فرار جیسے سارے واقعات جو اس وقت روم میں تھیٹر کے پردے پر دکھائے جا رہے تھے ان سب کا بھرپور اطلاق مجھ پر یہاں گھر بیٹھے ہو رہا تھا۔ محبت کی لطافت اور شہوانی جذبات کی برانگیختگی کے طوفانی بہاو میں بہہ کر میں بے خود سا ہوا جا رہا تھا کہ کچھ ہی دیر کے بعد میں ایک غضیلے اور وحشی درندے میں تبدیل ہو گیا۔ میرے حلق سے خوفناک آوازیں اور منہ سے جھاگ بہنے لگے۔ پھر ذہنی انتشار اور خلفشار کے عالم میں بے جان دیوار پر پیشانی ٹکائے میں سسک سسک کر رو رہا تھا۔ یہ فلم کا وہی منظر تھا جس میں کارڈیو کو دیواروں سے لپٹ کر روتے دیکھ کر اس کی بیٹی خوف سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔ اب کہانی کے آخری موڑ پر میں زمین پر پڑا بڑی جان لیوا اذیت کے عالم میں

مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ زہر کی گولیاں میرے اندر اپنا کام دکھا رہی تھیں اور میں جاں کنی کے عالم سے گزر رہا تھا۔ موت سے پہلے کا کارڈیو کی جاں کنی کا یہ منظر جسے دیکھ کر روم کے تماش بین محظوظ ہو رہے تھے وہی منظر وہاں سے پانچ سو کلومیٹر کی دوری پر یہاں موجود حقیقی طور پر میں پلے کر رہا تھا یعنی اس وقت جو کچھ بھی فلم میں ہو رہا تھا وہ سب کچھ مجھ پر یہاں گزر رہا تھا۔ لگاتار دو گھنٹے تک یہ فلم روم میں چلی اور میرے ساتھ یہی سب کچھ ہوتا رہا۔ اس کے بعد فلم کا دوسرا شو شروع ہو گیا اور میں پھر سے واقعات کے ساتھ جڑتا چلا گیا۔ شام کے چار بجے سے رات کے دو بجے تک چار شو مکمل ہوتے تھے۔ ایک ساتھ چار ہالوں میں فلم چل رہی تھی اور میں ایک دن میں چار چار بار کارڈیو کی موت کا جان لیوا عذاب جھیلنے پر مجبور تھا۔ ایسا بھیانک عذاب تو کسی عظیم گنہگار نے جہنم میں بھی نہ جھیلا ہوگا جو میں خدا کی بنائی ہوئی اس زمین پر جھیل رہا تھا۔ اور یہ سب میرے غیر معمولی حساس دل کی بدولت انجام پا رہا تھا۔

اگلے دن ریلوے اسٹیشن پر میں نے ٹرین پکڑی اور پھر سے روم پہنچ گیا۔ سفر اختیار کرتے وقت میں نے خاص طور پر اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا تھا کہ دورانِ سفر کا وقت فلم شو کے اوقات سے ہٹ کر ہو تاکہ سفر کی حالت میں میرا وجود مسافروں کی نظر میں تماشہ بن کر نہ رہ جائے۔

شہر کا معروف ماہر نفسیات جس سے علاج کی خاطر میں یہاں روم آیا ہوا تھا اس نے میرے کیس میں بڑی غیر معمولی توجہ کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے کہا مجھے اس کے پاس روز آنا ہوگا۔ دراصل وہ یہ چیک کرنے کا خواہاں تھا کہ فلم کے واقعات کا میری حرکات وسکنات اور جذبات واحسات پر کیا اثر پڑتا ہے۔

اور پھر اُس دن جبکہ میں اپنے معالج کی مطالعہ گاہ میں بیٹھا ہوا تھا فلم میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات نے مجھے اپنے حلقۂ بازو میں لے کر کہنا شروع کر دیا یہ فلم شہر "ملان" اور شہر "روم" میں ایک ساتھ دکھائی جا رہی تھی۔ دونوں فلموں کے شو میں وقت کے تھوڑے فرق کی وجہ سے دونوں فلموں میں واقعات کی ترتیب میں فرق پیدا ہو گیا تھا۔ ایک ہال میں پیچھے کے واقعات گردش کر رہے تھے تو دوسرے ہال میں آگے کے واقعات رونما ہو رہے تھے جس کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ایک ہی وقت میں مجھ پر دو متضاد کیفیتیں طاری ہونا شروع ہو گئیں۔ روم کی فلم میں اگر میں روزالی کے بھائی کے سر پر لاٹھی تانے ہوئے تھا تو اسی وقت ملان شہر کی فلم میں قید و بند سے رہائی پانے کے لیے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اسی طرح روم شہر کی فلم میں بٹی ہوئی چادر کی مدد سے قید سے فرار ہو رہا تھا تو ملان کی فلم میں زمین پر تڑپتے ہوئے موت کی ہچکیاں لے رہا تھا۔ غرض یہ کہ دو متضاد کیفیتوں کے تصادم کے سبب میرا جسم کسی بھی حرکت کو مکمل طور پر قبول نہ کر پانے کی وجہ سے صرف اینٹھ کر اور پھڑ پھڑا کر رہ جاتا تھا۔ مگر جب ملان کی فلم کا شو ختم ہو گیا اور روم کی فلم رہ گئی تو اس کے زیر اثر ہو کر میں نے زمین پر گر کر اور تڑپ تڑپ کر موت کا منظر عملی طور پر دہرانا شروع کر دیا۔

رات کے دو بجے روم کا فلم شو ختم ہونے پر میرے اسپیشلسٹ معالج نے مجھ سے کہا— "آؤ ذرا باہر

کی تازہ ہوا کا لطف لیا جائے۔"

اور میں اس کے پیچھے ہولیا۔

اب مجھے اپنے امریکن ڈائریکٹر کی تلاش تھی۔ وہ مجھے "پلازہ کولونا" میں ملا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ اُس نے مسکراہٹ کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور بنا تمہید باندھے شروع ہوگیا:

"آپ کو معلوم ہے فلم کے دس اور پرنٹ فروخت ہو چکے ہیں۔ کچھ امریکہ میں اور کچھ سویڈن میں۔ چند ہی روز میں یہ فلم وہاں کے بہت سے ہالوں میں ایک ساتھ دکھائی جائے گی۔"

اتنا سنتے ہی میرے چہرے پر ہیبت اور دہشت طاری ہوگئی۔ بے ساختہ میرے منہ سے بڑی بھیانک چیخ نکلی اور میں تیورا کر زمین پر گرتے ہی بے ہوش ہوگیا۔

میری بیماری میری سمجھ میں تو پہلے ہی آچکی تھی اور اب تو اس کا علاج بھی سمجھ میں آگیا ہے چنانچہ اپنا علاج میں نے خود ہی کیا ہے اور خدا کے فضل سے اب شفایاب بھی ہو چکا ہوں۔ آپ کہیں گے کیسے؟ تو سنیے میں نے فلم "مقتول کا انتقام" کے سارے حقوق ساری کاپیاں اور ان کے نگیٹو خرید کر انھیں تباہ کر دیا ہے۔

قربان جاؤں میں اپنے اس فرشتہ صفت ڈائریکٹر کے کہ اس بے چارے شرافت کے پُتلے نے مجھے اس جہنمی عذاب سے بچانے کے لیے مالی طور پر اپنے آپ کو تباہ و برباد کر ڈالا ہے اور دولت کی ہمالیائی چوٹی پر پہنچنے کے بعد وہ غریب پھر سے زمین پر آگیا ہے۔ اب وہ لاکھوں ڈالر کا مقروض ہے اور اس کا فلمی کیریر بھی پوری طرح چوپٹ ہو چکا ہے۔ اس نے فلم کی کہانی کو منحوس قرار دیکر اور اُسے اب کبھی نہ بنانے کا فیصلہ کر کے کہانی کا اسکرپٹ بھی نذر آتش کر دیا ہے اور وہ آج کل بیمار ہے۔ اس کے برعکس وقت اور محبت کے علاوہ مالی اعتبار سے میرا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ لگے ہاتھوں اب یہ بھی واضح کروں کہ فلم کے حقوق خریدنے لائق سرمایہ میرے پاس بالکل بھی نہیں تھا۔ اگر چہ ڈائریکٹر نے مجھے معقول رقم دی تھی مگر فلم کے حقوق خریدنے لائق تو وہ بالکل بھی نہ تھی، بچ تھی لہٰذا مصیبت سے جان چھڑانے اور بڑی رقم حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنا غیر معمولی حساس دل (Super Sensitive Heart) جو میری موت کے بعد ان کا ہوگا ایک میڈیکل کالج کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ اس سودے بازی میں میرے مشفق معالج کی کرم فرمائی بھی شامل رہی ہے۔ انھی کے اس مشورے پر کہ میرے دل کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے حیرت انگیز انکشافات روشنی میں آئیں گے میڈیکل کالج نے میرے دل کی خریداری منظور کر کے مجھے خطیر رقم ادا کی تھی۔

اب آپ لوگ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میڈیکل کالج سے ملنے والی وہ رقم اور اپنے ڈائریکٹر کی دی ہوئی رقم خرچ کر کے ہی میں نے فلم کے سارے حقوق اپنے نام کرائے تھے تبھی میری گلوخلاصی اس جہنمی عذاب سے ممکن ہوئی ہے۔

........☆........

نظمیں

پیش رو نظمیں

ندا فاضلی / شاہین / ارمان نجمی

ہم عصر نظمیں

راشد جمال فاروقی / پروین شیر / کہکشاں تبسم

رباعیات

ناوک حمزہ پوری

● ندا فاضلی

(۱)

آدمی نہیں کہتے

روز چھپ کے شاخوں میں
جلتے تپتے سورج کی
آگ کو جو پیتا ہے
اور کچھ نہیں کہتا
اس کو پیڑ کہتے ہیں
ٹیڑھے میڑھے جنگل میں
روز جو گڈریے کے
آگے پیچھے چلتی ہے
اور کچھ نہیں کہتی
اس کو بھیڑ کہتے ہیں
بے زبان پیڑوں کو
گھاس چرتی بھیڑوں کو
زندگی تو کہتے ہیں
آدمی نہیں کہتے

(۲)

اتفاق

ندی، پہاڑ، پیڑ، پھل
ہوا، چراغ، پھول، جل
یہ میرا آج تیرا کل
یہاں ہے جو بھی جس طرح
وہ ایک اتفاق ہے
اس اتفاق میں کسی کا دخل ہے
نہ روپ ہے
جو چھاؤں ہے تو چھاؤں ہے
جو دھوپ ہے تو دھوپ ہے
ببول کیوں ببول ہے
پتہ نہیں
گلاب کیوں گلاب ہے
پتہ نہیں
انار کیوں انار ہے
پتہ نہیں۔
پتہ نہیں ہے جس کا وہی
وجہ افتراق ہے
مگر یہ فرق
جو ہمارے بیچ کا نفاق
یہی کبھی وصال ہے
یہی کبھی فراق ہے

(۳)

جنریشن گیپ

صبح جب اخبار نے مجھ سے کہا
زندگی!
جینا بہت دشوار ہے
سرحدیں پھر
شور غل کرنے لگیں
جنگ لڑنے کے لیے تیار ہے
درمیاں تھا
جو خدا
وہ اب کہاں
آدمی سے آدمی بے زار ہے
پاس آ کر میرے
بچے نے کہا
آپ کے ہاتھوں میں جو اخبار ہے
اس میں پہلے کا نیا بازار ہے
ہاتھی
گھوڑا!
شیر
سب ہو گئے وہاں
ایسے دن ہر روز آتے ہیں کہاں
ہاف ڈے ہے آج
کل اتوار ہے

(۴)

کتابوں کی دکاں

یہ رستہ ہے وہی
تم کہہ رہے ہو
یہاں تو پہلے جیسا کچھ نہیں ہے
درختوں پر
نہ وہ چالاک بندر
شرارت کرتے رہتے تھے جو اکثر
نہ طاقوں میں چھپے
صوفی کبوتر
تلاوت کرتے رہتے تھے جو دن بھر
نہ کڑوا نیم املی کے برابر
جو گھر گھر گھومتا تھا
'وید' بن کر
کئی دن بعد تم آئے ہو شاید!
یہ سورج چاند والا
بوڑھا اَمبر
بدل دیتا ہے چہرہ ہو یا منظر
یہ عالی شان ہوٹل ہے جہاں پر
یہاں پہلے کتابوں کی
دکاں تھی

(۵)

نیند پورے بستر میں نہیں ہوتی

نیند پورے بستر میں نہیں ہوتی
وہ پلنگ کے ایک کونے میں
دائیں
یا بائیں
کسی مخصوص تکیے کی
توڑ موڑ میں چھپی ہوتی ہے
جب تکیے اور گردن میں
سمجھوتہ ہو جاتا ہے
تو آدمی
چین سے سو جاتا ہے

Sunrise Apartments 201-B,
Aram Nagar, Versova, Andheri,
Mumbai- 400061, Mob. :
09869487139

● شاہین (کینیڈا)

گیلا کاغذ

تراشیدہ ستاروں میں
ہمارے ہجرت آمادہ پرندے اُڑ رہے ہیں
قدم اپنی زمیں پر سے اُکھڑتے جا رہے ہیں
ارادے گیلے کاغذ کی طرح کمزور پڑتے جا
رہے ہیں
مگر ہم اس بھیانک خواب کی سی کیفیت سے
لوٹ آنے پر
خلوصِ دل سے خود کو ڈھونڈ لاتے ہیں

وہ دن آئے نہیں ہیں
پھر بھی اُن کے بے شکن، شاداب سائے
ناچتے ہیں اُن فضاؤں میں
جو پس منظر کے آئینے میں تیزی سے
گزرتے جا رہے ہیں
ہم اندر کے کھنڈر کے خالی پن میں
کاخ و کو تعمیر کرتے جا رہے ہیں
جو شاید پھر کھنڈر بن جائیں
لیکن اپنے اس آٹھوں پہر کے کھیل کو
جاری ہی رہنا ہے
کہ ہم نے زندگی سے
اپنی شریانوں کی گرہیں باندھ رکھی ہیں

● ارمان نجمی

(۱)

پناہ

دن کتنی جلدی بیت گیا

کرنوں نے جال سمیٹ لیے

شاخوں میں دھواں لہرانے لگا

سورج کی تمازت بجھنے لگی

برفانی ہواؤں کے جھونکے

دیوار بدن میں گڑنے لگے

ڈھلوانوں سے گلّے تھکے ہوئے

بستی کی جانب بڑھنے لگے

دیدار کے قابل کچھ نہ بچا

سب کھیل تماشے ختم ہوئے

اب واپس اپنے گھر کو چلیں

وہیں رات کی زد سے بچنا ہے

نئی صبح کا رستہ تکنا ہے

(۲)

امرت

اے جنگل کی شاداب فضا

اے تسکیں سے معمور ہوا

تو صبحِ ازل سے وابستہ

ترا عہدِ قدیم سے ہے رشتہ

شبنم سے دھلی صبحیں تیری

چہکار بھری شامیں تیری

تری مٹی میں سچا سونا

تو اندر باہر اک جیسا

تو اپنی جگہ محدود نہیں

ترے محور میں شامل ہے زمیں

کچھ اپنے وجود کا صدقہ دے

مجھے صبر سے جینا سکھلا دے

مری روح کے ویرانے میں اُتر

سانسوں میں سما رگ رگ میں بکھر

اے کاش میں تجھ سا ہو جاؤں

تری رنگت خود میں جذب کروں

ماحول کا سارا زہر پیوں

دنیا کو امرت دیتا رہوں

● راشد جمال فاروقی

مکالمہ

اتنی گہری چپ سے تو کوئی بھی گونگا ہو سکتا ہے
دیواروں سے بات کرو
پیڑوں سے بولو
خود سے کافی بول چکے اوروں سے بولو
اتنی چپ سے چہرے کے اعصاب جکڑ کر رہ
جائیں گے
ہنسو!
خود اپنی حماقتوں پر ہنسو
بہت کھل کر ہنس ڈالو
خواب نہیں دیکھے!؟
کب سے ایسا ہے؟
پھر تم زندہ ہی کیسے ہو؟
خواب تو سانسیں لینے جیسا کام ہے بھائی
خواب نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے
سر میں سودا سما گیا ہے!؟
یہ اچھا ہے
فکر کی کوئی بات نہیں ہے
اب تو خواب بھی دیکھو گے تم
بولو گے بھی

● پروین شیر (کینیڈا)

(۱)

عجب الجھن کے زنداں میں

بلا کا حبس ہے، تاریکیاں ہیں، سب
دریچے بند ہیں تازہ ہوا بے چین ہے پیہم
وہ اپنا سر پٹکتی ہے
یہ کہتی ہے
.....دریچے کھول دو، اندر تو آنے دو
نکالوں حبس کے زنداں سے میں تم کو.........
دبے قدموں اتر کر چاند اپنا ہاتھ دروازے
پہ رکھ کر منتظر ہے اس کے کھلنے کا
کہ آ کر تیرگی کے ناچتے افعی
کا اونچا سر کچل ڈالے !
دریچہ کھول دینے میں
یہ خدشہ بھی تو لاحق ہے
رو پہلی چاندنی کے ساتھ ہی
تازہ ہوا کی بند مٹھی میں
کہیں کیڑے مکوڑے
بے جھجک اندر نہ آ جائیں...!!

(۲)

مکمّل تصویر

مکتب میں بچے بیٹھے ہیں
پزل (puzzle) کے رنگیں ٹکڑے لے کر
ڈھونڈ رہے ہیں
کون ہے کس کا خانہ
کیسے گتھی سلجھے؟
لیکن ان کی پیہم کوشش بے معنی ہے
وہ ان ٹکڑوں کو ہر بار غلط خانوں میں
رکھ دیتے ہیں!
ناداں بچے کیسے سمجھیں؟
دنیا کے مکتب میں پزل کے
ہر ٹکڑے کا اپنا اپنا
اک خانہ ہے
جن میں سما کے
بے معنی بکھرے ٹکڑے با معنی ہونگے
تب پوری تصویر بنے گی!!

(۳)

مختلف رنگ

وہاں خاشاک سے لپٹی
گلی کی گرد اوڑھے پھول
ننگے پاؤں، ننگے سر
ادھورے اور بوسیدہ لباسوں میں بھٹکتے ہیں
وہ یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے تن پہ سہتے ہیں
یہاں مخمل کے غالیچے ہیں
ابریشم کی بانہیں ہیں
زمستاں میں
یہ آتش دان کے خوش رنگ
لہراتے ہوئے شعلے
مجھے آسودگی کی تھپکیاں دیتے ہیں، لیکن یہ
خلش، یہ درد، یہ بے چینیاں کیسی؟
کہ کاغذ پر قلم رکھے ہوئے
میں کب سے بیٹھی ہوں
مگر میرے قلم کا خون سارا منجمد ہے اور
مرے الفاظ کے سارے پرندے سو گئے ہیں اب
پریشاں ہو کے شعلوں کے حوالے
میں نے آخر کر دیا اپنے قلم اور کورے کاغذ کو
بہت ہی مختلف اب ہو گئے ہیں
رنگ شعلوں کے!!

(۴)

سلاخیں چیختی ہیں

سلاخیں چیختی ہیں سوزِ غم سے
آج بھی تھامے ہوئے اس کی
لرزتی انگلیوں کے ہر نشاں
زنداں کی پتھریلی فصیلیں سسکیاں لیتی ہیں
جیسے سر جھکائے بے کسی کے جال میں
اب بھی کوئی رنجور بیٹھا ہے
مگر راسخ صداقت کی صدا اس کی زباں پر ہے!
کہ اس کے عزمِ محکم کی توانائی کے آگے
یہ فصیلیں بے حقیقت ہیں
سلاخیں آج بھی دل گیر ہیں
وہ تک رہی ہیں بھیگتی آنکھوں سے
اس کی انگلیوں کے سب نشاں پیہم!
(روبن آئلینڈ، ساؤتھ افریقہ میں نیلسن مینڈیلا
کا جیل دیکھ کر)

128- Vineland Crescent
Winnipeg R 3 Y I T C
Manitoba Canada

(۵)

یہ خبر تھی کسے؟

زندگی تو فقط ایک قطرہ نہ تھی
پھر بھی میں نے اُسی میں
وجودو تشخص کے سارے سمندر اُنڈیلے اُسے
بے کراں کر دیا!
آج میں
خشک مٹی پہ رنجور بیٹھی ہوئی
دیکھتی ہوں کہ اطراف کتنے چمکتے ہوئے
اور بھی قطرۂ زیست ہیں
اب مگر
میرے سارے سمندر تو کام آ چکے ہیں
جو ان میں سما کر انھیں بوند سے
ایک ساگر کی گہرائیاں بخش دیں
میں نچوڑوں بھی خود کو اگر
کچھ بھی حاصل نہ ہوگا انھیں
زندگی تو فقط ایک قطرہ نہ تھی
یہ خبر تھی کسے.....؟

کہکشاں تبسّم

(۱)

سنو مری جاں

وہ درد بھی تھا سوا حدوں سے......
تمھاری آمد کا جس میں مژدہ چھپا ہوا تھا
وہ درد رگ رگ کی چیخ بن کر صدا ہوا تھا
تو آنکھ خوشیوں سے نم ہوئی تھی
زباں سے شکرِ خدا تھا نکلا
زمیں کا ٹکڑا جو زیرِ پا تھا
ہوا تھا جنت
کہ اپنی تکمیل پر ہوئی تھی میں سر بہ سجدہ......!
مگر مری جاں......
وہ خواب موسم گزر چکا ہے
ہزار راتوں کے رتجگوں کا حساب کیسا......؟
جسے کہ اپنے لہو سے سینچا
شجر بنایا
وہ میرا کب تھا......؟
عذاب کیسے اتر رہے ہیں
یا خواب آنکھوں میں مر رہے ہیں
رفاقتوں میں یہ ہجرتوں کی مہک گھلی کیوں......؟
مسافتوں میں تھکن سی کیوں جسم و جاں میں اتری......؟
کوئی بتائے......
کہ گود بھرنے کے بعد خالی یہ ہاتھ کیوں ہیں......؟
یہ کیسا چہرہ ہے زندگی کا......؟
لبوں پہ حرفِ دعا ہے ساکت......
غبار آنکھوں میں بھر چکے ہیں
وہ خواب موسم گزر چکے ہیں
کہ جس کو بننے میں عمر کاٹی......!!
میں پھر سے اک بار درد لہروں کی زد میں ٹھہری
یہ سوچتی ہوں
نوید لاتا ہو کوئی لمحہ
پلٹ کے آئیں وہ پاؤں جس کے لیے زمیں ہوں
کوئی پکارے کہ میں یہیں ہوں
نہیں ہے............کوئی صدا نہیں ہے
نہ کوئی آہٹ/سنو مری جاں............/یہ درد اب کے سوا ہے حد سے............!!!

(۲)

پشیمانی تری شاید

یہ ملزم کی طرح سے کون آتا ہے
دبے پاؤں
مرا سایہ......؟
نہیں......
یہ اور کوئی ہے
پشیمانی تری شائد......
معافی چاہتی ہے کیا......؟
ہاں......وہی تو ہے
نہیں تو منہ چھپائے' ہاتھ جوڑے
کون آئے گا
جھکے سر سے بھلا پاؤں پہ گرنے کو
سوا تیرے......!!

(۳)

نادیدہ منظر

سناٹے کی چیخ سی تھی......
ٹیس اٹھی تھی دل میں شاید
کوئی سایہ' کوئی آہٹ
کچھ بھی نہیں تھا
ہاں......اک ان دیکھے خوف میں جکڑی
میری چپ پتھرائی ہوئی سی
سناٹا کیوں چیخ پڑا تھا......!!

C/o : Z.I. Rizvi, Dept. of Urdu,
Sabaur College, Bhagalpur,
Mob. : 08651449489

(۴)

کروٹن

کروٹن کے ہرے پودے
ہوائیں جس کی شاخوں میں
الجھ کر گنگناتی ہیں
مدھر نغمے سناتی ہیں
سنہری دھوپ کی کرنیں
لپٹتی ہیں گلے جس کے
ٹپکتی اوس کا بوسہ
ہری شاخوں کے رخساروں پہ ہو لرزاں
مگر اک سچ ہے نیزہ سا
رگوں کو چھیدتا رہتا
سدا سرسبز پودوں کے
دکھوں کی ہے خبر کس کو
کہ رت کوئی بھی اس کی شاخ پر آئے
نہیں کھلتے کبھی غنچے......!!

(۵)

دن یوں بیتے

چاند کا گوٹا
چاند کی کرنیں
امّاں نے اوڑھنی میں ٹانکیں
بٹیا کے آنچل سجنے کا خواب تھا کیسا
جھلمل، جھلمل
جگمگ، جگمگ
چپکے چپکے دن یوں بیتے
زینہ زینہ
لمحہ لمحہ
چاندنی اتری بالوں پر......!!

ناوک حمزہ پوری

(۱)

اللہ رگ و پے میں ہُوا ٹھنڈا خون
دل ہے نہ دماغ اب نہ باقی ہے جنون
غلطاں غلطاں ھمی رَوم تا لبِ گور
یعنی نافذ ہوگا فطری قانون

(۲)

صد شکر کہ ہر شاخ ثمر دار ہوئی
صد شکر کہ ہر فکر گہر بار ہوئی
جب جھیل چکی صعوبتِ قید صدف
ہر فکر کی بوند دُرِ شہوار ہوئی

(۳)

تا عُمر رہا بن کے اجالوں کا نقیب
لیکن اب تک تو لکھ سکا ہوں تشبیب
باقی ہے گریز و مقصدِ اصلی بھی
ہے مُوئی ضعیف العمری اپنی رقیب

(۴)

ہو مال تو اب بھی ہیں خریدار بہت
سر ہو جو میسّر تو ہیں دستار بہت
یوسف ہی جو عنقا ہوں تو ناوکؔ صاحب
کیا سود جو ہوں مصر کے بازار بہت

(۵)

ہر گز نہیں کچھ عمرِ گریزاں کا ملال
خوش ہوں کہ نہ پھیلایا کبھی دستِ سوال
خوش ہوں کہ تصانیف ہیں یک صد مرا مال
خوش ہوں کہ نمایاں ہوئے میرے خدوخال

(۶)

ہر چند بہت دشتِ ہنر میں بھٹکا
پیچھا نہ کیا اس کا نہ اُس سے لٹکا
ہو مشرق و مغرب کہ شمال اور جنوب
گُم ہونے کا باقی نہیں کوئی کھٹکا

(۷)

بہتیرے دماغوں میں خلل ہے اب تک
کہتا ہوں رباعی کو تو فرماتے ہیں
پیاری متقارب و رمل ہے اب تک
چلتا ہوا سکّۂ غزل ہے اب تک

(۸)

ہر چند کہ ہوں بس خس و خاشاکِ وطن
ہوں تیرے ہر اک زہر کا تریاک وطن!
اللہ وہ سوزنِ تدبّر دے دے
کر ڈالوں رفو دامنِ صدچاک وطن

نادیدہ بہاروں کے نشاں......

(مکمل ناول)

شائستہ فاخری

جب پرندے پسِ دیوار خزاں بولتے ہیں
دل میں نادیدہ بہاروں کے نشاں بولتے ہیں

——احمد مشتاق

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

جتنے بھی تھے پھول سب رہ گئے ہیں جھلس کر
کسے کیا خبر
گزشتہ کل
روشنی انسانیت کے دل اور وریدوں میں سے گزری
غم واندوہ کی شدت
چاندنی وحشت ناک زردی میں منعکس ہو رہی تھی

ایک مکان آئینہ چشم
دھوپ کو منعکس کر رہا تھا
گل ہائے آسماں
اتر رہے تھے
صبح کی جھلمل روشنی میں
مچھلیاں سطح آب پر تیرتی تھیں
بادل دور
آسماں دور
سمندر دور
لیکن نظروں سے دور ہوتے ہوئے بھی
یہ بتاتے ہیں سب
کہ غبار کی آندھی میں بھی پھول ہیں
بس
موسم گل کا انتظار کرو

(۱)

ایک انتظار، ایک مسکراہٹ جو محبت اور قناعت کی غماز تھی، خواہش کی تکمیل کا سورج بن کر اس وقت اس کے چہرے پر امید کی سنہری کرنوں کی طرح پھیلی تھی۔ اس کا چہرہ روشن تھا اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں اور اسے دیکھتے ہوئے اس کی سہیلی سوچ رہی تھی کہ عورت اور یہ دھرتی ایک دوسرے سے کتنی مشابہت رکھتی ہیں۔ پیار کی ہلکی سی پھوہار اور پانی کی نرم بوچھار سے کتنی جلد سیراب ہو جاتی ہیں۔ عورت اور دھرتی دونوں پر ہی موسم کی شدت کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہ موسم دل کا ہو یا کسی رت کا، ٹھنڈک اپنے شباب پر تھی۔ درختوں سے اتر کر سناٹے سڑکوں پر دوڑنے لگے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ خاموش ہو چکی تھی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے اور وقت سے پہلے ہی اندھیرا گہرا گیا تھا۔ شام کے وقت کا فلسفہ بھی عجیب ہے۔ یوں تو اندھیرے علامت ہیں مایوسیوں کی، تنہائی کی، اکیلے پن کی...... مگر شام کے سائے میں بڑھتے اندھیرے کبھی کبھی سکھ کا پیش خیمہ بھی ہوتے ہیں۔ دن بھر کی تھکی ماندی مخلوق خود کو ان فرصت کے لمحوں کے حوالے کر دیتی ہے۔ دن بھر کی مصروفیات اور زندگی کے ہنگاموں سے آزاد ذہن حالت سکون میں آجاتا ہے۔ کچھ پل ہم اپنے لیے جینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اور ان سب کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی...... شعور کی رو میں سب بہتا چلا جاتا ہے۔ ہاں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان فرصت کے لمحوں میں جب اندھیرے کے پردے گرتے ہیں اور ذہن سے پردے سرک جاتے ہیں تو گزرا ہو دن اور بیتے ہوئے زمانے، دکھ اور سکھ اپنے اور غیروں کے اعمال نامے کھل جاتے ہیں۔ شام کے گہراتے اندھیرے فرصت کے لمحے لاتے تو ہیں مگر رات کی آمد

کسی پیشن گوئی کا اظہار یہ نہیں تھی۔ رات چین سے گزرے گی یا کروٹیں بدلتے مگر آج کی شام اسے یقین تھا کہ وہ سکون کے ساتھ نیند کی آغوش میں گم شدہ خوابوں کی بازیافت کے لیے حسین وادیوں سے گزرے گی۔

وہ لگا تار مسکراتی جا رہی تھی اور اس کی سہیلی اس کی خوشی میں برابر کی شریک تھی۔

گھر کے بالائی حصے میں بنے ہوئے ایک عالیشان کمرے میں یہ دونوں سہیلیاں منصوبہ بندی کے آخری مرحلے میں تھیں۔ مقام طے کیا جا چکا تھا۔ سرتاج ریستوراں کا منی گارڈن۔ جنوری کی چودہ تاریخ، رات آٹھ بجے کی بکنگ فائنل ہو گئی۔ آج سے ٹھیک ایک ہفتے بعد۔۔ دونوں سہیلیاں بیڈ پر آڑی ترچھی پیٹ کے بل لیٹی ہوئی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں کاغذ قلم تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں موبائل جس سے لگا تار وہ کھیل رہی تھی۔ اور پر جوش انداز میں اپنی باتوں سے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

''ہاں تو بتانا کتنے نام ہو گئے؟''

''بیس''

''ان دونوں کو شامل کر لیا نا؟''

''تمھارا حکم جو ٹھہرا تانیہ، ورنہ میں تو ہرگز نہ بلاتی''

ڈاکٹر تانیہ ماتھر کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کر گئی۔

''مائی ڈیر تم بعد میں سمجھو گی کہ انھیں بلانے میں میری کیا مصلحت ہے۔''

''تانیہ ڈیر! میں نے تمھاری صحبت میں آ کر سوچنا اور سمجھنا دونوں چھوڑ دیا ہے۔ بہت سوچ چکی، بہت سمجھ چکی۔ اب جیسا سامنے آئے گا ویسا کروں گی۔''

''شاباش علیزہ! یہ ہوئی نا بات، جب تک گھاٹے کا سودا کرتی رہو گی، نقصان اٹھاتی رہو گی۔ زندگی دل سے جی جاتی ہے مگر زندگی کے فیصلے ذہن سے کیے جاتے ہیں۔ اب تک تم نے دل کی مانی ہے، ایک فیصلہ ذہن سے بھی تو کر کے دیکھو۔''

ڈاکٹر تانیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا اب میں چلتی ہوں۔''

اس وقت اس کے چہرے پر جہاں فاتحانہ ہنسی تھی وہیں علیزہ کی ہنسی میں خود اعتمادی کی لہر تھی۔ اس نے دونوں بانہیں پھیلا کر ڈاکٹر تانیہ کو اپنی بانہوں میں بھرا اور شب بخیر کہہ کر اس کے دائیں گال پر ایک بوسہ دیا۔

ڈاکٹر تانیہ ماتھر چلی گئی۔ اور علیزہ آرام سے بیڈ پر بیٹھی اور پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں الجھا کر اس نے ہاتھ سر کے نیچے لا کر تکیہ سی بنائی اور چت لیٹ گئی۔ آنکھیں چھت پر ٹکی ہوئی تھیں مگر ذہن کہیں خلا میں بھٹک رہا تھا۔ کتنا فرق تھا ان دونوں سہیلیوں میں، ذہنی اعتبار سے دونوں ایک تھیں لیکن مذہبی اعتبار سے اور معاشرتی معیار سے دونوں الگ تھیں۔ پھر بھی دونوں ایک دوسرے کے اتنی ہی قریب تھیں جتنی آنکھ کے قریب کی تل......

(۲)

علیزہ کچھ عرصہ پہلے تک ایک گرلز کالج میں لائبریرین تھی، اور زندگی کی دھوپ چھاؤں سے گزرتی ہوئی تنہا ہی ہر نشیب و فراز کو چپ چاپ کسی طرح طے کرتی جا رہی تھی مگر آج کا دن اس کے لیے بے حد اہم تھا جب اسے

اپنے بوسیدہ ہوتے خوابوں کا ماحصل مل گیا تھا۔ ننھے وجود والے کومل خواب جو ادھورے رہ گئے تھے اور جن کے بیج وقت کی گرداب میں پھنس کر دل کی شاخ سے ٹوٹ کر زمین کی ریتلی مٹی میں گم ہو گئے تھے۔ ہاں یہ وہی خواب تھے جو ٹوٹ کر بھی دل میں چٹکی سی لیتے رہتے۔ خوابوں کی یہ چٹکی علیزہ کی فکر کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑھتی عمر کے ساتھ عورت جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا بند کر دیتی ہے۔ مگر علیزہ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا اور وہ مجبور ہو گئی ایسا قدم اٹھانے پر جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر ثانیہ کی زندگی علیزہ کے برعکس تھی۔ وہ شہر کی مشہور گائنولوجسٹ تھی۔ اپنا نرسنگ ہوم، اپنی گاڑی، اپنا بنگلہ، اپنا شوہر، اپنے بچے زندگی کی ہر دوڑ میں کامیاب۔ ثانیہ اور علیزہ اس وقت سے ایک دوسرے کے قریب رہی ہیں جب فراک اور پینٹی میں بچیاں اپنی گڑیوں کی چوٹیاں گوندھا کرتی ہیں۔ علیزہ ہمیشہ گڑیا کی ماں بنتی تھی جو اسے اچھا لگتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے لباس سل کر گڑیوں کو پہناتا۔ وہ اپنی گڑیا کے لیے جھوٹ موٹ کی ہلکو سیا بھی بنایا کرتی۔ کسی بچے کو روٹی کا نام دے دیتی، کسی ٹھیکرے کو بسکٹ کہہ کر پیار سے گڑیا کو کھلانے کا ناٹک کرتی اور اسے کندھے پر چپکا کر اس طرح ہلکان ہوتی جیسے گڑیا کی طبیعت خراب ہو اور وہ بے حد پریشان ہو رہی ہو۔ ننھے ننھے لفظوں کو بے تکا جوڑ کر وہ لوری گا گا کر اپنی گڑیا کو سلاتی بھی تھی۔ ثانیہ جسے سب پیار سے تنو کہتے تھے اس کا گڈا ہمیشہ الماری میں بند رہتا۔ ہاں جب علیزہ کو گڑیا کی شادی کرنی ہوتی تبھی تنو کا گڈا باہر نکالا جاتا۔ علیزہ کے سلے ہوئے کرتا اور پاجامہ اسے پہنائے جاتے اور پھر جب وداعی کا وقت آتا تو علیزہ سچ مچ رونے لگتی۔ تنو سے زبردستی لڑائی جھگڑا کرتی اور پھر اپنی گڑیا بھی تنو سے چھین کر جھٹ سے لے جا کر بکس میں بند کر دیتی۔ تنو کو گڈے گڑیا کے کھیل میں بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اپنی پیاری سہیلی کے لیے گڈے کی اماں بن جاتی تھی۔

آج کی شام علیزہ روشنی کے سیلاب میں خود کو بہا دینا چاہتی تھی۔ یہ اس کی شعوری کوشش تھی مگر لاشعور اسے اندھیرے کی طرف ڈھکیل رہا تھا جو روشنی کی آڑ میں شیطان کی طرح بیٹھا تھا۔

ثانیہ نے اندھیرے غار سے کھینچ کر اسے اس وقت باہر نکالا تھا جب اس کا دماغ سیلن سے بھری بدبو دار کوٹھری بن چکا تھا جہاں روشنی کی ایک کرن نہیں، تازہ ہوا کا ایک جھونکا نہیں، فکر کی ایک ننھی سی لہر بھی نہیں۔ محض سانسوں کی آمد و رفت کو زندہ رہنے کی دلیل نہیں مانا جا سکتا۔ انسانی بدن کچی مٹی کا وہ گھر ہے جو باہر سے لپا پتا تو دیکھ سکتا ہے مگر اندر سے کہاں کہاں کیا کیا ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے۔ مٹی کہاں کہاں سے جھڑ رہی ہے اور زمین دھنس رہی ہے اس کا اندازہ باہر سے نہیں لگایا جا سکتا۔ ہاں جب حالات اور وقت کا زلزلہ اس بدن کو زمین دوز کرتا ہے تب لوگ سمجھ پاتے ہیں کہ کہیں کچھ رونما ہوا تھا جو وہ نہیں دیکھ سکے۔ داخلی اور خارجی طور پر رونما ہونے والے اس عمل میں علیزہ کتنی بے بس ہو رہی تھی اسے تو دوسروں کی دی ہوئی ٹھوکروں کو سہتے رہنے کی اس طرح عادت ہو گئی تھی جیسے اس جسم پتھر کا ہو اور پانی اس پر جم ہی نہ پا رہا ہو۔

علیزہ اپنی بیڈ پر لیٹی ماضی کی تمام پرتوں کو آج اپنے ناخنوں سے کھرچ دینا چاہتی تھی۔ روشنی کی آڑ میں چھپے اندھیرے کو پامال کر دینا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھیں چھت پر ٹنگی تھیں۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی کی تو بات ہے جب اس کے بدن میں سانسوں کی آمد و رفت تو جاری تھی مگر وہ مردہ ہو چکی تھی۔ اس کے مردہ گھر میں کم سن خوابوں کی بے

شمار لاشیں سڑ رہی تھیں۔ جس کی سرانڈ نے اس کے دماغ کو مفلوج کر دیا تھا۔ اس کی حس کو ختم کر دیا تھا۔ وہ جیتی جاگتی ایسا اشتہار بن گئی تھی جس کی تحریریں وقت کی گرد میں ضائع ہو گئی تھیں۔

انسان اپنے اندرون میں کئی بار مرتا ہے کئی بار جیتا ہے۔ علیزہ جی جی کر مری تھی اور مر مر کر جی رہی تھی مگر اب تصویر کا رخ بدل گیا تھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ علیزہ کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی مگر وہ سونا چاہتی تھی تاکہ صبح تر و تازہ اٹھ سکے۔ ٹھنڈی ہواؤں کا تیز جھونکا اسے پریشان کر رہا تھا وہ کھڑکی کے قریب پہنچی۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ کناروں پر لگے درختوں کی پرچھائیاں کسی عفریتی سائے کی طرح لگ رہی تھیں۔ نیلا دھلا ہوا آسمان، چھٹکے ہوئے تارے، ایسا چمکتا چاند جس کی گول تھال کو بچہ ترچھا نہیں کر سکتا ہے۔ اس نے بے زاری سے کھڑکی کے پٹ بند کیے اور بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ ابھی لیٹے ہوئے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ وہ گہری نیند میں ڈوب گئی جیسے نیند بھی اندھیرے کی طرح پلکوں کی اوٹ میں چھپی بیٹھی ہو۔ کمرے میں نائٹ بلب کی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ نیند میں غافل تھی۔

رات کا درمیانی حصہ تھا۔ علیزہ ایک دردناک چیخ کے ساتھ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نیند، خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ سردی کے باوجود جسم پسینے سے تر تھا۔ کمرے میں گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ شاید بجلی چلی گئی تھی۔ بینائی اندھیرے کو چیرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ علیزہ نے ایمرجنسی لائٹ جلائی، ٹیوب کی روشنی پھیل گئی۔ نائٹ گاؤن کے ایک کونے سے اس نے پسینے سے بھیگے اپنے چہرے کو پونچھا۔ ٹھنڈک کے باوجود جسم میں خوف کی کپکپی تھی۔ وہ خود پر قابو پانے کے لیے آیۃ الکرسی پڑھنے لگی۔

'اف کتنا خوفناک خواب تھا! سوچتے ہی اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے گہری گہری سانس لی۔ کچھ راحت ملی۔ دو چار بار پلکیں جھپکائیں۔ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی مگر آنکھوں کے سامنے بار بار وہ منظر آ جاتا جس میں اس نے دو مردوں کے آگے خود کو برہنہ کیا تھا۔ لیکن وہ دونوں ہی مرد اس کے اپنے تھے اور وہ بھی عریاں تھے۔'

علیزہ نے خواب میں یہی تو دیکھا تھا کہ بٹوارے میں بانٹی گئی زمین کی طرح اس کا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ وہ نڈھال چت پڑی ہے۔ جسم کے داہنے حصے کا کوئی تعلق بائیں حصے سے نہیں ہے اور نہ بایاں داہنے حصے کو چھو رہا ہے۔ سر چہرہ گردن سینہ پسلیاں ناک اور پھر ناف کے نیچے کی نازک سطح تک سب کچھ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ دماغ کے دو حصوں میں بٹتے ہی متضمن فکر اور نتائج کے سلسلے بھی ٹوٹ گئے۔ ذہن کچھ سوچنے سے محروم ہو گیا۔ ناف کے اوپر کا آدھا یوگ اور ناف کے نیچے کا آدھا بھوگ..... تکمیلیت کہیں نہیں۔ تکمیل کی پوری منزل ڈوبتے سورج کے عذاب میں گم ہو چکی تھی۔ اب وہ کاٹھ کی پتلی کی طرح ٹوٹی کئی حصوں میں منقسم پڑی ہوئی ہے۔ آنکھوں کی دونوں پتلیوں کی وسعت سمٹ گئی۔ اب وہ محدود دائرے کو ہی دیکھ سکتی تھی۔ داہنی طرف کی پتلی نے دیکھا کہ اس کے داہنے پہلو میں فرحان مرزا لیٹا ہے اور بائیں پتلی گواہی دے رہی تھی کہ اس کے بائیں پہلو میں اعیان تھا۔ فرحان اس کے داہنے رخسار پر بوسہ دے رہا تھا۔ اس کی انگلیاں گردن سے سرکتی ہوئی اس کی داہنی پستان سے کھیلتی ہوئی ناف کے نیچے کی گھاٹی میں اترتی جا رہی تھیں۔ اور بائیں جانب لیٹا ہوا اعیان اس کے بائیں پیروں کے ناخنوں کو بوسہ دیتا

ہوا اس کی برہنہ ٹانگوں کو چومتا ہوا ناف کے اوپر سے ہو کر پستان کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ چپ چاپ پڑی ہوئی تھی جیسے برف کے نیچے کوئی نرم ہری بھری کونپل بہار کے انتظار میں دم سادھے بیٹھی ہو۔ یہ بے نیازی اور بے بسی کا احساس ہی شاید روح کی آوارگی ہے۔

علیزہ اپنی مٹی کا تماشا دیکھ رہی تھی تبھی آنکھوں کے کناروں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ تقسیم شدہ جسم کے بیچوں بیچ جیتی جاگتی ایک ننھی بچی لیٹی ہے اور ٹکر ٹکر اپنی چمکیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ پیاسی ہے۔ اس کی گلابی گلابی چھوٹی سی زبان ہونٹوں کے درمیان پھسل رہی ہے۔ بچی کو اپنی گود میں لینے کے لیے اس کے دونوں بازوؤں میں لرزہ سا اٹھا۔ دونوں ہاتھ ایک ساتھ بچی کو اٹھانے کے لیے اس کی طرف بڑھے۔ پوری قوت لگا کر اس نے اسے اپنے سینے سے بھینچنا چاہا۔ تبھی وہ بچی بھربھری ریت کی طرح مٹھیوں سے پھسل کر فضا میں تحلیل ہوگئی۔ علیزہ ماہیِ بے آب کی طرح پھڑ پھڑا اٹھی۔ خدا نے خواہشات اور آرزوؤں کا ایک میلہ عورت کے من آنگن میں کیوں بھر دیا۔ اور پھر اس کی تکمیل کا بیڑا خود اپنے ہاتھوں میں لے کر تشنگی اور تلاش کو اس کا مقدر بنا دیا۔ علیزہ پھپھک پھپھک کر رو رہی تھی جیسے کبھی بچپن میں گڑیا کی جدائی کے احساس سے رویا کرتی تھی پھر ایک دردناک چیخ کے ساتھ نیند کی غفلت سے بیدار ہوگئی۔ اپنی ہی آواز سے خوف زدہ ہو کر وہ ہوا کی زد میں آئے ہوئے زرد پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ خوف، تاریکی اور خواب کی دہشت میں اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ چونکہ کمرہ اوپری منزل پر تھا اس لیے نیچے کے حصے میں سونے والے کسی کے کان اس کی چیخ کو نہیں سن سکے، یوں بھی کمرہ بند تھا۔

اف کتنا منحوس تھا یہ خواب اور کتنی خوف ناک ہے یہ رات۔ آج وہ بچی نہیں تھی کہ کوئی اس کی فراک سے اس کے آنسو پونچھ کر چہرہ دھلا دیتا۔ خود ہی رونا اور خود ہی چپ ہو کر جی کو بہلا لینا۔

سونے سے پہلے تو اس نے ایسا کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔ بلکہ آج تو وہ بے حد خوش اور مطمئن تھی مگر یہ بھی کڑوا سچ ہے کہ لاشعور کی آنکھیں شعور کی آنکھوں سے زیادہ دور بیں ہوتی ہیں۔ وہ اکثر ماضی کی قبروں سے ان لمحوں کو بھی کھینچ لاتی ہیں جو بچھو کی طرح ذہن کے سوراخوں سے جھانکتے رہتے ہیں اور ہم ان سوراخوں کو دلائل کی مٹی سے ڈھانپنے کی شعوری کوشش میں مشغول رہتے ہیں۔

علیزہ نے تو کب کا اس سچ کو تسلیم کر لیا تھا کہ رونے کے لیے نہ تو وہ اب کسی کاندھے پر سر رکھے گی اور نہ آنسو پونچھنے کے لیے کسی کا دامن پکڑے گی۔ وہ جانتی تھی کہ ادھار کی مانگی ہوئی خوشیوں کے لیے بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور وہ اپنی غیرت کو گروی رکھنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔

رونے کے بعد جب اس کا جی کچھ ہلکا ہوا تو خود ہی اس نے گلاس کے پانی سے منھ دھویا تب تک بجلی آچکی تھی۔ نائٹ بلب کی نیلی روشنی کمرے میں پھیل گئی۔ پارٹی میں کیا کیا ہونا ہے، وہ کس رنگ کی ساڑی پہنے گی، کس طرح کی جیولری اس پر جچے گی، کون سا ہیر اسٹائل سوٹ کرے گا، ان تمام باتوں کو سوچتے ہوئی وہ دل بہلانے لگی مگر وہ دل ہی کیا جو بہلانے سے بہل جائے۔ اسے تو روئی کی آگ کی طرح سلگتے رہنا ہے۔ جل کر خاک ہونا بہت آسان ہے مگر سلگتے سلگتے جیتے رہنے کی جدوجہد خاک ہونے سے زیادہ مشکل ترین مرحلہ ہے۔ اور علیزہ کے لیے یہ مرحلہ اذیت

ناک نہیں ہوگا یہ وہ جانتی تھی۔ ڈاکٹر تانیہ نے اسے اس بات کا پختہ یقین دلایا تھا اور یہ یقین صرف مفروضہ نہیں تھا۔

علیزہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے اپنے بستر پر کروٹ بدلی اور بیتے دنوں کے ان سنہرے پلوں کو تلاشنے لگی جب اس کے ہونٹوں پر بغیر کسی کوشش اور بنا کسی تصنع کے سچے دل سے مسکراہٹ آ جایا کرتی تھی۔

(۳)

ستاروں سے بھرا گہرا، نیلا آسمان رنگ بدل رہا تھا۔ پھیکے پھیکے سیاہی ڈوبتی جا رہی تھی اور اجلی اجلی سفیدی صبح صادق کا اعلان کر رہی تھی۔ علیزہ کے قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ بابل کی دہلیز ہمیشہ کے لیے پیچھے چھوٹ رہی تھی۔ "کاہے کو بیاہا بدیس ارے لکھیا بابل مورے" گانے کی تیز آواز علیزہ کو بے چین کیے ہوئے تھی۔ یہ وہ گھڑی ہوتی ہے جب لڑکی ترازو کے دونوں پلڑوں پر مستقبل کے دکھ سکھ کے باٹوں کو لے کر نفع نقصان کے سودے سے انجان کمسن خوابوں کی تکمیل کے لیے ایک اجنبی کے بھروسے نئی زندگی، نئے شب و روز کے سفر پر نکل پڑتی ہے۔ وہ بڑی سی سرخ چادر سے لپٹی ہوئی تھی جس کی کناری چوڑے سنہرے گوٹے سے سجی ہوئی تھی۔ بھاری لباس، بھاری زیور اور بھاری بھرکم دھوپ چھاؤں جیسے جذبات اس کے قدموں کو لڑکھڑا رہے تھے تبھی کسی نے آواز دی' ارے بھائی! قرآن پاک تو لاؤ، دلہن کے سر پر سایا کرنا ہے'

......اور پھر پاکیزہ سایے میں وہ رخصت ہو گئی۔ باراتیوں سے بھری بس چند لمحے پہلے ہی آگے روانہ ہو چکی تھی۔ سرخ گلاب اور موگرے کی سفید لڑیوں سے سجی اس کی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ سب کی دعاؤں کے حصار میں اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔

'ارے ذرا ایک گلاس پانی تو دلہن کو پلا دو۔ روتے روتے کہیں بے ہوش نہ ہو جائے' یہ تانیہ کی آواز تھی جس نے ہلتی ڈولتی کپکپاتی سرخ گٹھری کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ علیزہ رو رہی ہے، سسک رہی ہے......اپنے والدین کو یاد کر کے گھٹ رہی ہے۔

نکاح کے بعد تانیہ جب علیزہ کو مبارکباد دینے آئی تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پپوٹے پھڑک رہے تھے۔ اور ہونٹوں سے ہلکی ہلکی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ وہ اپنے امی ابو کو آوازیں دے رہی تھی۔ اس کے ابو کا انتقال تو اسی وقت ہو گیا تھا جب وہ محض دس سال کی بچی تھی۔ اور امی چھ مہینے پہلے ہی کینسر کے مرض میں فوت ہو چکی تھیں۔ بے حد اذیت کے دور سے انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے تھے۔ یہ تو علیزہ جانتی ہے کہ ان راتوں میں جب سب نیند کی غفلت میں ہوتے اور امی تکلیف کی شدت کو برداشت کرنے کے لیے پلنگ پر سکڑی سمٹی اپنے گھٹنے کو سمیٹ کر ماتھے پر چوٹ کیا کرتیں تو علیزہ کتنا تڑپ تڑپ جاتی تھی۔ "کیا کرتی ہیں امی؟ ایسا کر کے تکلیف کم تو نہیں ہو جائے گی؟'

وہ کراہتی ہوئی کہتی۔ 'بیٹی تیرا کیا ہوگا؟'

'کچھ مت سوچیے، سب ٹھیک ہو جائے گا، آپ اچھی ہو جائیں گی۔'

علیزہ کی ماں نے ہی ایک سال پہلے فرحان مرزا سے اس کا رشتہ طے کیا تھا۔ حالانکہ مرزا گھرانہ عزت دار اور دولت مند گھرانہ مانا جاتا تھا مگر انھیں شریف لڑکی کے ساتھ اپنی رشتہ داری میں ہی شادی کرنی تھی۔ فرحان

مرزا کی ماں نے سوچا یتیم لڑکی ہے، کار خیر بھی ہوگا اور ثواب بھی ملے گا۔ وہ علیزہ کے دادیہالی رشتہ دار تھے۔ ایک دن فرحان مرزا کی امی آئیں اور بہت سادگی سے علیزہ کے سر پر سرخ چنری ڈال دی۔ انگوٹھی پہنائی اور شگون کے ایک ہزار ایک ہاتھ پر رکھ کر چلی گئیں۔ فرحان مرزا کی تعلیم مکمل ہوئی تھی اسی دوران کب بریسٹ کینسر کے موذی مرض نے علیزہ کی امی کے جسم کے ایک حصے کو ناسور بنا دیا، اس کا احساس کسی کو ہو نہ سکا۔ شاید اس کی امی کو پہلے بھی تکلیف رہی ہوگی مگر انھوں نے شرم کی وجہ سے یا اپنی تنگ حالی کی وجہ سے یا بیٹی کی شادی ہو جائے پھر سوچا جائے، کے رویے سے خود کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں زندگی اور موت کے بیچ اتنا ہی فاصلہ ہوتا ہے جتنا دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ علیزہ کو کبھی لگتا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور کبھی اس کی سانسیں تھمنے لگتیں کہ بس اب کچھ ہی لمحوں میں سب ختم ہو جائے گا۔ علیزہ کی شادی کا سارا انتظام اس کی امی پہلے ہی کر چکی تھیں۔ کوئی عورت جب بیٹی کو جنم دیتی ہے تو گدے پر سے ہی اس کے سہرے کی کلیاں کھلنے کی دعائیں مانگنے لگتی ہیں۔ اس کی امی بہت دنوں سے ہی تنگ حالی کے باوجود رفتہ رفتہ اس کے لیے پیسے اور سامان جمع کرنے شروع کر دیے تھے۔ اپنے جہیز کا زیادہ تر سامان اسٹور میں بند کر دیا تھا۔ بھاری بھاری تانبے کے برتن، گھڑے پرانی بناوٹ کے زیورات جو اس کی نانی نے بڑے شوق سے گڑھوا کر اپنی بیٹی کو پہنائے تھے اب علیزہ کے جسم کی زینت بن رہے تھے۔ حد تو یہ کہ انھوں نے بچے کام کے لباس بھی بڑی احتیاط کے ساتھ سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ تاکہ کہیں سے کوئی کمی اس کی شادی میں نہ آئے۔
مگر ان دنوں علیزہ کے گھر میں شادی کی خوشیاں نہیں بلکہ موت کے ماتم کی صفیں بچھی رہتیں۔

ساری دوائیں ساری ڈاکٹری ناکام ہو جاتی ہے جب قدرت کا جبر چلتا ہے۔ اب دعاؤں کا سہارا تھا۔ دعائیں کی جا رہی تھیں۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ طرح طرح کے تبصرے کر رہے تھے۔ علیزہ سب کی سن رہی تھی اور اجڑتی ہوئی دنیا دیکھ رہی تھی۔ ایسے میں اگر کوئی پیش پیش رہا ہے، صحیح معنوں میں اگر کوئی مددگار رہی تو وہ تھی تانیہ اور اس کے گھر والے۔ اس کے سسرال والے تو دو بار مہمانوں کی طرح آئے اور چلے گئے۔ وہ سب دیکھ رہی تھی، سمجھ رہی تھی مگر بے بس تھی۔

سورج اپنی دھوپ چھاؤں کی بساط سمیٹ چکا تھا۔ شام کا دھندلکا گہرے اندھیرے میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ صبح سے ہی تانیہ اور اس کے ڈیڈی آئے ہوئے تھے۔ علیزہ سے پھر آنے کے لیے کہ کر وہ بھی چلے گئے۔ آنے جانے والے لوگ بھی مریضہ کی لمبی بیماری کو دیکھ کر شاید یہی سوچ کر کنارے ہو جاتے ہیں کہ جانے والے کے ساتھ چپکا نہیں جا سکتا، کسی کے غم کو اپنا نہیں بنایا جا سکتا۔ اپنے اپنے مقدر کا دکھ درد تو سب کو تنہا تنہا ہی جھیلنا پڑتا ہے۔ علیزہ اور اس کی ماں اکیلی تھی۔ ماں بستر پر درد کی لہروں میں تڑپ رہی تھی۔ علیزہ سے دیکھا نہیں گیا تو اس نے دونوں آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا سرہاں کی پلنگ کی پٹی پر ٹکا ہوا تھا۔ جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ لرزتے آنسو چہرے پر رواں تھے۔ ماں کی زندگی کی دعائیں مانگتے مانگتے جیسے وہ بھی تھک چکی تھی۔ 'یا خدا! میں بھی کتنی خود غرض ہوں، اپنی خاطر امی کی زندگی چاہتی ہوں۔ جب زندگی امی کے ساتھ پہلے ہی دغا کر چکی ہے۔ آپریشن کے بعد وہ ایک پستان کی عورت بن چکی تھی۔ مگر ایسے کا اختتام یہیں پر نہیں ہوا۔ آپریشن کی ناکامی کھل کر سامنے آ گئی۔ کچھ عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو قدرت کی روندی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کے مقدر کی تحریریں آنسوؤں سے لکھی جاتی ہیں۔ اس کی امی کا شمار بھی ان ہی عورتوں میں تھا۔

رات کے درمیانی حصے میں جب علیزہ دعا کے لیے آنچل پھیلائے تھی تو وہی لمحہ دعا کی قبولیت کا بن گیا۔
امی کو قرار آچکا تھا۔ ان کا تڑپتا جسم سکون سے بستر پر پڑا تھا۔ پلکیں بند تھیں اور چہرہ اس طرح معصوم تھا جیسے زندگی کا کوئی درداب بچا ہی نہیں۔ امی ابدی نیند سو گئیں۔ اور علیزہ حالات کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گئی۔ اسے وہی کرنا تھا جو اس سے کہا جاتا۔ امی کے جاتے ہی علیزہ کی زندگی آزاد ہوگئی مگر سوچ پر غلامی کی موٹی زنجیریں چڑھ گئیں۔ اب اس کا ہر فیصلہ دوسروں کو کرنا تھا۔ دوسروں کی مرضی میں ہی اسے اپنی ہاں شامل کرنی تھی۔ رشتے داروں نے ماں کی برسی کا بھی انتظار نہیں کیا اور چھ ماہی کا فاتحہ ہوتے ہی اسے رخصت کر دیا گیا۔ اس کی سسرال کی پشتینی حویلی بارہ بنکی کے پاس ایک گاؤں میں تھی۔ کافی زمین جائداد تھی۔ فرحان کے امی ابو کو گاؤں کی تازہ کھلی فضا میں جینا اچھا لگتا تھا جبکہ وہ لکھنؤ میں خریدے گئے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس وقت علیزہ کی گاڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ چار پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ گاڑی سیاہ تارکول کی سڑک پر تیزی سے بھاگ رہی تھی۔

"علیزہ! پانی وغیرہ پیوگی۔" بغل میں بیٹھی اس کی نند بلقیس پوچھ رہی تھی۔ داہنی طرف بیٹھے اس کے شوہر فرحان مرزا نے کہا۔" باجی! پوچھتی کیا ہیں، اورنج جوس کی بوتل رکھی ہے پلا دیجیے۔ مسلسل چار گھنٹوں سے ہم لوگ سفر میں ہیں۔"

"اب تو ہم لوگ کافی قریب آچکے ہوں گے؟" بلقیس بانو نے پوچھا

"ہاں اب آدھے ایک گھنٹے میں پہنچ رہے ہیں" آگے کی سیٹ پر ڈرائیور کی بغل میں بیٹھے اعیان مرزا نے جواب دیا جو علیزہ کا دیور تھا۔

علیزہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ایک بھرے پرے گھر میں جا رہی ہے ورنہ اسے رشتوں سے کٹی اپنی زندگی کسی کیکٹس کی طرح لگتی تھی۔

اچانک موبائل رنگ کی آواز سے سب چونک اٹھے۔ اعیان نے فون ریسیو کیا اور بتایا کہ بس پر سوار بھی باراتی گھر پہنچ چکے ہیں۔ اور پھر ایک طویل سفر پورا ہوا۔ متواتر چلتی ہوئی گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ قدیم صدر گیٹ کھولا گیا اور رینگتی ہوئی گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے گاڑی رک گئی۔
ہلکا سا خوشگوار شور اٹھا۔ 'دلہن آگئی، دلہن آگئی' کی آوازیں علیزہ کے کانوں میں پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر تھکان سے بھری ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی۔ نکاح کے تین بول سے لڑکی پل بھر میں اپنی شخصیت کو کتنا باوقار سمجھنے لگتی ہے۔ لڑکپن ایک دستخط کے ساتھ ہی کتنی لمبی چھلانگ لگا جاتا ہے۔ ابھی تو اسے اپنے شوہر کے ساتھ چند گھڑیاں تنہائی میں گزارنے کو بھی نہیں ملی تھیں مگر وہ خود کو کتنا بدلا بدلا محسوس کر رہی تھی۔ اب وہ علیزہ مرزا بن چکی تھی اب اس کے دکھ درد میں شامل ہونے کے لیے ایک بندہ اس کے ساتھ تھا جو صرف اس کا اپنا تھا.... خالص اس کا اپنا.... جہاں کوئی بٹوارہ نہیں۔

"بلقیس! دلہن کو ابھی گاڑی سے نیچے مت اتارنا، قدسیہ بوا آرہی ہیں۔" اور جب قدسیہ بوا قریب آئیں تو معلوم ہوا کہ علیزہ کو اس کی گود میں چڑھ کر گھر کے اندر داخل ہونا ہے۔ مرزا گھرانے کا رواج ہے کہ دلہن جب پہلی بار دہلیز پر اترتی ہے تو اس کے پاؤں زمین پر پڑنے نہیں دیے جاتے۔ قدسیہ بوا نے مرزا گھرانے کی کئی

بہوؤں کو گود میں اٹھایا تھا۔ قدسیہ بوا لمبی چوڑی قد کاٹھی سے مضبوط چھیالیس سال کی عورت تھی جنھیں گھروں میں اسوقت بلایا جاتا جب کسی کے یہاں شادی ہوتی۔ یہ خوشی خوشی باورچی خانے کی انچارج بن جاتیں اور ہزار روپے روزانہ کے حساب سے اپنی محنتانہ لیتیں۔ کاموں سے جب انھیں فرصت ملتی تو بنا بنّی کے گیت گانے میں وہ کہیں سے پیچھے نہیں ہوتیں۔ گھیر دار شلوار، لمبا کرتا، سر پر پڑا ہوا چنا ہوا رنگین دوپٹہ ان کی شخصیت کی پہچان تھی لیکن علیزہ کو دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ ناک میں کیل کی جگہ قدسیہ بوا نے ایک لمبی سی لٹکتی ہوئی ایک سرخ چیز پہن رکھی تھی اور یہ موتی ناک کے بیچوں بیچ لٹک رہا تھا۔ اسے پہننا اس گاؤں کا رواج تھا جو یہاں ان کی ایک الگ پہچان بناتی تھی۔

قدسیہ بوا علیزہ کو گود میں لے کر گیت گاتے ہوئے دالان کے بیچوں بیچ بچھے بڑے سے تخت کے قریب پہنچیں اور تیز آواز میں بولیں۔ ''بیبو! پہلے میرا نیگ دے دو، پھر میں دلہن اتاروں گی۔''

علیزہ کے سر کے اوپر سے روپیوں کا نچھاور کیا جانے لگا۔ عورتوں اور مردوں کے نہ جانے کتنے ہاتھ آگے بڑھے جنھوں نے دس بیس روپے کے نوٹ علیزہ کے سر کے اوپر سے گھما کر قدسیہ بوا کے پھیلے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''اے اعیان بابو! بھاوج اتر رہی ہے، دس بیس سے کام نہیں چلے گا۔ پورے کے پورے اکیاون لوں گی۔''

''اکیاون کیوں بوا؟ میں تو پورے ایک سو ایک دوں گا۔ مگر آپ بھابی کو تخت پر بٹھا دیجئے، گود میں چڑھے چڑھے ان کی سانس رک رہی ہوگی۔'' قدسیہ بوا علیزہ کو تخت پر بٹھانے کے لیے جیسے ہی جھکی ان کا توازن ہلکا سا لڑکھڑایا اور اتنی ہی پھرتی سے اعیان نے علیزہ کو پکڑ کر تخت پر بٹھا دیا۔ یہ اس کا لاشعوری عمل تھا۔ بغیر کچھ سوچے اور رشتے کی نزاکت سمجھے، یہ اس کا لاشعوری عمل تھا۔ دو سلگتی ہوئی آنکھوں نے جیسے دو انگارے اعیان کی پیٹھ پر چپکا دیے ہوں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور خاموشی سے محفل سے نکل گیا۔ گانے بجانے، کھانے پینے کا دور شروع ہوا۔

''علیزہ! کچھ دیر اور بیٹھی رہو، پھر میں تمہارے لباس تبدیل کرا کر تمھارے کمرے میں پہنچا دوں گی۔''

علیزہ نے جی کہہ کر گردن ہلا دی۔

بلقیس بانو اس کی سگی نند تھی اور اس سے عمر میں صرف چار سال بڑی تھی۔ چونکہ وہ اس سے پہلے بھی دو تین بار بلقیس سے مل چکی تھی اس لیے اس سے کافی حد تک مانوس تھی۔

''بلقیس! تم نے بہو کو کھانا کھلا دیا۔''

''جی امی''

''بس تھوڑی دیر اور بٹھاؤ اور کمرے میں لے جاؤ، بیٹھے بیٹھے بہو کی کمر دوہری ہوگئی ہوگی''

''ٹھیک ہے'' بلقیس نے جواب دیا۔

اور آدھے گھنٹے کے بعد جب منھ دکھائی کا دور ختم ہوا تو بلقیس نے علیزہ کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ جب کپڑے تبدیل کر کے آرام سے سجی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی تو بلقیس بھی شوخ لہجے میں آرام کرنے کی تاکید کرتے ہوئے دروازے کے دونوں پٹ بند کر کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ علیزہ نے اطمینان کی ایک لمبی سانس بھری اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ یہ فرحان مرزا کا کمرہ تھا۔ ڈبل بیڈ، ڈریسنگ ٹیبل، نماز کی چوکی قرینے سے لگی ہوئی تھی۔ یہ وہی فرنیچر تھے جن کو ان کی امی نے اپنی زندگی میں ہی بنوا کر تانیہ کے بنگلے پر رکھوا دیا تھا۔ اور تانیہ کے ڈیڈی نے شادی کے دو

دن پہلے ہی سارا جہیز ٹرک پر لدوا کر اس کے سسرال پہنچوا دیا تھا تا کہ علیزہ جب اپنے گھر پہنچے تو سارا سامان اسے قرینے سے سجا ہوا ملے۔ دیواروں پر انگوری رنگ کی پینٹنگ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کی ہلکی ہلکی مہک کو ختم کرنے کے لیے روم فریشنر کا خاصا استعمال کیا گیا تھا۔ بیڈ چاروں طرف سے پھولوں کی لڑیوں سے سجا ہوا تھا۔ پھولوں کی تیز خوشبو سجا ہوا کمرہ، دبیز لٹکتے ہوئے دیوار کے رنگ سے میچنگ پردے...... علیزہ کی نگاہیں سرسراتی ہوئی پورے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ گردن موڑ کر جب اس نے پیچھے کی طرف دیکھا تو وہاں اس کے شوہر کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ اب تک اس نے جتنی بار بھی دیکھا تھا ایک ہلکی سی جھلک ہی دیکھی تھی۔ اب وہ اطمینان سے اپنی آنکھیں پوری کھول کر تصویر کا جائزہ لینے لگی۔ سانولی رنگت، چوڑا ماتھا، ناک کچھ حد تک پھیلی ہوئی، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ، گھنی مونچھ، سنجیدہ ہونٹ.... علیزہ کو اپنا شوہر اچھا لگا... بہت اچھا.... بہت اپنا سا... جیسے وہ اسے تب سے جانتی آئی ہے جب سے شعور کی آنکھوں نے جھپک کر کھلنا سیکھا تھا۔

''تصویر کیا دیکھنا؟ میں تو مجسم آپ کے سامنے ہوں'' ایک مردانہ آواز نے علیزہ کو ایسے چونکا دیا جیسے چوری کرتی ہوئی کسی بچی کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جائے۔ اس نے جلدی سے اپنا چہرہ دونوں اٹھے ہوئے گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بھی ایک دل فریب مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ فرحان مرزا اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

''میں جب اندر داخل ہوا تو آپ میری تصویر دیکھنے میں محو تھیں، میں نے آہستہ سے دروازے میں چٹخنی چڑھائی اور دبے قدموں آپ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔''

علیزہ چپ سنتی رہی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پریوں جیسی زندگی کا عکس اسے نظر آ رہا تھا۔ بے کار ہی اپنی نصیحتوں سے امی نے اسے ڈرا رکھا تھا۔ 'دیکھ بٹیا! اپنے شوہر کا ہر طرح سے خیال رکھنا۔ کیونکہ مرد اگر کمزور پڑتا ہے تو عورت گرد کی طرح نیچے بیٹھ جاتی ہے۔ مٹی میں مل جاتی ہے۔ اور اگر مرد جاندار بنا رہتا ہے تو عورت بھی دم دار رہتی ہے۔'

علیزہ نے بظاہر حامی میں سنجیدگی سے گردن ہلا دی۔ مگر اندر ہی اندر اس نے ہنس کر جواب دیا۔ 'امی! ہم دھول گرد تو ہیں نہیں کہ مٹی میں مل جائیں گے۔ ہم تو علیزہ ہیں علیزہ۔'

'کیوں مسکرا رہی ہے' امی کی کراہتی ہوئی آواز کے جواب میں جلدی سے علیزہ نے خود کو سنبھالا اور دوا دینے کے بہانے وہاں سے اٹھ گئی۔

امی کا اپنی زندگی پر سے بھروسہ اٹھ گیا تھا اور وہ چند لمحوں کے لیے جیسے ہی سکون میں آتیں علیزہ کو اس کی ازدواجی زندگی کا درس دینا نہیں بھولتیں۔ ایک دن بولیں۔ 'میری علیزہ! میری پیاری رانو! پورے دھیان سے سن! مرد ایک تیز رفتار آبشار کی طرح ہوتا ہے، اگر تو سیدھے سیدھے اس سے ٹکرائے گی تو پاش پاش ہو جائے گی، وہی عورت سمجھدار ہوتی ہے جو اس آبشار کا پانی کنارے کنارے سے پیے اور جیسے جیسے عادت پڑتی جائے قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھاتی جائے'

'امی! آپ کم بولا کریں تھک جاتی ہیں جب ٹھیک ہو جائیں گی تب ساری باتیں مجھے سمجھا دیجیے گا۔'

'بٹیا! زندگی پر سے اب میرا اعتماد اٹھ چکا ہے۔ سن لے میری بات اور اچھی طرح سے سن کر گانٹھ باندھ

لے، کل میں رہوں یا نہ رہوں کون تجھے سمجھانے والا ہوگا'۔

ماں کے دردناک لہجے سے علیزہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

'اچھا بولیے! کیا کہہ رہی ہیں'

امی تھوڑی دیر تک تیز تیز سانسیں لیتی رہیں پھر خود پر قابو پاتی ہوئی بولیں۔'بیٹی! عورت کی مٹی ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ صرف دوسروں کے کام آئے۔ یہ مٹی تبھی ٹھکانے لگتی ہے جب مرد اعتماد اور محبت کے ساتھ اس مٹی سے اپنا گھروندا تیار کرلے۔ تبھی عورت کی مٹی پاکیزہ کہلاتی ہے ورنہ وہ دلدل میں دھنستی جاتی ہے۔'

علیزہ کے چہرے پر بے زاری جھلکنے لگی وہ اپنی امی کی مٹی کا حشر دیکھ رہی تھی۔ آج وہ اپنی ہی زندگی کا تماشہ بنی ہوئی تھی۔ ان دنوں ان کی مٹی اپنے ہی خمیر کا ماتم منا رہی تھی اور وہ.......

''علیزہ! کہاں کھوئی ہو؟ تمھارے دل کی دھڑکن میں اپنے سینے پر صاف طور پر محسوس کر رہا ہوں۔ اتنی چپ کیوں ہو؟ کچھ تو بولو، مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی ننھی بچی کو اپنے سینے پر لٹا رکھا ہو۔''

علیزہ فرحان مرزا کی آواز سن کر لمحے بھر میں وقت کی لمبی چھلانگ کو پار کر کے ماضی سے حال میں آ گئی۔ بے ساختہ کچھ سوچے سمجھے اس کی زبان سے نکلا۔''ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے''

فرحان مرزا نے زندگی سے بھرپور ایک قہقہہ لگایا اور علیزہ کو اپنے بازوؤں میں کبوتری کی طرح دبوچ لیا۔ اس نے بند ہونٹوں سے اپنی امی کو اپنا اقرارنامہ دیا۔'ہاں امی! میں اپنی مٹی کو پاکیزہ بناؤں گی اور اس پاک مٹی سے اپنے شوہر کا گھروندا تیار کروں گی۔'

اس کے آگے کے الفاظ کہیں گم ہو گئے کیونکہ اس کے بند ہونٹ کسی کے کھلے ہونٹوں کی گرفت میں آ چکے تھے۔

کم سن خوابوں کے جھرمٹ میں کمہار کی چاک پر چڑھی کنوارے بدن کی گیلی مٹی گردش کھاتی رہی، گھومتی رہی، چکر پہ چکر لیتی رہی اور لمس کی تپش اور آنچ پر پکنے لگی پکنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تو جیسے آگ کے لاوے کی طرح آگے بڑھتا ہی گیا...... بڑھتا ہی گیا.... یہاں تک کہ ہفتے، مہینے اور سال گزر گئے، اس درمیان کیا کچھ نہیں ہوا، کیا کچھ نہ رونما ہوا....... امی کی باتیں کتنی گہری تھیں، کتنی سچی تھیں جن کے معنی اب وہ سمجھ سکی۔

فرحان مرزا جو اس کے شوہر تھے ان میں بہت سی خوبیاں ان میں دکھائی دیں اور ان خامیوں کو بھی جو وہ نہیں دیکھنا چاہتی تھیں، کھل کر اس کے سامنے آئیں۔ فرحان مرزا کی جو سب سے بڑی خوبی یا خامی اسے نظر آئی وہ تھی کسی بھی بات پر کیا جانے والا ان کا شدید ردعمل...... بہت جلد غصے میں حدیں پار کر جانا اور پھر سمندری جھاگ کی طرح ٹھنڈے پڑ کر معافی تلافی کرنا۔ کتنی بار فرحان مرزا نے کتنی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر سب کے بیچ اسے ذلیل کیا اور پھر تنہا کمرے میں اس کے پیروں پر سر رکھ کر معافی مانگ لی۔ آج صبح ہی کی بات ہے کہ فرحان مرزا نے اسے آواز دے دے کر کہا۔''علیزہ! دھوبی آیا ہے، میرے کپڑے پریس کے لیے دے دینا۔''

علیزہ اس وقت فرحان کی امی اور ابو کو ناشتہ دے رہی تھی۔ اعیان اس کے قریب کھڑا تھا کہ جلدی کیجیے بھابی، کچن میں جن سامانوں کی ضرورت ہو ان کی لسٹ پکڑا دیجیے تاکہ وہ ان کی خریداری کے لیے نکل سکے۔ اسی

درمیان فرحان مرزا نے آواز لگائی۔ "علیزہ! میں نے تم سے کہا تھا کہ شرٹ کا ایک بٹن ٹوٹ گیا ہے تم نے ابھی تک لگایا نہیں۔" وہ سارے کام چھوڑ کر کمرے میں گئی اور بٹن ٹانک کر آئی تو جلدی جلدی سامان کی لسٹ بھی بنانے لگی۔ اعیان نے آہستہ سے مذاقاً اس کے کان میں کہا۔ "کنگڑوں کوں کا نام بھی لکھ دیجئے گا، شام کو دعوت اڑائی جائے گی۔" علیزہ کو ہنسی آ گئی۔ تبھی کمرے کی کھڑکی سے فرحان نے اسے دیکھ لیا۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں پھوٹ پڑیں۔ وہ جھٹ باہر نکل آیا۔ "تم نے دھوبی کو پریس کے لیے کپڑے دے دیے؟"

"ارے میں تو بھول ہی گئی تھی، ابھی دیتی ہوں۔"

"وہ انتظار کرتے کرتے جا چکا ہے، تمہیں تو ہنسی مذاق کرنے سے فرصت ہی نہیں، وقت پر کوئی کام تم سے نہیں ہوتا۔ دماغ بھنکار رہتا ہے۔ میری بات کا تو تمہیں دھیان رہتا ہی نہیں ہے۔ میں بکتا ہوں تو بکتا رہوں۔ تمہیں تو وہی کرنا ہے.........."

"بیٹے فرحان! دھیمی آواز میں بولا کرو، شریف گھروں میں آوازیں چہار دیواری سے باہر نہیں جاتیں۔"

امی کے بیچ بچاؤ پر فرحان خاموش ہو گیا اور زہر آلود نگاہوں سے اعیان کو دیکھتا ہوا بغیر کچھ کھائے پیے آفس کے لیے نکل گیا۔ اعیان بے حد شرمندہ ہوا اس نے صفائی میں کچھ کہنا چاہا مگر علیزہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ گھر کے سارے کام نپٹا کر اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ دن بے حد بے کلی میں گزرا۔ شام ہوتے ہوتے علیزہ کے سر میں شدید درد اٹھ گیا۔ روتے رہنے سے آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ایک دو بار فرحان کی امی کمرے میں اسے بلانے بھی آئیں لیکن علیزہ نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ گہری نیند سو رہی ہو۔ حالانکہ اس کی امی بھی جانتی تھی کہ یہ محض سونے کا ڈراما ہے۔ آئے دن کی نوک جھونک وہ بھی دیکھ رہی تھی۔ بیٹے کی غلطیاں محسوس بھی کرتیں مگر نہ جانے کیا سوچ کر ہمیشہ خاموش رہ جاتیں۔ فرحان کے ابو ضعیفی میں آ چکے تھے اور زیادہ وقت مسجد میں گزارتے، گھریلو معاملات میں کم دخل دیتے۔

شام کو جب فرحان آیا تو اس نے گھر کے ماحول کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ صبح کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ وہ بھی کیا کرے۔ اعیان سے وہ سخت بے زار رہتا تھا۔ اعیان اس کا سگا بھائی نہیں تھا۔ چچا جانی کا بیٹا تھا۔ چچا جانی جواب اس دنیا میں نہیں رہے۔ کبھی تعلیم کے سلسلے میں چینئی گئے ہوئے تھے۔ وہیں ایک غیر مسلم لڑکی سے محبت ہو گئی اور انھوں نے سب کی مرضی کے خلاف چپکے سے مسجد میں جا کر اس سے نکاح پڑھوا لیا۔ انجلی سے وہ افشاں ہو گئی مگر انجلی دل سے کبھی خود کو افشاں تسلیم نہیں کر پائی۔ اس وقت فرحان کے دادا صاحب زندہ تھے وہ چچا جانی کو عاق کرنے والے تھے مگر خاندان کی عزت سڑک پر آ جائے گی یہ سوچ کر انھوں نے ان دونوں کو واپس اپنی حویلی میں بلا لیا۔ ایک دن چچا جانی جب کسی ضروری کام سے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے انھوں نے اپنی اس نئی بہو کو کمرے میں دھوپ بتی جلا کر مورتی کے آگے پوجا کرتے دیکھ لیا۔ ان کے گھر میں بت پرستی ہو رہی ہے اور انھیں علم بھی نہیں۔ دادا صاحب کو شدید صدمہ پہنچا اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ جب تک نئی بہو گھر میں رہے گی وہ اس گھر کا دانہ پانی منھ میں نہیں رکھیں گے۔ وہ گھر سے نکل گئے اور قریب کی اپنی خاندانی مسجد میں جو ان کے آبا و اجداد نے بنوائی تھی جا کر بیٹھ گئے۔

چچا جانی نے واپس آ کر حالات کو سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ان کی بیوی نے صاف لفظوں میں کہ

دیا کہ وہ اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتی۔ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر انھوں نے پہلے جو غلط فیصلہ کیا تھا اسے اب طویل کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس وقت اعیان ماں کے پیٹ میں تھا۔ شوہر گھر چھوڑ کر چلے گئے تو فرحان کی دادی پر قیامت ٹوٹ پڑی انھوں نے بھی خود کو کمرے میں قید کر لیا۔ گھر سے لاتعلق ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ رشتہ داروں میں بات پھیلنے لگی۔ اس وقت تک ان کی بڑی بہو یعنی فرحان کی امی ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھیں اور دوبارہ امید سے تھیں۔ گھر کا ہنستا کھیلتا ماحول بدل چکا تھا۔ پہلی بار مرزا گھرانے میں کچھ ایسا رونما ہوا تھا جس کو لے کر گھر کا ہر فرد شرمندہ تھا مگر افشاں کے لیے یہ گھر جہنم بنا ہوا تھا وہ خود اپنا تال میل اس گھر میں بیٹھا ہی نہیں پا رہی تھی۔ اعیان کی پیدائش کے بعد محض دو مہینے کی ننھی جان کو فرحان کی امی کی گود میں ڈال کر وہ ہمیشہ کے لیے اپنے ماں باپ کے گھر لوٹ گئی۔ جانے سے پہلے اس کے ہاتھ میں خود سے لیا ہوا طلاق نامہ تھا۔ چچا جانی کچھ نہ کہہ سکے۔ ان کی زندگی کا ایک اہم باب پھیلی ہوئی سیاہ روشنائی سے بدنما ہو چکا تھا۔ ان کی زندگی مایوسیوں کے گھیرے میں آ گئی تھی۔

مرزا گھرانہ دم بخود تھا۔ دادا صاحب مسجد سے گھر واپس آ چکے تھے مگر اب وہ شدید صدمے اور گرتی صحت کے باعث چراغ سحری ہو رہے تھے جو جلد ہی بجھ بھی گئے۔ دادا صاحب اور دادی کے انتقال کے بعد گھر کی باگ ڈور فرحان کے امی ابو کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس کے ابو شروع سے ہی گھر سے لاتعلق ہو کر باہر کی دنیا میں اپنی خوشیاں تلاشتے رہے۔ دوستوں کا ایک بڑا دائرہ بنا۔ وہ سب شکار پر جاتے، پرندوں کو مار کر لاتے اور پھر خود ہی سارے دوست گوشت کی ہانڈی تیار کرتے، جشن مناتے، شعر و شاعری کا دور چلتا تو ساری ساری رات ڈرائنگ روم ہال میں محفل جمی رہتی۔ مشہور درگاہوں کی زیارت کرنے کے بہانے وہ ہندوستان بھر میں گھومتے۔ غرض کہ باپ دادا کی جمع کی ہوئی دولت کو فرحان کے ابو نے من موجی ڈھنگ سے فراخ دلی سے خرچ کیا۔ فرحان کی امی کا شمار ان عورتوں میں ہوتا تھا جو شوہر کا حکم بجا لانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتی ہیں۔ مرزا گھرانے کی بہو بننے کے بعد انھوں نے ہونٹ سی کر زندگی گزاری۔ جب انھوں نے اس حویلی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا تو دادا صاحب کا دبدبہ تھا اور دادا صاحب کے بعد شوہر کی بے راہ روی..... ان کے اندر سیلن زدہ اداسی بھر گئی اور اپنی اس اکیلی دنیا میں انھوں نے خاموش سمجھوتہ کر لیا۔ ان کے لیے زندگی تار عنکبوت بن چکی تھی۔ تین تین بچوں کی پرورش اور گھر ذمہ داریاں اکیلی ہی سنبھالتی سنبھالتی وہ ٹوٹ گئی۔

ہر زہر کا تریاق، ہر زخم کا مرہم اور ہر غم کا مداوا وقت ہے، جس کے بہاؤ میں خس و خاشاک بھی بہہ جاتے ہیں اور سنگلاخ چٹانیں بھی.... زخم ہمیشہ ہرے نہیں رہتے، رنج و الم کے نشتر ہمیشہ دل میں پیوست ہی نہیں رہ جاتے بلکہ جب وقت کا چابک چل رہا ہوتا ہے، رتھ کا پہیہ بھاگ رہا ہوتا ہے تو دکھ درد کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی حالات کے جھٹکوں سے ٹوٹتے بکھرتے پیچھے چھوٹتے جاتے ہیں، ماضی کا حصہ بنتے جاتے ہیں اور پھر محض یادوں کے نقوش بن کر ہمارے اندرون میں گھل مل جاتے ہیں۔

ایک شب جب فرحان مرزا علیزہ سے اپنی زندگی کا درد بانٹ رہا تھا تو بے حد رندھے گلے سے اس کی گود میں اپنا سر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ "علیزہ! مردوں کی بے وفائیوں کی بھی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ ہمارے ابو میں کوئی بری لت نہیں تھی مگر پھر بھی انھوں نے امی کے ساتھ وفا نہیں کی۔"

''وہ کیسے؟'' علیزہ نے سوال کیا۔

فرحان نے اپنے باپ کی صفائی دیتے ہوئے اسے سمجھایا۔ ''بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم بغیر سوچے سمجھے ایسے کام بھی کر ڈالتے ہیں جن کی سنجیدگی کو ہم پوری طرح سمجھ نہیں پاتے، ہمارے اندر گہری، تاریک اور پر اسرار قوتیں ہیں جن کے ہاتھوں میں ڈوریاں ہوتی ہیں اور ہم بے بس سے کٹھ پتلیوں کی طرح ان کے اشاروں پر رقص کرنے لگتے ہیں۔ بغیر جانے کہ یہ عمل کیوں اور کیسے کر رہے ہیں۔''

علیزہ شوہر کے بھاری بھرکم اس فلسفے کو آنکھیں جھپکاتے بے حد معصومیت اور اپنائیت سے سن رہی تھی۔ وہ اپنی انگلیوں سے لپٹے ہوئے فرحان مرزا کے بالوں سے آہستہ آہستہ کھیلتی بھی جا رہی تھی۔

علیزہ فرحان کے کہنے پر اس کے بالوں میں تیل لگاتی ہوئی اعیان کے بارے میں سوچنے لگی۔ اعیان کی شخصیت فرحان سے کافی جدا تھی۔ صاف ستھری رنگت، لحیم شحیم قد کاٹھی، ہلکی نیلی آنکھوں میں سمندر جیسی گہرائی، اس کے سیاہ خم دار بالوں کے لچھے لاپرواہی سے اس کی چوڑی پیشانی پر بکھرے رہتے۔ وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر سنجیدگی سے باتیں کرتا تھا۔ ہر ایک مسئلے پر خوب غور و فکر کر کے ہی انجام تک پہنچتا، کم گو اور بہت حد تک دوسروں سے محتاط رہنے والا شخص تھا۔ فرحان مرزا مزاجاً جہاں اپنے والد کے قریب تھے وہیں اعیان شکل و صورت و نفاست اور جمالیاتی خوب روئی میں اپنی ماں پر گیا تھا۔ تائی امی کی پرورش نے اسے وقت سے پہلے معتبر بنا دیا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی رائے مشوروں کے لیے تائی امی کے پاس پہنچتا۔ وہیں فرحان مرزا اپنے فیصلے خود مختاری سے لیتے کیونکہ باپ نے یہی سمجھایا تھا کہ جو مرد عورت کے پہلو میں دبک کر زندگی جیتے ہیں وہ گیدڑ بن جاتے ہیں۔ فرحان مرزا بڑی حقارت سے اعیان کو دیکھا کرتا، اس کی نگاہ میں اعیان کبھی اچھا انسان بن ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کی رگوں میں ایک غیر مسلم عورت کا خون دوڑ رہا تھا۔ فرحان اور اعیان جب پانچ چھ سال کے بچے ہوا کرتے تھے تب سے فرحان اس پر حکومت کر رہا تھا۔ جو چیز پسند آ گئی امی کے نہیں نہیں کرنے کے باوجود وہ بے خوف ہو کر اس سے چھین لیتا۔ خواہ کھانے پینے کا سامان ہو، کھلونے ہوں یا پھر پہننے کے کپڑے فرحان کے والد اس حرکت پر اسے ڈانٹتے تو تھے مگر باپ کی حیثیت سے سختی یا اس کی تنبیہ نہیں کرتے تھے ایسے میں اعیان تائی امی کی گود میں دبک کر گھنٹوں رویا کرتا۔ اور تائی امی اسے پیار سے سمجھاتیں کہ بیٹا چپ ہو جا، فرحان تیرا بڑا بھائی ہے، تو جھگڑے مت کیا کر میرے پاس آیا کر میں تجھے اس سے اچھی چیز دوں گی۔

تائی امی بھی اپنے کہے کی لاج رکھتی تھی۔ اور اس کے لیے ہمیشہ الگ کچھ نہ کچھ خاص کر کے چیزیں اس کو پکڑا دیتیں۔ ماں کی یہی باتیں ننھے فرحان کو ماں سے دور کرتی چلی گئیں اور وہ باپ کے قریب ہوتا چلا گیا۔ اسے باپ کی محفل میں بڑوں کی گود میں بیٹھ کر کاجو کشمش وغیرہ چبانا اچھا لگتا۔ طرح طرح کی کہانیاں بھی اسے سننے کو ملتیں۔ بٹیر کیسے لڑائی جاتی ہے، فاختہ کیسے اڑایا جاتا ہے، پتنگوں کی تان کیسے کھینچی جاتی ہے اور شکار کر کے لائے پرندوں کے پروں کو کیسے نوچا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ننھے فرحان نے یہ ساری باتیں کم عمری میں ہی جان لی تھیں۔ مگر ایک بات اسے سمجھ میں نہیں آئی، ابی کے خاص دوست تھے راحت چچا۔ ایک بار وہ فرحان کو اپنی گود میں بٹھا کر بھنے ہوئے مرغے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے منہ میں ڈالتے جا رہے تھے، کسی بات پر ابی اور ان کے دوستوں کے بیچ

بحث ہورہی تھی راحت چچا پر جوش لہجے میں بولے۔ 'عورتیں تو مردوں کے پیر کی جوتیاں ہوتی ہیں، یہ تو ہم شاعروں نے تخیل میں انھیں چڑھا چڑھا کر سر بٹھا لیا ہے اب موتیں گی تو منھ پر نہ آئے گا تو کہاں جائے گا۔'

ابی نے آنکھ کے اشارے سے رحمت چچا کو بولنے سے روکا اور فرحان کو ان کی گود سے اتار کر ماں کے پاس بھیج دیا۔ کمرے میں پہنچ کر فرحان نے دیکھا کہ امی اعیان کو گرما گرم بریانی کھلا رہی ہیں۔

فرحان تو ماں کے پاس آیا تھا یہ پوچھنے کے لیے کہ عورت کو جوتی کیسے بنایا جاتا ہے مگر ماں کے ہاتھ میں کھانے کی پلیٹ دیکھ کر رونے لگا۔ 'میں اتنی دیر سے بھوکا ہوں تو آپ نے نہیں کھلایا اور اعیان کو کھلانے لگیں۔'

ماں نے پیار سے سمجھایا۔ 'بیٹا تم تو مردانے میں تھے، میں نے تو کھانا وہاں لگوادیا ہے، اچھا آؤ! میں تمھیں بھی بریانی کھلاتی ہوں۔'

'میں اعیان کا جوٹھا نہیں کھاؤں گا۔' فرحان نے ضد کی۔

'نہیں بیٹے ایسا نہیں بولتے، اعیان نے بھی تو تمھارا جوٹھا کھایا ہے۔'

'میں تو بڑا ہوں'

'بڑے اور چھوٹے سے کیا ہوتا ہے بیٹا؟ تم دونوں بھائی بھائی ہو، پیار محبت سے رہا کرو'

جب تک ماں اس کے لیے دوبارہ کھانا لے کر آتی تب تک ننھا فرحان باپ کے پاس چلا گیا۔

فرحان کو اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات امی ابو میں زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ امی روتی رہیں....روتی رہیں.....دونوں بچے ماں کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے رہے۔ فرحان جہاں منھ بسورتے ہوئے رونے کا ناٹک کر رہا تھا وہیں اعیان کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو ٹپک رہا تھا۔ پھر دونوں ہی بچے ماں کے پہلو دائیں بائیں لیٹ کر سو گئے۔

فرحان بولتا جا رہا تھا اور علیزہ اپنے میں ہی گم شعور کی رو میں بھٹک رہی تھی۔

اس درمیان تانیہ کئی بار علیزہ سے ملنے اس کے گھر آئی۔ دو دو تین تین دن ٹھہری بھی۔ اکثر تنہائی میں وہ علیزہ کو چھیڑتی بھی۔ 'علیزہ! تیرے مزاج کو فرحان نہیں اعیان سوٹ کرتا ہے۔ اگر اعیان تیری زندگی میں آیا ہوتا تو...'

اس کے آگے کے الفاظ ادا ہونے سے پہلے ہی علیزہ نے تانیہ کو ہونٹوں پر انگلی رکھ دی 'خبردار تو! ایسے الفاظ دوبارہ نہ کہنا۔ فرحان میرا شوہر ہے اور اعیان میرا پیارا سا دیور.......بس اور کچھ نہیں.....'

علیزہ اور تانیہ میں شاید ہی کوئی ایسا دن گزرتا ہو جب فون سے باتیں نہ ہوتی ہوں۔ وہ ایک ایک بات تانیہ سے شیئر کرتیں چاہے وہ باتیں اس کی سسرال کی ہوں یا پھر اس کے دل کی۔ ابا کی بڑھتی ضعیفی کی وجہ سے گھر کی حکومت آہستہ آہستہ فرحان مرزا کے ہاتھ میں آگئی۔ اب گھر میں وہی ہوتا جو فرحان چاہتا۔ سارے فیصلے فرحان کرتا اور اعیان بہت خاموشی سے اپنی منظوری کی مہر لگا دیتا۔ ساری چیزیں ہونے کے باوجود اعیان بچپن سے احساس کمتری کا شکار رہا۔ والدین کی سرپرستی چھن جانے کے بعد تائی امی کی محبت نے اسے سیراب تو کیا مگر وہ محبت بھی اسے تحفے میں ملی بھیک جیسی لگتی۔ وہ تائی امی اور تایا ابو کا احسان مند تھا جنھوں نے اسے نہ صرف سڑک پر آنے سے بچایا تھا بلکہ حتی الامکان کوشش کی تھی کہ وہ کہیں سے خود کو ثانوی حیثیت میں نہ پائے۔ آخر اسے اپنے والد کے حصے کی جائداد بھی تو ملی تھی۔ ابی نے شرعی اعتبار سے بلقیس باجی کی شادی میں ان کا حصہ ان کو دے دیا تھا۔ بلقیس باجی کا رشتہ

بھی کہیں دور نہیں ہوا تھا وہ سگے موموں زاد بھائی سے بیاہی گئی تھیں۔ محض ۲۱ سال کی عمر میں ہی وہ دو بچوں کی ماں بن کر بھاری بھر کم جسم والی عورت ہو چکی تھی۔ مہینے میں وہ ایک دو بار مائیکے کا چکر لگا چکی تھیں۔ فرحان اور اعیان کی بہت سی باتیں علیزہ کو بلقیس باجی کی زبانی ہی معلوم ہوئی تھیں۔

اس شب کی اڑان دیکھتے ہیں

محبت فریب نظر ہے، واہمہ ہے
یا/
محبت ہے ہی نہیں/
محبت ایک بند پنجرہ ہے
یہاں دم گھٹتا ہے
چلو،
اس شب کی اڑان دیکھتے ہیں

(۱)

محبت فریب نظر ہے، محض واہمہ ہے، جو بادلوں کی طرح امنڈتے گھمڑتے جذبات پر سورج کا چھتر تان دیتی ہے اور پھر دھنک کے سارے رنگ ازدواجی زندگی میں پھیل جاتے ہیں۔ علیزہ بھی اپنی شادی کے شروعاتی دنوں میں قوس قزح کے ان ہی رنگوں کے لباس میں لپٹی خوابوں کے طلسماتی قالین پر بیٹھی کھلے آسمان پر اڑتی پھر رہی تھی۔ شادی کو محض بیس پچیس دن ہوئے تھے۔ دنیا رنگین تھی، خوشحال گھرانہ، فرحان مرزا جیسا شوہر اور بھائی جیسا دیور جو ہر پل اس کا منھ تاکا کرتا، کب اسے کس چیز کی ضرورت ہے۔ ایک دن بلقیس باجی آئی ہوئی تھیں۔ فلمیں دیکھنے کی شوقین تھیں اور اس طرح کے پروگرام سال میں ایک دو بار بن ہی جاتے تھے۔ فرحان یوں تو فلمیں دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا مگر کبھی کبھار اس تفریح میں شامل ہو جاتا تھا۔ علیزہ سے اس کی مرضی دریافت کی گئی اس نے جھٹ حامی بھر دی۔ اوور اعیان ٹکٹ لینے چلا گیا۔

جب پکچر ہال جانے کے لیے سب تیار ہو رہے تھے تبھی فرحان مرزا نے جیسے اپنا فرمان جاری کیا۔ میں اور علیزہ فلم دیکھنے نہیں جائیں گے۔

''کیوں''؟ بلقیس باجی کا سوال تھا۔

''کیونکہ مجھے راحت چچا سے ملنے جانا ہے۔ وہ علیزہ کو کئی دنوں سے یاد کر رہے ہیں۔''

اعیان نے کہا ''بھائی! ایسا کرتے ہیں، فلم دیکھنے کے بعد ہم سب راحت چچا کے گھر چلتے ہیں۔''

امی جو بہت دیر سے سروتے سے چھالیہ کترتی ہوئی سب کی باتیں سن رہی تھیں، بول اٹھیں۔ ''اعیان

ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ٹکٹ جب آ ہی گیا ہے تو پیسے کیوں برباد کیے جائیں۔ مجھے بھی شام کو شمسل بھائی کے گھر میلاد شریف میں جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے امی!"

"بیٹا پڑوسی ہونے کا حق تو ادا کرنا پڑے گا۔ اور پھر اپنے سرکار ﷺ کی محفل ہے۔ دم بھی نکلتا رہے تو بھی جاؤں گی۔ شمسل بھائی کی بیوہ کل رات ہی مجھے آہستہ سے بتا گئی تھیں۔"

"امی! کیا ہم سب کو بھی چلنا ہے۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"نہیں بلقیس۔ اپنی قلیل آمدنی میں وہ کسی طرح گزارا کر رہی ہیں۔ بچوں کو قرآن شریف پڑھانے میں کتنا ملتا ہوگا۔ تمھارے ابو کا وقت تو مسجد میں ہی گزرتا ہے نا، نہ وہ کل گھر سے وابستہ تھے نہ وہ آج ہیں، اللہ یہ کارخانہ چلا رہا ہے........"

امی جب بولنے پر آتیں تو بڑی تفصیل سے بولتی چلی جاتیں۔ اللہ اللہ کر کے جب خاموش ہوئیں تو سب نے جانے کی اجازت مانگی۔

فلم دیکھنے کے بعد سب راحت چچا کے گھر پہنچے۔ اچانک ہم سب کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور رات کے کھانے کا انتظام کرنے لگے۔ علیزہ کو یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ راحت چچا کو علم ہی نہیں تھا کہ اسے فرحان مرزا کے ساتھ ان کے گھر آنا ہے جبکہ فرحان نے بتایا تھا کہ راحت چچا نے ان دونوں کو کھانے پر بلایا ہے۔ آخر فرحان کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ علیزہ پورے وقت ذہنی اذیت کی شکار رہی کیوں کہ فرحان نے ایک لفظ بھی اس سے بات نہیں کی تھی۔ پورے وقت وہ سختی سے ہونٹوں کو بھینچے خاموش رہا۔

سب ہنسی مذاق اور اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے۔ فرحان چھت پر بنے کمرے میں تنہا آنکھیں بند کیے چپ لیٹا ہوا تھا۔ کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ جیسے سبھی اس کے اس رویے کے عادی ہوں۔ ہاں علیزہ کے چہرے کی پریشانی دیکھ کر راحت چچا نے اس کے قریب آ کر کہا تھا۔

"جانے دو بہو، تھکا ہوگا۔ سو گیا۔"

کسی کو فرحان مرزا کی پرواہ نہیں تھی۔ یا پھر سب اس کے مزاج سے واقف تھے۔ مگر فرحان اس کا شوہر تھا۔ اسے اس کی طرف سے لوگوں کی بے نیازی میں اپنی ذلت لگ رہی تھی۔ وہیں اعیان اپنے ہنسی مذاق دلچسپ باتوں اور طرح طرح کے چٹکلوں سے سبھی کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ علیزہ پر گئی تو وہ اس کے قریب آ گیا۔

"بھابی! بھائی ایسے ہی ہیں، کوئی بات اپنے دل پر نہ لیجئے گا۔" اعیان اپنی بات کہہ کر چلا گیا مگر علیزہ ایک عورت تھی اور فرحان اس کا شوہر تھا جو مرجھایا ہوا ایک کمرے میں پڑا تھا، اس کا دل محفل کے ہنسی ٹھٹھے میں نہیں لگا۔ وہ بھی فرحان مرزا کے کمرے میں چلی گئی۔ آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو محبت سے سہلا رہی تھی کہ تبھی جھٹ سے فرحان مرزا نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں میں سے جھانکتے اکیلے پن کے احساس کے ساتھ اجنبی پن کے جذبے نے جیسے علیزہ کے کلیجے پر چھری چلا دی ہو۔

"ارے آپ کو کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

''کچھ نہیں طبیعت ٹھیک نہیں''

''گھر چلیں؟''

''چلو''

''پھر اٹھیے نا''

''تم راحت بچا سے کہہ دو کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں واپس جانا چاہتا ہوں۔''

علیزہ اپنے آپ سے ہی الجھتی رہی۔ اسے فرحان مرزا کا یہ رویہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بغیر کسی وجہ کے اداس ہو جانا، اپنے میں ہی گم سم ہو جانا، جب سب ہنس بول رہے ہوں تو چپ رہنا یا پھر کسی کنارے جا کر لیٹ جانا۔

اف کتنی شرمندگی تھی سب کے بیچ سے اسے اکیلے جاتے ہوئے۔

''کیا ہوا فرحان کو، کیا ہوا فرحان کو۔ لوگوں کی سوالیہ نگاہیں اس کی طرف اٹھتیں اور وہ ان نگاہوں سے بچنے کے لیے باورچی خانے میں جا کر پناہ لیتی۔ شادی کے محض بیس پچیس دنوں میں ہی وہ اپنے آپ کو کتنی باسی محسوس کر رہی تھی۔ علیزہ راحت بچا کے پاس نہیں گئی اور اشارے سے اس نے بلقیس باجی کو کنارے بلایا۔

''باجی! فرحان واپس گھر جانا چاہتے ہیں''

''کیوں؟''

''پتہ نہیں''

''تم سے کوئی بات تو نہیں ہوئی؟''

ابھی وہ دونوں گفتگو ہی کر رہی تھیں کہ اس دوران اعیان آ پہنچا۔

''پریشان مت ہوئیے بھابی، میں نے بوا سے کہہ کر آپ دونوں کا کھانا پیک کروا دیا ہے۔ ڈرائیور گاڑی پر آپ دونوں کا انتظار کر رہا ہے۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ پیچھے کی سیڑھی سے اتر کر چلی جائیے۔ میں یہاں بات سنبھال لوں گا۔''

''ارے تمھیں کیسے معلوم ہم کیسے اتنا سمجھ گئے۔ میں نے تو تم سے کچھ کہا نہیں۔''

اعیان کے سنجیدہ چہرے پر گہری مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''بھابی یہ مت بھولیے کہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ میں ان کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ گھر جائیے، خوش رہیے۔ ٹی وی دیکھیے یا پھر آرام کیجیے۔''

بوا کھانا پیک کر کے گاڑی میں رکھ آئی تھی۔ علیزہ بہت بجھے دل کے ساتھ فرحان مرزا کے ساتھ پیچھے کی سیڑھی سے اتر کر گھر کے لیے نکل پڑی۔ راستے بھر وہ اپنے آپ سے الجھتی رہی۔ اف اسے کتنی ذلت محسوس ہو رہی تھی۔ بغیر کسی سے ملے چوروں کی طرح نکلنا اسے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اس نے آنکھوں کے کناروں سے فرحان کی طرف دیکھا۔ وہ بے نیاز بیٹھا تھا۔ 'کوئی اپنے ہی گھر میں اتنا اجنبی بن کر کیسے جی سکتا ہے۔'

اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ سیٹ پر رکھے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ایسا کر کے وہ اسے اپنے پن کا احساس کرانا چاہتی تھی۔ مگر وہ اسی طرح بت بنا بیٹھا رہا۔ نہ اس کے چہرے پر کوئی الجھن تھی نہ پریشانی نہ شرمندگی۔ نہ علیزہ کے پیار کے اس اظہار پر کوئی ردعمل.... تھوڑی دیر بعد علیزہ نے اپنا ہاتھ کھینچ کر اپنی گود میں رکھ

لیا اور فرحان کی طرح وہ بھی سڑک پر خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

گھر واپس آکر فرحان نے خاموشی سے کپڑے تبدیل کیے اور علیزہ کے بار بار اصرار کے باوجود شب خوابی کا لباس پہن کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ علیزہ نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ باوجود اس کے کہ وہ بھوکی تھی۔ لائٹ آف کر کے وہ بھی خاموشی سے لیٹ گئی۔

علیزہ کے لیے فرحان مرزا کی نفسیات کو سمجھنا بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ اور مرد کی نبض پر ہاتھ رکھ کر دل و دماغ کی کیفیات کو پڑھ لینے کا ہنر اسے نہیں آتا تھا۔

شب کا سیاہ آنچل دھرتی پر سایہ فگن تھا۔ گہری اور تاریک رات اپنے دامن میں سناٹے سمیٹے ہوئے تھی۔ ڈوبتے چاند کے اثرات سے ستاروں کی روشنی پھیکی پڑ رہی تھی اور علیزہ چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ شوہر کو منانے کی وہ ہر ممکن کوشش کر چکی تھی۔ جب فرحان نے اسے ایک دھکے سے بیڈ سے نیچے گرا دیا تو جیسے اس کے سارے حوصلے ایک دم سے ٹوٹ گئے۔ فرحان کی طرف سے ملنے والا یہ اس کا پہلا زخم تھا۔ بیڈ سے نیچے گرنے کے بعد وہ کچھ دیر ساکت پڑی رہی۔ پھر کسی سہمی بچی کی طرح اٹھ کر پائیتانے لیٹ گئی۔ اس کی ذہنی دنیا زلزلوں کے شدید جھٹکوں سے ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ فرحان کے الفاظ کسی پگھلے سیسے کی طرح اب بھی اس کے کان میں سوئیاں چبھو رہے تھے۔ 'اب مجھ سے کیا چاہتی ہے، یہ پیاس بھی جا کر اعیان سے ہی بجھوا لے، بے شرم عورت! اندھیرے میں اعیان کے بغل میں پکچر دیکھتے ہوئے تجھے غیرت نہیں آئی۔'

اف علیزہ نے تو اس پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اس کے ایک طرف فرحان مرزا بیٹھا تھا اور دوسری طرف اعیان۔ بلقیس باجی کو بیچ میں بیٹھتے ہوئے گھٹن ہوتی تھی اس لیے اس نے کنارے کی کرسی پکڑی تھی۔ علیزہ مرد کی نفسیات سے ناواقف تھی اس لیے اسے ان دونوں کے بیچ بیٹھنے میں تکلف نہیں ہوا۔ اس وقت احساسات کے تیز نوکیلے نشتر اس کی روح کے زخموں کو کرید رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کتنا آسان ہوتا ہے عورت کو عورت کا سمجھ لینا، اور کتنا مشکل ہوتا ہے ایک عورت کا مرد کو سمجھنا۔ کتنا بوسیدہ ہے عورت اور مرد کو ملانے والا وہ پل جو کسی ہوائی جھولے کی طرح لمحہ لمحہ دل کو دہلاتا رہتا ہے کہ کب کون سا سرا ٹوٹے اور کب وہ جھولا ہوا کی زد کا شکار ہو جائے۔ علیزہ نے دھیرے سے اپنی کمر سہلائی، انگلیاں بھیگ گئیں۔ بیڈ کے کنارے سے لگی کھرونچ تیز تھی۔ ہلکا سا خون کا رساؤ علیزہ نے اپنی انگلیوں میں جذب کر لیا۔

(۲)

ایک دو دن اور اطمینان سے گزر گئے جیسے کہیں کچھ ہوا ہی نہیں مگر علیزہ کا ذہن اس رات کے بعد سے تار تار ہوتا رہا۔ فرصت کے لمحات ختم ہونے والے تھے اور فرحان، اعیان اور علیزہ کے لکھنؤ جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ اس کی ازدواجی زندگی اتنی جلدی اتنی کروٹیں بدلے گی۔ وہ فرحان مرزا کے مزاج کو سمجھ نہیں پا رہی تھی اور جتنا سمجھ پا رہی تھی اس سے اندیشہ تھا کہ آنے والی زندگی اس کے لیے شمشیر کی دھار پر چلنے جیسی ہوگی۔ ابھی تو کنوارے خواب پوری طرح رنگین بھی نہیں ہوئے تھے۔ ازدواجی زندگی ایک ڈھرے پر نہیں آئی تھی اور کالی آندھی کے چلنے کے امکانات شروع ہو گئے تھے۔ مگر یہ آندھی نہ فرحان مرزا کی آنکھوں میں نظر

آتی نہ گھر کے دیگر افراد میں..... سب کے لیے سب کچھ زندگی کے عام حالات کی سی تھی۔ جتنا زیادہ فرحان اپنی ذاتی زندگی میں تھا اس سے زیادہ الجھا ہوا وہ بستر پر تھا۔ تعلقات تو نرمی سے بھی بنائے جا سکتے ہیں فرحان کو تو شکار میں پھنسے پرندوں کے پروں کو نوچنے میں جو لذت ملتی تھی وہ لذت پروں کو آہستہ روی سے سہلانے میں کہاں ملتی۔

ایسا نہیں تھا کہ اسے علیزہ سے محبت نہیں تھی۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ اس کی زندگی میں آنے والی وہ پہلی لڑکی تھی مگر کہتے ہیں نا کہ جس نے لذت کا مزانہ چکھا ہو اور وہ جب پہلی بار نشہ کرتا ہے تو باؤلا ہوا تھتا ہے۔ ہر رات علیزہ اسی طرح مرتی تھی اور ہر دن سورج کی روشنی کے ساتھ جی اٹھتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا کہ مرد اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ سب عورتیں کم و بیش اسی طرح جھیلتی ہیں تو پھر اس کے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ایک معمولی گھر کی معمولی لڑکی اور کہاں فرحان مرزا کا جانا مانا گھرانہ، ہاں اتنا ضرور تھا کہ علیزہ کے والدین نے اسے اعلیٰ سوچ اور فکر کا اعلیٰ معیار دیا تھا۔ زندگی کو برتنے کا ایک رویہ دیا تھا۔ پھر کہاں چوک ہوگئی جو علیزہ فرحان کے معیار پر پوری طرح اتر نہیں پا رہی تھی۔ بے شک فرحان اعیان سے بے حد مختلف تھا مگر اتنا مختلف بھی نہیں کہ اس سے نفرت کی جائے یا اس سے خوف زدہ رہا جائے۔ اس کی ماں نے اس سے کہا تھا کہ عورت کا مقدر ایک سے زیادہ جیون ہے ایک سے زیادہ مرن۔ آج علیزہ جیون اور مرن کے معنی کو جی رہی تھی اور جیتے جی مر رہی تھی۔

اس شام گھوم پھر کر فرحان باہر سے گھر میں داخل ہوا اور آتے ہی گھر والوں کو فرمان سنا دیا کہ وہ کل صبح علیزہ کو لے کر لکھنؤ جا رہا ہے۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے بھائی، کچھ دن اور رک جائیے، میری چھٹی تیس تاریخ تک ہے۔'' اعیان کی پریشانی کا لطف اٹھاتے ہوئے فرحان نے کہا ''تو تم بعد میں آجانا، میں نے جانے کا فیصلہ کرلیا۔''

سب کے منع کرنے کے باوجود اس نے ٹیکسی بک کرالی۔ فرحان کے والدین اس کے معاملات میں زیادہ تر خاموش رہتے۔ بلقیس باجی نے ایک بار بتایا تھا کہ فرحان ہمیشہ اپنے ماں باپ کو مورد الزام ٹھہراتا ہے کہ انھوں نے اعیان کو گود لے کر اس کی حق تلفی کی ہے۔ ماں کے دودھ کا بٹوارہ، پیار کا بٹوارہ۔ خوشیوں کا بٹوارہ......... جب دونوں بھائی بچپن میں آپس میں جھگڑ کر ماں کے پاس پہنچتے تھے تو ماں فرحان کو اپنے سینے سے لگاتی تھی۔ اور اعیان کے آنسو پونچھ کر اسے چوما کرتی تھی۔ طرح طرح کی باتوں سے اسے بہلا کر چپ کراتی، ایسے میں ماں کے سینے میں دبکا فرحان صرف چپکے چپکے سسکتا رہتا۔ اور اپنی ماں کے لیے بدظن ہوتا رہتا کہ ماں کیوں نہیں اعیان کو اس کی امی کے پاس بھیج دیتیں۔

بڑے ہو کر جب فرحان نے ماں باپ کی شان میں گستاخی کی تو والدین خاموش ہوگئے۔ جوان لڑکے کے منھ لگنا جگ ہنسائی تھی۔ انھیں بھی احساس تھا کہ شاید انھوں نے اپنے بیٹے کا حق پورا ادا نہیں کیا مگر وہ کرتے بھی تو کیا کرتے۔ مر کر خدا کو منھ دکھانا تھا، ماں باپ چپ ہوتے چلے گئے اور فرحان مرزا اپنی بدتمیزیوں میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا چلا گیا۔

اعیان جوں جوں بڑا ہوتا گیا حالات کا اسے علم ہوتا چلا گیا۔ فرحان کے ماں باپ اس کے لیے عظیم

تھے کہ اگر ان کا سہارا نہ ہوتا تو کسی یتیم خانے میں ہوتا یا پھر کسی اور کے ٹکڑوں پر پل رہا ہوتا۔ وہ گھر کے ماحول کو خوشگوار بنائے رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا، گھر کی ہر چھوٹی بڑی ذمہ داریاں اس نے اپنے سر لے رکھی تھیں۔ فرحان کی ہر بدتمیزی کا وہ جواب خاموشی اور کنارہ کشی سے دیتا۔ یہی بات فرحان کو بری لگتی۔ آخر اتنا فرشتہ صفت بننے کی ضرورت کیا ہے۔ یقیناً وہ اسے نیچا دکھانے کے لیے ایک چولا پہن کر ہم سب کے بیچ رہتا ہے۔

صبح کے آٹھ بجتے ہی بک کی گئی ٹیکسی آ گئی۔ اعیان نے ٹیکسی میں سارے سامان رکھے پھر علیزہ کو سمجھانے لگا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ فرحان اپنے امی ابو سے جانے کی اجازت لے رہا تھا مگر اس کی نگاہیں اعیان اور علیزہ پر ٹکی تھیں۔ بلقیس باجی سے گلے ملنے کے بعد سب سے اجازت لے کر دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی رینگتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ علیزہ نے پیچھے مڑ کر شیشے سے باہر دیکھا۔ دور تک اسے گھر والوں کے ہوا میں ہلتے ہوئے ہاتھ دکھائی دیے۔

دو کمروں پر مشتمل یہ فلیٹ علیزہ کو بے حد پسند آیا۔ ہر سامان قرینے سے سجا تھا۔ راشن اور دیگر ضروریات سے کچن اتنا بھرا تھا کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہاں صرف دو فرد رہتے ہیں۔ کچن میں ایک چھوٹا سا اسٹول رکھا ہوا تھا جس پر ایک ٹیبل واچ اور ڈائری پنسل رکھی تھی۔ فرحان نہانے چلا گیا تھا اور علیزہ اطمینان سے کچن کا معائنہ کر رہی تھی۔ اس نے ڈائری اٹھائی اور پڑھنے لگی۔ مختلف قسم کی دال، چاول سبزیوں کی الگ الگ طرح کی ڈشز کی ریسیپی درج تھی اور آخر میں یہ بھی نوٹ کیا گیا تھا کہ کون کون سی ڈش کتنی دیر چولہے پر دھیمی آنچ میں چڑھی رہے گی۔ کتنی اسٹیم کس دال کو لگے وغیرہ وغیرہ۔ اسے ہنسی آ گئی۔ تحریر سے اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اسے فرحان نے لکھا ہے یا اعیان نے۔ وجہ یہ تھی کہ ابھی تک اسے دونوں کی تحریر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ دلہن بن کر اسے مرزا گھرانے میں آئے ایک ماہ بھی تو نہیں ہوا تھا، وہ کچن سے نکل کر بالکنی پر آ گئی۔ چھوٹی سی بالکنی تھی مگر دو چار گملے وہاں پر بھی رکھے تھے۔ پانی نہ ملنے کی وجہ سے پودے مرجھا گئے تھے۔ علیزہ نے بوتل میں پانی لا کر پودوں کو پانی دیا۔ قریب ہی کپڑے سکھانے کا ایک اسٹینڈ رکھا ہوا تھا۔ وہ بڑے پیار سے اسٹینڈ کو ایسے سہلانے لگی جیسے وہ کوئی ذی روح ہو۔ اسے اپنے شوہر سے بے تحاشا محبت تھی۔ اس لیے شوہر سے جڑی ہر چیز سے علیزہ کو محبت تھی۔

''علیزہ چائے تیار ہو گئی؟'' فرحان کی آواز آئی۔

''جی ہاں، دم دے کر ٹیبل پر رکھ دیا ہے۔ ابھی سبزی وغیرہ تو کچھ ہے نہیں اس لیے بریڈ مکھن اور آملیٹ کا ناشتہ لگایا ہے۔''

''جیسی مرضی میری سرکار کی۔'' فرحان نے ہنستے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

''کتنی صبح اٹھ کر نہائی تھی؟''

''فرحان! میں نماز کی پابند ہوں، فجر تو ہرگز قضا نہیں ہوتی۔''

''اچھا'' فرحان کے لہجے میں شوخی تھی۔ علیزہ ناز سے اتراتی ہوئی بولی۔ ''جانتی ہوں بڑی رہوں گی تو تمھاری شرارتیں چلتی رہیں گی، اس لیے اذان کی آواز ملتے ہی جھٹ پٹ نہا کر نماز ادا کر لی''

''مگر میں تو تھوڑا کاہل ہوں۔ کل کے سفر کی تھکان بھی تو تھی۔''

''آٹھ بج رہے ہیں۔ آپ کو کب نکلنا ہے؟''

''مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔''

''کیا مطلب''

''میں وہاں تمھیں سب کی نظروں سے دور اپنے قریب رکھنا چاہتا تھا اس لیے یہاں آ گیا۔''

''ارے آپ مجھے تو سچ بتا دیتے۔ میں تو پریشان ہو گئی کہ ایسا کون سا ضروری کام آن پڑا۔''

اسے فرحان کے ساتھ تنہائی میں وقت گزارنا تو اچھا لگ رہا تھا مگر اس طرح بھرے پرے ماحول سے نکل کر یہاں آنا اسے اچھا نہیں لگا۔ سب سے بری بات جو اسے فرحان کی لگی کہ اتنا ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سیدھے سیدھے وہ اسے اعتماد میں لے کر سچ بتاتا اور وہ دونوں مل کر اطمینان سے رخصت ہوتے نہ کہ اتنی عجلت اور الجھن میں۔ ایک دن فرحان علیزہ کو فلم دکھانے بے حد پیار سے اپنے ساتھ لے گیا۔ فلم دیکھنے کے درمیان وہ بہت جذباتی ہو کر علیزہ سے بولا۔ ''علیزہ! میرے ساتھ کبھی دغا مت کرنا۔ تمھارا جسم میرا ہے، تمھارے خیالات میرے ہیں، تمھاری فکر میری ہے، تمھارا وجود الگ سے کچھ نہیں، تم میرے وجود کا ہی ایک حصہ ہو۔''

علیزہ نے بھی پیار سے اس کا ہاتھ دبایا۔ ''پگلے! میں تو مکمل طور پر تمھاری ہوں۔ جسم و جان، دل و دماغ سب کچھ بغیر تقسیم کیے تمھاری ہی رہوں گی۔''

''میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ'' فرحان کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔ اس کی آواز کی مٹھاس ختم ہو گئی۔

''کیا بچپنا کر رہے ہو۔ یہ اپنا گھر نہیں ہے پبلک پلیس ہے۔ پکچر ہال میں بیٹھ کر میں تمھارے ہاتھ پر سر رکھ کر قسم کھاؤں گی تو تماشا بنے گا۔ اور پھر قسم کھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے قول پر کیا تمھیں بھروسہ نہیں''

''میں کہتا ہوں میرے ہاتھ پر رکھ کر قسم کھاؤ، مجھے تم پر بھروسہ ہے لیکن دوسروں پر نہیں جو ہمارے ارد گرد رہتے ہیں۔''

''کیا بکواس کرتے ہو فرحان، تم یہ کہہ کر میری توہین کر رہے ہو۔''

علیزہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ فرحان کا اشارا اعیان کی طرف ہے۔

''تم قسم کھاتی ہو یا نہیں؟''

''بات سمجھنے کی کوشش کرو فرحان'' علیزہ نے ملائمیت سے کہا

''بس بہت سمجھ چکا۔'' فرحان تیزی سے اٹھا اور پکچر ہال سے باہر جانے لگا۔ فرحان کو منانے کی کوشش کرتی ہوئی وہ بھی اس کے پیچھے بھاگی۔ سڑک پر آ کر فرحان کے غصے میں بائیک اسٹارٹ کرنے کے لیے مارنا شروع کیا۔

''لو میں قسم کھاتی ہو کہ........''

فرحان نے علیزہ کا ہاتھ پکڑ کر جھٹک دیا۔ بائیک کے ہینڈل سے ٹکرا کر کئی چوڑیاں ایک ساتھ ٹوٹ گئیں۔ فرحان نے اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی کہ پیچھے مڑ کر علیزہ کی کلائی میں پڑی کھرونچ سے رستے خون کو صاف کر دیتا۔ بائیک اسٹارٹ ہو کر آگے کی طرف روکی۔ علیزہ سب کچھ بھول کر جھٹ اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ راستے بھر دونوں

چپ رہے۔ گھر پہنچ کر بھی خاموشی طاری رہی۔ رات کا وقت بے حد خاموشی کے دوران ہی گزرا۔

بستر پر دونوں ہی اپنا اپنا منہ پھیر کر کروٹ لیٹے رہے۔ کچھ سوچتے کچھ کچھ نیند کی گرفت میں آتے جاتے دونوں نے ہی رات گزار دی۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی علیزہ نے بستر چھوڑ دیا۔ آج وہ بنا نہائے نماز ادا کر رہی تھی جبکہ فرحان مرزا نے سر سے لے کر پاؤں تک چادر تان لی۔ وہ صبح گیارہ بجے تک سوتا رہا۔ اور علیزہ .... علیزہ کے لیے پندرہ گھنٹے کسی قیامت سے کم نہیں گزرے۔ وہ فرحان کو سمجھنے میں بار بار خود کو ناکام پا رہی تھی اور جو سمجھ رہی تھی اسے سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ اب آخری منزل تک کا سفر اسے فرحان مرزا کے سائے میں ہی گزارنا تھا۔ وہ بار بار کمرے میں جاتی، کچھ دیر فرحان کو دیکھتی یہ جاننے کے لیے کہ وہ جاگ رہا ہے کہ سو رہا ہے۔ پھر کچھ کہے بغیر اپنے ذہنی انتشار میں الجھی باورچی خانے میں آ جاتی۔ بلقیس باجی سے اس نے جو کچھ سنا تھا وہ سارے کھانے فرحان کی پسند کے مطابق بنا رہی تھی۔ اس نے نہا کر فرحان کی پسند کی گلابی ساڑی پہنی کھلے بالوں کا ہلکا سا جوڑا باندھا، ہونٹوں پر گلابی لپ اسٹک لگائی اور کئی بار خود کو آئینے میں نہارا کہ کہیں سے کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے۔ آنکھوں میں لگا ہوا موٹا کاجل اس کے حسن کو بڑھا رہا تھا بالوں کی ایک لمبی گھنگھریالی لٹ گالوں سے جھولتی ہوئی گردن تک آ رہی تھی۔ فرحان کو علیزہ کو یہ لٹ کافی رومانٹک بناتی تھی۔ وہ اپنی انگلیوں میں ان بالوں کے لچھے بناتا اور کھولتا پھر جھٹکے سے اسے پشت کی طرف پھینک دیتا۔ جب اس کا موڈ ٹھیک رہتا تو وہ علیزہ کو اسی طرح نہارتا جیسے ایک پجاری نہایت عقیدت سے اپنی دیوی کو نہارتا ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے تک فرحان کی نیند ٹوٹی۔ اس درمیان علیزہ ہر پل اس خوف میں جیتی رہی کہ اگر آرام کے بعد بھی فرحان مرزا کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا تو وہ کیا کرے گی۔

(۳)

یہ زندگی اور یہ جہان دونوں ہی وقت کے گرداب میں چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ جبکہ وقت سب سے بے نیاز صرف رفتار جانتا ہے، ریت گھڑی کی طرح پل پل جھڑتے لمحوں کا احساس جانتا ہے۔ رفتہ رفتہ ڈھائی سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس درمیان علیزہ نے زندگی کے بہت سے تجربے سیکھ لیے، رشتوں کی گہرائیاں سمجھیں۔

اعیان اور فرحان کے بیچ وہ کسی گھن کی طرح پس رہی تھی۔ دن رات کی ذہنی اذیتوں سے جہاں اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی وہیں فرحان بھی چڑچڑا اور بدمزاج ہو رہا تھا۔ اعیان کو اس نے کبھی اپنا سمجھا ہی نہیں اور علیزہ اس کے شک کے گھیرے میں رہتی تھی جس پر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر علیزہ اور فرحان کا جھگڑا ہو جاتا۔ ہفتوں ہفتوں بات چیت بند رہتی، ایسے موقعے پر اعیان کسی بڑے کی طرح بیچ میں پڑ کر معاملہ سلجھانے کی کوشش کرتا۔ زندگی ایسے ہی کبھی میٹھی کبھی کڑوی ہو کر گزر رہی تھی۔ اس دن بہت معمولی بات پر علیزہ پھپھک کر رو اٹھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ فرحان نے کھانا مانگا اور علیزہ اس وقت کپڑے دھو رہی تھی مگر جب صحت ساتھ نہ دے تو معمولی کام بھی پہاڑ لگتا ہے۔ علیزہ نے تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میری قسمت ہی خراب ہے........''

فرحان نے اس کا جملہ پورا کیا۔ '' جو مجھ جیسا شوہر تم کو ملا۔ میں تو پہلے دن سے تمھاری نگاہ پہچان رہا ہوں۔ تمھیں تو اعیان جیسا مرد چاہیے تھا۔ خوش مزاج جو تمھاری زندگی کو ایک لانگ پکنک بنا دے۔''

علیزہ روتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ 'میں تم سے کچھ نہیں کہنا چاہتی......''

بستر پر لیٹ کر وہ کافی دیر تک سسکتی رہی۔ اچانک اسے اپنے کندھے پر فرحان کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے آنکھ کھول کر دیکھا، وہ گرما گرم کافی کا کپ لیے کھڑا تھا۔ ''لو کافی پیو، زیادہ روؤ گی تو طبعیت خراب ہو جائے گی۔''

'فرحان!' علیزہ سسکتی ہوئی فرحان کے سینے سے لگ گئی۔ اور کافی دیر تک روتی رہی۔ اچانک اسے اپنی پیشانی اور چہرے پر نمی محسوس ہوئی۔ یہ فرحان کے آنسو تھے جو اسے بھگو رہے تھے۔

''علیزہ! میں تم سے بے تحاشہ محبت کرتا ہوں، تمہارے بغیر میں جی ہی نہیں سکتا، تم ہی تو ایک ہو جسے میں مکمل طور پر اپنا کہ سکتا ہوں۔ تمھارے ساتھ میں کسی کا شیئر برداشت نہیں کر سکتا۔''

''فرحان میں تو تمھاری ہی ہوں، اس بات کا یقین تمھیں کیوں نہیں آتا ہے۔''

''یقین ہے نا، مگر......''

اچانک ڈور بیل بجی۔ فرحان نے دروازہ کھولا۔ شام کے دھندلکے میں اعیان ہاتھ میں کئی پیکٹ لیے کھڑا تھا۔ سلام دعا کے بعد وہ اندر آیا اور علیزہ کو آواز دینے لگا۔ ''بھابی کہاں ہو بھابی؟''

علیزہ اپنے آپ کو سنبھال کر باہر آئی۔ ''کیا ہوا اعیان؟''

''یہ لو بھابی، ایک نیا ریسٹورنٹ کھلا ہے۔ میں وہاں سے اپنے تینوں کے لیے کھانے پیک کروا آیا ہوں۔ آج کھانا بنانے سے آپ کی چھٹی۔''

باورچی خانے میں جا کر جب علیزہ نے پیکٹ کھولا تو اسے دیکھ کر یہ اچھا لگا کہ سبھی کھانے وہ فرحان کی پسند کا لایا تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ تینوں کھانے کی میز پر آ گئے۔ روز کی بہ نسبت آج ماحول خوشگوار تھا۔ کیونکہ فرحان مرزا آج خوش تھا۔ ریلیکس تھا اور ہنسنے بولنے کے موڈ میں تھا۔

دس گیارہ بجے رات تک گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر وہ دونوں کمرے میں سونے کے لیے چل گئے۔

وقت گزرتا رہا۔ پچھلے دو ڈھائی برسوں میں اگر علیزہ نے کہیں کچھ شیئر کیا تو اپنی الجھنوں، اپنی پریشانیوں اور دو مردوں کے بیچ اپنے ذہنی انتشار کو کہیں بانٹا تھا تو وہ تھی تانیہ جو اب ڈاکٹر تانیہ ماتھر کے نام سے جانی جاتی تھی۔ علیزہ کے لیے تو وہ تنو تھی۔ تنو ہر بار علیزہ کو یہی سمجھاتی۔ 'عقلمندی سے مسئلے کو ڈیل کرو۔ فرحان تمھارا شوہر ہے تو اعیان دیور۔۔۔ دونوں سے میں ملی ہوں دونوں اچھے انسان ہیں۔ کتنے سلجھے ہیں، یہ تمھیں جاننا سمجھنا ہے۔'

علیزہ نے بھی انھیں جاننے اور سمجھنے میں کوئی کوتاہی نہیں مگر کرے تو کیا کرے۔ شوہر جب حاکم بن جائے تو عورت کی ذہنیت غلاموں کی سی ہو جاتی ہے۔ یہ بات ڈاکٹر تانیہ ماتھر کیسے سمجھتی جبکہ اس طرح کے حالات اس نے کبھی دیکھے جانے ہی نہیں۔

دوپہر کا وقت ایک ایسا وقت ہوتا تھا جب علیزہ اپنے کو پوری طرح سے آزاد محسوس کرتی۔ اسی درمیان وہ موبائل فون سے یا پھر ای میل چیٹنگ سے تانیہ سے رابطہ قائم کرتی۔ ہاں علیزہ بات چیت کے بعد کمپیوٹر ہو یا

موبائل وہ اپنی بات چیت یا فون کال کو ڈیلیٹ کرنا نہ بھولتی ۔ جانتی تھی فرحان مرزا شکی مزاج انسان ہے اور اکثر وہ ان چیزوں کو چیک کیا کرتا ہے۔

ثانیہ یہ جان کر حیران ہوگئی تھی کہ رات کی تنہائی میں جبکہ میاں بیوی بستر پر ہوتے ہیں اس وقت بھی فرحان مکمل طور پر ان لمحوں کو نہیں جی رہا ہوتا ہے۔ بلکہ ہر لمحے اسے کھٹکے کا احتمال رہتا۔ اور یقین ہوتا کہ اعیان کہیں نہ کہیں سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے یا پھر ان دونوں کی نقل وحرکت کی آہٹ سننے میں لگا ہے۔

اس رات تو حد ہوگئی جب علیزہ اور فرحان بہت قریبی لمحوں کو جی رہے تھے تو اچانک باتھ روم کے نل کے کھلنے کی آواز آئی۔ رات کے پونے بارہ بج رہے تھے۔

'ارے اعیان ابھی تک جاگ رہا ہے۔'

'لگتا تو ہے علیزہ نے جواب دیا۔

چھوٹا سا فلیٹ، گھر میں کہیں کچھ ہو، ہلکی سی آہٹ یا سرسراہٹ بھی پورے گھر میں سنائی دیتی تھی۔ ایسے میں گرتے پانی کا شور بند کمرے تک کیوں نہ پہنچتا۔

'دیکھا! میں کہتا تھا نا کہ اعیان سوتا نہیں۔ وہ ہم دونوں کی خبر گیری میں رہتا ہے۔'

علیزہ خاموش رہی۔ دونوں کے موجزن جذبات برف کے گالے کی طرح بیٹھ چکے تھے۔ چند لمحوں میں پانی کی آواز آنی بند ہوگئی۔ 'دیکھو اب وہ ہم دونوں کی بات چیت سننا چاہتا ہے۔'

فرحان نے اپنے کان باہر ہونے والی قدموں کی آہٹ پر لگا دیے۔ علیزہ خاموش پڑی رہی۔ دونوں اپنی اپنی فکر اور انتشار میں پیاسے ہی سو گئے۔

صبح ناشتے کے دوران بات چیت کے بیچ اعیان علیزہ سے مخاطب ہوا۔ 'بھابی، کل رات آپ کی بات نہ مان کر غلطی کی۔'

فرحان نے جلدی سے کہا۔ ''کون سی بات؟''

'' دراصل بھیا! کل شام میں نے دوستوں کے ساتھ کھا پی لیا تھا، اس لیے رات کا کھانا نہیں کھایا، بھابی نے کہا بھی تھا۔ بارہ بجتے بجتے اتنی شدید بھوک لگی کہ خود کو روک نہ سکا اور باورچی خانے میں جا کر کچھ کھانے کے لیے ڈھونڈنے لگا۔''

''ارے، روٹی کے ڈبے میں صبح کا ایک پراٹھا تو تھا' علیزہ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھابی اسی پراٹھے کو گرم کر کے بالائی کے ساتھ کھایا۔ نیند کی جھونک میں تھوڑی بالائی پیروں پر گر گئی۔ بڑی کوفت ہوئی، رات میں ہی صابن سے پاؤں دھونا پڑا، چکنائی سے چپچپاہٹ ہو رہی تھی۔''

علیزہ نے بے ساختہ کہا ''ہاں میں سن رہی تھی''

''تو آپ نے باہر آ کر میرا حال کیوں نہیں پوچھا بھابی؟''

''ہاں نیند میں تھی نا' علیزہ نے بات سنبھالی

اعیان کے اٹھتے ہی فرحان نے علیزہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ''ہم دونوں میاں بیوی کے درمیان اگر

کوئی بات ہوئی ہو تو تم کیا اسے سب کے بیچ بتاؤ گی؟"

فرحان کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور غصے کی شدت سے لہجہ دھیما مگر سخت تھا۔ علیزہ کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے معافی مانگ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ اسے اعیان پر بے حد افسوس ہو رہا تھا، اگر پورے مرزا گھرانے میں کوئی صحیح معنوں میں عذاب بھری زندگی جی رہا تھا تو وہ تھا اعیان۔ بچپن میں والدین کی محفوظ گود اس سے چھن گئی۔ چچا چچی کی محبت کا سہارا ڈھونڈا تو فرحان مرزا بیچ میں آ گیا۔ بھابی سے اس کو بہت امید تھی مگر وہ کم عقل نہیں تھا جو حالات کی سنجیدگی کو نہ سمجھ رہا ہو۔ باہر دوستوں کی دنیا بنانی چاہی تو دل ان اجنبی لوگوں میں رما نہیں۔ وہ مزاجاً خود میں مرتکز رہنے والا تھا۔ نہ گھر کے اندر اپنا پن تھا اور نہ گھر کے باہر اسے کوئی اپنا نظر آ رہا تھا۔

(۴)

دسمبر کا مہینہ تھا اور کڑاکے کی ٹھنڈ پڑ رہی تھی ساری رات سرد ہوائیں شور مچاتی رہیں۔ یہاں تک کہ صبح سورج بھی ٹھنڈا پڑ کر بادلوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ سڑکوں پر کرفیو سا لگا تھا اکا دکا دکانیں ہی کھلی تھیں ایسے میں فرحان اور اعیان بھی گھر کے اندر قید تھے۔ فرحان تو چھٹیوں میں زیادہ وقت علیزہ کے ساتھ گھر پر ہی گزارتا مگر اعیان ضرور ناشتے کے بعد باہر نکل جاتا اور پھر کبھی شام کو اور کبھی رات آٹھ نو بجے تک گھر لوٹتا۔ فرحان نے کبھی نہیں پوچھا کہ وہ دن بھر کہاں رہتا ہے اور علیزہ چاہتے ہوئے بھی نہیں پوچھ سکی۔ ڈاکٹر ثانیہ نے یہی تو سمجھایا تھا کہ علیزہ ہر لفظ کو تول کر، سوچ سمجھ کر بولنا۔ یہاں تک کہ فرحان کے آگے بھی اپنا حال دل بیان کرنے نہیں بیٹھ جانا۔ الجھا ہوا انسان ہے کس بات کا کون سا مطلب نکال لے اور پھر تمھاری زندگی عذاب بن جائے۔ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا.....'
علیزہ بات کی گہرائی کو سمجھ رہی تھی ابو اور ابو کے بعد امی کی جدائی نے اس کی رہی سہی قوت کو بھی چھین لیا تھا۔ وہ ہر لحظہ خود کو امتحان میں گھری پاتی۔ سیر سپاٹے کے نام پر اب صرف اتنا رہ گیا تھا کہ ایک دو مہینے پر جب کبھی کسی سامان کی خریداری کے لیے نکلنا ہوتا تو وہ فرحان کے ساتھ بائیک پر نکلتی۔ ٹھیلے پر سے چاٹ کھانا اس کی کمزوری تھی۔ کچ کچ پتوں میں گرما گرم آلو کی ٹکی اور چھیٹے کر لیے دیکھ کر اس کے منہ میں پانی آ جاتا پانی کی پھلکیاں کھانے میں بھی وہ کبھی پیچھے نہیں رہتی۔ شروع میں تو اکثر فرحان اسے چاٹ کھلانے کے لیے ہی لے جاتا تھا۔

ایک دن اعیان شام کو آفس سے لوٹتے ہوئے چاٹ کا پیکٹ لے کر آیا اور ہنستے ہوئے بولا 'لیجیے بھابی آپ کی چٹوری چاٹ، بہت دن سے کھانے کے لیے باہر بھی نہیں نکلی ہیں، گرما گرم پیک کروا کر لایا ہوں، جلدی سے کھا لیجیے' علیزہ نے وہیں کرسی پر بیٹھ کر چاٹ کے پتے کھولے اور چٹخارے لے کر کھانے لگی۔ اس نے اسٹول پر پیکٹ رکھے دونوں ٹانگیں تھوڑی پھیلائیں اور جھک کر یوں جلدی جلدی کھانے لگی جیسے لوگ ٹھیلے کے پاس کھڑے ہو کر کھایا کرتے ہیں اسی لمحے فرحان کمرے میں داخل ہوا' ارے چاٹ' اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

علیزہ کے ہاتھ سے چاٹ کا پتہ چھوٹ کر گر گیا اور وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ گھبرا کر بولی۔ 'میں نے نہیں منگوایا تھا، اعیان خود لایا ہے۔"

فرحان کی تیز نگاہیں کبھی اعیان اور کبھی علیزہ کو دیکھ رہی تھیں۔ علیزہ سہمی کھڑی تھی اور اعیان بے حد شرمندہ ہو رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بند کمرے میں ان دونوں کے بیچ کیا ہوتا ہے۔ مگر اکثر اس نے ایسی آوازیں سنی

تھیں جیسی دھنیا کے روئی دھونے کے وقت نکلتی ہیں۔اس کے بعد دیر تک اس کے کانوں میں ہلکی سسکیاں سنائی دیتی رہتیں۔ ایک بار جب برداشت نہیں ہوا اور روئی کوٹنے جیسی آوازیں بند نہیں ہوئیں تو اس نے دروازے پر ایک ساتھ کئی دستک دے ڈالی مگر دروازہ نہیں کھلا۔

اس بات کو بھی چھ مہینے گزر گئے۔اعیان نے کئی بار علیزہ کو تنہائی میں یہ سمجھانا چاہا کہ وہ فرحان کی بے جا زیادتیوں کو برداشت نہ کرے۔دنیا میں ہر شخص اکیلا ہے اس لیے وہ بھی اپنے کو تنہا محسوس نہ کرے مگر کلمات اس کے ہونٹوں تک آتے آتے دم توڑ جاتے۔علیزہ سے اسے بے حد ہمدردی تھی۔وہ اسے ایک مضبوط اور بولڈ عورت بنانا چاہتا تھا مگر رشتے کی نزاکت اس کے قدموں کی بیڑی بنی رہتی۔

''علیزہ آج تو موسم کا تقاضا ہے کہ گرما گرم پیاز اور بیسن کی پکوڑیاں کھائی جائیں۔کیوں اعیان! تمھارا کیا خیال ہے؟''

فرحان سیدھا اعیان سے مخاطب تھا اس کا موڈ خوشگوار تھا۔موسم کا مزاج اچھا تھا۔اور پھر چھٹی کا دن۔ وہ صبح سے صوفے پر کمبل اوڑھے لیٹا تھا اور اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔بارش کی ہلکی پھواریں بھی شروع ہو چکی تھیں۔

''کیوں نہیں بھائی! پکوڑیاں ضرور بنی چاہئے،چلیے بھابی آپ بیسن پھینٹیے،میں پیاز اور مرچے کاٹ کر آپ کو دیتا ہوں۔''علیزہ بے نیازی کے عالم میں اٹھ کر باورچی خانے میں جانے لگی۔اس نے جیسے سوچنا ہی بند کر دیا تھا۔نہ کہیں اپنی رائے اپنا مشورہ اور نہ کہیں اپنی مرضی اپنی پسند۔اعیان کو عورت کی یہ خود سپردگی کبھی نہیں بھائی۔اکی ماں نے بھی تو بہت جلدی حالات کے آگے سمجھوتہ کر کے گھٹنے ٹیک دیے تھے اور پھر بجائے جدو جہد کے فراری کی راہ اختیار کی تھی۔معصوم اعیان ماں کی کمزور فطرت کا شکار ہو گیا۔

''بھابی کتنی پیاز کاٹنی ہے۔؟''

''دو تین لے لو کافی ہوگی،ہری مرچ ڈلیے میں رکھی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

علیزہ نے جلدی جلدی پکوڑیاں چھانیں،ہری دھنیے کی چٹنی کے ساتھ چائے کی ٹرے لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔خوشگوار ماحول میں کھایا پیا گیا۔

''بھائی! آپ کو کمپیوٹر پر کام نہ کرنا ہو تو میں فیس بک پر تھوڑی دیر گوسپ کر لوں؟''

''ٹھیک ہے تم کمپیوٹر ٹیبل پر جاؤ اور میں کمرے میں جا کر لیٹتا ہوں۔آؤ علیزہ!''

علیزہ فرحان کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی گئی۔

شام کے چھ بج رہے تھے۔ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔سرد ہوائیں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اندھیرا گہراتا جا رہا تھا۔اچانک تیز آواز میں بجلی کڑکی اور لائٹ چلی گئی۔بیٹری پرانی ہو جانے کی وجہ سے انورٹر پہلے سے ہی خراب تھا۔گھر میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔اعیان نے اٹھ کر ایمر جنسی لائٹ جلائی اور اپنے دیوان پر لیٹ کر موبائل پر گانا سننے لگا۔ہلکی روشنی دروازے کی جھری سے فرحان کے کمرے میں بھی پہنچ رہی تھی۔

علیزہ فرحان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اور فرحان کی انگلیاں اس کے بدن سے کھیل رہی تھیں۔علیزہ کا ذہن کل تانیہ سے ہوئی بات چیت میں الجھا ہوا تھا۔وہ ایک دو دن کی چھٹی گزارنے کے لیے اس کے پاس آنا چاہتی تھی، اس کے پاس ٹھہرنا چاہتی تھی تا کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لے سکے۔ وہ جانتی تھی کہ علیزہ بے حد حساس لڑکی ہے، وہ اپنا درد کسی کو نہیں بانٹے گی اور ایک دن کوئی بڑی بیماری لگا لے گی۔ ڈاکٹر تانیہ اس لیے بھی پریشان تھی کہ وقت گزرتا جارہا تھا اور علیزہ ابھی تک ماں نہیں بن سکی تھی۔

تانیہ کی جاننے والی کئی لیڈی ڈاکٹر بھی تھیں وہ علیزہ کا میڈیکل ٹیسٹ کرانا چاہتی تھی تا کہ جان سکے کہ حمل نہ ٹھہرنے کا سبب کیا ہے۔ یہ علیزہ کے لیے مشکل ترین مرحلہ تھا۔ وہ فرحان کے مزاج کو بھی سمجھتی تھی اور اپنی مجبوریاں بھی جانتی تھیں۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں فرحان کی وجہ سے وہ اپنی اس اکلوتی سہیلی کو ہی نہ کھو بیٹھے۔ کہیں اس کی زندگی کی ہر راہ گہرے اندھیارے میں نہ ڈوب جائے، یوں بھی فرحان اسے لوگوں سے ملنے جلنے نہیں دیتا۔ اس کا کہنا تھا کہ دوسرے لوگ میاں بیوی کے رشتوں میں آگ پیدا کرتے ہیں۔

اچانک دروازے پر تیز دستک ہوئی، کہیں دور بجلی کڑک کر گری اور زوردار دھماکے کی آواز ہوئی۔ خیالات کے جنگل میں بھٹکتی علیزہ جیسے یکدم ہوش میں آگئی۔ 'ارے اس کا جسم کپڑوں سے کب جدا ہو گیا اور کب وہ فرحان کے برہنہ جسم کے نیچے آگئی اس کا اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ دماغ اور جسم آپس میں کتنے الگ تھلگ پڑ گئے تھے۔ دستک تیز ہوتی جارہی تھی اور پھر اعیان کی آواز آئی۔ ''بھائی! جلدی دروازہ کھولو''

''کمبخت چین نہیں ہے اس کو۔''

''بھابی! جلدی کیجیے، دروازہ کھولیے'' اعیان کی آواز اس بار اور اونچی تھی۔ غالباً وہ سمجھ رہا تھا کہ پانی کے شور کی وجہ سے اس کی آواز اندر نہیں پہنچ رہی تھی۔

''بھائی......'' اعیان کی آواز اور تیز ہوئی۔

''کم بخت جینے نہیں دے گا۔''

فرحان کا جسم مٹی کے تودے طرح علیزہ کے پہلو میں ڈھ گیا۔ علیزہ ساکت پڑی تھی اس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' فرحان نے لیٹے لیٹے ہی غرا کر پوچھا

''امی جان کا فون ہے، وہ آپ سے اسی وقت کچھ ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔ فون لائن پر موجود ہیں۔''

''اٹھو علیزہ دروازہ کھولو اور موبائل لا کر مجھے دو''

'ارے فرحان میں اس حالت میں کیسے جاؤں گی' علیزہ کی نگاہ اپنے جسم پر تھی اور وہ چادر سے خود کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

فرحان نے اپنے اوپر گاؤن ڈالا اور بڑبڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے موبائل لیا اور دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ امی کی روتی ہوئی آواز آئی۔ ''فرحان بیٹا فوراً آجاؤ تمھارے ابی کی اچانک

طبیعت بگڑ گئی ہے، وہ تمھیں یاد کر رہے ہیں، بلقیس کے میاں نے انھیں اسپتال میں بھرتی کروا دیا ہے۔ میں اسپتال سے ہی بول رہی ہوں..."

اس کے آگے فرحان کچھ نہیں سن سکے کیونکہ ماں کی آواز رونے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ پل بھر میں فرحان کی دنیا الٹ پلٹ گئی۔ "امی میں فوراً پہنچتا ہوں، آپ پریشان مت ہوئیے گا۔"

فون کاٹ کر فرحان نے اعیان کو آواز دی۔ "اعیان میں گھر جا رہا ہوں۔"

اعیان جو دروازے پر ہی کھڑا تھا، کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ فرحان کے والد اس کے سگے ابا نہیں تھے مگر اعیان نے کبھی خود کو ان کی اولاد سے کم نہیں سمجھا۔ ان کا شفیق اور سنجیدہ چہرہ بار بار اعیان کے سامنے آ رہا تھا۔

علیزہ کی حالت بدتر ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ پا رہی تھی نہ کچھ بول پا رہی تھی۔ اس نے نیند کا ناٹک کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ آنسوؤں سے بھیگتی اس کی پتلیاں بند پلکوں میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

"بھابی کو تو جگا دیجیے" اعیان کی آواز علیزہ کے کانوں میں آئی اور فرحان کو پھر جیسے ہوش آ گیا۔

وہ اعیان کی کلائی پکڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ "بھائی! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" اعیان بچوں کی طرح بلک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ فرحان بھی کم پریشان نہیں تھا۔ پہلی بار خود کے بڑا ہونے کا اسے احساس ہوا۔ وہ اپنے کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "نہیں اعیان ابھی رات کے نو بج رہے ہیں، اندھیرا ہے، بارش ہے ایسے میں علیزہ کو ساتھ لے کر نکلنا مشکل ہے، بس ٹیکسی کیا ملے گی، کچھ نہیں معلوم، تم علیزہ کے ساتھ یہیں رہو اور میرے فون کا انتظار کرو، میں جیسا کہوں گا ویسا کرنا۔"

اعیان بے بسی سے فرحان کو تکتا رہا، تبھی علیزہ کمرے سے باہر نکلی۔

"فرحان ہم تینوں ایک ساتھ نکلتے ہیں، جیسا ہو گا دیکھ لیں گے۔"

"نہیں اس وقت تمھیں لے کر جانا ممکن نہیں ہے، میں کسی طرح دوڑ بھاگ کر کے جو گاڑی جہاں سے ملے گی کر لوں گا۔" "تم دونوں میرے فون کا انتظار کرو بس۔...."

فرحان نے زوردار لہجے میں کہا اور ایک جوڑے کپڑے کے ساتھ جتنے روپے اس وقت اعیان اور اس کے پاس تھے سب پرس میں ڈالا اور رین کوٹ لے کر سڑک کے باہر آ گیا۔

بارش کی وجہ سے بس اسٹینڈ تک بھی پہنچنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے ایک گاڑی سے لفٹ مانگی اور کسی طرح بس اسٹینڈ تک پہنچا۔ ایک رینگتی ہوئی بس ملی۔ فرحان جھٹ سے اس پر سوار ہو گیا۔ کم لوگ تھے اس لیے جگہ بھی مل گئی۔

تھوڑی دیر میں بس نے اپنی اسپیڈ پکڑ لی۔ فرحان کی آنکھوں کے سامنے بار بار اپنے باپ کا شفیق چہرہ سامنے آ رہا تھا۔ اسے ماں سے زیادہ باپ سے انسیت تھی۔ اس کے ذہن میں جتنی خوبصورت یادیں محفوظ تھیں ان میں باپ کا فریم ہی نظر آتا۔ ماں تو پیار کے بٹوارے میں اعیان کے ساتھ لگی تھی۔ ایسا وہ ہمیشہ محسوس کرتا۔ وہ عید اس کے لیے یادگار تھی جب پانچ چھ سال کی عمر میں وہ اپنے ابو کے ساتھ عید گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ اس عید پر اعیان

اس کے ساتھ نہیں تھا۔ تیز بخار کی وجہ سے ننھے اعیان کا جسم تپ رہا تھا اور ماں اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھ رہی تھی۔ ابو نے ہی اسے نہلا کر تیار کرایا۔ سفید کرتا پائجامہ ٹوپی گہرے نیلے رنگ کی جیکٹ پہننے کے بعد وہ خود پر اترا رہا تھا۔ اتراہٹ اس لیے بھی تھی کہ مقابلہ کرنے کے لیے کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ جب وہ ابو کی انگلی پکڑ کر گھر سے باہر نکل رہا تھا تبھی اس کے کانوں میں ماں کی آواز آئی۔ ارے بچے کی آنکھوں میں سرمہ تو لگا دیجیے، سنتے ہی ماں بھاگ کر آئی اور سرمہ اس کی آنکھوں میں ڈال دیا۔

عید کی نماز کے بعد جب وہ گھر کی طرف اپنے ابی کے ساتھ بڑھا تو راستے میں نہ جانے کتنے رشتہ دار، ابی کے جاننے والے اس کے ہاتھ میں عیدی کے روپے پکڑاتے جاتے۔ اس کے دونوں مٹھیاں روپوں سے بھر گئی تھیں۔ اگر اعیان ساتھ ہوتا تو یقیناً یہ روپے بھی آدھے ہو جاتے۔ گھر پر ماں نے روپے جوڑ کر بتائے کہ پورے دو سو ساٹھ تھے۔ اس دن ننھا فرحان اپنے آپ کو کسی راجہ سے کم نہیں سمجھ رہا تھا۔

'بھائی صاحب، کھڑکی کا شیشہ گرا دیجیے، ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔'' فرحان نے ایک نظر اس مسافر پر ڈالی اور شیشہ بند کر دیا حالانکہ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اور لگ رہا تھا کہ ہوا میں آکسیجن کی کمی ہو رہی ہے۔ اسی لیے اس نے شیشہ کھسکا دیا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکے سے بارش کی پھواریں اسے کافی حد تک بھگو چکی تھیں مگر اسے ہوش کہاں تھا۔ اس نے بغل میں بیٹھے مسافر سے پوچھا۔'' کون سی جگہ ہم لوگ پہنچے؟'' اندھیرے اور بارش کی وجہ سے معلوم نہیں ہو رہا ہے۔

اچانک فرحان کا موبائل گنگنا اٹھا۔ اور اسی کے ساتھ فرحان کو اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی سی لگی۔ جلدی سے اس نے فون ریسیو کیا۔ 'ہاں امی بولیے'

'بیٹا ڈاکٹر نے تمھارے ابی کو خطرے سے باہر بتایا ہے'

'اللہ تیرا شکر ہے' فرحان نے ایک گہری سانس لی۔

'تم آ رہے ہو نا؟'

'جی امی، میں راستے میں ہوں اور آدھے سے زیادہ سفر پار کر چکا ہوں۔''

''علیزہ اور اعیان بھی ساتھ میں ہے نا؟''

'' نہیں امی، یہاں کا موسم بہت خراب تھا۔ علیزہ کو ساتھ لے کر نکلنا مناسب نہیں تھا۔ علیزہ کی وجہ سے میں نے اعیان کو ہی بعد میں آنے کے لیے کہا ہے''

خدا حافظ کہہ کر باتوں کا سلسلہ ختم ہوا۔

وقت گزرتا رہا اور فرحان حال اور ماضی کے درمیان غوطے لگاتا رہا۔ اچانک ایک جھٹکے سے بس رک گئی۔ 'ارے کیا بس پنکچر ہو گئی' فرحان نے گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ کئی مسافر ہنس پڑے۔ کنڈکٹر کی ہنستی ہوئی آواز آئی۔' بابو جی رائے بریلی آ گیا ہے۔'

'ارے؟' فرحان اپنا بیگ لے کر بس سے نیچے اترا اور ایک ٹیکسی پکڑ کر سیدھے اسپتال پہنچ گیا۔ وہیں سے اس نے ماں کو فون ملایا۔' امی! میں آ گیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا میں آئی سی یو کے باہر ہی بیٹھی ہوں''

تھوڑی دیر میں فرحان اپنی ماں کے سامنے کھڑا تھا۔ جوان بیٹے کو سامنے کھڑا دیکھ کر ماں کا صبر ٹوٹ گیا۔ وہ اس کے سینے سے لگ کر پھپھک کر رونے لگی۔ فرحان خود بھی اندر ہی اندر سسک رہا تھا۔ مگر ماں کو سنبھالنے کے لیے خود کو پتھر بنائے ہوئے تھا اور بہن کو بھی سنبھال رہا تھا۔

''ماں سب ٹھیک ہو جائے گا..... میں آ گیا ہوں نا''

تبھی سامنے سے بلقیس باجی کے شوہر آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ گھر سے چائے بسکٹ وغیرہ لے کر آئے تھے۔

''ماں! میں پہلے ڈاکٹر سے مل لوں پھر چائے پیتا ہوں۔''

ڈاکٹر سے ملنے کے بعد فرحان کو کافی راحت محسوس ہوئی۔ مائنر ہارٹ اٹیک تھا اب وہ خطرے سے باہر تھے۔ صحیح وقت پر صحیح ٹریٹمنٹ سے اس کے ابو جلد ہی سنبھل گئے تھے۔ اس کے لیے وہ تہہ دل سے بلقیس باجی اور اس کے شوہر کا شکر گزار تھا۔ اپنوں کی اور رشتہ داروں کی ضرورت شاید ایسے ہی موقعوں پر پڑتی ہے۔

ادھر علیزہ اور اعیان فرحان کے فون کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ مگر اس نے فون نہیں کیا۔ کئی بار علیزہ نے امی کو فون ملایا مگر موبائل سوئچ آف ملا۔

'بھائی لگتا ہے امی جان کے موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہوگی۔ اتنی پریشانی میں کسے ہوش رہتا ہے کہ موبائل چارج کرے۔'

'ہاں لگتا تو یہی ہے۔ کیا ہم لوگوں کو نکلنا چاہیے؟'

''پہلے میں بھائی سے بات کرلوں۔''

اعیان فرحان کے مزاج کو سمجھتا تھا اور کسی کام میں پہل کرنے سے پہلے اس سے بات ضرور کر لیتا تھا۔

مرزا گھرانے کے اوپر سے ایک بھاری مصیبت ٹل گئی تھی۔ سبھی نے راحت کی سانس لی۔ فرحان نے آئی سی یو میں جا کر خود ہی ابی سے بات کی تو اسے بڑی راحت ملی۔ 'بہو اور اعیان نہیں آئے' فرحان کے والد نے بڑے دھیمے سے پوچھا۔

''نہیں ابو میں اتنی عجلت میں نکلا تھا کہ سب کو ساتھ میں لے کر نکلنے میں بہت دشواری ہوتی۔ اور مجھے یہاں پہنچنے میں تاخیر ہوتی۔''

''بیٹا! وہاں بہو اکیلی ہے، اب تو میں سنبھل چکا ہوں، تم واپس چلے جاؤ''

''نہیں ابی! میں آپ کو اسپتال میں چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں گا۔''

''میں تو ہوں نا'' بلقیس باجی کے شوہر نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا'' وہ دونوں بھی بہت پریشان ہوں گے، تم جاؤ اور پھر پندرہ بیس دن کا وقت لے کر ان کے ساتھ واپس آؤ کیونکہ گھر کے ماحول کو بدلنے کے لیے سب کا ساتھ ہونا بے حد ضروری ہے۔''

''ہاں بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم اطمینان سے جاؤ''

''ٹھیک ہے ابو ایک دو دن رک کر پھر جاتا ہوں اور پھر انشاءاللہ جلد ہی لوٹوں گا۔''

''انھیں فون کر دیا ہے'' فرحان کے والد نے پوچھا

''کر دیتا ہوں، ابھی موبائل میں بیلینس ختم ہو گیا ہے''

ایک دو دن رکنے کے بعد اجازت لے کر فرحان رائے بریلی سے لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

(۵)

بھائی کا فون آنے کے باوجود اعیان شدید الجھن میں تھا۔ علیزہ کے لیے یہ لحات بہت بھاری تھے۔ والدین کی محرومی کا درد وہ جانتی تھی۔ کبھی وہ فرحان کے ابو کو یاد کرتی اور کبھی اپنے ابی کی یاد میں آنسو بہاتی۔ جب سے فرحان گیا تھا وہ نماز کی چوکی پر بیٹھی صرف دعا ہی تو مانگ رہی تھی۔ باورچی خانے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اعیان نے کہیں سے آرڈر کر کے کھانے کا ناشتہ دان منگوا لیا تھا۔ مگر کسی نے منھ میں لقمہ نہیں ڈالا تھا۔ اپنی ذہنی الجھنوں میں مبتلا اعیان تیزی سے بائک چلاتا ہوا اپنے آفس جا رہا تھا کہ اچانک اسے خیال آیا کہ بلقیس باجی کے شوہر کو فون کر کے خیریت معلوم کی جائے۔ بائک کی تیز اسپیڈ ،ٹریفک اور بلقیس باجی کے شوہر سے بات کرتے ہوئے اس نے دھیان ہی نہیں دیا کہ کب وہ ٹریفک سگنل توڑ کر آگے غلط لائن پر آ گیا ہے سامنے سے آتی ہوئی کار نے اسے بھرپور ٹکر ماری اور بائیک اس کے پیروں پر گری اور کچھ دور تک گھسٹتی چلی گئی۔ گھٹنے پر سے جینس پھٹ گئی۔ خون کی لالی کپڑے کے اوپر آ گئی۔ دونوں کہنیاں چھل گئیں اور وہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ وہ تو خیریت رہی کہ موبائل پر اس کی بات چیت ختم ہو چکی تھی ورنہ ایکسیڈنٹ کا علم وہاں بھی لوگوں کو ہو جاتا۔ کافی دیر تک فٹ پاتھ پر بیٹھا کراہتا رہا۔ دو چار لوگ بھی اکٹھا ہو گئے۔ پھر اس نے خود ہی ہمت کی، کھڑا ہوا کسی راہگیر نے بائیک اسٹارٹ کر کے اسے پکڑا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ بائیک چلاتا ہوا گھر تک پہنچ گیا۔

علیزہ جو پہلے سے بے حد پریشان تھی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ اعیان کو اس حال میں دیکھ کر تو اس کے ہوش ہی اڑ گئے۔ وہ اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی مگر اعیان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا اور کراہتا ہوا اپنے دیوان کی طرف بڑھا۔ بدحواسی میں علیزہ دروازے پر چٹخنی چڑھانا بھول گئی اور جلدی سے جا کر اسپرٹ اور روئی لے کر آئی، تب تک اعیان لڑکھڑاتے ہوئے باتھ روم گیا۔ اپنے جوتے موزے اتارے، جینس اتاری، دونوں پیر بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ ایک دو جگہ پر سڑک کی گٹیوں نے دھنس کر زخم کو گہرا کر دیا تھا۔ جگہ جگہ ہاتھ پاؤں میں لگی مٹیاں صاف کیں۔ اور برمودا پہن کر واپس اپنے دیوان پر آ کر بیٹھ گیا۔

''آرام سے لیٹ جاؤ اعیان، میں گرم دودھ میں پھٹکری ڈال کر ابھی دیتی ہوں۔''

''آپ تکلیف نہ کریں بھابی''

''پاگل ہو، تکلیف کیسی؟ میں تمھاری بھاوج ہوں۔ لیٹ جاؤ میں تمھارے زخموں کو صاف کرتی ہوں۔''

تکلیف سے اعیان کا برا حال تھا، وہ بری طرح کراہ رہا تھا۔ اس سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ شاید کولھوں میں بھی جھٹکے لگے تھے۔ وہ آہستہ سے لیٹ گیا۔ علیزہ جھک کر اس کے زخمی حصے کو اسپرٹ سے صاف کرنے لگی۔ تکلیف ضبط کرنے کے لیے اعیان نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں۔ مسلسل ایک کے بعد دیگر بدلتے ہوئے

تکلیف دہ حالات نے اسے بدحواس سا کر دیا تھا اور اس وقت اسے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا اور اعیان کی شدید تکلیف ہی اس کی پوری توجہ کی مرکز تھی۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ فرحان مرزا کب دروازے سے اندر داخل ہوا اور کتنی دیر سے وہ لگاتار جلتی آنکھوں سے ان دونوں کو ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

فرحان نے دیکھا کہ اعیان دیوان پر چت لیٹا ہوا ہے، اس کی دونوں ٹانگیں برہنہ تھیں۔ علیزہ دیوان سے ٹی بیچوں بیچ کھڑی جھک کر کسی عمل میں مصروف ہے۔

فرحان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ غصے اور نفرت سے وہ باؤلا ہوا تھا۔ ”غضب خدا کا، میری غیر موجودگی میں اتنی بے باکی، وہ بھی کھلے دروازے.......... کیا ان لوگوں نے سمجھا ہے ابھی کی جگہ فرحان مر گیا“ اس کی بینائی کے آگے جیسے پردہ پڑ گیا ہو۔ اسے صرف لیٹا ہوا اعیان اور جھکی ہوئی کسی عمل میں مصروف علیزہ ہی نظر آ رہی تھی۔

گزشتہ برسوں میں وہ جس شک وشبہ میں جی رہا تھا، وہ اس کا محض وہم ہی نہیں بلکہ اس کا بے دار شعور تھا جو اسے ہوشیار کرتا رہتا تھا۔ اگر اس نے اپنے اندر کی آواز کو پہلے ہی سن لیا ہوتا تو اب تک وہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر چکا ہوتا۔ ایک عورت اس حد تک بے حیا ہو سکتی ہے اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اپنے خاندان کا وقار رکھنے کے لیے اس نے بہت برداشت کر لیا..... بس! اب اور نہیں......

فرحان کو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف جیسے اندھیرا چھا گیا ہو۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے جسم کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا ہو۔ اس کے کانوں میں اعیان کی کراہ گرم سانسیں بن کر سیسہ سا پگھلا رہی تھیں۔ شلوار سوٹ میں ملبوس اس کی بیوی اسے برہنہ نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اور زیادہ بے حیائی نہیں برداشت کر سکتا تھا۔ یکلخت وہ آگے بڑھا اور پیچھے سے اس نے علیزہ کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر اس کا منھ اپنی طرف گھمایا اور ایک بھرپور زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر مارا۔

”بدبخت عورت! میں تجھے طلاق دیتا ہوں... طلاق دیتا ہوں... طلاق دیتا ہوں...“

.....اور پھر پل بھر میں ایک دنیا تہ وبالا ہو گئی۔ اجڑ گئی دنیا علیزہ کے ساتھ ساتھ فرحان مرزا کی بھی۔

علیزہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ اور سچائی جاننے کے بعد فرحان دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے پر تھپڑ مار رہا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھا ہوا تھا اس کی دونوں ٹانگیں دائیں بائیں پھیلی ہوئیں تھیں اور وہ دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ علیزہ کے بے ہوش جسم پر پچھاڑیں مار کر گر رہا تھا۔ اپنے بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر کھینچ رہا تھا اور خود کو ایذا پہنچا رہا تھا اور اعیان! وہ تو بت بنا اپنے دیوان پر بیٹھا تھا وہ جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی زمین پر بے سدھ پڑی علیزہ کو دیکھتا اور کبھی تڑپتے ہوئے فرحان مرزا کو۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ خالی خالی آنکھوں سے دونوں کو دیکھتے دیکھتے جب تھک گیا تو اپنے دیوان پر ایسے لیٹ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ گہرے صدمے نے اس کے دماغ کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ نیم بے ہوشی کی حالت میں چلا گیا۔

وقت کتنا آگے بڑھ گیا۔ کتنے گھنٹے گزر گئے۔ تینوں کو جیسے کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ دوپہر سے شام، اور شام سے رات ہونے کو آئی۔ موبائل کی گھنٹیاں اعیان کو جیسے کچھ ہوش میں لے آئیں۔ دوسری طرف امی جان تھیں۔

”ہیلو!“ اعیان کی آواز تھی۔

''بیٹے اعیان تم لوگ فون کیوں نہیں اٹھا رہے ہو۔ فرحان گھر پہنچ گئے نا؟''

''جی امی'' اعیان کو اپنی ہی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔

''امی جان! بھائی بھابی ابھی سو رہے ہیں۔''

اعیان نے اندھیرے میں فرش پر پڑے ان دو بے سدھ جسموں کو دیکھا اور جیسے اپنے آپ کو ہی جواب دیا۔

''ٹھیک ہے بیٹا خوش رہو'' امی جان نے فون کاٹ دیا۔

(۲)

........اس کے بعد وہ ہوا جس نے تینوں کی زندگیاں تہ و بالا کر دیں۔ مرزا گھرانے کی عزت رکھنے کے لیے اور فرحان مرزا کو اپنی محبت کو موہوم سے معلوم تک کے لمبے سفر میں زندہ رکھنے کے لیے وہ کرنا پڑا جس کی اجازت شرعی اعتبار سے مذہب اسلام سے حاصل تھی۔ کاٹھ کی پتلی کی طرح عورت کا استعمال ایک بار پھر کیا گیا........ حلالہ.... حلالہ....... کیونکہ کسی بھی قیمت پر فرحان مرزا علیزہ کو اپنی زندگی سے الگ نہیں کر سکتا تھا، یہ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی اور بیوی ہی رہے گی۔ طلاق تو محض جنون تھا، غصہ تھا، شیطانی فعل تھا، اور اپنی سمجھ کا واہمہ تھا....... اب اس کا واحد حل، اس کا ایک ہی راستہ حلالہ ہے۔ جس پر چل کر مرد اس عورت کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہے۔

طلاق ایک جنون ہے تو حلالہ وہ پڑاؤ جہاں جذبات کے نہیں ذہن کے سودے کیے جاتے جاتے ہیں۔ فکر کی بساط پر عورت ایک پانسے کی طرح پھینکی جاتی ہے۔ صدیوں سے ایسا ہوتا آ رہا ہے اور صدیوں تک ایسا ہوتا رہے گا۔ جب جب مرد کے جنون کے آگے عورت کا وجود منتشر ہوگا تو ان چیتھڑوں میں بکھرے ہوئے اس کے وجود کو سمیٹنے کے لیے مرد حلالہ کی چال چلے گا...... یہی تو فرحان کو سمجھایا گیا تھا۔ اور فرحان نے اس کے لیے تمام منتوں کے بعد آخرکار اعیان کو رضامند کر ہی لیا۔ مرزا گھرانے کے احسان کو اتارنے کے لیے بھی اعیان کے آگے کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔

کسی نے علیزہ سے نہیں پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ حلالہ کے لیے اس کی رضامندی ہے بھی یا نہیں۔ وہ عدت گزارنے کے بعد اعیان سے نکاح کرے گی بھی یا نہیں۔؟ اعیان سے دوبارہ طلاق لے کر عدت کے دن کہاں کاٹے گی۔ اعیان سے طلاق کے بعد فرحان مرزا سے دوبارہ شادی کرے گی یا نہیں؟ سوالوں کی ایک لمبی جھڑی اور جواب دینے والی دماغی طور پر مفلوج..... صدمے سے ذہن کند پڑ گیا تھا۔ سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ شب و روز کا فرق اس کے لیے مٹ گیا۔ اندر کا کمرہ صرف اس کے لیے خالی کر دیا گیا جہاں وہ تنہا رہ کر عدت کی مدت گزارے گی۔ اور عدت کے دوران فرحان اور اعیان کو باہری کمرے میں رہنا ہوگا۔

گم سم اپنے آپ میں ڈوبی، بکھرے بال، ویران آنکھیں اور زرد چہرے والی پگلی سی دکھنے والی علیزہ کو دونوں مردوں نے مل کر عدت پوری کرنے کے لیے اس طرح کمرے میں لے جا کر چوکی پر بٹھایا جیسے مانجھے میں لے جا کر دلہن بٹھائی جاتی ہے۔

شب کی کھڑکیاں اور دروازے

کتنے گھر باقی ہیں، کتنی دستکیں باقی ہیں اور
تیرا دروازہ کھلے گا، کتنے دروازوں کے بعد

——احمد مشتاق

(۱)

پچھلے ایک مہینے سے فرحان مرزا کا گھر تین زندہ انسانوں کا قبرستان بنا ہوا تھا۔ جہاں نہ کوئی ماتم کرنے والا بچا تھا اور نہ ماتم پرسی کے لیے کوئی آنے والا...... وہ آوازیں جو گھر کو زندگی کا احساس کراتیں، رہنے والوں کو جلا بخشتی تھیں، وہ ناپید ہو چکی تھیں۔ نہ باورچی خانے میں برتنوں کی کھٹر پٹر، نہ تیز تیز چلتے قدموں کی بھاری آہٹ، نہ چوڑیوں کی کھنک، نہ پازیبوں کی جھنک، نہ پکارے جانے والے ناموں کی کوئی بازگشت، گھر کے در و دیوار بھی جیسے سہم گئے ہوں۔ کوئی کسی کو آواز نہیں دیتا تھا۔ کوئی کسی سے کوئی کام نہیں کہتا تھا۔ کہیں اشاروں میں بات ہو جاتی اور کہیں جملوں کے نامکمل الفاظ کی آدھی ادھوری ادائیگی بات کا مفہوم سمجھا جاتی۔

فرحان مرزا گہری شرمندگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ اب وہ کسی کو منھ دکھانے لائق نہیں رہا۔ مرزا گھرانے کی عزت اس نے ڈبو دی۔ باپ کے نام پر کالک لگا دی۔ کاش زندگی کا یہ رنگ دیکھنے سے پہلے اس نے دنیا چھوڑ دی ہوتی۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ بات کھل گئی تو ماں کا سامنا وہ کیسے کرے گا۔ کیسے دے گا ان سوالوں کا جواب جو اس کے رشتہ دار اس سے کریں گے۔ اس نے تو اپنے ساتھ ساتھ اعیان کی کشتی بھی ڈبو دی تھی۔ وہ اعیان سے آنکھیں ملانے کے قابل نہیں رہا۔ اس کا رواں رواں اعیان کا احسان مند تھا۔ اعیان کی شخصیت میں بھی زبردست تبدیلی آئی تھی۔ پچھلے ایک مہینے سے اس کی شگفتگی مٹ چکی تھی۔ نہ کسی سے بولتا، نہ باتیں کرتا، نہ ہنسی مذاق، نہ قہقہے...... ہاں پہلے جہاں وہ کھانے پینے کے سامانوں کے پیکٹس کا انتظام کرتا تھا اب بہت خاموشی سے اس نے ٹفن سروس لگوا لی تھی۔ تین ناشتے دان صبح شام گھر میں آ جاتے۔ نئی ملازمہ جسے اعیان نے ہی گھر کے کام کاج کے لیے رکھا تھا۔ سب کا ٹفن سب کے پاس پہنچا دیتی۔ اور پھر جو جھوٹے بچے کھانوں کا ایک ڈھیر وہ گھر سے جاتے وقت کتے کے آگے ڈال دیتی۔ گھر کے مالکوں کی طرح ملازمہ نے بھی چند دنوں میں گھر کا یہ دستور سیکھ لیا کہ کسی سے کچھ بولنا نہیں، کچھ پوچھنا نہیں اور جو سمجھ میں آئے خاموشی سے کرنا اور چلی جانا۔ اسے صرف گھر کے ضروری کام کے لیے رکھا گیا تھا۔

ذلت کا احساس جہاں اعیان کو جینے نہیں دے رہا تھا وہیں آنے والے وقت کے گرداب میں وہ خود

کو پھنسا ہوا پاتا۔ کیسے کرے گا وہ علیزہ سے نکاح، کیسے بنائے گا اس عورت کو اپنی بیوی جسے وہ بھابی کہہ کر بلایا کرتا تھا۔ وقت کے جبر وستم کو مان کر اگر ایسی عورت کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو فوراً ہی اسے طلاق دے کر اپنے سے جدا کس طرح کیا جائے۔ اکثر اعیان کو لگتا کہ سوچتے سوچتے اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ ساری ساری رات جاگتے رہنا اس کی عادت میں شامل ہو گیا تھا۔ 'واہ ماں واہ! کاش تم نے مجھے پیدا کرتے ہی زہر دے کر مار دیا ہوتا۔ تو آج میں مرزا گھرانے کا قرض دار نہ بنتا'

اعیان کبھی اپنی ماں کو یاد کرتا اور کبھی اپنی قسمت کو کوستا، کبھی فرحان مرزا کو برا بھلا کہتا اور کبھی علیزہ کو......علیزہ کا خیال آتے ہی اس کا ذہن ماؤف ہو جاتا۔ اسے اس کمرے کی طرف دیکھنے میں بھی وحشت ہوتی جہاں علیزہ عدت میں بیٹھی تھی۔ ابھی تو دو مہینے بچے ہیں۔ اس کے بعد......نہیں......نہیں.....اس کے بعد اسے کچھ نہیں سوچنا ہے۔ اس نے خود کو حالات کے حوالے کر دیا۔ اور چپل گھسیٹتا اس بنجارے جیسا ہو گیا جس کے راستے میں دور دور تک سر پر سایا کرنے کے لیے پتے کا بھی سہارا نہیں تھا۔

کیسا ہوگا وہ دن جب اسے علیزہ کا سامنا کرنا پڑے گا جو دن رات اپنی چوکی پر ایک ٹک دروازے کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ نہ بالوں میں کنگھی، نہ نہانا، نہ کپڑے بدلنا، دیوار سے پیٹھ ٹکائے آلتی پالتی مارے وہ مسلسل بت کی مانند بیٹھی رہتی۔ جب تھک جاتی تو تکیے کا سہارا لے کر سو جاتی۔ پتھر پر پڑے کٹورے کی طرح اس کی آنکھیں بالکل خالی تھیں۔ نہ آنسوؤں کی نمی، نہ زندگی کا نوحہ، نہ حالات کی کوئی ماتم پرسی، نہ کوئی گلہ، نہ کوئی شکوہ، پھٹی پھٹی خالی ویران آنکھیں، اس کے پتھرائے چہرے پر کسی مجسمے پر پتلی کی طرح جڑی ہوئی تھیں۔ چوڑیوں سے خالی کلائیاں، دونوں شانے ڈھیے ہوئے، اس کے خستہ حال اندرون کا ترجمان بنے تھے۔ وہ تو ہونٹوں کو جیسے کھولنا ہی بھول گئی۔ اس کا رشتہ خارج سے ٹوٹ گیا، اس نے اپنے اندر الگ ہی دنیا آباد کر لی تھی۔ اس کی سوچ، اس کا خیال، اس کی فکر، اس کی اپنی ہی بسائی دنیا میں محدود ہو گئے تھے۔ وہ اپنے وجود کے خول میں سمٹ چکی تھی۔ اس کے اندر سرد، یخ لاوے کا سیل رواں تھا جو اپنے آپ میں کھول رہا تھا۔ جس کی اٹھتی ہوئیں لہریں جمی ہوئی برف کی آگ تھیں۔ لیکن اس کے ذہن کا ایک گوشہ اب بھی عقلی ضبط کے تحت واضح اور منور تھا۔ دھوپ چھاؤں جیسی کیفیت اس کے اندر کا تضاد تھا جو کبھی اسے منجمد بنا دیتا اور کبھی دہکتے انگاروں کا پھیلا ہوا سمندر۔

فرحان نے دو ایک بار ملازمہ کو بھیج کر زبردستی علیزہ کو نہلوایا۔ اسے کھانے کھلانے کی ذمہ داری بھی ملازمہ کو ہی دی گئی تھی۔ اس کے لیے اسے الگ سے پیسے دیے جاتے تھے۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ علیزہ بیمار ہے۔ مالک کی رشتہ دار لگتی ہے اس لیے علاج کے لیے یہاں آئی ہوئی ہے۔

ملازمہ نے جب یہ بتایا کہ علیزہ کا بدن پچھلے دو دنوں سے تپ رہا ہے تو فرحان اور اعیان دونوں ہی پریشان ہو گئے۔ ملازمہ کو ڈانٹ پڑی کہ اس نے فوراً اطلاع کیوں نہیں دی۔

فرحان تیزی سے تھرمامیٹر لے کر اس کے کمرے کی طرف بڑھا اور جتنی تیزی سے بڑھا اتنی ہی تیزی سے ٹھٹھک کر رک گیا۔

''اعیان میں اپنا حق کھو چکا ہوں۔ ذرا تم تھرمامیٹر سے اس کا بخار ناپ لو۔''

''میں ان کے پاس کس حق سے جاؤں گا بھائی؟''
''پھر! پھر کیا ہوگا، کیا اسے ایسے ہی مرنے دیں۔''
''نہیں ہر گز نہیں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''
''تو کیا کیا جائے؟''
''میں کسی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔''
'میں بھی کتنا بد عقل ہوں اعیان، اتنا بھی نہیں سمجھ پایا......... مجھے جینے کا کوئی حق نہیں''
فرحان اعیان سے لپٹ کر رونے لگا۔''میں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی کشتی ڈبو دی اعیان، میں معافی کے لائق بھی نہیں بچا۔ میں منھ چھپا کر جیوں بھی تو کس طرح جیوں؟''
اعیان خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ کیونکہ فرحان سے وہ حد درجہ ناراض تھا۔ اس کی حرکت پر بھی اور پھر خود کو اپنے ساتھ ناکردہ احساس گناہ میں گرفتار کرنے کے لیے بھی۔ اس نے ایک طرف عورت کی زندگی برباد کی، پھر حلالہ کا فتنہ چھوڑ کر نہ صرف اسے برباد کرنے پر تلا۔ بلکہ ایک عورت کے ساتھ کھلونے کی طرح کھیل رہا ہے۔ مذہب کی آڑ میں ایک گھناؤنا تماشا کر رہا ہے۔ اس نے چپکے چپکے کئی مولویوں سے رابطہ بھی کیا۔ اور حلالہ کے مسئلے پر تحقیقات بھی کی۔ شریعت میں بھی عورت کو کہیں سے کمزور ہونے نہیں دیا۔ اگر مرد کو حلالہ کرنے کی اجازت ملی تو عورت کو اپنی مرضی سے ہاں یا نا کہنے کا اختیار بھی حاصل ہے۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ وہ خود علیزہ سے بات کرے اور پوچھے کہ کیا وہ فرحان جیسے مرد کے ساتھ رہنا بھی چاہتی ہے یا نہیں اور اگر نہیں رہنا چاہتی تو وہ حلالہ کے پھندے میں اپنی گردن کیوں پھنسائے۔ ڈاکٹر تانیہ کو بلا کر سارے حالات بتائے اور اس کے ساتھ علیزہ کو ہمیشہ کے لیے واپس بھیج دے۔

(۳)

اعیان کا ماننا تھا کہ عورت کو اپنی اور اپنی مرضی سے زندگی جینے کا حق ہے۔ ڈاکٹر تانیہ کا نام ذہن میں آتے ہی خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا۔ کیونکہ اس درمیان جتنی بار ڈاکٹر تانیہ کا فون علیزہ کے موبائل پر آیا فرحان نے ریسیو کیا۔ کیونکہ موبائل علیزہ کے پاس نہیں فرحان کے پاس رہتا تھا۔ اس نے ہر بار کوئی نہ کوئی بہانا بنا دیا۔ علیزہ یہاں گئی ہے، علیزہ وہاں گئی ہے۔ ایک دن جب بہانے بناتے بناتے تھک گیا تو موبائل اعیان کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور بولا۔'ڈاکٹر تانیہ سے کہہ دو کہ ابو کی طبعیت ٹھیک نہیں چل رہی ہے، اس لیے امی نے علیزہ کو اپنے پاس بلوا لیا ہے۔'
اعیان نے رٹو طوطے کی طرح وہی جملے دہرائے۔ اور پھر زور سے اپنی زبان دانتوں تلے کچل لی۔ اسے اپنی ذات سے گھن آرہی تھی۔ جو فرحان جیسے ناقص اور جنونی مرد کے آگے ایک الجھا کردار بن گیا تھا۔ اگر مرزا گھرانے کی عزت کی بات نہ ہوتی تو اب تک کب کا وار انیارا کر چکا ہوتا۔ وہ اندر ہی اندر اپنی ماں سے بھی ناراض تھا اور علیزہ سے بھی ناراض تھا۔ اسے ہر اس عورت کے تئیں ناراضگی ہے جو گھٹنے ٹیک کر مردوں کی بے جا زیادتیوں کو ہوا دیتی ہے۔
ڈاکٹر تانیہ نے بڑی سادگی سے 'اچھا' کہا اور فون کاٹ دیا۔

'اعیان! اب تو دو مہینے گزر گئے ہیں، صرف ایک مہینہ اور بچا ہے۔'

اعیان نے کوئی جواب نہیں دیا اور آفس جانے کے لیے گھر سے باہر نکل گیا۔

ایک شام جب دونوں مرد تھکے ماندے گھر لوٹے تو ملازمہ نے اطلاع دی کہ آج بی بی نے ایک دانہ بھی منھ میں نہیں ڈالا۔ انھیں تین چار بار الٹیاں ہوئی ہیں۔

''ارے بدہضمی تو نہیں ہوگئی؟'' فرحان کے سوال پر ملازمہ نے جواب دیا۔ ''ارے کچھ کھائیں گی تب ہی تو بدہضمی ہوگی، صرف پانی آرہا ہے''

''بھائی! جسم میں پانی کی کمی نہ ہو جائے، فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہیے''

اعیان ڈاکٹر کو بلانے کے لیے بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔ ڈاکٹر سنجیو پانڈے جو ایک مشہور فیزیشین تھے اور اعیان کے دوستوں میں سے تھے، وہ سیدھے ان کی کلنک کی طرف بڑھا۔ ادھر فرحان ہاتھ پیٹھ کی طرف کیے بے چینی کی حالت میں گیلری میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری فکر کی لکیریں تھیں۔ آنکھوں میں پشیمانی تھی۔ ایک چھوٹی سی تشکیک نے اس کی زندگی جہنم بنادی۔ وہیں علیزہ کی زندگی داؤں پر لگی تھی۔ کتنا عرصہ ہوگیا تھا اسے علیزہ کی آواز سنے ہوئے۔ اس کی انگلیاں علیزہ کے لمس کو شدت سے یاد کرتیں۔ اگر ابی کے بعد اس نے دنیا میں کسی کو سمجھا تو وہ صرف علیزہ تھی۔ کبھی کبھی آنکھیں بھی کتنا دھوکا دے جاتی ہیں۔ جو منظر اس دن اس کی آنکھوں کے سامنے تھا، اسے برداشت کرنا کسی بھی غیرت مند مرد کے لیے ناممکن تھا۔ مگر بظاہر جو شرم ناک منظر تھا سچ کتنا دردناک تھا۔ اعیان کاش اس دن تمھارا ایکسیڈنٹ نہ ہوا ہوتا تو آج میری زندگی میں یہ حادثہ بھی رونما نہ ہوتا۔

وہ علیزہ کے بغیر جی نہیں سکتا تھا۔ اور جینے کے لیے لازمی تھا کہ حلالہ کا راستہ اپنا کر پھر اسے اپنایا جائے۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر اعیان ڈاکٹر کو لے کر آچکا تھا۔ حالات سننے اور علیزہ کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ انھیں فوراً گلوکاز کی ڈپ چڑھنی چاہیے۔

''اعیان، پلیز گھر میں ہی ڈپ چڑھوادو''

''بہتر ہے'' اعیان نے بجھے لہجے میں کہا

''ٹھہریے، میں کچھ دوائیں بھی لکھ رہا ہوں، ان کو بھی کچھ دن تک جاری رکھنا ہوگا کیونکہ مریضہ کی حالت تشویش ناک ہے، حالانکہ میں نے بلڈ پریشر وغیرہ دیکھ لیا ہے، سب ٹھیک ہے۔ انھیں بہت زیادہ جسمانی کمزوری ہے۔ اچھی غذا دیجیے اور ساتھ میں طاقت کی دوائیں۔ تب یہ ٹھیک ہو جائیں گی''

اعیان دواؤں کا نسخہ لے کر ڈپ کا انتظام کرنے چلا گیا اور فرحان گھر سے آئے ماں کے فون کو ریسیو کر کے گیلری میں بات چیت کرنے چلا گیا۔

ادھر ڈاکٹر پانڈے نے بے حد نرمی سے علیزہ کو دیکھا۔ ''میڈم! آپ کو کیا تکلیف ہے؟''

علیزہ کی آنکھیں جو آنسوؤں سے خشک رہتی تھیں اچانک نم ہو اٹھیں۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔ ایک اجنبی شخص کی ہمدردی نے اسے پگھلا دیا تھا۔ ورنہ اپنوں کا زخم اتنا کاری تھا کہ وہ اب اپنے ہی لوگوں سے خوف

زدہ رہنے لگی تھی۔ جو اپنے تھے وہ اب اس کی نظر میں غیر بن چکے تھے اور اجنبی چہرے اسے بہت اجنبی لگ رہے تھے۔ ڈاکٹر بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنی ہتھیلیوں کی گرفت میں لے کر دھیرے سے انھیں تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا، اپنے آپ پر یقین رکھئے۔ رات جتنی اندھیری ہوتی ہے سویرا اتنا ہی اجیارا۔ اگتے سورج کو یاد کر کے اپنا دل بہلائیے اور خوش رہئے۔''

آنکھوں میں تھما ہوا علیزہ کا آنسو موتی کی طرح جھلکنے لگا۔ اگتے سورج کو اس نے یاد کیا اور ایک چہرہ ابھرا۔ سورج میں جو چہرہ ابھرا تھا وہ ڈاکٹر تانیہ کا تھا۔ وہ سسک اٹھی۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر گلوکوز چڑھنے کا انتظام کمرے میں ہی ہو گیا۔ میز پر علیزہ کو دی جانے والی ساری دوائیں رکھ دی گئیں۔ ڈاکٹر پانڈے نے جاتے جاتے نسخے پر ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر عسکری کو ریفر کر دیا۔

''اعیان ایک بار تم ڈاکٹر عسکری کو بھی دکھا دو۔'' ڈاکٹر پانڈے نے دوستانہ لہجے میں کہا

ہفتہ دس دن اسی کشمکش میں گزر گئے کہ علیزہ کو ماہر نفسیات کو دکھایا جائے کہ نہیں کیوں کہ وہ واقعی کہیں سے نارمل نہیں دکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جہاں اجنبی پن تھا وہیں وہ ہر وقت خوف زدہ اور سہمی سہمی سی لگتی تھی۔ ہلکی سی آہٹ سے بھی وہ چھوٹی بچی کی طرح سہم کر گٹھری بن جاتی۔ اور دونوں گھٹنوں کے درمیان اپنا منھ چھپانے کی کوشش کرنے لگتی یا پھر بھاری کمبل کے اندر سکڑی سمٹی پڑی رہتی۔ آخر کار طے ہوا کہ ڈاکٹر عسکری کو بلوانا بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر عسکری نے آتے ہی اعیان کو کمرے سے باہر کر دیا تا کہ وہ تنہائی میں علیزہ سے بات کر سکے۔

دروازے کا پردہ کھینچ دیا گیا اور اب کمرے میں صرف علیزہ اور ڈاکٹر عسکری تھے۔ علیزہ نے جب ایک اجنبی شخص کو سامنے دیکھا تو سہم کر آڑوں ٹکڑوں ہو کر چوکی پر بیٹھ گئی اور دیوار کی طرف خود کو سمیٹنے لگی۔ وہ اس طرح دیوار پر ہاتھ پھیر رہی تھی جیسے کسی پردے کو سرکا کر دوسری جانب کود جانا چاہتی ہو۔ ڈاکٹر عسکری خاموشی سے کچھ دیر اس کا جائزہ لیتے رہے پھر آہستہ سے بولے۔ ''کیسی ہیں آپ؟'' دوسری طرف خاموشی رہی۔ اسی سوال کو ڈاکٹر عسکری نے تین چار بار دہرایا۔ جواب میں علیزہ نے بے حد بیزاری میں کہا۔ ''جیسی ہوں، ٹھیک ہوں۔''

''کیا نام ہے آپ کا؟''

اس بار علیزہ نے اپنے دسوں انگلیوں کے ناخن سے دیوار پر کھرونچے مارنا شروع کیا۔ جیسے وہ پردے کو پھاڑ کر چھپ جانا چاہتی ہو۔ اس کا جسم تھر تھرا رہا تھا اور اس کی پیٹھ ڈاکٹر کی جانب تھی۔ ڈاکٹر نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ ''کیا نام ہے آپ کا؟'' سوال کئی بار دہرایا گیا آخر میں مختصر جواب آیا۔ ''عورت''

ڈاکٹر عسکری کو ہنسی آ گئی۔ ''عورت کوئی نام ہوتا ہے؟'' اس بار علیزہ نے گردن موڑ کر ڈاکٹر عسکری کی طرف دیکھا اور کانپتے ہونٹوں سے کہا ''نہیں ذات ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر عسکری چوکی کے ایک کنارے پر بیٹھ گئے اور علیزہ سرک کر دوسرے کونے پر چلی گئی۔ اب دونوں روبرو تھے۔

''آپ کو اپنی ذات کیسی لگتی ہے؟'' ڈاکٹر عسکری نے پھر سوال کیا۔

علیزہ کچھ دیر تک بچوں کی طرح اپنے ہونٹوں کو بسورتی رہی پھر بولی۔ ''بری''

ڈاکٹر عسکری چوکی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کرسی کھینچ کر قریب ہی بیٹھ گئے۔ علیزہ نے اطمینان کی گہری سانس لی جیسے کوئی بہت بڑی آفت ٹل گئی ہو۔ سکڑا سمٹا جسم ڈھیلا پڑا اور وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر عسکری اس کی ہر نقل و حرکت کا گہرائی سے جائزہ لے رہے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ علیزہ جب اپنی صحیح حالت میں آ گئی ہو۔ چہرے پر چھائے ہوئے خوف اور دہشت میں کمی آ رہی ہے تو انھوں نے خاموش رہ کر اسے اور سنبھلنے کا موقع دیا۔ کچھ دیر بعد وہ اس طرح بولے جیسے باتوں کا سلسلہ جاری رہا ہو۔

'بری کیا! بری کیوں؟ عورت کی ذات تو ایک خوبصورت شے ہے۔"

جواب میں علیزہ انھیں معصومیت سے دیکھتی رہی اور گہری گہری سانسیں لیتی رہی۔ ڈاکٹر عسکری کچھ اٹ پٹے سوال کر کے اس کی جمی ہوئی ذہنی کیفیات میں ہیجان پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ مریض کا سچ ان کے سامنے آ سکے۔ انھوں نے کچھ دیر اور خاموشی سے ساتھ ساتھ گزار دیے۔ اس درمیان علیزہ کونے سے سرک کر چوکی کے درمیان آ کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر کو اپنی پہلی فتح کا احساس ہوا۔ انھوں نے اگلا سوال کیا۔

"آپ کہاں رہتی ہیں؟"

"کوٹھری میں" علیزہ نے بے ساختہ جواب دیا۔

"کوٹھری میں؟ یہ تو کمرہ ہے جو کافی شاندار دکھ رہا ہے۔" علیزہ پھر خاموش ہو گئی۔

"اچھا بتایئے آپ کی اپنی کوٹھری میں کیا کیا ہے؟"

"بدبو ہے، سیلن ہے، سرانڈ ہے"

ڈاکٹر عسکری کا اگلا سوال تھا۔ "کس چیز کی بدبو اور سرانڈ ہے؟"

"لاش سڑ رہی ہے اسے کیڑے کھا رہے ہیں" علیزہ عالمِ بے اختیاری میں جو جی میں آتا جواب دیتی جا رہی تھی۔

"لاش کس کی ہے؟"

ڈاکٹر کے سوال پر علیزہ نے دونوں ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔ اس بیچ علیزہ کی سہل مزاجی کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر عسکری دھیرے سے کرسی سے اٹھ کر چوکی کے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ اور علیزہ کے اگلے ردعمل کا انتظار کرنے لگے لیکن اس کی طرف سے بے نیازی ہی بے نیازی تھی۔ اس سے پہلے کہ علیزہ اپنے اندرون کی دنیا میں گم ہو جاتی فوراً ہی ڈاکٹر عسکری نے مداخلت کی۔

"اچھا آپ اپنی کوٹھری میں لے چلیں گے؟ میں بھی تو دیکھوں کہ وہاں کیا کیا ہے؟"

علیزہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟ آپ مجھے اپنا گھر نہیں دکھائیں گی؟" ڈاکٹر عسکری اس کے ذہنی رویوں کا پوری طرح تجزیہ کرنا چاہتا تھا اس لیے اس کے سوال بھی علیزہ کے جواب سے ہی نکل رہے تھے۔

"وہاں کوئی کھڑکی نہیں، روشن دان نہیں، دروازہ نہیں، ہوا نہیں، دھوپ نہیں...... حبس ہی حبس ہے"

"اچھا یہ بتایئے وہ کوٹھری ہے کہاں؟"

''یہیں پر..''

علیزہ کا جواب سن کر ڈاکٹر عسکری نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہیں پر لیکن مجھے تو کہیں نظر نہیں آرہی ہے۔''

علیزہ نے بے حد معصومیت سے خود اپنی طرف انگلی اس طرح اٹھائی جیسے اس کا بدن اس کی کوٹھری ہو۔ ڈاکٹر عسکری نے بھی علیزہ جیسی معصومیت چہرے پر لاتے ہوئے اپنے بدن کی طرف اشارا کیا۔ ''ہاں ایسی کوٹھری تو میرے پاس بھی ہے۔ مگر یہاں کھڑکی ہے، روشن دان ہے، دروازہ ہے، ہوا ہے، دھوپ ہے، اور تروتازگی بھی ہے......''

علیزہ کی آنکھیں حیرانی سے پھیل گئیں۔ پھر ڈاکٹر عسکری نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''مگر علیزہ وہاں کسی کی لاش نہیں ہے۔''

''اچھا!'' علیزہ نے بچوں جیسے انداز میں حامی بھری۔

''اچھا بتایئے آپ کی کوٹھری میں کس کی لاش ہے؟''

''معلوم نہیں''

''ارے یہ کیا بات ہوئی، پہچانیے تو، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ اسے جانتی نہ ہوں۔''

علیزہ کی آنکھوں میں ڈھیروں آنسو آ گئے۔ جیسے وہ کچھ چھپانا چاہتی ہو اور چھپا نہیں پا رہی ہو۔

''بولئے نا!'' ڈاکٹر عسکری نے ضد کی۔

علیزہ نے پراسرار لہجے میں کمزور آواز میں کہا۔ ''وہ لاش میری ہے۔''

''مگر آپ مریں کیسے؟ کیا آپ بچنا نہیں جانتی تھیں؟''

''بچتی کیسے؟ مارنے والا تو میرا اپنا آپ ہی تھا۔''

''آپ کوٹھری سے باہر آنا چاہتی ہیں؟''

''ہاں!'' علیزہ نے جیسے پوری طاقت لگا کر حامی بھری۔

''باہر کی دنیا کی آب وہوا چاہتی ہیں؟''

علیزہ نے سہمے سہمے سے انداز میں اثبات میں گردن ہلادی۔

''پھر سے زندہ ہونا چاہتی ہیں؟''

علیزہ نے اسی انداز میں جلدی جلدی کئی بار گردن ہلائی۔

''تو پھر آپ کو ایک کام کرنا ہوگا''

علیزہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''میری انگلی پکڑیئے''

علیزہ نے کچھ سوچے بغیر ڈاکٹر عسکری کی انگلی پکڑ لی۔

''اب آپ کھڑی ہوجایئے''

علیزہ نقاہت اور کمزوری کے باوجود ڈاکٹر عسکری کی مدد سے چوکی پر کھڑی ہوگئی۔ جیسے ہی وہ کھڑی ہو سکی ڈاکٹر عسکری نے بے حد پھرتی سے اسے ایک جھٹکے سے چوکی سے نیچے کھینچ لیا۔ ایک چیخ کے ساتھ علیزہ زمین پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ خوشی، ڈر، دہشت، خوف، اجنبی پن اور پرائے پن کے الگ الگ رنگوں کا ایسا کینوس بنا ہوا تھا جس پر پل پل بدلتے رنگ آرہے تھے جارہے تھے۔ کبھی ہونٹ بھنچ جاتے کبھی کھل جاتے۔ کبھی سکڑ جاتے کبھی مسکرانے لگتے۔ جیسے ماضی کی پرتیں اس کے چہرے کی تحریر بنتی جارہی ہوں۔ اور ہونٹ ان تحریروں کے عنوان بن رہے ہوں۔ ڈاکٹر عسکری نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور خاموشی سے اس کی آتی جاتی کیفیت کو پڑھتے رہے۔ اور جب ایک جذبہ جو اپنے پن کا تھا اس کے چہرے پر آکر منجمد ہوگیا تو ڈاکٹر عسکری کے چہرے پر گہرے اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

''دیکھا! بند کوٹھری سے باہر آنا کتنا آسان ہوتا ہے، بس ایک چھلانگ لگانے بھر کی دیر تھی۔ آپ نے ایک چھلانگ لگائی اور سڑانڈ والی کوٹھری سے باہر آگئیں''

''اچھا'' علیزہ کے چہرے کا پھیکا رنگ کھل گیا۔

''آیئے، اب ہم لوگ اس کمرے میں ساتھ ساتھ ٹہلتے ہیں''

ڈاکٹر عسکری اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ کمزوری اور نقاہت سے علیزہ سے چلا نہیں جارہا تھا پھر بھی وہ ڈاکٹر عسکری کا سہارا لے کر چلنے کی پوری کوشش کررہی تھی۔ اپنے لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھال رہی تھی۔ ڈاکٹر عسکری نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ ٹہلاتے ٹہلاتے کمرے سے ذرا باہر کی طرف آئے۔ اس کی نظریں جیسے ہی سامنے کھڑے ہوئے فرحان اور اعیان پر پڑیں اس کے چہرے کا چمکتا رنگ جاتا رہا اور وہ پھر افسردہ ہوگئی۔ اچانک اس کے چہرے کی لکیروں سے خوف عیاں ہونے لگا۔ ملازمہ کچھ دوری پر کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر عسکری نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور علیزہ کو نہلوا کر صاف ستھرے کپڑے پہنوانے کو کہا۔ ملازمہ علیزہ کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئی اور ڈاکٹر عسکری نے فرحان اور اعیان کو کڑے لفظوں میں پھٹکارا۔ ''ہوشیار ہو جایئے ورنہ ایک عورت کے مارے جانے کا الزام آپ دونوں کے سر آسکتا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب.......'' فرحان نے ہکلاتے ہوئے کہا

''اچھے بھلے انسان کو اگر ایک کمرے میں قید کردیا جائے اور اس کی ساری جذباتی شیئرنگ پر روک لگادی جائے تو وہ یا تو خودکشی کرلے گا یا پاگل ہوجائے گا۔ آپ لوگوں نے ان کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیوں کر رکھا ہے۔''

فرحان نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور پھر اپنے لہجے کو سخت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔'' ڈاکٹر صاحب! یہ ہم لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ ہم لوگوں کو صرف یہ بتایئے کہ اب کیا کرنا چاہیے''

''ڈاکٹر پانڈے نے جو دوائیں لکھی ہیں ان کو جاری رکھئے۔ ان کی علی الصباح کھلی فضا میں چہل قدمی کروایئے، تھوڑی بہت ورزش اور قوت بخش غذائیں دیجئے۔ پندرہ دنوں میں ان کی حالت بہتر ہوجائے گی۔''

ڈاکٹر عسکری جاچکے تھے اور ان کے کہنے کے مطابق عمل کیا جانے لگا جس کا خاطر خواہ نتیجہ سامنے آرہا تھا۔ فرحان مرزا کا گھر جو ڈھائی مہینے سے جیتے جاگتے انسانوں کا قبرستان بنا ہوا تھا وہاں اب زندگی کی ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔

فرحان اور اعیان خوش تھے کہ علیزہ ایک نارمل عورت کی طرح برتاؤ کرنے لگی تھی۔ اس نے اس سچ کو تسلیم کرلیا تھا کہ فرحان اس کا شوہر ہے جس نے غلط فہمی کی بنیاد پر حالت جنون میں اسے طلاق دیا تھا۔ وہ اپنی غلطی پر بے حد نادم ہے اور اپنے کیے پر اسے بہت پچھتاوا ہے اس لیے وہ پھر سے اس کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی شروع کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اسے اعیان کے ساتھ حلالہ کرنا ہے یعنی ایک ایسا وقتی نکاح جو شب بسری کے بعد ہی اسے پھر سے اس لیے طلاق دے دیا جائے گا تاکہ وہ فرحان کے لیے حلالہ بن جائے۔ یہ طلاق اعیان دے گا۔ ایک بار اسے پھر تین مہینے کی عدت گزارنی ہوگی اس کے بعد اپنے سابقہ شوہر فرحان مرزا کے ساتھ ازدواجی زندگی کی تجدید ہوسکے گی۔

ایک ہفتے کے بعد اعیان کے ساتھ اس کا نکاح ہونا طے تھا۔ ایک دلہن کی طرح اس نے سجنے سنورنے سے انکار کردیا تھا۔ صرف سر پر سرخ دوپٹہ ڈال کر ہی قاضی کو نکاح پڑھوانا تھا۔

قاضی کے ساتھ گواہوں کا بھی انتظام ہوگیا۔ اب صرف طے شدہ وقت پر نکاح ہونا ہی باقی تھا۔ طے شدہ وقت پر قاضی اور گواہ آگئے۔ گھر کا ماحول حسب معمول تھا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے نکاح ہوجانا تھا اور اس وقت علیزہ ملازمہ کے ساتھ باورچی خانے میں تھی۔ ملازمہ رات کا کھانا بنا چکی تھی کیونکہ اسے حکم ملا تھا کہ وہ شام سے پہلے چلی جائے۔ علیزہ چائے بنا رہی تھی۔ چائے کے چھ کپ ٹرے میں رکھ کر اس نے ملازمہ کو دیا کہ وہ سب کے بیچ رکھ آئے اور وضو کر کے خود عصر کی نماز ادا کرنے چلی گئی۔ ملازمہ بھی چائے کی ٹرے رکھ کر علیزہ کی ہدایت کے مطابق گھر سے نکل گئی۔

سب کچھ ایسے چل رہا تھا جیسے کہیں کچھ خاص ہی نہیں شاید فرحان اعیان اور علیزہ تین مہینے میں اتنا کچھ سوچ چکے تھے، اتنی ذہنی اذیتیں اٹھا چکے تھے۔ فکر کے اتنے مرحلے پار کر چکے تھے کہ اب سوچنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ یا پھر تینوں کے ذہن اتنا تھک چکے تھے کہ اب کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

مغرب کی نماز کے بعد نکاح ہو چکا تھا۔ قاضی اور گواہ چلے گئے۔ اور علیزہ خاموشی سے آکر بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے کمرے کی لائٹ آف کردی کہ اس وقت اس کی آنکھوں میں روشنی چبھ رہی تھی۔ باہر کی لائٹ چھن چھن کر کمرے میں آرہی تھی۔ عارضی نکاح کے تین بول کے ساتھ ہی ایک بار اس کی ذہنی کیفیت تار تار ہورہی تھی۔ اس کی فکر آوارہ پرندے کی پرواز ہورہی تھی۔ ہم سب کتنے ذہیث واقع ہوئے ہیں۔ فرحان......اعیان اور علیزہ ....کیسے فیصلہ ہوسکتا ہے کہ کس کی اذیت کس پر بھاری ہے۔

اسے فرحان مرزا کے ساتھ گزارے شب و روز خواب کی طرح یاد آرہے تھے۔ کتنے میٹھے مگر کتنے مختصر تھے۔ تنہائی میں وہ دونوں ایک دوسرے سے بچوں کی طرح چھیڑ چھاڑ کیا کرتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر روٹھ جاتے اور پھر ناز سے ایک دوسرے کو منایا کرتے.....گدگدایا کرتے.....اور کبھی ایک دوسرے سے لپٹ جاتے.....اور فرش پر ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے گیند کی طرح لڑھکتے چلے جاتے.....یہ حسین لمحے کتنے کم وقت کے لیے اس کی زندگی میں آئے تھے.....آئے اور گزر گئے.....خوبصورت ہوا کے جھونکوں کی طرح.....اور پھر اسے وہ بے شمار راتیں یاد آ

نے گئیں جو اس نے روتے جاگتے گزاری تھیں۔ فرحان مرزا کی دی ہوئی جسمانی اور ذہنی اذیتوں کو وہ کیسے فراموش کر سکتی ہے۔ اس کے اندر فعال آتش فشاں پھٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے نم ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی، شاید ہر شادی ہی ناکام ہوتی ہے۔...... وہ جوڑے جو علیحدہ نہیں ہوئے ہیں وہ بھی ایک بے جان رشتے کا گہوارہ اٹھائے قبرستان کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔..... ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہم سفر بن کر چل نہیں رہے ہوتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو گھسیٹ رہے ہوتے ہیں۔ نہ ان میں کوئی رنگینی بچتی ہے نہ کوئی چاشنی.........

اعیان..... اعیان کے لیے اس کے دل میں نرم گوشہ تھا۔ مگر تھا تو وہ ایک مرد ہی.......... ایسا مرد جو چند راتوں کے لیے اس کا شوہر بنا تھا...... اس وقت کمرے میں اعیان موجود نہیں تھا۔ مگر اس کی غیر موجودگی بول اٹھی تھی۔ اس کے وجود کی گہرائیوں میں بہت سے انجانے علاقے تھے جہاں اب فرحان کے نام اعیان کے نام کا شور اٹھ رہا تھا...... ایسا شور جو اس کے دماغ کی رگوں میں لہو بن کر سرایت کر رہا تھا۔ سوچ منجمد ہو رہی تھی۔ دماغ ماؤف ہو رہا تھا، وہ خلا میں بھٹک رہی تھی۔ بھٹکتے بھٹکتے گہری تاریکی میں جا کر وہ نیند کی حالت میں آ گئی۔

نکاح کے بعد اعیان جو سفید کرتے پاجامے میں تھا اس نے اپنی دو پلی ٹوپی اتاری اور بغیر کسی سے کچھ کہے گھر سے نکل گیا۔ اسے اپنے اندر جیسے آکسیجن کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور وہ کھلی فضا میں ٹہلنا چاہتا تھا۔ سب سے برا حال فرحان مرزا کا تھا جو دل کو لاکھ بار سمجھانے کے باوجود خود کو سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ اپنے ہاتھوں اپنی پیاری بیوی کو دوسرے مرد کے حوالے کرنے کا درد کیا ہوتا ہے، یہ کوئی فرحان مرزا سے پوچھے۔ فرحان مرزا کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کسی لمحے اس کے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی۔ اسے ہلکا ہلکا چکر آ رہا تھا۔ اس نے بلڈ پریشر کی دوا نکال کر کھائی۔ پچھلے دنوں جو عذاب اس پر بیتا تھا اس نے فرحان مرزا کو ہائی بلڈ پریشر کا مریض بنا دیا تھا۔ وہ بے قراری سے بار بار علیزہ کو دیکھتا اور علیزہ اس سے قطعی لاتعلق بے حد آرام سے نیند کی غفلت میں تھی۔ یہ نیند تھی یا خود فراموشی خدا جانے...... فرحان چاہتا تھا کہ علیزہ اس کے پاس آئے اور اپنے دل کا حال سنائے۔ اور پھر دو چار تخت کڑے جملے کہے۔ اس سے بدکلامی کرے، اس کو جتنا چاہے برا بھلا کہے۔ جنونی کیفیت میں آ کر اس کی شرٹ نوچ ڈالے، اس کے سینے پر مکے مارے اور کہے کہ تم کیسے شوہر ہو جو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی عورت کو دوسرے مرد کے حوالے کر رہے ہو۔ مگر علیزہ نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اچانک ڈور بیل بجی۔ اعیان واپس آ گیا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ کھانے کا وقت تھا، ہاتھ دھو کر وہ سیدھے باورچی خانے میں گیا اور کھانا گرم کرنے لگا۔ اس نے خاموشی سے کھانا میز پر لگایا۔ تین پلیٹیں، تین گلاس رکھے۔ اور بغیر کسی کو آواز دیے دو چار لقمے منہ میں ڈال کر پانی پی لیا۔ اس رات فرحان نے کھانا کھایا نہ علیزہ نے۔ حالات کی مجبوری کے تحت وہ تینوں تین سمت کھڑے تھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی نقل و حرکت سے باخبر تھے۔ فرحان ڈرائنگ روم میں اس دیوان پر لیٹا جس پر اعیان لیٹا کرتا تھا۔ اور اعیان جیسے لاتعلق ہو کر کمپیوٹر پر بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا۔ رات گزرتی رہی، بارہ، ایک، دو، تین بج گئے۔ علیزہ گہری نیند سو رہی تھی یا خود بے نیازی کی حالت تخیلاتی جہان میں بھٹک رہی تھی۔ یہ وہی بہتر جانے۔ فرحان کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ ذہن سلگ رہا تھا، دل ڈوب رہا تھا، پورا جسم اس طرح سے اینٹھ رہا تھا جیسے وائرل بخار کی حالت میں اینٹھتا ہے۔

اعیان ان سب باتوں سے جیسے غافل کمپیوٹر پر ایسے محو ہو کر کام کر رہا تھا جیسے شام کو کچھ ہوا ہی نہیں۔ حلالہ میں مباشرت ایک اہم شرط ہے۔ فرحان چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اعیان اس فریضے سے فارغ ہو کر علیزہ کو طلاق دے دے۔ مگر اعیان کو تو اپنے کام سے فرصت نہیں۔ فجر کی اذان فضا میں گونجی۔ اعیان وضو کر کے مسجد چلا گیا۔ تھوڑی دیر کروٹ بدلنے کے بعد علیزہ بھی عادت کے مطابق اٹھ گئی اور فرحان کو رات کے جاگنے کی وجہ سے جھپکی آنے لگی۔

صبح ایسے شروع ہوئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ روز مرہ کی طرح ملازمہ سات بجتے بجتے آ گئی۔ علیزہ اس کے ساتھ مل کر ناشتہ کھانا تیار کروانے لگی۔ ناشتہ تینوں اپنے اپنے وقت کے حساب سے الگ الگ کرتے تھے۔ پورا ناشتہ ٹیبل پر لگا دیا جاتا تھا۔ فرحان اور اعیان دونوں ناشتہ کر کے جا چکے تھے۔ ملازمہ بھی چلی گئی اور دس بجتے بجتے علیزہ بھی تیار ہو کر نکل گئی۔ ڈاکٹر عسکری کے مشورے پر فرحان اور اعیان کی رضامندی سے حالات کی مجبوری کے مدنظر علیزہ کی ذہنی صحت کے لیے اس نے دن کے وقتوں میں باہر نکل کر اپنے معمولات کے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک اسکول میں لائبریرین ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیا سوچ کر یا پھر بغیر سوچے ہی علیزہ شادی کے بعد فرحان مرزا کی اجازت سے لائبریرین کی ڈگری حاصل کر لی تھی وہی کام آئی۔ علیزہ کو ذہنی اور جسمانی طور پر سنبھالنے میں اس نوکری کا خاصا دخل رہا۔ خود اعتمادی جاگی۔ ہاتھ میں اپنا پیسہ آیا، نئے نئے لوگوں سے ملنا جلنا، ان ساری باتوں نے اس کے اندر کافی تبدیلی پیدا کی۔

(۴)

ایک دن اور ایک رات کٹ گئی۔ دوسرا دن بھی پچھلے دنوں سے جدا نہیں تھا۔ پچھلی رات کی طرح کھانے کے بعد علیزہ سونے چلی گئی۔ اور اعیان کمپیوٹر پر بیٹھ گیا۔ فرحان مرزا انتہائی ذہنی انتشار میں بے مقصد ادھر ادھر چہل قدمی کرنے لگا۔ کچھ نہیں سمجھ میں آیا تو ایک خالی گلاس اٹھایا اور پانی بھر کر غٹا غٹ پی گیا۔ گیلی مونچھوں کو خشک کرتے ہوئے اس نے ایک نگاہ اعیان پر ڈالی اور دوسری نگاہ اس بھڑے ہوئے دروازے پر جس کمرے کے اندر علیزہ اپنے آپ سے بے خبر اور حالت بے گانگی میں بستر پر پڑی ان ناگفتہ بہ لمحوں کی زد میں آنے والی تھی جو اسے ایک بار پھر فرحان مرزا کی اس رات کی یاد دلا دے گی جو شادی کی پہلی رات تھی۔ کمرہ بھی اداسیوں کے ایک نئے وقوعے کا منتظر تھا۔ ادھر اعیان دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی نئے قدم کی پیش رفت سے غافل تھا۔ کچھ دیر تک فرحان اسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں کی تپش نے اعیان کو پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

''کیا ہوا بھائی؟ آپ اتنے بے چین کیوں ہیں؟''

''تم یہ سب کیا کر رہے ہو؟ سونے کب جاؤ گے؟''

''جاتا ہوں بھائی، بس تھوڑی دیر اور کام کر لوں۔''

فرحان مرزا اپنے تھکے قدموں سے اس کے قریب آئے اور شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''اعیان! کل بھی تم نے یہی کہا تھا۔ میرے اصرار کے باوجود تم ساری رات جاگتے رہے اور کسی کی پرواہ کیے بغیر اپنا کام کرتے رہے۔''

''بھائی!'' اعیان مرزا جیسے کچھ کہتے کہتے رک سا گیا۔

''مت بھولو اعیان کہ ہم لوگوں نے اپنے والدین کو بھی اندھیرے میں رکھا ہے صرف ایک مقصد کے

تحت۔ جو کچھ ہوا وہ تو شرمناک ہے ہی مگر عزت کی خاطر پردہ داری ضروری تھی۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ ہمارا جو منصوبہ ہے وہ جلد سے جلد تکمیل پا سکے۔ کمرے میں جاؤ، مزید وقت ضائع مت کرو۔" فرحان مرزا کی آنکھوں میں گڑگڑاہٹ اور آنکھوں میں نمی تھی۔ جبکہ اعیان کی آنکھوں میں بے رخی اور لہجے میں سختی تھی۔ اس نے آواز دباتے ہوئے کہا۔" بھائی! میں نے مرزا گھرانے کی عزت رکھنے کے لیے یہ سودا کیا ہے۔"

علیزہ کی طرف سے بھی وہ بے نیاز تھا۔ اس کی نظر میں جو عورت اپنے حق کے لیے خود لڑائی نہیں کر سکتی اس کی طرف سے کوئی دوسرا کھڑا ہو کر نہیں لڑ سکتا۔ کتنی بار اس نے سوچا کہ وہ علیزہ کو سمجھائے کہ فرحان مرزا جیسے مرد کے ساتھ وہ دوبارہ زندگی گزارنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اپنا رشتہ ہمیشہ کے لیے مرزا گھرانے سے توڑ دے۔ جہاں اس کی خودداری کو ٹھیس پہنچی ہو، جہاں اس کا وقار کچلا گیا ہو، جہاں اس کا مان توڑا گیا ہو، جہاں اس کا وجود روندا گیا ہو۔ ایسے گھرانے کے مرد کے ساتھ دوبارہ رشتہ جوڑنا کسی لعنت سے کم نہیں ہے۔ مگر وہ اپنی اس سوچ کو اپنے اندر ہی محدود رکھنے کے لیے مجبور تھا کیونکہ رشتے کی نزاکت اس کے لیے اسے اجازت نہیں دیتی تھی۔ سب سے افسوس ناک بات تو یہ رہی کہ اعیان کا استعمال بھی ایک مہرے کی طرح کیا گیا۔ اگر عورت کی دوشیزگی ہوتی ہے تو مرد کی مٹی بھی تو ایک وقت تک کنواری ہوتی ہے۔ اس کنواری مٹی کی پہلی خوشبو کو وہ وہاں کیوں مہکائے جہاں نہ کنوارے جذبات تھے نہ کنوارے خواب اور نہ کنوارا بدن۔ سب سے اہم بات تو یہ تھی وہ خود بھی اپنی نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ آپس میں کوئی انسیت، نہ محبت، نہ حاصل کرنے کی پیاس اور نہ سب کچھ پا لینے کی آرزو۔ اعیان کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلی ہو گئیں۔ بینائی کے سامنے کمپیوٹر ایک دھبے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اچانک فرحان مرزا کے ہاتھ کے دباؤ کو اس نے اپنے شانے پر محسوس کیا۔ پلٹا تو دیکھا کہ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں الجھائے سینے کی طرف مٹھیوں کو بھینچے مجسم التجا بنا رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہا ہے پھر آہستہ سے بولا۔" جاؤ اعیان جاؤ! کمرے کے اندر جاؤ۔"

فرحان مرزا کی آنکھوں کی بے بسی شرمندگی، پچھتاوے کی سلگتی آنچ نے اعیان کے برف جیسے جذبات کو کچھ پگھلایا۔ انسان حالات کے آگے کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔ کیا یہ وہی فرحان مرزا ہے جسے وہ بچپن سے جانتا آیا ہے۔

وہ اٹھا اور بغیر کچھ کہے کمرے میں چلا گیا جہاں علیزہ لیٹی تھی۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا، چٹخنی چڑھنے کی آواز کے ساتھ ہی فرحان مرزا کو ایسے لگا جیسے اس کا پورا وجود روئی کا گالا بن کر ہوا میں اڑ رہا ہو۔ زمین آسمان چکر کھا رہے ہوں اور وہ سوا نیزے پر آئے سورج کے عذاب میں گرفتار ہو چکا ہو۔

(۵)

ٹک ٹک کرتی گھڑی کی سوئی آگے بڑھتی رہی، وقت گزرتا رہا اور فرحان مرزا زمین پر پالتی مارے علیزہ اور اعیان کے کمرے کے سامنے کسی پجاری کی طرح دروازے پر ٹکٹکی لگائے ہاتھ باندھے بیٹھا رہا کہ کب دروازہ کھلے اور کب اعیان کمرے سے باہر نکلے۔ مگر افسوس ایک رات۔ دو رات، تین رات، یہاں تک کہ ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہر صبح فرحان ڈبڈبائی آنکھوں سے اعیان کی طرف دیکھتا اور اعیان خاموشی سے ٹوپی اٹھا کر فجر کی نماز ادا کرنے مسجد چلا جاتا۔ فرحان کا دل ڈوب جاتا۔ کب آئے گی وہ رات جب اعیان علیزہ کے کمرے سے نکل کر غسل کے لیے جائے گا اور اس کے لیے دوبارہ ایک نئی زندگی کا راستہ کھلے گا۔ ایک دن ملازمہ اپنے سارے کام نپٹا

کر دروازے سے باہر جانے ہی والی تھی کہ اچانک فرحان اسے آفس سے لوٹتے ہوئے مل گیا۔''صاحب دروازہ بند کر لیجئے گا۔'' ملازمہ یہ کہتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔ فرحان نے دروازہ بند کیا اور اندر داخل ہوا۔ اچانک اس کی نگاہ اس بیگ پر پڑی جو اعیان کا تھا اور جسے لے کر وہ آفس جایا کرتا تھا۔'تو پھر اعیان کہاں ہے؟' وہ تیزی سے غسل خانے کی طرف بڑھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے باورچی خانہ جھانکا، ادھر ادھر ہر جگہ دیکھنے کے بعد آخرکار وہ علیزہ کے کمرے کی طرف بڑھا جہاں اندر کمرے سے باتوں کی سرگوشیاں سی سنائی دے رہی تھیں۔ یعنی اعیان اور علیزہ بند کمرے میں ہیں۔'تو کیا وہ.........'' سوا نیزے پر ٹھہرا ہوا سورج زمین پر آ گیا۔.......'غضب خدا کا سرِ شام ہی......'اس نے اپنے کان لکڑی کے دروازے پر سٹا دیے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ دروازہ کمرے کے اندر کے منظر کا گواہ بن کر گرم سانسوں کی سرگوشیوں، ٹھنڈی سسکاریوں کا مرکز بن گیا ہو۔ اس نے اپنے نیم بے ہوش ہوتے جسم کو سنبھالنے کے لیے دیوار کا سہارا لے کر ٹیک لگا لی۔ آنکھوں کے آگے گھپ اندھیرا تھا، منتشر خیالات کی آندھی میں روندا جاتا ہوا وہ، اپنے ہی رو میں خود کلامی کرتے ہوئے علیزہ سے جیسے مخاطب ہو۔ 'علیزہ تم میری ہو، صرف میری۔ اعیان تو محض ایک ذریعہ ہے تمہیں دوبارہ حاصل کرنے کا۔ خدارا تم اعیان کے بھنور جال میں مت الجھنا۔ اعیان کے لیے تو دنیا پڑی ہے مگر میری دنیا تم پر ہی ختم ہے'

ادھر بند کمرے میں موبائل لگاتار بج رہا تھا۔ علیزہ جانتی تھی کہ فون ڈاکٹر تانیہ کا ہے کیونکہ صبح سے وہ مسلسل اسے فون ملا رہی تھی تاکہ اپنے بدلتے حالات سے اسے آگاہ کر سکے۔ اسے ڈاکٹر تانیہ کی اتنی شدید ضرورت اس سے پہلے نہیں محسوس ہوئی تھی جتنی آج۔ اعیان سے اس کا نکاح ضرور ہوا تھا مگر اس نے اسے کبھی شوہر کی نظر سے نہیں دیکھا تھا اور جو شوہر نہ ہو اس کے سامنے اپنا بدن کھولنا جیتے جی عذاب کو اوڑھنے جیسا نہ ہوگا۔ وہ کرے تو کیا کرے۔ اس نے تو دن سے ہی کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ اعیان اور فرحان ......فرحان اور اعیان.........دو مرد....دو انسانی وجود.....دونوں کا مقصد ایک.....اور علیزہ اس مقصد کی تکمیل کا ایک چھوٹا سا مہرہ۔ گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ اعیان اس کی بغل میں لیٹا تھا۔ ایک مرد......اپنے مقصد کے حصول کے لیے.....ذہنی تیاریاں اور ٹوٹتی بکھرتیں خیالات کی کڑیاں.....عورت کا بدن...مرد کی سیر گاہ.......کوئی چہل قدمی کرتا ہے، تر وتازگی بٹورتا ہے تو کہیں زمین کی نازک ہری دوب قدموں سے روندے جانے کا مقدر بنتی ہے۔ گرم گرم سانسوں کے دہکتے لاوے دو جسموں کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ ادھر بستر کی سلوٹیں بڑھ رہی تھیں، ادھر فرحان مرزا کی دھندلی آنکھوں کے سامنے علیزہ کے ننگے بدن کے زاویے رقص کر رہے تھے۔ اس کے بدن کے اتار چڑھاؤ کی ساری جنبشوں سے واقف تھا۔'اعیان اس وقت کیا کر رہا ہوگا۔ اس کی انگلیاں کہاں کہاں پھسل رہی ہوں گی۔ وہ جاننا چاہتا تھا۔ وہ بند دروازے کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اچانک اسے لگا کہ دروازہ دھڑام سے زمین پر گر گیا ہو۔ دو برہنہ بدن آپس میں الجھے ہوئے اسے صاف نظر آ رہے تھے۔ اسے ہر طرف بیڈ کی چرمراہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کے کان مختلف آوازوں کا نقطہ بنا ہوا تھا۔ کہیں سسکیاں، کہیں ہونٹوں کے لمس کے چٹخارے، کہیں سانسوں کی تیز رفتار اور کہیں اس کے اندرون کا وہ قیامت برپا کرتا شور جو اسے زار زار رلا رہا تھا۔ دیوار سے لگا ہوا فرحان کا جسم آہستہ آہستہ پھسلتا ہوا زمین پر آ کر ٹک گیا۔ اسے ہلکے ہلکے سے چکر آنے شروع ہو گئے تھے۔ ذہن

نے کچھ بھی سوچنے سے انکار کر دیا۔ اس کی سماعت میں شور جیسے دور کہیں گھاٹی میں اترتے ہوئے خاموش ہوتے جا رہے تھے اور خاموش ہوتے ہوتے ساری آوازیں کہیں گم ہو گئیں۔ اور وہ لڑھک گیا۔

صبح چار بجے دروازہ کھلا۔ اعیان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس کے اندر کا طوفان تھم چکا تھا۔ آنکھوں میں ایسی بے نیازی تھی جیسے گزشتہ رات کچھ رونما ہوا ہی نہیں۔ اس نے حقارت سے چوکھٹ پر پڑے فرحان کو دیکھا۔ اور صدر دروازہ کھول کر گھر سے باہر نکل گیا۔

علیزہ کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو چکے تھے، جبڑے کسے ہوئے تھے، پھٹی پھٹی پتلیاں ایک ٹک چھت کو تاک رہی تھیں۔ اس کا جسم اب بھی برہنہ تھا۔ جس پر اعیان نے جاتے جاتے چادر ڈال دی تھی۔ دایاں ہاتھ دیوان کے نیچے لٹکتا ہوا جھول رہا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں اب بھی پھیلی ہوئی یوں پڑی تھیں جیسے اس میں کوئی حرارت نہ ہو..... اس طرح جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ان میں کوئی حرکت ہی نہ ہوئی ہو۔ زندگی کے امکانات اس میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ سب کچھ مشینی انداز میں رونما ہوا۔ نہ کوئی جذبات نہ کوئی لذت..... ہاں کان میں اب بھی ان تین لفظوں کی بازگشت ہی جو اعیان نے جانے سے پہلے بغیر اس کی طرف دیکھے کہے تھے۔ وہی الفاظ جن کو کبھی فرحان نے ایک زنانے دار تھپڑ کے ساتھ اس کی طرف اچھالے تھے۔ اعیان نے بھی وہی کیا جو فرحان نے کیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جو کام اس نے نفرت اور غصے میں کیا اعیان نے وہی کام ٹھنڈے پن اور بے نیازی سے کیا۔

علیزہ کے لیے اب سوچنے کو بچا ہی کیا تھا۔ وہ تو اب اس قابل بھی نہیں بچی تھی کہ اپنی ہی موت کی تعزیت کر پاتی۔ شدید صدمے جب حد سے گزرتے ہیں تو جیسے تکلیف پہنچانے کی اپنی قوت بھی کھو دیتے ہیں۔ کمالے را زوال... انتہا ایک نئی ابتدا کی پیشین گوئی ہوتی ہے جو انسان کے زخمی احساسات کے لیے مرہم ہوتی ہے۔

(۶)

فرحان کو ہوش آ چکا تھا۔ ملازمہ نے باورچی خانہ سنبھال لیا تھا۔ اعیان بالکونی پر بیٹھا یوں اخبار پڑھ رہا تھا جیسے اسے اپنے اندر کی دنیا سے کوئی مطلب نہیں بلکہ اس پر بیرونی دنیا غالب ہو۔ شب خوابی کا لباس تن پر ڈالے علیزہ ابھی تک بستر پر پڑی تھی۔ نہ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، نہ کسی نے اسے اٹھانے کی زحمت کی۔ ملازمہ کی دی ہوئی چائے پی چکی تھی۔ اچانک ڈور بیل بجی۔ سامنے ہی ڈاکٹر تانیہ کھڑی تھی۔ پریشان گھبرائی تانیہ نے فرحان اور اعیان کو سامنے دیکھ کر فوراً سوال کیا۔ ''سب خیریت ہے نا؟ علیزہ کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے، آپ کیسے؟'' فرحان نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''کل میں پورا دن مصروف رہی، شام کو موبائل آن نہیں کیا اور سونے سے پہلے جب آن کیا تو ایک ایک کر کے پندرہ میسج مجھے ملے۔''

''میسج؟'' فرحان نے حیرانی سے پوچھا

''ہاں! علیزہ کے میسج تھے۔ ہر میسج میں صرف ایک ہی جملہ تھا کہ مجھ سے ملو۔'' تانیہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''اس کے بعد میں لگاتار فون ملاتی رہی، پوری پوری رنگ گئی لیکن فون ریسیو نہیں ہوا۔''

''اچھا!'' اعیان کو یاد آیا کہ کچھ آواز تو اسے بار بار سنائی دے رہی تھی مگر اسے اتنا احساس نہیں تھا کہ وہ

آواز کی جانب توجہ دے پاتا۔

''آخر علیزہ ہے کہاں؟'' ڈاکٹر ثانیہ نے الجھ کر پوچھا

دونوں نے کمرے کی اشارا کر دیا۔ ڈاکٹر ثانیہ تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے کی طرف بڑھی اور پھر جیسے وقت تھم گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد جب ڈاکٹر ثانیہ کمرے سے باہر نکلی تو سراپا جلال اور قہر کا مجسمہ بنی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور غصے کی چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ فرحان اور اعیان کو پھنکار رہی تھی۔ دونوں مجرم کی طرح گردن جھکائے کھڑے تھے اور پھر اس نے فیصلہ سنا دیا۔'' علیزہ لاوارث نہیں ہے، آگے کیا ہونا ہے یہ بعد میں سوچا جائے گا۔ فی الحال میں علیزہ کو لے کر جا رہی ہوں۔ جب وقت آئے گا تو علیزہ کو آپ کے سامنے لے آؤں گی''

........اور پھر ڈاکٹر ثانیہ علیزہ کو اپنے ساتھ لے کر نکل گئی۔ علیزہ نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ فرحان کو دیکھا نہ اعیان کو، اس کی ایک چھوٹی سی اٹیچی جو ڈاکٹر ثانیہ نے خود تیار کی تھی، اس کے ایک ہاتھ میں تھی اور دوسرے ہاتھ میں تھی علیزہ کی کلائی جو برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈاکٹر ثانیہ اور علیزہ دونوں چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ دونوں کی نگاہیں سامنے کی سیاہ تارکول کی سڑک پر تھی اور ڈرائیور تیز رفتاری سے گاڑی کو آگے بڑھاتا جا رہا تھا۔

(۷)

مسلسل تین ہفتوں کی بحث آخر کار اختتام پذیر ہوئی۔ علیزہ نے اپنی رضامندی دے دی۔ ڈاکٹر ثانیہ کے گھر میں آکر علیزہ ایک نئی الجھن میں گرفتار ہوگئی۔ حالانکہ یہ الجھن ایسی نہیں تھی جو اسے اذیتوں کے نئے دور میں داخل کرتی یہاں تو بس اپنی رضامندی دینی تھی۔ ہاں یا نا..... علیزہ نے ہاں کر دی۔ بحث ختم ہوگئی۔

اعیان کی دی گئی طلاق کے بعد کی تین ماہ کی عدت اب ختم ہونے کو آ رہی تھی۔ اب محض بیس دن بچے تھے۔ اور یہ بیس دن فرحان اور اعیان کے لیے انتظار کے وہ پل تھے جنہیں وہ لمحہ لمحہ اپنی سانس کی طرح گنتے ہوئے کاٹ رہے تھے۔ کب بیس دن گزرے، عدت کی میعاد کب ختم ہو اور کب فرحان کو اپنی مطلقہ بیوی پر دوبارہ اختیار حاصل ہو سکے۔

ان چھ مہینوں میں پہلے فرحان کے والد کا اچانک ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوا اور پھر ان کی موت کا غم نہ سہ کر اس کی والدہ بھی اس دنیا سے چل بسیں۔ فرحان اور اعیان پر قیامت ہی قیامت ٹوٹتی جا رہی تھی۔ ادھر علیزہ کی جدائی پل پل ان کو عذاب میں مبتلا کیے ہوئے تھی اور اب چند دنوں کی ہی بات تھی کہ پھر سے یہ گھر اپنے معمول پر آ سکے گا۔ پرانے سے دن ہوں گے اور پرانی سی راتیں.....وہی پیار کی برسات ہوگی، وہی کھٹی میٹھی نوک جھونک ہوگی۔ فرحان نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ علیزہ کو لے کر اعیان کی نظروں سے بہت دور چلا جائے گا اور اپنی بچی ہوئی زندگی گاؤں کی پشتینی حویلی میں ہی کاٹے گا۔ اعیان کا وہ احسان مند تھا مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس کی بے جا دخل اندازی کو وہ برداشت کرنے گا۔ رات گئی، بات گئی۔.......اب تو کچھ نہیں ہے نا.....ادھر اعیان بھی اپنے نا کردہ جرم کے ذہنی خلفشار سے آزاد ہو چکا تھا۔ وقت کے اتار چڑھاؤ نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا مگر تمام ٹوٹ پھوٹ

کے بعد اب وہ اپنے حواس میں واپس آ گیا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا، بالکل نہیں ہونا چاہیے تھا مگر جب ہو ہی گیا تو کوئی نہ کوئی راستہ یا حل نکالنا ہی تھا۔ ہاں اکثر تنہائی میں اسے بڑا قلق ہوتا کہ اس رات ان تمام مردوں سے وہ الگ نہیں تھا جو عورت کی مٹی کو روند کر اپنی مٹی کی آگ کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ اس رات اس نے علیزہ کا بے دردی سے استعمال کیا تھا۔ اس کے پورے بدن میں جو آگ لگی تھی وہ ہوس کی نہیں تھی بلکہ ایک ناگفتہ بہ غصہ تھا جو فرحان کی دین تھا۔ اس پر اس رات اسی غصے نے ایسی غضب ناکی اختیار کر لی تھی کہ اسے اس کا احساس ہی نہیں ہو سکا کہ وہ محض ایک فریضے کی ادائگی کے لیے یہ عمل کر رہا ہے۔............اس رات جب علیزہ نے تڑپ کر اس کے چنگل سے نکلنا چاہا تھا تو اعیان نے اپنی پوری مردانہ طاقت سے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اپنی بھرپور ہتھیلی اس کے منہ پر رکھ دی تھی تا کہ کوئی آواز دروازے سے باہر نہ جانے پائے۔ پھر بھی دروازے کی جھری سے وہ آواز باہر آ ہی گئی تھی جسے سن کر ہی فرحان پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔

یہ سب باتیں سوچ سوچ کر اعیان شرمندہ ہوتا۔ خود کو ذلیل و خوار پاتا اور توبہ کرتا۔ کاش ایک بار علیزہ تنہائی میں مل جائے تو وہ ساری سچائی اس کے روبرو رکھ دے۔

فرحان اور اعیان دونوں گزرتے ہوئے ایک ایک دن کے ساتھ کلنڈر پر تاریخ نشان زد کرتے جاتے اور باقی دنوں کا حساب رکھتے جاتے۔ اس عمل میں دونوں برابر کے شریک تھے کیونکہ دونوں کو ہی علیزہ کی واپسی کا شدت سے انتظار تھا۔

(۸)

عدّت کی میعاد ختم ہوئی۔ دونوں نے چار دنوں تک ڈاکٹر تانیہ کے فون کا انتظار کیا کیونکہ جاتے وقت اس نے تو کہا تھا کہ آگے کیا ہونا ہے وہ بعد میں سوچا جائے گا۔ ڈاکٹر تانیہ کے اس وقت کے کہے ہوئے جملوں پر ان لوگوں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن اب وسوسے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ پانچویں دن فرحان نے ڈاکٹر تانیہ کو فون ملایا۔ فون ریسیو نہیں ہوا۔ اور پھر تو فون کرنے اور ریسیو نہ ہونے کا ایک سلسلہ سا چل پڑا۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ ایک شب جب دونوں بھائی بیٹھے اس موضوع پر محو گفتگو تھے کہ فرحان مرزا نے کہا۔ "اعیان بس یہ آخری فون، اس کے بعد میں خود تانیہ کے گھر جاؤں گا اور علیزہ کو جبراً لاؤں گا۔"

"بھائی! ابھی نہیں کل بات کیجیے گا، غصے سے بات بگڑتی ہے، ہم لوگوں کو کوئی کڑا قدم اٹھانے سے پہلے بہت سوچنا سمجھنا ہے۔"

اعیان کے کہنے پر دوسرے دن گیارہ بجے فرحان مرزا نے ڈاکٹر تانیہ کے موبائل پر فون کیا۔ اس بار فون ریسیو ہوا۔ خیریت پرسی کے بعد فرحان کچھ کہتا اس سے پہلے ہی ڈاکٹر تانیہ کی آواز آئی۔ "میں اس وقت علیزہ کو لے کر ہاسپٹل میں ہوں"

فرحان نے بڑی تشویشناک لہجے میں پوچھا۔ "کیوں علیزہ کو کیا ہوا؟"

"علیزہ امید سے ہے" ڈاکٹر تانیہ کا مختصر جواب تھا اور پھر اس کے بعد فون لائن کٹ گئی۔

فرحان مرزا کے پورے جسم میں زلزلہ آ گیا۔ فون کی بات چیت اعیان نے بھی سن لی تھی اس کے

چہرے پر گلابی رنگت پھیل گئی۔ آنکھوں میں نرمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پل میں اس کے چہرے پر چھایا ہوا سارا تناؤ کافور ہو گیا۔ وہ خوشی سے جیسے باؤلا سا ہوا تھا، ماضی کی ساری شرطیں بھول گیا۔ ساری کڑواہٹ پل میں دور ہو گئی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ باپ بننے والا ہے۔ اس کے اندرون میں ایک نئی دنیا ہمکنے لگی۔ یکلخت اسے محسوس ہوا کہ اس کی دنیا بدلنے والی ہے۔

اسے بھی کوئی ابو کہہ کر پکارے گا۔ باپ بننے کے خیال نے ہی اس کی نگاہ میں اس کی شخصیت کو عظیم بنا دیا۔ چہرہ روشن ہوا تھا، آنکھیں چمک اٹھیں۔ ہونٹوں پر آئی ہوئی بے ساختہ مسکراہٹ...... وہ اپنی اس خوشی کا اظہار کیسے کرے.... اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر فرحان مرزا کی طرف دیکھا۔ فرحان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ صدمے کی وجہ سے دونوں ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ اور آنکھیں جذبات سے خالی تھیں۔ الفاظ گونگے ہو رہے تھے۔ مگر اعیان فرحان کی اس کیفیت سے بالکل بے نیاز تھا۔ ایک لٹا پٹا انسان اپنے اعمال کی سزا پاتا ہے اور اعیان کو لگ رہا تھا کہ خود اسے اپنی قربانی کا ثمر مل گیا ہو۔ اب تک اس نے جتنے رشتے بنائے وہ سب مانگے کا اجالا تھے۔ مگر اب اس کے وجود کی توسیع ہو رہی تھی، اس کا خون پروان چڑھ رہا تھا۔ اس کے دل کی نرم مٹی میں جیسے کوئی کونپل نئی بہار کے انتظار میں چپکے سے آ بیٹھی ہو۔

اس کی جھولی میں تلخ تجربات کے انگارے بھرے تھے مگر امید کا ایک ایسا ستارہ روشن ہوا۔ جس نے دہکتے انگاروں کو سرخ گلاب میں بدل دیا۔ نیند کی غفلت میں لاشعور کے دریچے وا ہو جاتے اور اس میں سے جھانکتی ایک ننھی جان اسی کی ہم شکل بالکل اس جیسی وہ بچی جب اعیان کو ابو کہہ کر آواز دیتی ہوئی دونوں بازو پھیلا دیتی تو اعیان خوابوں کی دنیا سے باہر آ کر اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اسے اپنے اوپر ملامت ہوتی کاش اس نے اتنی جلد بازی نہ کی ہوتی، کچھ تو انتظار کیا ہوتا۔ تو آج علیزہ ڈاکٹر تانیہ کے گھر نہیں بلکہ اس کی بانہوں میں اس کی بیوی بن کر رہ رہی ہوتی۔ اس کی نظروں کے آگے بار بار اس رات کا منظر گھوم جاتا، کرب و درد سے اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اسے اپنے اوپر ندامت ہوتی۔ اس کے بارے میں علیزہ نے نہ جانے کیا کیا سوچا ہوگا۔ بے شک علیزہ فرحان مرزا کی بیوی تھی مگر نکاح تو اس کے ساتھ بھی ہوا تھا..... آج وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ مگر افسوس اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی۔ اعیان اس دن کے انتظار میں جی رہا تھا جب اس کی گود میں اس کا اپنا بچہ ہوگا۔

فرحان کو بچے کی نہیں علیزہ کی فکر تھی۔ علیزہ جو اس کی اپنی تھی۔ عمر کی پختگی نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا، جینے کا سلیقہ بھی اور زندگی کو برتنے کا طریقہ بھی۔ غصہ ور تو وہ ہمیشہ کا ہی تھا مگر غصے کی آندھی نے اس طرح اسے اپنی لپیٹ میں پہلی بار لیا تھا۔ شاید جذباتی منفی ردعمل کا سبب یہ تھا کہ اور کسی نے اسے اس طرح ٹوٹ کر نہ چاہا تھا جیسا علیزہ نے.... اس کے شدید منفی جذباتی ردعمل کی وجہ کچھ بھی رہی ہو مگر یہ بالکل واضح ہے کہ علیزہ کی دوری اور علیحدگی نے فرحان مرزا کو ایک ایسے خلا میں لٹکا دیا جہاں سے وہ رحم طلب نگاہوں سے دیکھ سکتا تھا تو صرف علیزہ کو........ علیزہ کے بغیر وہ جینے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ اس کے قریب تھا تو اپنے اور اس کے تعلق کے بارے میں سوچنے کی فرصت نہ تھی اب فاصلے تھے لیکن جذبوں کی اصلیت دھندلانے کی بجائے نکھر کر سامنے آنے لگی تھی۔ علیزہ کی نزدیکیوں نے بہت سی نئی کیفیات سے اسے روشناس کرایا تھا۔ اس کی قربت میں اسے پہلی بار

اپنے بدن کے ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اپنے ساتھ ساتھ اس نے عورت کے بدن کے نشیب و فراز کو بھی سمجھا تھا۔ نئی لذتوں کا احساس دونوں نے مل کر کیا تھا۔ مگر ایک ہی جھٹکے میں وہ ساحل کے اس پار کھڑی تھی اور خود فرحان ساحل کے اس پار اب اسے صرف انتظار تھا بچّے کی پیدائش کا۔ جیسے ہی علیزہ کو فراغت حاصل ہو گی وہ بچہ اس کی گود سے لے کر اعیان کی جھولی میں ڈال دے گا۔ اور خود علیزہ کا ہاتھ پکڑ کر اعیان کی زندگی سے دور چلا جائے گا۔ ایک طویل عرصے پر محیط شدید ذہنی رقابت اب اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی۔

ادھر علیزہ بھی احساسات کی نئی کیفیتوں سے دوچار تھی۔ ایک ننھا وجود اس کے شکم میں پنپ رہا تھا۔ وہ اس کے جسم کا ایک حصہ تھا جو اس کی سانسوں سے اپنی زندگی جی رہا تھا۔ اس کے خون سے اس کی نشو و نما ہو رہی تھی۔ چاہت کی نئی کونپل پھوٹ رہی تھی جو تمام چاہتوں سے جدا تھی۔ ایک مکمل عورت ہونے کا احساس اس کے اندر جاگ اٹھا تھا۔ اپنے وجود سے ایک وجود گڑھنے کے بعد ہی عورت ایک مکمل عورت کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔ نئے نئے خیالات، نئے نئے رجحانات، انسیت، رغبت اور چاہتوں کے نئے نئے باب گڑھے جا رہے تھے۔ علیزہ خوش تھی، بے انتہا خوش۔ گھر سے باہر نکلتی تو چھوٹے چھوٹے کھلونوں کو تلاشتی رہتی۔ ننھے منے کپڑے اپنی طرف کھینچتے، چلتے پھرتے ٹہلتے وہ اس طرح اپنا خیال رکھتی جیسے نازک کانچ کی ایک پتلی ہو کیونکہ اپنا خیال رکھ کر ہی وہ شکم میں پلنے والے بچے کا خیال رکھ سکتی تھی۔ اس کو خوابوں میں اکثر وہ گڑیا دکھائی دینے لگی جس سے وہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی۔ تازہ ہوا میں چہل قدمی کرتے ہوئے اس نے کتنی بار کھلی آنکھوں سے خیالوں میں اس گڑیا کو نہلایا تھا..... رنگ برنگے کپڑے پہنائے تھے ریشم جیسے ملائم لچھے دار بالوں کی کونی باندھی تھی...... روتی ہوئی بچی کو طرح طرح کے کھلونوں سے بہلایا تھا۔ اس کی انگلیاں پکڑ کر اس کے ننھے ننھے قدموں کے ساتھ دوڑی تھی۔ کتنی بار اس سے لکا چھپی کا کھیل کھیلا تھا۔ اور بے ساختہ اس کے سامنے آ کر اس کو چونکایا بھی تھا۔ بغیر دانتوں گلابی دہن جب کھلکھلاتا تو جھٹ وہ اسے گود میں لے کر اپنا پستان اس کے منہ میں لگا دیتی۔ دودھ کی ننھی ننھی بوندیں اس کے نازک ہونٹوں کے کناروں سے بہنے لگتیں۔ جسے علیزہ آہستہ سے روئی کے پھاہوں سے صاف کر دیتی۔ دن رات کھلی آنکھوں کے ان ہی خوابوں کے بیچ علیزہ اس دن کے انتظار میں جی رہی تھی جب یہ بچی سچ مچ اس کی گود میں آئے گی۔ اور اس کی زندگی کو ایک نیا معنی دے گی۔

(۹)

آٹھ مہینے پورے ہو چکے تھے۔ اس درمیان وہ لگاتار ڈاکٹروں کی ایک مختصر ٹیم کے مشوروں اور احتیاط پر جی رہی تھی۔ ڈاکٹر تانیہ کا زیادہ تر وقت اس کے ساتھ ہی گزرتا۔ دواؤں اور غذا کی ذمہ داری ڈاکٹر تانیہ نے مصروفیت کے باوجود اپنے اوپر اٹھا رکھی تھی۔ اگر وہ گھر میں نہ ہوتی تو فون کر کے اپنی ملازمہ کو ہدایتیں دے دیتی۔ علیزہ کا زیادہ وقت آرام سے ہی گزر رہا تھا۔ ہاں اکثر فرحان یا اعیان آتا تو وہ اپنے ذہن جھٹک دیتی۔ ڈاکٹر تانیہ نے سمجھایا تھا کہ ذرا سا بھی ذہنی تناؤ اس کے بچے پر برا اثر ڈال سکتا ہے۔ علیزہ نے ہر برے خیال سے خود کو دور کر لیا تھا۔ اس کے سامنے صرف ایک تصویر تھی جو اس ایک بچی کی تھی۔ صرف وہی خواب تھے جو اس کی بچی سے جڑے ہوئے تھے۔

شکم میں پروان چڑھتے بچے کی حرکتوں کو محسوس کرنے کے لیے گھنٹوں وہ اپنے بستر پر چت لیٹی

رہتی۔ اور ہلکی سی حرکت سے بھی ایسا خوش ہوتی جیسے بچہ اس کے رحم میں نہیں اس کی گود میں آ گیا ہو۔ کلکاری مار رہی ہو۔ وہ ساکت ہو کر محسوس کرتی کہ کس کس زاویے سے بچہ اس کے رحم میں گھوم رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں کی پوروں سے پیٹ کو سہلاتی...... ہاں یہاں ہے بچے کا ہاتھ...... ہاں ابھی ابھی اسے پاؤں کا احساس ہوا تھا۔ اور...... یہ ہے سر...... چھوٹا سا گول سا سر...... بے حد نازک...... کچی موم کی طرح گداز اور نرم نرم سا...... علیزہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور ایک بہشتی احساس سے دوچار ہوتی۔ زندگی کے لمبے نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد آج علیزہ جس دور سے گزر رہی تھی وہ ویسی ہی کیفیت تھی جیسے نصف النہار کے سورج نے ننگے سر چلنے والی ڈوبتی سلجھتی عورت...... یکلخت ایک ایسی نورانی دنیا میں پہنچ جائے جہاں ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی ہو...... بادِ صبا کی ہلکی خنک ہو...... خوشبو سے معطر فضا ہو...... جہاں سکوت نہیں سکون کی ٹھنڈی چھاؤں ہو...... وہ تھی اور اس کے رحم میں پلنے والی مخلوق تھی...... اس کی اپنی جان، اپنا بچہ...... دن گزرتے رہے، وقت قریب آتا گیا اور مقررہ وقت پر علیزہ نے ایک صحت مند بچی کو جنم دیا...... دنیا سیراب ہو گئی...... چاہتوں کا ایک نیا آبشار اس کے سامنے تھا۔ وہ خوش تھی...... بے انتہا خوش...... اس خوشی کے اظہار کے لیے الفاظ ہانپ ہانپ جاتے پھر بھی معنوں کی مکمل ادائیگی نہ ہو پاتی...... دن تاریخ مہینہ جوڑتے جوڑتے جب فرحان اور اعیان کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اب تک بچہ ہو جانا چاہیے تھا۔ تو انھوں نے ڈاکٹر ثانیہ کو پھر فون کیا۔ ”ثانیہ جی! ہم لوگ کب آئیں؟“ یہ فرحان کا سوال تھا۔ اعیان فرحان کو اشارہ کر رہا تھا کہ وہ پوچھے کہ بچہ کیسا ہے۔ مگر ڈاکٹر ثانیہ کے جواب سے دونوں کو ایک بار پھر چپ ہونا پڑا۔ ”اتنی جلدی کیا ہے فرحان صاحب؟ سوا مہینے تو ہو جانے دیجیے، پھر میں ایک پارٹی کا اہتمام کروں گی اس میں آپ لوگ بھی مدعو ہوں گے۔ آئیے گا، پھر بات چیت ہو گی“

ڈاکٹر ثانیہ نے فون کاٹ دیا۔ اور اعیان کے ساتھ فرحان بھی انگلی پر دن جوڑنے لگے کہ کب تک سوا مہینے پورا ہو گا۔

یہ مدت بھی پوری ہو گئی۔ پانچ دن زائد ہو گئے۔ علیزہ کے ماں بننے کے اعزاز میں محفل منعقد کی گئی تھی۔ چند خاص لوگوں کی ہوم گیدرنگ جس میں فرحان اور اعیان پوری تیاری سے آئے تھے۔ فرحان نے جہاں پھل میوے وغیرہ کی باسکٹ اٹھا رکھی تھی وہیں اعیان کے ہاتھ بچی کے کپڑوں اور کھلونوں کے کئی پیکٹ تھے۔ جیسے ہی دونوں گاڑی سے نیچے اترے۔ ڈاکٹر ثانیہ نے لپک کر ان کا استقبال کیا۔ کھانا پینا شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر ثانیہ سیدھے ان کو کھانے کی میز پر لے آئی۔ دونوں کی نظریں علیزہ کو تلاش رہی تھیں جو بے حد سجی دھجی گود میں ننھی سی بچی کو پیار سے سمیٹے ایک کارنر کی میز پر بیٹھی تھی۔ اس کی میز پر رنگ برنگے تحفے کے ڈھیر لگے تھے۔ ان ہی تحفوں میں فرحان اور اعیان کا لایا ہوا تحفہ بھی رکھا ہوا تھا جسے ڈاکٹر ثانیہ نے ان کے ہاتھ سے لے کر ملازمہ کے ذریعہ میز پر رکھوا دیا تھا۔ علیزہ کا کھانا اس کی میز پر پہنچ چکا تھا جسے وہ آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی فرحان اور اعیان کی طرف نہیں دیکھا جبکہ دونوں کی آنکھیں علیزہ اور اس کی بچی پر لگی تھیں۔ وہ دونوں ہی شدید ذہنی جھٹکے میں تھا۔ علیزہ کا رویہ ان دونوں کو الجھن میں ڈالنے والا تھا۔ کئی بار ان کے قدم علیزہ کی طرف بڑھے جنھیں ڈاکٹر ثانیہ نے قصداً روک دیا۔

”جلدی کیا ہے؟ ہم بھی ساتھ چلتے ہیں۔ مہمانوں کو رخصت تو ہونے دیجیے۔“

دونوں مردوں کی سانسیں تھمی ہوئی تھیں۔ کب مہمان رخصت ہو..... کب وہ دونوں علیزہ کے قریب پہنچے اور کب علیزہ بچی کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر گھر واپس آجائے۔

مہمان ایک ایک کر کے مبارکباد دیتے ہوئے رخصت ہونے لگے اور پھر آخر میں بچے فرحان، اعیان، علیزہ اور ڈاکٹر ثانیہ..... تھوڑی دیر میں انھیں سرتاج ریستوراں کا منی گارڈن خالی کر دینا تھا کیونکہ ان کی ان کی بکنگ رات دس بجے تک کی ہی تھی اور اس وقت رات کے پونے دس بج چکے تھے۔ ڈاکٹر ثانیہ اطمینان سے خراماں خراماں چلتی ہوئی علیزہ کی طرف بڑھنے لگی۔ ساتھ میں فرحان اور اعیان خوشی اور اضطراب کی دوہری کیفیتوں میں پھنسے ڈاکٹر ثانیہ کے قدموں کے ساتھ اپنے قدم ملاتے ہوئے بے حد صبر کے ساتھ علیزہ کی طرف نظریں جمائے بڑھتے جا رہے تھے۔ علیزہ اب بھی ان دونوں سے بے نیاز بچی کے ساتھ مگن تھی۔ جبکہ فرحان کی نظریں علیزہ پر اور اعیان کی نظریں بچی پر ٹکی تھیں۔ تینوں علیزہ کے قریب جا کر رک گئے۔ علیزہ قصداً ان کی طرف نہ دیکھ کر قریب ہی درخت سے لٹکتی روشنی کی لڑ کو دیکھ رہی تھی۔ فرحان کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر علیزہ کی کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی اضطرابی کیفیت میں کہا" ثانیہ صاحبہ! اب ہم لوگوں کو اجازت دیجیے بہت دیر ہوگئی ہے، ہم لوگ علیزہ اور بچی کو لے جاتے ہیں۔"

اعیان نے پدرانہ حق جتاتے ہوئے بچی کو ماں کی گود سے اٹھانے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔

"ٹھہریے" ڈاکٹر ثانیہ نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر ثانیہ کے بدلے ہوئے لہجے نے اعیان کے بڑھتے ہو ہاتھوں کو روک دیا۔ فرحان کے چہرے پر بے شمار سوالات اور الجھنیں لیے کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے حیران آنکھوں سے ڈاکٹر ثانیہ کو دیکھتے ہوتے ایک ساتھ بولے۔

"کیا مطلب؟" اس بار فرحان اور اعیان کا لہجہ تیکھا اور تلخ تھا۔

"مطلب یہ ہے کہ آپ لوگ آگے نہیں بڑھ سکتے"

یہ سنتے ہی فرحان آپے سے باہر ہو گیا اور اعیان کے ماتھے کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"ڈاکٹر ثانیہ! آپ اپنی حد سے تجاوز کر رہی ہیں" فرحان کی بات کی تائید اعیان نے بھی کی۔

"ڈاکٹر ثانیہ! آپ ہمارے گھریلو معاملات میں زیادہ دخل نہیں دے سکتیں" ڈاکٹر ثانیہ کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

"بے شک علیزہ آپ دونوں کی نکاحی بیوی رہی ہے مگر اب آپ دونوں ہی اپنا اختیار کھو چکے ہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں علیزہ ایک طلاق شدہ عورت ہے۔"

"ڈاکٹر ثانیہ! یہ مت بھولیے کہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ عدت پوری ہونے کے بعد آپ علیزہ کو ہمارے ساتھ بھیج دیں گی" فرحان نے بیچ میں ہی ڈاکٹر ثانیہ کو چپ کرا دیا

"واپس؟؟ واپس بھیج دوں گی؟ کس کے بھروسے؟"

"میرے بھروسے، میں فرحان مرزا جس پر علیزہ کی ذمہ داری ہے"

"آپ اپنی ذمہ داری کا بہت ثبوت دے چکے ہیں فرحان! اس لیے آپ بالکل خاموش رہیے"

''یہ دھوکا ہے، وعدہ خلافی ہے'' فرحان بپھر رہا تھا، بکھر رہا تھا۔ اعیان نے بات کو بگڑتے دیکھ کر سنبھالنے کی کوشش کی اور نرمی سے بولا۔

''ڈاکٹر ثانیہ! آپ اس سے انکار نہیں کر سکتیں کہ یہ بچی میری ہے اور میں اسے لے کر رہوں گا۔''

اس درمیان علیزہ خاموش رہی۔ وہ اس طرح سے ساری باتیں سن رہی تھی جیسے ان ساری باتوں کا اس سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اس کے چہرے پر چھائے ہوئے اطمینان اور ہونٹوں پر خاموشی کو دیکھ کر فرحان کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ پیر پٹختا ہوا بولا۔ ''ہم لوگ اپنا حق لے کر رہیں گے، چاہے اس کے لیے ہمیں کوئی بھی قدم اٹھانا پڑے''

ڈاکٹر ثانیہ فرحان کے رویّوں سے بے نیازی برتتی ہوئی سیدھے اعیان سے ہم کلام ہوئیں۔ ''یہ بچی آپ کی ہے اس کا ثبوت کیا ہے؟''

اعیان جو بہت دیر سے زہر کے گھونٹ پی رہا تھا، ترش لہجے میں بولا۔ ''میڈم! آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ بچی میری نہیں ہے''

''ثبوت؟'' ڈاکٹر ثانیہ کے ہونٹوں پر طنزیہ ہنسی آ گئی۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک موٹی میڈیکل فائل نکال کر میز پر رکھ دی۔

فرحان اور اعیان حیرت سے اس فائل کو دیکھنے لگے جس پر علیزہ کا نام لکھا ہوا تھا مگر ان دونوں میں سے کسی نے فائل دیکھنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ وہ کبھی ڈاکٹر ثانیہ کو دیکھتے اور کبھی گود میں بچی کو لیے ہوئے علیزہ کو اور کبھی اس فائل کو دیکھ رہے تھے جس پر علیزہ کا نام درج تھا۔ اعیان نے اپنا پورا حق جتاتے ہوئے پوچھا ''یہ فائل کیسی ہے؟''

جواب میں ڈاکٹر ثانیہ کے الفاظ کسی دہکتی ہوئی سرخ سلاخ کی طرح فرحان کے ساتھ ساتھ اعیان کو بھی اپنے کانوں میں پیوست ہوتی محسوس ہوئی۔

اعیان ہیبت زدہ آنکھوں سے اس فائل کو دیکھ رہا تھا۔ مگر اب وہاں لفظوں کی کوئی تحریر نہیں تھی سب کچھ ایسا کالا ہو رہا تھا جیسے کسی نے اپنی آنکھوں میں بھرے کاجل کو کورے کاغذ سے پونچھ کر پھینک دیا ہو۔ فرحان کسی بت کی مانند کھڑا تھا اور اعیان کو اپنا وجود سوا نیزے پر آئے سورج کے نیچے اڑتے ہوئے روئی کے گالے جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر ثانیہ کے لفظوں کی بازگشت انھیں سنائی دے رہی تھی۔ کتنی آسانی سے ڈاکٹر ثانیہ نے کہہ دیا کہ عورت شطرنج کے کھیل کی گوٹ نہیں جسے مرد جیسا چاہے جب چاہے اپنے حساب سے اپنی بساط پر کھیل لے۔ اس نے یہ کیا کہہ دیا۔

''یہ بچی اعیان کے نطفے (sperm) کی دین نہیں، آپ دونوں میں سے کوئی اس بچی کا دعویدار نہیں کیونکہ یہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی ہے۔''

☆☆☆

پسِ پردۂ شب

یہ ناول ابھی اختتام کو نہیں پہنچا ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کہیں کوئی بات اپنے خاتمے پر آتی ہے

تو وہیں سے ایک نئی بات کی شروعات ہوتی ہے اور یہ وہ نئی شروعات ہوتی ہے جو نئی زندگی کے آغاز کا سورج طلوع کرتی ہے۔علیزہ کی زندگی میں بہت کچھ ایسا ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہوا اور ہو کر گزر گیا۔ ہوتے اور گزرنے کے درمیان پینگیں لیتی علیزہ جو پہلے بہت کم گو تھی، سہمے سمٹے ماحول کی دبی کچلی لڑکی تھی ہر ٹھوکر کو اپنا مقدر جان کر چلنے والی وہ سیدھی سادی لڑکی جب اپنے ہی توسط سے اپنی شناخت کرتی ہے تو اس عورت کو پہچانتی ہے جس کی گود میں آدم کی نسلیں پروان چڑھی ہیں۔ وہ اپنے اس وجود کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوتی ہے جسے اس نے کئی پردوں اور کئی پرتوں میں دفن کر رکھا تھا۔

طوفان اور زلزلے گزرنے کے بعد جب نئی علیزہ بیدار ہوتی ہے تو جذبۂ اظہار کا دبا ہوا سیلاب امنڈ پڑتا ہے۔ایسے میں وہ اپنے قارئین سے راست مکالمہ کرتی ہے اور ان لمحوں کو ان کے ساتھ بانٹتی ہے جن کی تحریریں اس نے خاموش لبوں کے ساتھ اپنی مٹھیوں میں بند رکھی تھیں۔
بند مٹھی کھلتی ہے..... تحریریں باہر آتی ہیں اور علیزہ کی آوازوں کی بازگشت اپنے قارئین کی دنیا میں گونج اٹھتی ہے :

(۱)

میں مخملی گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوں، پارک میں بچے کھیل رہے ہیں۔ان بچوں میں ایک علینا بھی ہے۔ میں دور سے بیٹھی اسے نہار رہی ہوں۔ ننھے ننھے پیروں سے دوڑتی بھاگتی علینا کتنی پیاری لگ رہی ہے۔آج میں نے اسے گلابی رنگ کی فرل والی فراک پہنائی ہے اور خود میں نے بھی پنک شیفون کی ساڑی پہن رکھی ہے۔

علینا بچوں کے ساتھ جھولا جھولنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہی ہے۔ اچانک نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ جھٹ اس نے اپنی دونوں بانہیں پھیلائیں اور ژوں ژوں کی آواز نکالتی، بھاگتی ہوئی میری طرف آنے لگی۔اس کی میٹھی آواز میرے کانوں میں رس گھول گئی—— ''ممّا! ایروپلین آ گیا، چلو بیٹھو اس میں۔''

میں ہنسنے لگی۔''مگر یہ تو بتاؤ تم جھولا کیوں نہیں جھولی؟''

''جھولوں گی ناممّا''

وہ جھٹ سے میری پیٹھ کی طرف آئی اور اپنی نرم بانہیں میری گردن میں پھنسا کر پیٹھ پر سوار ہو گئی—— ''چلو ممّا! جھولا جھلاؤ''

میں بیٹھی بیٹھی ہی اسے جھولا جھلانے لگی۔علینا میری پیٹھ پر جھولا جھول رہی تھی اور میں یادوں کے جھولے میں خود کو جھلا رہی تھی۔

••

کہانی ختم ہو گئی تھی۔ دو حیران چہرے..... ان کے تئیں میری آنکھوں میں کمتی ہوئی ڈھیر ساری نفرت..... کبھی سوچتی ہوں..... میری زندگی میں ایک ہی موسم رہا..... ایک ہی موسم کا بسیرا کیوں؟..... نفرت کا یہ زہر میرے اندر تو رہا لیکن میں اس نفرت کو اپنے وجود سے باہر نہیں نکال پائی..... نکالتی بھی تو کیسے؟

''ارے، ارے ٹھہرو..... علینا رک جاؤ..... رکو نا علینا..... میں اتنی تیز نہیں بھاگ سکتی علینا.....''

علینا میری پیٹھ سے اتر کر پارک میں تیزی سے دوڑنے لگی۔''ممّا، مجھے پکڑو، مجھے پکڑو نا ممّا——''

اس کی میٹھی ہنسی جیسے میرے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ وہ بھاگ رہی ہے اور میں اسے پکڑنے کے لیے دوڑ رہی ہوں۔ میں اسے آغوش میں لے کر اس کے گلابی گالوں کو چوم لیتی ہوں۔

علینا........

اس کی گول گول چمکتی آنکھوں میں میں جھانکتی ہوں۔ خود سے پوچھتی ہوں —— کون ہے علینا؟

پیچھے گزرے کئی برس میری آنکھوں کے سامنے کیمرے کی فلم کی طرح گھومتے چلے جاتے ہیں۔

فرحان مرزا کا طلاق دینا——

اعیان کا ہمدردی میں طلاق کا بوجھ اٹھانا——

اف!

ابھی بھی جیسے دو غلیظ کیڑے میری رگوں میں سرسرا رہے ہوں —— سانپ کی طرح رینگ رہے ہوں۔

میں اور اعیان...... بند دروازہ اور دروازے پر چپکی دو خوفناک آنکھیں جو آج بھی میرے جسم میں کانٹے کی طرح چبھتی ہیں۔

ایک نے میری روح کو زخمی کیا تو دوسرے میں، میں نے زندگی تلاش کرنی چاہی..... مگر دوسرا..... دوسرا تو پہلے سے زیادہ لجلجا، غلیظ کیڑا نکلا جس نے میری سوچ کو تار تار کر دیا...... میں اپنے لیے ہی ایک بوجھ بن گئی.....

لیکن یہ سب کچھ آج میں کیوں یاد کر رہی ہوں؟ کیوں کہ وہ لمحے ناقابلِ برداشت قرض کی طرح میرے جسم میں رکھے ہوئے ہیں۔ علینا کی موجودگی میں یہ بوجھ کم ضرور ہو جاتا ہے لیکن اب اس بوجھ کو اتار کر ہمیشہ کے لیے ہلکی ہو جانا چاہتی ہوں اور شاید اسی لیے زندگی کے ان صفحوں کو میں کہیں بانٹ نہیں سکی تھی مگر آج ان لمحوں کو افشا کرنا چاہتی ہوں جنھیں میں نے چھپا کر سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے۔

ان گزرے لمحوں میں میں نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا —— 'تم میں تمھارا کیا ہے علیزہ........ کچھ بھی نہیں نا......؟ تم دوسروں میں اتنا گم ہو گئیں کہ جینا ہی بھول گئیں.....؟'

کبھی ماں باپ کی سلطنت..... کبھی ایک جلاد کی نگہبانی میں...... تم اسی لیے تو دنیا میں نہیں آئی تھیں نا.....؟

اور علیزہ..... سنو.....

زندگی کبھی ختم نہیں ہوتی... زندگی ایک لمحے کا سچ ہے جو اچانک حیران کر جاتی ہے.... چپکے سے بند روزن کھولتی ہے.... آہستہ سے جگاتی ہے کہ آنکھیں کھولو...... عمر کے حصار سے باہر نکلو.... اور اس اندھیرے سے بھی جس کی نگہبانی نے تمھارے جسم سے سارا رس نچوڑ لیا ہے..... وہ رس تم میں اب بھی ہے علیزہ..... باہر آؤ... یہ لوگ ایسے بدنما کیڑے ہیں جو تمھارے جسم کو جونک بن کر چوس ڈالیں گے۔

اعیان.... اب سوچتی ہوں شاید کسی کمزور لمحے میں جسم کی بہاروں نے ایک خاموش گیت اعیان کے لیے بھی گایا تھا۔

کئی مواقع ایسے تھے جب اس کی باتوں میں ایسی مردانہ چمک نظر آئی جہاں اس سمٹتی ہوئی خزاں کو بہاروں کا سراغ مل سکتا تھا۔ شاید اسی لیے فرحان مرزا کی طلاق کے وزنی پتھر بھی مجھے اندر سے پوری طرح زخمی کر

کے، جان نہیں لے سکے تھے — بلکہ میرے لیے اس وقت یہ لفظ ایسے ہی تھے...... جیسے ڈائننگ ٹیبل، پلیٹیں، کوفتے، کباب یا پھر ایسی ہی فرمائشیں جو وہ عام دنوں میں کرتا تھا یا کر سکتا تھا— اس نے جس گھڑی طلاق کے لفظ اچھالے ممکن ہے میری آنکھوں نے بارش کے قطروں سے دوستی کی ہو لیکن میری روح شاداب تھی.... میری روح مسکرائی تھی..... جیسے چپکے سے خود سے کہا ہو.... اب تمھارے لیے ایک کپ چائے بھی نہیں بنا سکتی میں.... سن لیا تم نے؟..... ایک کپ چائے بھی نہیں بنا سکتی...... خاموش آنکھیں جب اندر ہی اندر فرحان مرزا کی گھٹن کا اندازہ کرتیں تو میں جیسے ان لمحوں میں کھلکھلا رہی ہوتی.....

ہاں! اعیان کے ذکر کے ساتھ ہی میرے وجود میں ایک بجلی کوندی.....

(۲)

میں ایک بار پھر انھی وادیوں میں ہوں، جہاں زندگی کبھی رقص کرنا بھول گئی تھی۔ شاید آخری بار میں زندگی کے ان خوفناک صفحوں کو کھولنا چاہتی ہوں...... مجھے سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ ایک طرف مذہب کی ہدایت پر عمل کرنے والا اعیان تھا...... اور دوسری طرف گھر کے کسی گوشہ میں اسی مذہب کی پیروی کرتا ہوا فرحان مرزا...... میں مسلسل دوزخ کی آگ سے گزر رہی تھی۔ وہ خوفناک لمحہ...... میں ان لمحوں میں زندہ تھی، جب اعیان نے بھائی کا فرض پورا کیا تھا— بیزاری سے بھرے ہوئے عمل کے بعد کھٹ کی آواز ہوئی۔ میری آنکھیں صرف اتنا دیکھ سکیں کہ اعیان دروازہ کھول کر جا رہا ہے۔ میرے لباس کہاں تھے، مجھے نہیں معلوم...... تھے بھی یا نہیں...... یہ بھی نہیں کہہ سکتی۔ مگر میں دروازہ بند نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شاید میں سرتاپا برہنہ تھی...... یا یوں کہیں...... میں تھی ہی نہیں۔ بستر پر میری جگہ ایک کینچوا آ گیا تھا۔ اور یہ کینچوا اس وقت بستر پر سرسرا رہا تھا...... میرے جسم سے نفرت کی شعاعیں نکل رہی تھیں...... مجھے یاد آیا، ابھی جو کچھ گزرا ہے، اس میں دو انسانوں کے جذبات کی جگہ صرف مذہب کو دخل ہے...... کینچوا بستر پر سرسرا رہا ہے— محبت کا وہ عمل جہاں نہ خدا ہوتا ہے، نہ عبادت کی کوئی منزل، جہاں صرف سمندر کی تیز گھن گرج ہوتی ہے۔ جہاں محبت جسم کا ابال بن جاتی ہے۔ جہاں لمحۂ وصل کو جسم کی شادابی کے ساتھ سکون اور نہ ختم ہونے والے قرار کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر وصل کے ان لمحوں میں یا تو مذہب کی فریاد تھی، یا بیزاری اور مسلسل عذاب سے گزرنے کا عمل...... کینچوا بستر پر آہستہ آہستہ سرک رہا ہے...... ایک لمحہ کو میری چیخ نکل گئی۔ بس اتنا احساس ہوا...... دروازہ ذرا سا کھلا...... کسی کا چہرہ اندر آیا۔ اور پھر دروازہ بند ہو گیا......

'کون ہو گا؟'

'کیا فرحان مرزا.....؟'

میرے اندر آگ لگی ہوئی تھی...... وہ دیکھنے آئے تھے کہ کیا سچ مچ اعیان نے مذہب کی پیروی کی یا نہیں—؟ یعنی میرے ساتھ ہمبستری کے عمل سے گزرا یا نہیں......؟ ہمبستری...... صرف ایک لفظ نہیں۔ یہاں فرحان کے ساتھ طلاق کا معاملہ نہ ہوتا تو کسی اور کے ساتھ ہم بستری کا تصور بھی اس کے وجود کے پرخچے اڑا سکتا تھا— مگر یہاں...... اس موقع پر...... وہ مذہب اور شریعت کے اصولوں کا پابند ایک ایسی آگ میں ڈھکیل دیا گیا تھا، جہاں وہ کسی اور کا جوٹھا کھانے کو مجبور تھا......

کینچوا بستر پر سرسرا رہا ہے — لیکن جوٹھا کس نے کھایا۔ اعیان نے یا فرحان نے؟

ایک دبی سی چیخ نکلی اس کے ہونٹوں سے۔ اس نے آنکھیں کھولیں ...... ایک ریشمی گورا بدن بستر پر ننگ پڑا ہے ...... کبھی جب آئینہ کے سامنے وہ اپنے لباس اتارتی تھی تو جیسے آئینہ سے بھی آگ اور دھواں اٹھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ مگر اس وقت ...... جانگھوں کے پاس پانی کے قطروں جیسا کچھ تھا ...... اس نے ہاتھ بڑھایا ...... تو جیسے ہاتھ شل تھے۔ بے جان ...... اس نے اپنے گھٹنے اپنے پیٹ کی طرف موڑ لیے۔ اس وقت وہ سارے جہان سے بے نیاز تھی ......

اور شاید یہ وہی لمحہ تھا، جب وہ ایک نئے جہان سے گزر رہی تھی ......

"میں داسی نہیں تھی/

لیکن صدیوں کا کرب بھوگتی رہی میں/

میں پرچھاؤں میں جلی/

میں خواہشوں میں ستی ہوئی/

رسیاں پھاندنے کی عمر میں/

میری رسیاں ہی جل گئیں/

زمین پر لکیریں کھینچتے ہوئے/ آنکھیں موند کر گوٹ پھینکتے ہوئے/

مٹی کی گوٹ ہی ٹوٹ گئی/

بستر پر بجھے ہوئے انگارے تھے/

اور ماں باپ کی آنکھوں میں/ کسی طرح مجھے گھر سے کسی اور گھر بھیج دینے کا ارمان/

میں دمینتی تھی، سیتا یا رادھا یا خدیجہ/

میں ربر کی ایک پچکی ہوئی گیند تھی/

اور اس گیند سے کھیلنے والے تماشائی/ ......"

II

میں گھٹنوں کو پیٹ میں سمائے بستر پر سرک رہی تھی ......

میں داسی نہیں تھی/

لیکن صدیوں کا کرب بھوگتی رہی میں ......

بستر کی ان گنت سلوٹوں کے درمیان کہیں میں دبکی پڑی تھی ...... خود میں لہولہان ...... مرت ...... لیکن —

مجھ میں ایک نئی علیزہ جھانک رہی تھی —

'تم نے خواب دیکھنا چھوڑ دیا تھا علیزہ — ایسا کیوں ہوا ...... آنکھوں سے خواب کی ساری قندیلیں بجھا دیں ...... کیوں بجھا دیں ......؟

میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دروازہ بند کرنے اور شاور سے غسل لینے تک مجھ میں ایک نئی علیزہ بیدار ہو چکی تھی II

دوسرے دن صبح ہی صبح ڈاکٹر تانیہ نے میرے کمرے میں دستک دی—

تانیہ کی گہری نظریں میرے اندر کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھیں......

'معلوم ہوا کہ تم نے کل رات سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے......؟'

'ہاں......'

'کیوں......؟'

'معلوم نہیں......'

میں آخری بار تانیہ کے گلے لگ کر اپنے جسم میں قید سارے آنسوؤں کو نکال لینا چاہتی تھی......میری آنکھیں اشکبار تھیں۔تانیہ شاید ان لمحوں کے درد سے واقف تھی۔اس نے مجھے قریب کیا اور میری آنکھیں بارش کا موسم بن گئیں......

میں دیر تک تانیہ کی آغوش میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔پھر اچانک جھٹکے سے میں اس سے الگ ہوئی......

'تو تم آج میرے ساتھ چل رہی ہو......؟'

'ہاں—'

'کسی سے کچھ کہنے یا پوچھنے کی ضرورت ہے......؟'

'میرے خیال سے نہیں۔ہاں اگر تم ضروری سمجھتی ہو تو تم انھیں بتا سکتی ہو۔'

تانیہ کی نظریں ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھیں۔وہ اچانک مسکرائی۔تبدیلی ایک پراسرار اور گنگنی دھوپ کی طرح ہے— اس موسم کو آنا چاہیے۔اس موسم کے مزے لو......'

میں نے تانیہ کو پلٹ کر دیکھا— اور میں چونک گئی تھی۔میری آنکھوں میں امیدوں کے ڈھیر سارے روشن چراغ جانے کہاں سے جمع ہو گئے تھے۔

'بہت سی باتیں ہیں۔جو تم سے جاننی ہیں۔تانیہ آہستہ سے بولی۔اس کے لیے میرے خیال سے میرا گھر زیادہ مناسب ہے۔'

'ہاں—'

تو پھر دیر مت کرو۔جلدی سے تیار ہو جاؤ۔اور سنو۔آج میں نے چھٹی کر لی ہے۔'

تانیہ مسکرائی تو میں ایک بار پھر اس سے لپٹ گئی۔

'تم میری نئی زندگی کے لیے ایک فرشتہ بن کر آئی ہو تانیہ......'

'نئی زندگی......؟' تانیہ نے مجھے غور سے دیکھا۔اس کا مطلب تمھارے اندر بہت کچھ ٹوٹا پھوٹا ہے۔لیکن اس بار تم میں ایک نئی علیزہ دیکھ رہی ہوں......جانے کب سے اس علیزہ کا میں انتظار کر رہی تھی۔

(۳)

میں ڈاکٹر تانیہ کے بنگلے پر آ گئی۔باہر ایک بڑا سا لوہے کا گیٹ،گیٹ میں داخل ہوتے ہی دونوں طرف خوبصورت سی

پھلواری۔ درمیان کے حصے میں ٹائلس لگے تھے۔ ایک سرخ قالین سیڑھیوں تک بچھی ہوئی تھی — پہلی بار گاڑی سے اترتے ہوئے میں اپنی نئی دنیا کے نظارے دیکھ رہی تھی۔ چمکتا ہوا نیلا آسمان...... دور تک پھیلا ہوا...... سورج کی پھسلتی ہوئی کرنیں...... دھوپ اچانک بادلوں کے درمیان چھپ گئی...... میں نے پھلواری کے پھولوں کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا۔ رنگ برنگے گلاب...... مجھے نہیں معلوم تھا۔ ڈاکٹر ثانیہ کو گلابوں کا اتنا شوق ہے...... میں پچھلی زندگی بھول جانا چاہتی تھی......

اس کینچوے کو بھی...... اس بدنما کینچوے کو، جو رات میں علیزہ کا بدن پہن کر بستر پر آ گیا تھا۔

II

میں ایک بار پھر غسل خانہ میں تھی۔ کریم کلر کے ٹائلس...... یہ غسل خانہ اتنا بڑا تھا۔ جتنا فرحان مرزا کے گھر میں میرا بیڈ روم۔ کریم کلر کے باتھ ٹب کو دیکھ کر جیسے میں پاگل ہو اٹھی۔ میں باتھ ٹب میں سما گئی...... باہر سے ثانیہ کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی......

'فریش ہو کر باہر آ جانا...... چائے آ گئی ہے۔ ہم وہیں باتیں کریں گے......'

'ٹھیک ہے ثانیہ......'

میں جیسے گہرے نشے میں گنگنا رہی تھی......

اس رات کا سجدہ واجب ہے......

اس رات ملی جب خود سے میں

اک زخمی زخمی کایا تھی

اک زخمی زخمی عورت تھی

اس رات کا سجدہ واجب ہے......

پھر یہ ہوا کہ میں تیز آواز میں کھلکھلا کر ہنسی...... باتھ ٹب کا پانی زور سے چھلکا۔ بھیگے ہوئے جسم کے ساتھ میں آدم قد آئینہ کے سامنے کھڑی تھی......

آئینہ میں طلوع ہوتے سورج کی شادابی لیے جو عورت تھی، میں اس سے نا آشنا تھی......

لیکن وہ عورت مسکرا رہی تھی......

میں ایک مکمل عورت تھی —

میں داسی نہیں تھی......

میں اسی آزادی کے ساتھ جینا چاہتی تھی / جیسے کوئی مرد جیتا ہے۔

میں صدیوں کا کرب بھوگتی رہی......'

میں نے انگڑائی لی...... صندل سے زیادہ حسین بانہیں ہوا میں لہرائیں...... میں نے گنگناتی موجوں کی طرح آئینہ میں ایک بار پھر اپنے چہرے کو دیکھا......

اور وہ اچانک چونک گئی — آئینہ میں میرے قدموں کے پاس دو کیڑے تھے...... جو مردہ حالت میں پڑے تھے......

(۴)

دھوپ رخصت ہو چکی تھی...... بادلوں کے ٹکڑے آسمان پر چھا چکے تھے۔ ہوا خوشگوار اور بدن کی موجوں کو گنگنانے والی تھی...... مجھے یاد آیا...... علیزہ نے تو برسوں سے سجنا اور سنورنا دونوں چھوڑ دیا تھا — میک اپ تو دور کی چیز ہے۔ باہر پھلواری میں کین کی بنی کرسیاں آمنے سامنے تھیں۔ میز پر چائے کی پوٹ پڑی تھی۔ چائے قلفیوں میں ڈھالتے ہوئے بھی تانیہ بار بار میری طرف پلٹ کر دیکھ لیتی تھی......

چائے پیتے ہوئے تانیہ کی آواز سنائی پڑی:

'میرے لیے یہ جاننا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ تم ایک قید خانہ سے چھوٹ کر آئی ہو......'

'بالکل سہی......' میری آنکھوں میں اب تاروں کا سہما ہوا قافلہ نہیں تھا۔ مجھے حیرت تھی...... میں ماضی کو بغیر درد میں ڈوبے ہوئے کرید سکتی تھی......

تانیہ نے ٹھنڈی سانس بھری...... 'کہتے ہیں شوہر کا گھر پناہ گاہ ہوتا ہے۔ ایک معصوم جسم کی پناہ گاہ......'

'کہتے ہوں گے......'

'تمہیں فرحان مرزا سے شکایت تھی......'

'نہیں...... شکایت میں اپنا پن ہوتا ہے تانیہ...... میں یہ حق بھی اسے نہیں دے سکتی۔'

'ہونہہ......' تانیہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی...... 'اور اعیان......؟'

'میرے لیے ایک گناہ...... تو دوسرا بدتر از گناہ......'

بدلیوں کے درمیان سورج پھر سر پر آ گیا تھا۔ لیکن سورج نے اس موقع کے لیے اپنی شدت چھپائی تھی......

'تو اب کیا سوچا ہے تم نے......'

'کچھ سوچ رہی ہوں تانیہ۔ لیکن شاید ابھی کچھ کہنا جلد بازی ہوگی...... ابھی دو چار دن کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی۔ بس اپنی زندگی جینا چاہتی ہوں...... ان چند دنوں میں وہ سب کرنا چاہتی ہوں...... جو کبھی نہیں کر پائی......' میری آنکھوں میں مسکراہٹوں کے گلاب کھل گئے تھے۔

'اچھا سنو تانیہ...... تم آئس پائس کھیلو گی؟ تمہیں رسیاں کھیلنا آتا ہے......؟ یاد ہے۔ بچپن میں ہم مٹی کی گوٹ سے کھیلا کرتے تھے...... میں احتیاط تو برتتی نہیں تھی۔ میری گوٹ ہمیشہ ٹوٹ جاتی تھی......'

'تم پاگل ہو......'

میں کھلکھلا کر ہنسی...... 'بس یہ چند دن میں پاگلوں کی طرح ہی جینا چاہتی ہوں تانیہ۔ سب کچھ بھول کر — عمر کے احساس پر قفل چڑھا کر تو خیر۔ گھر میں ناچتی ہوئی علیزہ کو دریافت کرنا چاہتی ہوں...... تم بھی میرے ساتھ ان کھیلوں میں شریک ہو جاؤ نا......'

دھوپ پھر رخصت...... اس بار گہرے بادل آئے تھے......

'بارش ہوسکتی ہے.....'
میں زور سے اچھلی — سچی مچی..... اف ..... میں بارش میں نہانا چاہتی ہوں۔ جسم میں یادوں کی جو بھی گرد رہ گئی ہے نا،
تانیہ..... آج اسے بھی بارش کی رم جھم میں بہا دینا چاہتی ہوں.....
میری پکار اللہ نے سن لی تھی.....
بجلی کی تیز گرج کے ساتھ آسمان سے ننھی منی بوندیں ہمیں بھگونے لگی تھیں.....
میں رقص میں گم تھی.....
میں ناچ رہی تھی.....
زندگی کے سرد و گرم بھول کر میں نے خود کو بارش کے قطروں کے حوالے کر دیا تھا۔

II

'علینا.....'
'علینا کہاں ہو.....'
'دیکھو علینا..... ایسے نہیں چھپتے..... تم سمجھ رہی ہو نا.....'
'علینا..... اف..... تمہاری ماں کا دل بہت کمزور ہے..... علینا.....'
میں گنتی گن رہی ہوں..... ایک..... دو..... تین..... اب جلدی سے سامنے آجاؤ.....
پھر ایک کھلکھلاہٹ بھری گونج..... ممی..... تم کیوں ڈر جاتی ہو.....
'علینا..... میری بچی.....'
جھک کر علینا کو بانہوں میں سنبھالتی ہوئی ایک بار پھر انہی وادیوں کی سیر میں نکل گئی ہوں..... علینا بھی جانتی ہے۔ میں ڈر جاتی ہوں۔ مگر کیوں ڈرتی ہوں میں..... کیا اب بھی ڈرتی ہوں..... کیا اب بھی کہیں غیر محفوظ ہونے کا کوئی احساس میرے ساتھ رہ گیا ہے.....؟
آنکھوں کی پتلیوں پر ایک ساتھ کتنے چہرے ابھرتے ہیں۔ پھر ڈوب جاتے ہیں۔ برسوں پہلے ایک الّھڑ ندی کی موجوں کو لفظوں کے کیسے کیسے پتھر روک دیا کرتے تھے..... امی ابو کے گھر میں لڑکی کے جوان ہونے کا مطلب زندگی کو نئی آنکھوں سے دیکھنا تھا ہی نہیں — اور اسی لیے تو..... علیزہ بس جوان ہوئی لیکن..... خوابوں پر بھی پہرے تھے.....
آنکھوں میں کہیں ایک سوئی ہوئی رومانیت تھی جو کبھی کبھی سناٹے میں جاگ جاتی تھی..... یا جسم کا خاموش تقاضہ بن جاتی تھی..... پھر یہ تقاضے سونے لگے — اور مذہب زیادہ سے زیادہ جاگنے لگا.....
میں اب ان دنوں کا تجزیہ آرام سے کر سکتی ہوں..... ایسا نہیں ہے کہ میں مذہب کے خلاف ہوں..... مگر مذہب کے انجکشن جس طرح سے ایسے ماحول میں نوجوان بچیوں کو لگائے جاتے ہیں، اب ان کے مفہوم بھی واضح ہو چکے ہیں — خاندانی وقار، عزت و ناموس کی دہائیاں صرف لڑکیوں کے لیے ہوتی ہیں — اس لیے ان کے لیے کبھی کبھی اپنے ہی آنگن تنگ ہو جاتے ہیں — اپنا سائبان بھی اپنا نہیں لگتا — اپنی چھت بھی اپنی نہیں لگتی..... اور اپنا گھر بھی.....:

مرے خدا! تو مجھے اتنا معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں، اس کو گھر کر دے

نہ مکان نہ گھر...... نہ کوئی چوکھٹ اپنی...... نہ کوئی جسم اپنا...... نہ کوئی شانہ کہ جس پر سر رکھ کر دکھ کا مداوا تلاش کیا جائے— بس ایک پرائے آنگن سے دوسرے پرائے آنگن کا سفر— ایک پرایا آنگن امی ابو کا...... جس کے در، دروازے، کھڑکیوں سے بھی آشنائی کی رسم وراہ نہ ہو سکی...... ننھی منی مٹی کی گوٹ سے کھیلنے والی عمر میں سر پر یوں آنچل کا سایہ کیا گیا کہ اپنے ہی گھر کو دیکھنے والی آنکھیں بھی اندھیرے میں ڈوب گئیں...... پھر اس پرائے آنگن سے دوسرے پرائے آنگن تک— فرحان مرزا سے اعیان تک...... ایک خونخوار جسم سے دوسرے سرد اور بے جان جسم تک......

اب ایک چیخ اٹھتی ہے......

میں کوئی ٹھنڈی آگ نہیں تھی/
لیکن مجھے سرد کیا گیا/
جب اڑنا چاہا/
سر پر آنچل کا سایہ کیا گیا/
جب رومانی ہونا چاہا/
مذہب کا خوف بیٹھا دیا گیا/
جب رسم ورواج کے نام پر ایک جسم مجھے سونپا گیا/
تو وہاں بھی انھی عقیدوں کی حکومت تھی......
اور میں...... کوئی ٹھنڈی آگ نہیں تھی......
لیکن مجھے سرد کیا گیا......

II

میں کہہ سکتی ہوں، ڈاکٹر تانیہ کے گھر آنے کے بعد کشمکش کے لمحوں سے دور نکلنا چاہتی تھی...... وہ پہلی رات...... ڈاکٹر تانیہ کے گھر کی وہ پہلی رات میرے لیے ایک ایسی رات تھی، جب میں مکمل طور پر اپنا تجزیہ کر سکتی تھی...... میں ناری ایسی جلی کوئلہ بھئی نہ راکھ......

میں نے خود سے کہا...... علیزہ...... نہ میں کوئلہ ہوں...... نہ مجھے راکھ بننا منظور۔ اس رات ایک اور بات ہوئی...... مجھے کچھ پرانی سہیلیوں کے نمبر یاد آ گئے۔ میں نے سوچا...... اتنے برسوں میں شاید نمبر بدل گئے ہوں گے...... دو ایک سہیلیوں کے نمبر تو بدل گئے تھے...... مگر شاہینہ، ثنا، رباب سے دیر تک بات ہوتی رہی...... سب کے پاس اپنی ایک زندگی تھی۔ مگر جانے کیوں ایسا لگا...... ان میں سے کوئی بھی اپنی زندگی سے خوش نہیں ہے۔ جسے نبھانا ایک رسم ہو۔ بچے ہیں، شوہر ہے تو زندگی ایک رسم تو بن ہی جاتی ہے...... سہیلیوں سے باتیں کرنے کے بعد جیسے مجھ میں ایک نئی علیزہ کی واپسی ہو رہی تھی— اور میں نے سوچ لیا تھا، مجھے ڈاکٹر تانیہ سے اب کن موضوعات پر باتیں کرنی ہیں—

مجھے دوسرے دن صبح کے ہونے کا انتظار تھا—

(۵)

صبح کے آٹھ بج گئے تھے۔ بریک فاسٹ ہو چکا تھا— ڈاکٹر تانیہ نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ ہاسپٹل سے فون آیا تھا— ایک ایمرجنسی ہے۔ انہیں دس بجے جانا ہے۔ مگر ابھی دو گھنٹے ہیں میرے پاس۔ اور دو گھنٹے میں تو فوجیں ملک فتح کر لیا کرتی تھیں۔
'تو مجھے فتح کرنے کا ارادہ ہے......'
'تم فوج نہیں ہو......' ڈاکٹر تانیہ کھلکھلا کر ہنسی......
'اچھا بتاؤ میں کیا ہوں......؟' مجھے بھی شرارت سوجھی تھی......
'بتاؤں......' تانیہ کے ہونٹوں پر ایک شرارت تھی......
'ہاں بتاؤ نا......'
ہم ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پھلواری میں آ گئے تھے۔ یہاں آمنے سامنے کی کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے تانیہ نے ایک سرخ گلاب توڑ کر میری طرف بڑھایا...... اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی......
'تم یہ ہو جان...... گلاب...... کوئی نام سے واقف نہ ہو، گلاب تب بھی گلاب ہوتا ہے۔ کوئی اس کی قدر نہ جانے، تب بھی یہ گلاب ہوتا ہے۔ اور یہ پھول اتنے معصوم ہوتے ہیں کہ انہیں روندنے یا مسلنے والا واقف بھی نہیں ہوتا کہ وہ کتنا بڑا گناہ کرنے جا رہا ہے......'
میں نے تانیہ کی آنکھوں میں اپنے لیے لہراتے شبنمی قطروں کو محسوس کر لیا تھا۔
'تمہارے احساس کی قدر کرتی ہوں۔ لیکن میں گلاب نہیں ہوں...... میں اب ان معصوم پتیوں کی طرح نہیں ہونا چاہتی، جنہیں کوئی بھی بکھیر کر چلا جائے......'
تانیہ کے چہرے پر ایک رنگ آیا۔ اور گیا۔ اس نے چونک کر دیکھا— مسکرائی۔
'گویا رات بھر سوئی نہیں؟'
'ہاں—'
'فیصلہ چلتا رہا—'
'ہاں—'
'کیا فیصلہ کیا......؟'
'کس بارے میں؟'
'اپنے بارے میں جان......'
'اپنے بارے میں مجھے کوئی فیصلہ کرنا ہی نہیں تھا۔' میں زور سے مسکرائی۔
'مطلب—' ڈاکٹر تانیہ نے چونک کر میری طرف دیکھا— پھر کہا— اچھا ایک بات پوچھوں......'
'پوچھو نا......'

تمھیں فرحان مرزا پسند نہیں تھے؟'

'ہاں.....'

'اور اعیان..... تم بتا چکی ہو..... لیکن پھر بھی جاننا چاہتی ہوں — اعیان تو تمھیں پسند تھا۔ بلکہ اس گھر میں قدم رکھنے کے بعد ایک وہی تھا، جو تمھیں سمجھتا تھا۔ پھر کیا ہوا.....'

میں آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی.....

'عورت کو صرف سمجھنا کافی نہیں ہوتا تانیہ۔ سمجھتے تو بہت سے لوگ ہیں — عورت کو کھولنا ہوتا ہے — اور کھولنے کا ہنر سب کے پاس نہیں ہوتا۔ کھولنے کا مطلب عورت کو ننگا کرنا نہیں ہے..... اس کے ریشے ریشے میں ڈوب کر اسے برآمد کرنا ہوتا ہے..... وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کے لیے مرد کی آنکھوں میں جھانکتی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی پسند کے لیے..... صرف کیئر کرنا سب کچھ نہیں ہوتا ہے۔ عورت کو جیتنا ہوتا ہے — اعیان میری کیئر سے زیادہ اپنی شرافت کی کینچلی سنبھالے ہوا تھا۔ اور فرحان مرزا اپنی غلطی کے لیے ندامت کا شکستہ آئینہ لیے کھڑے تھے..... مجھے دونوں ہی گوارہ نہیں تھے.....'

'پھر.....؟ تانیہ کی آنکھیں میری آنکھوں پر جم کر رہ گئی تھیں — پھر کیا سوچا ہے تم نے.....

'کچھ سوچ رہی ہوں.....'

'لیکن کیا.....'

'جلد بتا دوں گی تمھیں — ابھی کچھ دن اڑتے پرندوں کا نغمہ سننا چاہتی ہوں — پھولوں کو مسکراتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ مست رنگین تتلیوں کو پکڑنے کی آرزو میں اپنے ہاتھ زخمی کرنا چاہتی ہوں..... ابھی تو گنگنی دھوپ کو مٹھیوں میں بھر لینے کی آرزو ہے تانیہ..... ابھی تو بہتی ہوا کے ساتھ رقص کرنا ہے مجھے.....'

'اف.....' تانیہ مسکرائی..... تو روکا کس نے ہے۔ کرو نا رقص۔ اور ہاں — اب مجھے تیار ہونا ہے — اسپتال جانا ہے —'

تانیہ سیڑھیوں سے غائب ہو چکی تھی۔

آسمان پر پرندوں کے غول طواف کر رہے تھے۔ اور اس منظر کو آنکھوں میں بھرنا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔

(۶)

میری آنکھوں میں اب کوئی خوف یا دہشت نہیں ہے مگر مردوں کے تئیں نفرت کی ایک تیز لہر موجود تھی جسے تانیہ نے بڑی آسانی سے پڑھ لیا تھا۔ ایک سچی سہیلی کی طرح وہ ہر ممکن طریقے سے میرا خیال رکھتی ہے، میری دل جوئی کرتی ہے اور میری تنہائی بانٹنے کی کوشش کرتی۔ اگر ایک سہیلی کے ساتھ زندگی کے ہر رشتے جیے جا سکتے تو شاید میں بھی ڈاکٹر تانیہ کے سنگ سنگ اپنی زندگی کا سفر پورا کر لیتی مگر میرے لیے یہ ممکن نہ تھا۔

ان دنوں میں حال اور ماضی کے بیچ بھٹکتی رہتی۔ ماضی کیا ہے محض ہمارے مستقبل کی بنیاد..... اصل تو ہمارا حال ہے..... حال جو وقت کی رفتار ہے، بہاو ہے اور میں اس بہاو میں بہتی ہوئی کہاں سے کہاں پہنچ رہی تھی۔

ایک بار ڈاکٹر ثانیہ نے دبے لفظوں میں بے حد ہمدردی سے مجھ سے پوچھا تھا۔ 'کیا تم شادی کرنا چاہو گی؟'

میں نے نفی میں اپنی گردن ہلا دی تھی۔ شادی کے بہانے مرد عورت کی زیادہ عصمتیں لوٹتا ہے بہ نسبت دوسرے طریقوں کے۔۔۔

اس رات میں نے سچ مچ بیماری کا بہانہ کر کے خود کو کمرے میں قید کر لیا۔ صبح سے نہار منہ تھی۔ کھانے پینے کی جیسے خواہش ہی ختم ہو گئی۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ ثانیہ تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ وہ فکرمند نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر کمرے میں داخل ہو کر میری سنگل بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی اور آہستہ سے بولی— 'کیا تم مرد کے بغیر زندگی جی سکتی ہو؟'

میں اس وقت اس سے کہنا چاہتی تھی کہ ہاں میں مرد کے بغیر زندگی گزار سکتی ہوں کیونکہ اکثر شادی کے معاہدے میں جو جیتتا ہے وہ مرد ہوتا ہے— اور وہ اپنی جیت کو عمر بھر کیش کرتا رہتا ہے— اور جو ہارتی ہے وہ عورت ہوتی ہے۔ مرد اسے سمجھا دیتا ہے کہ اس کی ہار میں ہی اس کی جیت ہے۔ گھٹنے ٹیکنے میں ہی اس کی بڑائی ہے۔ مرد کے آگے اس کی خود سپردگی اس کی زندگی کی معراج ہے۔ عورت کو اپنی کانچ کی ٹلی توڑ دینا چاہیے جس میں اس نے خودداری اور انا کے بیج چھپا کر رکھے ہیں۔ جہاں تک جسم کی بات ہے وہ تو فانی ہے، آج نہیں تو کل مٹی کا ہے مٹی میں مل جائے گا۔ ایسی بے مصرف مٹی کو مرد کے تلوے کے نیچے پڑا رہنا چاہیے کیونکہ ان ہی تلووں کی عظمت سے منتقل ہو کر ایک دن جنت عورت کے پیروں کے نیچے آ جائے گی۔ میں بھی ایک مکمل عورت بن کر جنت پاؤں کے نیچے لانا چاہتی تھی مگر اس چاہت نے مجھے دوزخ کی زندگی دی— اور میں دوبارہ کسی بھی قیمت پر اس دوزخ میں نہیں جاؤں گی۔

میں نے اپنے اندر ہی اندر فیصلہ کیا— مگر اب جاؤں کہاں... میں جنت حاصل کر نہیں پائی اور دوزخ میں جانا نہیں چاہتی...... ''علیزہ!'' ثانیہ نے بے حد پیار اور اپنائیت سے مجھے آواز دی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اتنا مت سوچو کہ زندگی سوچ میں کٹ جائے۔''

''کیا کروں؟'' میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

''آج رات کچھ نہیں...... فیصلہ صبح کرنا...... پھر صبح سے پہلے تمھیں آج کی رات ہی گزارنی ہے نا!''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پرس کھولا اور ایک سی ڈی نکال کر میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔

''یہ کیا ہے؟''

''پڑھو کیا لکھا ہے؟''

میں نے سی ڈی کور پر نگاہ ڈالی— ''ایک ڈاکٹر کی موت''

''ہاں! ایک ڈاکٹر کی موت، آج رات تم اس پکچر کو دیکھو گی مگر دیکھنے سے پہلے کچھ کھا لو، یہ ایک سہیلی کا نہیں ایک ڈاکٹر کا آرڈر ہے، سمجھی نا!......''

اس نے پیار سے میرے سر پر چپت لگائی اور کھانا بھجوانے کے لیے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں الٹ

پلٹ کر سی ڈی دیکھنے لگی۔

●●

رات بھر میں وہ فلم میں نے کتنی بار دیکھی یہ مجھے یاد نہیں۔ فجر کی اذان ہوگئی، عادت کے مطابق میں نے نماز ادا کی اور تازہ ہوا کے لیے کھڑکی اور دروازے کھول دیے۔ سورج کی نرم کرنیں کمرے میں پھیل گئیں۔ میں اپنے ان روشن کرنوں کو اپنے چہرے پر محسوس کرتی رہی تبھی ڈاکٹر ثانیہ کی آواز آئی ـــ "فلم دیکھ لی؟"

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ پوری خود اعتمادی اور ایک عورت کے مکمل وجود کے ساتھ... میری آنکھوں میں میرے خوابوں کی اجلی تعبیر تھی۔ ثانیہ آگے بڑھی اور اس نے میری پیٹھ تھپتھپائی.......... جب تک سانسیں باقی رہتی ہیں زندگی کے راستے کبھی گم نہیں ہوتے۔ بس تلاشنے کی دیر ہوتی ہے۔ پھر آنکھیں کھلتے ہی منزل سامنے نظر آنے لگتی ہیں.......... 'میں ابھی ہاسپٹل جارہی ہوں، ایک دو دن میں تم سے بات کروں گی۔'

ایک دو دن کیا ہفتہ گزر گیا مگر ثانیہ نے اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی میں جلد سے جلد کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی تھی مگر ہر بار ثانیہ مجھے ٹال دیتی۔ شاید وہ میرے صبر کا امتحان لے رہی تھی یا پھر مجھے اور سوچنے.....اور سوچنے.....اور سوچنے کا موقع دے رہی تھی۔

اور یہی وہ موقع تھا جب فرحان اور اعیان اور ان کی دی ہوئی ساری نشانیاں مجھ سے دور ہوتی جارہی تھیں۔ اور ایک نیا جہان میرے پاس آتا جارہا تھا۔ جہاں ہم تھے ہماری ملکیت تھی اور ہماری اپنی تلاشی تراشی دنیا تھی۔

●●

وہ چھٹی کی صبح تھی۔ ڈاکٹر ثانیہ لان میں بیٹھی، صبح کی پہلی چائے کے ساتھ اخبار پڑھ رہی تھی، میں بھی اس کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ صبح میری چائے پینے کی عادت نہیں تھی۔

ثانیہ نے اخبار تہہ کر کے کنارے رکھ دیا اور ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''کیسی لگی فلم؟''

''بہت اچھی''

''یہ ریلٹی پر بنی فلم ہے، تمھیں معلوم ہے نا!''

میں نے آہستہ سے کہا ـــ ''بس تھوڑا تھوڑا''

اور پھر اس نے تفصیل سے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر سجاش مکھا پادھیائے ہندوستان کے پہلے ایسے ڈاکٹر تھے جنھوں نے اِن وِٹرو فرٹیلائزیشن in-vitro fertilization پر کام کیا ـــ کامیاب ہوئے ـــ مگر حالات کچھ ایسے پیچیدہ ہوئے کہ انھیں خاطر خواہ رزلٹ نہیں ملا اور انھوں نے خودکشی کر لی۔

مجھے یہ کہانی سننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں جلد سے جلد FIV تکنک کو جاننا چاہتی تھی۔ فلم دیکھتے ہوئے میں نے جاگتی آنکھوں سے یہ خواب دیکھا تھا کہ جیسے بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا، طلوع ہوتا نرم سورج آسمان سے اتر کر میری گود میں آگیا ہو۔

'جانتی ہو علیزہ! تپن سنہا نے یہ فلم اسی ڈاکٹر پر بنائی ہے۔''

پھر اچانک دھماکہ ہوا۔ مجھے خود پتہ نہیں یہ جملہ میرے منہ سے کب کیسے ادا ہوا۔
''تانیہ! میں ماں بننا چاہتی ہوں''۔
تانیہ شاید ہنسی مذاق کے موڈ میں تھی مگر اس کے اسی مذاق نے مجھ پر گہری چوٹ کی۔ اس نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''بے چارے دو دو مرد تو ناکام ہو چکے ہیں''
'وہ ناکام ہونے کے لیے ہی بنے تھے۔ کیونکہ میں انہیں کامیابی کا غرور نہیں دے سکتی تھی'۔
میرے لہجے میں سختی تھی۔ ''میں فیصلہ لے چکی ہوں تانیہ۔ مرد شاید اسی لیے خود کو عظیم سمجھتے ہیں کہ وہ عورت کو ماں بننے کا رتبہ دلواتے ہیں، مگر میں مرد کی صحبت کے بغیر ماں بننا چاہتی ہوں۔ جینے کے لیے کوئی تو سہارا چاہیے نا!''
اور شاید یہی وہ فیصلہ تھا، جس کے لیے اس بھوکی ننگی شام کے بعد میں مسلسل اپنے جسم کے عذاب سے گزرتی رہی تھی۔ نہ فرحان مرزا نہ اعیان...... لیکن ان دونوں کے باوجود مجھے اپنی زندگی کی آبشار لہروں کے لیے ایک نئی زندگی کی ضرورت تھی۔ تو کیا جو کچھ بھی ہوا، وہ اللہ کی مصلحت تھی......؟ جیسے اعیان کے گھر سے تانیہ کے گھر میں آنا۔ تانیہ کا مجھے فلم دیکھنے کے لیے کہنا۔ ایک ڈاکٹر کی موت کو دیکھتے ہوئے بار بار مجھے اس بات خیال کا آنا کہ اس فلم میں وہ سب کچھ موجود ہے، جو ایک لمحے میں میری دنیا کو تبدیل کر سکتی ہے۔ تو کیا یہ تبدیلی خدا کی طرف سے بھیجی گئی تھی۔ ؟ ان لمحوں کے انعام کے طور پر...... جہاں میں مسلسل ایک عذاب سے گزرتی رہی تھی۔ میں بھول گئی تھی کہ میں علیزہ ہوں...... جہاں خواب ہی خواب ہیں...... جہاں رومانیت کی ایسی تیز لہریں ہیں، جن پر قابو پانا آسان نہیں ہوتا...... مگر ایک طرف بند بندی چہار دیواری اور دوسری طرف فرحان مرزا کے گھر کی خوفناک دیواریں...... لیکن اب میں ان دیواروں سے دور نکل آئی تھی...... کتنے کتنے دروازے...... اب یہ دروازے بہت پیچھے چھوٹ گئے تھے۔
اور شاید اسی لیے ایک مضبوط فیصلہ لینے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔
میرا فیصلہ سننے کے بعد تانیہ جی جان سے اس کام میں جٹ گئی۔ میرا میڈیکل ٹریٹمنٹ شروع ہو گیا۔ ہم دونوں اس کام میں مصروف ہو گئے۔ دن ہفتے گزرنے لگے۔ اس درمیان کئی بار فرحان کے دھمکی بھرے فون تانیہ کے پاس آئے کہ وہ علیزہ کو واپس لے جانے کے لیے آ رہا ہے۔ مگر تانیہ کے پاس بھی بہانوں کی کمی نہیں رہتی تھی۔ میڈیکل ٹریٹمنٹ کے دوران ہی مجھے معلوم ہوا کہ ICSI تکنیک کا استعمال کیا جائے گا کیونکہ میری وہ صلاحیت کم زور تھی جو کسی عورت کو ماں کا درجہ دلواتی ہے۔
پھر میری زندگی کا وہ لمحہ بھی آیا جب صحبت کے بغیر مرد کا وہ عنصر میرے اندر انجیکٹ کیا گیا جس نے ایک نئے وجود کو میرے اندر گڑھنا شروع کیا...... ایک ڈیزائنر بے بی نے آہستہ آہستہ اپنے پاؤں نکالنے شروع کر دیے۔

●●

یہ کشمکش بھرے لمحے تھے۔ اور میں کہہ سکتی ہوں، ان لمحوں کو علیزہ جیسی کسی عورت کے لیے جینا آسان نہیں تھا۔ میں نے جس فیصلے کو بہت آسان سمجھ لیا تھا، اس میں ہزار طرح کی دشواریاں تھیں۔ تانیہ نے ہی بتایا تھا کہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا راستہ ابھی ہر عورت کے لیے بہت آسان نہیں ہے۔ اور اس معاملے میں تم Lucky ہو۔ میں کتنی خوش

نصیب تھی، شاید یہ صرف میں جانتی تھی۔ میں ایک پنجرہ چھوڑ کر یا توڑ کر آئی تھی۔ اور میری نئی زندگی میں مردوں کے لیے کوئی مقام نہیں تھا۔ لیکن کیا یہ سچ تھا......؟

کیا کوئی عورت حقیقتاً مرد کے بغیر بھی رہ سکتی ہے......؟

جب رات اپنی چادر پھیلا دیتی تو چپکے چپکے ان اذیت بھرے لمحوں میں، میں خود کو سمجھایا کرتی — فرحان مرزا اور اعیان ہی تو مرد نہیں ہیں۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ دنیا کے سارے مردوں کے چہرے ایک جیسے ہوں...... یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ آہستہ آہستہ میں اس بات کو سمجھنے بھی لگی تھی۔ شاید میں نے اپنی اب کی زندگی میں اسی لیے نفرت کے کسی باب کو جگہ نہیں دی تھی۔ اور میں کہہ سکتی ہوں، اعیان اور فرحان سے بھی میں نفرت نہیں کر سکی۔ میرے لیے وہ نفرت سے زیادہ ہمدردی کے مستحق تھے۔

جب رات اپنے پروں کو پھیلاتی تو ایک عجیب سی سرشاری یا نشہ میں اپنے جسم میں محسوس کرتی۔ بعض اوقات اس کیفیت سے باہر نکلنا میرے لیے دشوار بھی ہوتا، مگر ماں بننے کا جذبہ ایک لمحے کے اندر مجھے اس آتش فشاں سے باہر نکال لانے میں میری مدد کرتا......

اس درمیان ایسے کتنے ہی مواقع آئے جب فرحان مرزا نے مجھے بلانے کے لیے تانیہ سے غیر شریفانہ لہجہ تک اختیار کیا۔ مگر یہ تانیہ ہی تھی، جو ایسے لمحوں سے باہر نکلنا جانتی تھی۔ اور ایک بار تو تانیہ نے صاف طور پر کہہ دیا:

'سنیے فرحان مرزا۔ ابھی علیزہ کی دماغی کیفیت بہت اچھی نہیں ہے۔ وہ اچھی ہو جائے گی تو خود ہی آپ کے یہاں چلی جائے گی۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور آپ سے زیادہ اس کی نگرانی کر سکتی ہوں۔ ایک بات اور۔ یہ مت بھولیے کہ علیزہ آپ کے ظلم کا شکار ہوئی ہے۔ آپ نے زبردستی کی تو میں اس معاملے کو وومین سیل تک لے جا سکتی ہوں۔ آپ میری بات......'

تانیہ کے سخت لہجے کے بعد فرحان مرزا نے فون کرنا بند کر دیا — دن گزرتے جا رہے تھے — طرح طرح کے چیک اپ — ٹسٹ...... تانیہ کی ہمت اور میرے لیے نئی زندگی کی شروعات بس اس خواب کے اس زینہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی...... جہاں میں معصوم کلکاریوں کی آواز سن سکتی تھی...... جیسے آبشار گرتا ہو...... جیسے جھرنے بجتے ہوں......

اور اس احساس کے ساتھ ہی میرے جسم میں ایک عجیب سی ہلچل مچ جاتی تھی۔

●●

اور یہی وہ لمحہ تھا جب خوابوں کی ندیاں پار کرتے ہوئے چپکے سے ایک لفظ میرے ہونٹوں سے باہر آیا تھا...... علینا......

لمحے غبارے کی طرح اڑ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈیزائنر بے بی علینا کی شکل میں میری گود میں آ گئی۔

حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا......

خواب کے در کھل گئے تھے...... علینا کی معصوم آنکھیں میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں......

پھر جھانجروں کے بجنے کی آواز سنائی پڑی......

اور پھر......

وہ کیڑے بھی نظر آئے جو بوجھل قدموں سے تانیہ کے گھر کے دروازے سے باہر نکل گئے تھے۔

'کیا یہ لمحے فتح کے تھے......'

میں ایک بار پھر ان لمحوں کا تجزیہ کر سکتی ہوں۔ یہ لمحے فتح کے نہیں تھے۔ یہ صرف ایک نئی زندگی شروع کرنے کی آہٹ تھی۔ مجھے اس بات کا احساس پہلے ہی ہو چکا تھا کہ فرحان مرزا یا اعیان اصلیت جانتے ہی اس مردہ چھپکلی کی طرح ہو جائیں گے جو اب دیوار پر نہیں چڑھ سکتی — اس لیے ان کے واپس لوٹنے پر میری آنکھیں نہ نم ہوئیں، نہ ان آنکھوں میں فتح کا کوئی جشن شامل تھا — بلکہ علینا کے ساتھ زندگی اور مستقبل سے وابستہ کئی سوالوں نے مجھے بکھرنے نہیں دیا تھا بلکہ مضبوط ہی کیا تھا۔ اور انھیں دنوں مجھے معلوم ہوا تھا کہ تانیہ ایک NGO چلاتی ہے —

حقوق نسواں کے لیے چلائے جانے والے اس NGO کا میں کب ایک ضروری حصہ بن گئی، مجھے پتہ بھی نہیں چلا — پھر ڈاکٹر تانیہ کے بنگلہ کے قریب ہی ایک چھوٹے سے گھر پر میں نے اپنا نام لکھ دیا —

●●

اور یہ گھر کا باہری حصہ تھا، جہاں دوڑتی ہوئی علینا نے مجھے سچ مچ تھکا دیا تھا......

علینا...... پلیز...... رک جاؤ علینا......

اتنا تیز مت دوڑو...... علینا...... رک جاؤ......

لیکن اچانک میں چونک گئی تھی...... اتنا تیز مت دوڑو......؟ کیوں نہ دوڑے علینا...... وہ اسی لیے تو ہارتی رہی کہ وہ دوڑنا جانتی ہی نہیں تھی...... وہ اسی لیے تو ناکام ہوئی کہ ایک پر شکستہ کے علاوہ اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں...... وہ ایک چھوٹی سی اڑان کو بھی ترس گئی تھی۔ مگر اب......

علینا......

وہاں چھوٹے چھوٹے گول گول پتھر ایک قطار سے لگے تھے — یہ پھلواری کی دائیں طرف کا حصہ تھا۔ اسی کی دوسری طرف دیوار پر کنٹیلے تار لگے تھے...... علینا دوڑتی ہوئی پتھروں پر قدم رکھتی ہوئی اونچائی پر چڑھ گئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

مما...... میں یہاں ہوں۔ تم بھی آجاؤ نا......

دھوپ کو اچانک بادلوں نے ڈھک لیا ہے...... میں تیز دوڑتی ہوئی علینا کے پاس پہنچ گئی ہوں...... لیکن — دوڑتے ہوئے بھی میرے قدم تھکے ہوئے محسوس نہیں ہو رہے ہیں......

میں پتھروں کے اوپر...... بلندی پر کھڑی علینا کو دیکھ رہی ہوں......

میں دیر تک اس منظر میں گم رہنا چاہتی ہوں۔

●●

یہ میرا گھر

علینا نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا...... 'مما...... میرا ہاتھ تھام لو......'

پتھر کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے علینا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی......

'یہ گھر تم نے میرے لیے بنایا ہے نا مما۔؟'

'ہاں بیٹا۔'

علینا کی آنکھوں میں چمک تھی...... تم جانتی ہو...... ایسا گھر میرے دوستوں کے پاس بھی نہیں ہے......

میں اچانک گم ہوگئی ہوں۔ دھوپ کی شدت ختم ہو چکی ہے۔ دھوپ آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی کچھ دیر میں دیواروں سے غائب ہو جائے گی...... میں علینا کا ہاتھ تھام کر ایک نظر اپنے گھر پر ڈالتی ہوں...... میرا گھر......

یہ جملہ کہیں مجھے مضبوطی دینے کے لیے کافی ہے۔ میرا گھر تھا ہی کہاں؟ امی ابو کے گھر میں آزادی کے پرندے کہاں تھے۔ دربوں میں بند مرغیاں تھیں— غٹرغوں کی آوازیں مجھے پاگل بنایا کرتی تھیں— پھر فرحان مرزا کا گھر بھی میرا اپنا کہاں تھا۔ مگر یہ گھر...... جب تانیہ کے ساتھ اس گھر کو دیکھنے آئی تھی، تبھی ایک نئے گھر کا خاکہ میرے ذہن میں بن چکا تھا— گھر آسانی سے کہاں بنتے ہیں۔ چونا، سیمنٹ، ٹائلس اور اسٹائلش دروازوں سے لے کر کچن تک میں نے اپنے حساب سے تیار کرایا تھا۔ محراب نما دروازہ کے کھلتے ہی ایک طرف چھوٹا سا پورٹیکو اور دوسری طرف میری چھوٹی سی پھلواری...... طرح طرح کے پھولوں کے لیے میں نے گھر اور نرسری کے ہزاروں چکر کاٹے تھے۔ اور ڈرائنگ روم کا وہ جالی نما فانوس...... روشن ہوتے ہی الگ الگ جالیوں سے الگ الگ رنگوں کی کرنیں ایک ایسی نئی دنیا کے دروازے کھولتی ہیں، جہاں سیاہ رنگوں کا گزر ہی نہیں۔ زمین اور دروازوں کے لیے میں نے سفید ماربل کا استعمال کیا ہے— آپ یقین نہیں کریں گے، یہ سب میں نے اکیلے کیا ہے۔ اور جب اس گھر کی تعمیر ہو رہی تھی، جیسے میرے پاؤں میں جنوں کے گھنگھرو آ گئے تھے۔ یہ گھنگھرو بجتے تھے اور میں ساری تھکان بھول جاتی...... یہاں سے گھماؤ دار سیڑھیاں میرے بیڈروم تک گئی ہیں— اس خوبصورت بیڈروم کا خواب تو میں بچپن سے دیکھتی رہی تھی...... یہاں دروازے پر قیمتی موتیوں کی لڑیاں آپ کا استقبال کرتی ہیں...... یہ میرا بیڈروم ہے۔ اور بیڈروم کے سرہانے دیوار پر یہ شیر کی پینٹنگ کیوں لگی ہے......؟ جانے دیجیے— پھر بھی ایک راز کی بات بتا دوں۔ یہ میں ہوں...... آپ ہنس سکتے ہیں۔ لیکن یہ سچ میں ہوں...... وحشت کے ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر اور حلالہ کی خوفناک رسم سے گزرنے کے بعد اپنی آزادی کا جو خواب میں نے دیکھا تھا، وہ میرے لیے یہی گھر تھا...... میرا گھر......

یہاں سے ایک گھماؤ سیڑھی اوپر چھت کی طرف جاتی ہے...... آئیے نا میرے ساتھ......

یہ کھلی چھت ہے۔ اور یہاں میں نے یہ خوبصورت سا جھولا بھی ڈال رکھا ہے۔ جھولے پر بیٹھ کر نیلے آسمان کو دیکھنا مجھے اچھا لگتا ہے— مجھے جینا اچھا لگتا ہے— اور یوں...... اپنے دونوں ہاتھوں کو کھول کر...... لہراتے ہوئے...... ہوا میں رقص کرنا بھی......

دھوپ سمٹ گئی ہے...... آسمان میں دو ایک پتنگیں ہیں جو اڑ رہی ہیں...... پرندوں کے قافلے ہیں...... جو شاید اپنی منزلوں کی طرف لوٹ رہے ہیں...... میری روح آزاد ہے...... کہ یہاں اب صرف میں بستی ہوں...... یہاں اب صرف میری حکومت ہے......

'میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں......'

........☆........

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی

● شمیم قاسمی

'آمد' ۳ ذرا تاخیر سے ملا۔ دورانِ مطالعہ کہنا پڑا کہ دیر آید درست آید! حسبِ روایت مشمولات میں اظہار و بیان کی تازگی، موضوعی تنوع اور ایک طرح کی بُت شکنی جابجا روشن ہے۔ بیباک بے لاگ یعنی زندہ تحریروں کا یہ ادبی آرگن حلقۂ احباب میں کچھ یوں ہی نہیں دھوم مچا رہا ہے۔ اب نام تو یاد نہیں کسی شاعر کا یہ شعر اس وقت مدیرِ آمد کی ادبی صحافت اور اس کے ''نجات پسند'' تخلیقی سفر کا سائبان بنتا ہے:

کوئی رسول نہیں میرے اور اس کے بیچ
مری کتاب کے اوراق منتشر کر دے

'آمد' نے اپنے پہلے ہی شمارے سے ادب میں زندہ لہو کی جس ''گردش'' کو فوکس کیا تھا اس کی معنی خیزی پیشِ نظر اداریہ کے پس منظر سے عیاں ہے ہر چند کہ زیرِ مطالعہ ''شہرِ مدعا'' اپنے اندرون میں ایک جہانِ معنی رکھتا ہے لیکن اس کا بنیادی موقف وضاحت طلب نہیں۔ اداریہ کو ''شوخیِ تحریر'' کے تحت بہ اندازِ غالب کیا خوب کا غذی پیرہن عطا کیا گیا ہے۔ یوں شعرِ غالب کی تفہیم کو سہل بنانا کوئی مدیرِ 'آمد' سے سیکھے۔ جہاں تک ہم جیسے بے فکرے قارئین کا معاملہ ہے تو کہا جا سکتا ہے: ع ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔ بہر حال! مدیر کا مطمحِ نظر بہت واضح ہے یعنی بقول علامہ جمیل مظہری:

نہ سیاہی کے ہیں دشمن نہ سفیدی کے ہیں دوست
ہم کو آئینہ دکھانا ہے، دکھا دیتے ہیں

علامہ مظہری کا یہ شعر یاد آیا تو یاد آئے برادرم کوثر مظہری، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵ —— اب یوں ہوا کہ میں ''شہرِ مدعا'' سے نکل کر سیدھے ''شہرِ خیر و خبر'' کی سیر کر رہا ہوں۔ اس کے طول و عرض میں تقریباً چار صفحات کی گھیرا بندی کیے پروفیسر موصوف کی علمیت کی گاڑھی دال بگھارتا ہوا ان

کا مراسلہ مرکزِ نگاہ ہے۔ مراسلہ کیا ہے ایک '' آورد'' ہے جسے آپ نے '' آمد'' کا حصہ بنایا ہے۔ شکریہ، کہ آپ نے ٹُٹ ٹوٹ لگا کر اُ گلدان کو گلدان نہیں بننے دیا۔ ویسے بھی برساتی پانی کے جماو کو جھیل نہیں کہتے اور اگر واقعی جھیل ہے تو بقولِ سلطان اختر: جھیل کو جھیل ہی رہنے دے سمندر نہ بنا۔ مزید شکریہ اس مقام پر کہ مدیرِ آمد نے ایک حق پسند ادبی صحافی کا فریضہ ادا کر دیا۔

منشائے مراسلہ نگار یعنی اس کا Effrontery attitude عیاں ہے جو اس کی تلخ کامی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس بحار باتی بقراطی اور قدرے ہکلاتی تحریر یعنی شدید ترین جذباتی طرزِ اظہار سے اندازہ ہوا کہ مراسلہ نگار مکمل طور پر High Iragic Passion کا شکار ہے۔ ہر چند کہ وہ اپنے نام نہاد ناول [؟] کے ہیرو مولوی نما رضوان کی طرح صوم وصلوۃ کا پابند ہے لیکن اس کے اندر صبر وضبط (Tolerance) یا درگزر کا مادہ نہیں جبکہ علمائے دین تو اسلامی طرزِ حیات میں اس مادہ پر بہت زور دیتے ہیں لیکن افسوس.........

بہ حیثیت ایک قاری کے میں نے مراسلہ نگار کے اصرار پر '' آنکھ جو سوچی'' ہے، کو کبھی پڑھنے کی طرح پڑھا تھا اور جب اپنے تاثرات لکھنے کا موڈ ہوا تو پھر بڑی خلوص نیتی سے لکھنے کی طرح لکھا۔ یوں '' آنکھ جو سوچتی ہے'' کا جو سچا نتیجہ نکلا اسے 'آمد' کے حوالے سے قارئین کی نذر کر دیا— اب مشروم پیدا کرنے والے گندم کی سرٹیفکٹ طلب کریں تو اس کا جواب نہیں۔ میں نے '' آنکھ جو سوچتی ہے'' کا ایک چھوٹا سا سچ لکھا تھا، اب فکشن کے سنجیدہ قارئین آزاد ہیں کہ ایک بڑا سچ لکھیں۔ مراسلہ نگار نے جا بہ جا مغربی ادب سے مستعار ادبی اصلاحات کا استعمال کر کے فکشن کے معصوم قارئین کو دھونسانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ مضمون '' آنکھ جو سوچتی ہے کا سچ'' میں ہر چپانے والی کوئی بات نہ تھی کہ مراسلہ نگار بلبلا کر جتھے سے اُکھڑ جائے اور اسے کہنا پڑے کہ **''فکشن کی تفہیم بہت آسان نہیں (کیا ناول لکھنا آسان ہے؟) یہاں تک کہ بڑے بڑے ناول نگاروں کے بس کی بات نہیں کہ وہ فکشن کے متن کو Decode کر سکیں، پھر شمیم قاسمی تو ایک شاعر ہیں۔'' (جی ہاں! شمیم قاسمی شاعر کیا ہوا کہ کھیت کی مُولی ہو گیا کہ وہ لگے............)** آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مراسلہ نگار نے اس مقام پر بڑے بڑے ناول نگاروں، ناقدوں اور شعرا کو بھی لپیٹ لیا۔ کیا ایک شاعر کو بہ حیثیت قاری فکشن پڑھنے کا حق نہیں اور پھر ایک سطحی قسم کا ناول (اب میں دو کوڑی کا لکھنے سے رہا) پڑھنے کی غلطی کرنے والے کو فکشن کی شعریات اور فلاں...... فلاں... پڑھنے کی کیا واقعی ضرورت ہے؟— محسوس کیا جا سکتا ہے کہ مراسلہ نگار لاشعوری طور پر اپنی تصنیف رناول کو قرۃ العین حیدر کی صف میں رکھ کر قارئین کو مرعوب کرنے کے لیے حد درجہ اُتاولا نظر آ رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ '' آنکھ جو سوچتی ہے'' کا متن اتنا Esoteric بھی نہیں کہ قاری کو سر کھپانا پڑے۔ اس قدر Sloven Text تو حسینہ کانپوری کے ناولوں کا بھی نہیں کہ بہ حالتِ مجبوری فرحت احساس کے اس شعر کا سہارا لینا پڑے:

میں نے طلسمِ جسم کی طرفیں تمام کھول دیں — پھر بھی کہاں وہ متنِ خاک پوری طرح بیاں ہوا

ضعفِ زبان و بیان کو چھوڑ بھی دیجیے تو بھی متذکرہ ناول میں معتبر قلم مزدور مشرف عالم ذوقی کے فکشن

زبان کی نشتریت اور عریاں حقیقت نگاری کو ایک نئی معنویت سے روشناس کرانے کے پروسس میں زورِ بیان کے وفور کی وہ تخلیقی طغیانی بھی نہیں کہ کہنا پڑے: "لے سانس بھی آہستہ" کہ.....؟.....؟.....

کیا مجھے مراسلہ نگار کے ناول پر اپنے ذاتی تاثرات کا غیر مصلحت پسندانہ اظہار کرنے سے قبل صلاح ومشورہ کرنا چاہیے تھا؟..... کاش کہ میں پیشہ ور نقاد ہوتا پھر انہیں بھرپور طریقے سے "خوش" کر دیتا۔ میرا پیشہ تو درس وتدریس بھی نہیں اور میں کسی ادارہ کا سربراہ یا کسی یونی ورسٹی کا وائس چانسلر بھی نہیں کہ وہ مجھ سے "اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے" والا رشتہ برقرار رکھیں۔ میں تو ٹھہرا ایک ادنیٰ سا کلرک یعنی کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، کر خوشی سے پھول جا والی زندگی جینے کا عادی۔ اب ایسے میں ادھ جلی تندوری روٹی میرے مطالعے کی ڈش میں پروس دی جائے تو لقمہ گلے میں اٹکے گا ہی۔ یوں بھی مصلحت پسندی میری فطرت میں نہیں۔

مراسلہ نگار رناول نگار کا بیان ہے کہ "میں نے اس ناول (آنکھ جو سوچتی ہے) کی **تشہیر کے لیے کچھ نہیں کیا جبکہ کرنا چاہیے تھا**" اب ناول نگار کو اس کا ملال نہیں ہونا چاہیے کہ یہ کام غیر ارادی طور پر شمیم قاسمی نے انجام دے دیا— مراسلہ نگار نے بار بار میرے شاعر ہونے پر زور دیا ہے گویا ایک شاعر کو فکشن پڑھنے اور اس پر اپنی رائے دینے کا حق نہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ میرے ادبی سفر کی ابتدا افسانوں سے ہی ہوئی تھی اور کسی زمانے میں میرے افسانے آجکل، صبح نو، آہنگ، تحریک، کتاب، مورچہ، پیکر، زرافشاں، پرواز ادب، زبان وادب، سہارا میگزین یہاں تک کہ بیسویں صدی وغیرہ میں شائع بھی ہوتے رہے ہیں۔ بہار میں اُردو افسانہ نگاری (مرتب وہاب اشرفی) میں بھی میری شمولیت ہے۔ علاوہ ازیں میرے افسانوں (پانچ سلاخوں والا پنجرہ: افسانوی مجموعہ) پر پروفیسر خورشید سمیع، ڈاکٹر جمشید قمر، پروفیسر عزیز احمد اور عبید قمر وغیرہ نے مضامین رتاثرات بھی لکھے ہیں۔ لیکن مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں خود کو شاعر کہلانا زیادہ پسند کرتا ہوں اور وہ بھی غزل کا!

آگے چل کر مراسلہ نگار مزید فرماتے ہیں "شمیم قاسمی صاحب ناول کے اقتباس کی Paraphrasing تک سے نابلد اور ناواقف محض ہیں۔" اب ذرا آگے بڑھیے تو Hallucination, Hetroglossia, Chronotope, Hedonism اور Epicurus وغیرہ وغیرہ یعنی مغربی زبان وادب سے مستعار اصطلاحات اور دھواں دھواں مغربی نظریات وافکار کی دھونس جما کر اپنے اکہرے معنی ومفہوم اور بازاری عورت کی طرح حد درجہ استعمال شدہ موضوع پر آدھارت، زبان واسلوب کی سطح پر ایک نہایت لچر قسم کے ناول کا غیر ضروری دفاع کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ آگے چل کر مشورہ بھی دیتے ہیں کہ "**شاعروں، ادیبوں کو بھی احساسات وجذبات کی مجذ دیانی سے باہر آنا چاہیے۔**" کاش کہ وہ اپنے کہے پر ہی پہل کرتے۔

اقتباس کی Paraphrasing سے کون نابلد ہے؟ یہ تو قارئین فیصلہ کریں گے۔ ویسے مجھے پتہ ہے کہ Paraphrasing کا گر مراسلہ نگار کو خوب آتا ہے جبھی تو وہ ایک مخصوص حلقہ میں اپنی ادبی دکان چمکا رہے ہیں۔ اے۔سی چیئر مبارک! فی الحال Paraphrasing کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

"وہ تنہا (بالکل جھوٹ) پورے معاشرہ اور اپنی قومی وملی فکر کے مدمقابل کھڑا ہے۔ وہ تنہا سیتا مڑھی سے لیکر بتیا تک اس فسادزدہ ماحول میں رہ کر کام کرتا ہے (وہ ہرگز تنہا نہیں ہے بقیہ علاقہ کے لوگ رکردار کہاں گئے؟ فسادزدہ ماحول میں جب چہار جانب قتل وخون کا بازار گرم ہو تو کیا اکیلا چنا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے؟) قومی یکجہتی کے عناصر کو بھی (متذکرہ ناول میں) پوری اعتدال پسندی کے ساتھ دکھانے سے کیا مُراد ہے؟ کیا "آنکھ جو سوچتی ہے" میں جو کچھ قلمبند ہوا ہے وہ سچ نہیں ہے؟ کیا سب خام خیالی ہے، پھر سات برسوں تک پولی بیگ میں مراسلہ نگار نے جو حقائق جمع کیے تھے وہ سب جھوٹ کا پلندہ تھے؟) لیکن سب کچھ کے باوجود مرکزی کردار رضوان شمیم صاحب کو بزدل نظر آتا ہے۔ افسوس ہوتا ہے اس کج فہمی پر کہ جب رضوان زخمی ہو کر ہاسپٹل میں موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے تو اسے جناب شمیم کہتے ہیں "ناول کے آخری حصہ میں کمرشیل فلم کی طرح بے موت مرجانے والا مولوی ثمار رضوان اس وقت کو اور بھی بزدل اور بونا نظر آتا ہے۔"

(آمد ۳: ص ۳۱۲، ۳۱۳: کوثر مظہری)

الفاظ کی ہیرا پھیری یعنی Linguistic Manipulation کا گُر کوئی مراسلہ نگار سے سیکھے۔ اب اصل متن قارئین بغور پڑھیں اور دیکھیں کہ رضوان کب شمیم قاسمی کو بزدل اور بونا نظر آتا ہے:

"مولوی ثمار رضوان اس وقت اور بھی بزدل اور بونا نظر آتا ہے جب سیتا مڑھی کے حوالات کی سلاخوں سے رشوت خوری اور سیاسی پیروی کے بل بوتے پر آزاد ہوتے وقت معصوم نوازی کو ایک جھٹکے میں بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے تب ملی جذبوں کو لے کر حد درجہ حساس نظر آنے والا رضوان کتنا مفاد پرست دکھائی دیتا ہے۔ ...... سند ر ہے کہ رضوان ان فرقہ پرست کھدر دھاریوں کی خوشنودی کے لیے کئی بار استقبالیہ گیت لکھ چکا ہے جو سیتا مڑھی میں فساد کی جڑ رہے ہیں۔"

(آمد۔ ص۔ ۲۹۹: شمیم قاسمی)

محولہ متن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مراسلہ نگار کے عجلت پسندانہ اور جذباتی ردِّعمل نے اسے کس طرح Decode یا بے حجاب کر دیا ہے۔ مراسلہ نگار نے مجھے شاعر تسلیم کر لیا ہے تو مجھے بھی کہنا چاہیے کہ میں کوئی فکشن کا ناقد نہیں۔ ہاں! فکشن کا مطالعہ میری کمزوری ہے لیکن جب کچھ پڑھ لیتا ہوں تو پھر کبھی بغیر کسی مصلحت کے بالکل آزادانہ طور پر کچھ لکھنا بھی ہو جاتا ہے۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ ادبی سطح پر کچھ لکھنے پڑھنے کے معاملے میں میں کبھی کسی کا Dictation قبول نہیں کرتا۔

بہر حال! مراسلہ نگار کو اپنی "نومشقی" کے زمانے میں لکھی گئی تصنیف رناول کے حوالے سے کسی قاری کے تاثراتی مضمون کو پڑھ کر یوں جامے سے باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔ یاد آیا کہ چند سال قبل دورانِ سفر دہلی میں ایک شب میں نے ان کے ہاں بسر کی ہے، ان کا نمک کھایا ہے۔ اب ان کی گولی بھی کھانے کو تیار ہوں۔ مراسلہ نگار کو چاہیے کہ وہ صبر و تحمل اور رواداری کا دامن نہ چھوڑیں۔ یہ عقلمندی نہیں کہ الٹے چور کوتوال کو ڈانٹے اور پھر ذہنی خلفشار کا خود شکار ہو جائے۔ یہ جدید ترین جذباتی ردِ عمل ر بوکھلاہٹ کسی زاویے سے مراسلہ نگار کی جسمانی صحت کے لیے بھی سود مند نہیں۔ لیکن مراسلہ نگار ہیں کہ اپنے ناول پر میرے ذاتی تاثرات پڑھ کر یوں جگر آب ہو گئے کہ بس.......... اور پھر کسی چونیا ماسٹر کی طرح بلیک بورڈ پر منحنی لکیریں کھینچتے ہوئے مجھے لگے سمجھانے کہ یوں.....؟ اب جب کہ گرتا پھٹ چکا ہے تو اس کی تُرپائی کرنے سے کیا فائدہ؟....... اب مجھے کیا معلوم تھا کہ :

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم! — تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

یہ تو کمالِ فن ہے کہ "آنکھ جو سوچتی ہے" کی زیبا کلیم قاری کو پسند آئی محض اس لیے نہیں کہ اس کی غزالی آنکھوں میں بلاوے کے اضطراب کا منظرِ اتصال ہے اور اس کے گدرائے بدن کے مخصوص عضو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں بلکہ محض اس لیے کہ وہ اس مشینی عہد اور موجودہ جمہوری نظام کی سیاسی بازیگری کے زیرِ اثر پروان چڑھتی صارفیت زدہ اور وحشت ناک انسانی زندگی کی زمینی حقیقت کی ترجمانی کرنے میں بہت حد تک کامیاب نظر آتی ہے۔

اب مراسلہ نگار یا ناول کے خالق کو اس بات کا اعتراض رملال ہے کہ صوم و صلوٰۃ کے پابند رضوان کی جگہ زیبا ہی شمیم قاسمی کو پسند ہے تو اس کا کیا جواب۔ اب شمیم قاسمی کا ذوق اتنا خراب بھی نہیں کہ......... چلتے چلتے میں مراسلہ نگار کو بتا تا چلوں کہ لال باغ، رمنہ روڈ کی زیبا کلیم (اب زیبا بختیار) دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود آج بھی سڈول، ذہین اور تر و تازہ ہے۔ ہر چند کہ وہ رضوان کو بے وفا تو نہیں کہتی لیکن زندگی کے بعض حقائق سے وہ اس طرح چشم پوشی کرے گا اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اب یوں رضوان کا راہِ فرار اختیار کرنا بزدلی نہیں تو اور کیا ہے؟ جبھی تو رضوان زیبا کی نگاہ میں آج بھی ایک بزدل اور ڈھکلیل محض ہے۔ اب مولوی نما رضوان کو "بہشتی زیور" والی عورت پسند ہے تو اسے مبارک۔ کیا منٹو کی سوگندھی کی طرف متوجہ ہونے اور کالی شلوار کی سلطانہ کے لازوال کردار کو نہ بھولنے یا پسند کرنے والے قارئین جہنمی قرار دیے جائیں گے؟ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

المختصر مجھے صرف اب اتنا ہی کہنا رہ گیا ہے کہ میری مراسلہ نگار سے کوئی شخصی رقابت نہیں اور یہ بھی کہ میں ہمیشہ ان کی صحت و کامرانی کے لیے ربّ کائنات سے دعا گو رہا ہوں۔ "آنکھ جو سوچتی ہے کا سچ" پڑھ کر مراسلہ نگار کو میری خلوص نیتی پر شک نہیں کرتے ہوئے میرے اس تھوڑے سے لکھے کو زیادہ سمجھ کر میرا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔ میرے جیسے اب کتنے بے وقوف ہیں جو اس طرح کی فالتو کتاب پڑھ کر اپنا قیمتی وقت ضائع کریں؟ مجھے اندازہ ہوا کہ ادبی دوستوں رشناساؤں پر ایمانداری سے لکھنا پڑھنا بھی کارِ زیاں ہے۔ اب تو یہ کارِ فضول میں

کر ہی چکا۔

مجھے کہنے دیجیے کہ مراسلہ نگار کی زیر مطالعہ تحریر میں وہ متانت، وقار اور علمی لیاقت نہیں جھلکتی جو واقعی جامعہ کے اساتذہ کا خاصہ رہی ہے۔ البرٹ کا ہیٹ احمد کے سر کب تک رکھا جاتا رہے گا؟ مراسلہ نگار نے مجھے فکشن کی شعریات اور فلاں کے ساتھ ساتھ اقتباس کی Parapharasing وغیرہ سیکھنے کا بطور خاص مشورہ دیا ہے جو سر آنکھوں پر لیکن میرا تو انھیں بہ حیثیت قاری بس ایک ہی مشورہ ہے کہ وہ زبان کی جمالیات پڑھیں۔ فکشن رفسانے کی حمایت میں لکھنے کو ''مخالفت'' میں لکھا تصور نہ کریں۔ ہو سکے تو کچھ لکھنے سے پہلے ٹھنڈا جل پی لیا کریں۔ عجلت کا کام شیطان کا ہوتا ہے، اس سے نجات حاصل کریں کیوں کہ ''خود پسندی'' سے ''نجات پسندی'' بہتر ہے۔ یہ بھی بہتر ہوتا کہ مراسلہ نگار اپنے اطراف میں جو واقعی علم والے یا دانشورانِ ادب ہیں ان کی صحبت میں اُٹھک بیٹھک کریں۔ اپنے بزرگوں اور پیش رو قلم کاروں کا احترام کریں اور مجھے یقین کامل ہے کہ وہ مشرقی ادب سے استفادہ کریں تو پھل دار درختوں سے جھکنا سیکھ جائیں گے۔ لازم ہے کہ سب سے پہلے ذہن کی گرہیں کھولیں۔ اب اتنے Slavy نہ بنیں کہ.........؟

یہاں تک آتے آتے احساس ہوا کہ لکھنے بیٹھے تھے رقعہ لکھ گئے دفتر، ورنہ سچ تو یہ ہے:

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی | اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے (غالبؔ)

اللہ علم کے شرّی وفور سے تمام تخلیقی اذہان کو نجات دلائے۔ آمین!

"Bait-ul-Mokarram"
Mahmood Shah Lane, Sabzibagh, Patna-800004, (Bihar)
Mob. : 09304009026

.........☆.........

التماس

ادبا اور شعرا سے مخلصانہ التماس ہے کہ اپنی نگارشات اردو ان پیج (InPage) میں کمپوز کر کے درج ذیل ای میل آئی۔ڈی پر بھیجنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔ ساتھ ہی تخلیقات ر مضامین کی ہارڈ کاپی (پرنٹ آوٹ) ڈاک سے 'آمد' کے پتے پر ارسال کریں۔

e-mail: khursheidakbar@gmail.com
Address : Arzoo Manzil, Sheesh Mahal Colony,
Alamganj, Patna-800007 (Bihar) India
Mob.: 09631629952 / 07677266932

● ناوک حمزہ پوری

شخصی رباعیات

(۱)

دُنیا ہے عدوے زیست پر زندہ ہوں
کمھلایا، نہ سنولایا ہوں، تابندہ ہوں
ہر 'آمدِ'نو کا کرتا ہوں استقبال
صد شکر کہ نادم ہوں نہ شرمندہ ہوں

(۲)

کچھ بھیجیے فرماتے ہیں خورشید اکبر
ہو نظم، غزل، رباعی یا صنفِ دِگر
صفحات پہ 'آمد' کے چھپیں تو یہ لگے
جیسے ہوں کسی حسیں کے زرّیں زیور

(۳)

کیا حکم ہے، اے مدیر، اب لکھوں فقط؟
ہر چند نہیں بگڑا ابھی خامے کا قط
بسیار نویسی بھی مگر ہے اک عیب
تخلیق اگر نہیں ہو تخلیق نمط

مکتوبات

• **اقبال مجید (بھوپال)** ''آمد'' ۳ کا اداریہ فکر انگیز بھی ہے، معنی خیز بھی۔ اسی کے ساتھ ہماری ادبی سوسائٹی جو بدقسمتی سے 'یک تحفۂ عہدِ زوال پرستاں' کی ایک شکل بنتی جارہی ہے، اس سوسائٹی کے نئے مینیجروں کی گروہی نفسیات کی پیدا کردہ بدعتوں کی ایک گھناؤنی تصویر بھی دکھادی آپ نے۔ اس غلاظت کو اور بھی بہتر طریقے سے عطر میں لپیٹ کر کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے، یہ مسئلہ اب ''معصوم بھیڑوں'' کی آنے والی نسلوں کا ہے، ہم تو جیسے تیسے کاٹ لائے اور میر کا یہ شعر پڑھتے ہوئے جانے کو تیار بیٹھے ہیں:

جفائیں دیکھ لیاں، بے وفائیاں دیکھیں　　　بُرا ہوا کہ تری سب بُرائیاں دیکھیں

مگر اتنا تو طے ہے کہ سرکاری فیاضی کے تصدق میں ہالی وڈ کے گلیمر اور چکا چوندھ والے میلوں کے طرز پر ہونے والے سے می ناروں سے ناول کی تخلیق نہ تو پہلے کبھی ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگی کیوں کہ ادب کا سفر ان یخ بستہ راتوں میں بھی تنہا ہی ہو رہا تھا جب 'Crime and Punishment' لکھا جارہا تھا اور اودھ کی اُن جھلسا دینے والی دوپہروں میں بھی تنہا سفر تھا جب 'آگ کا دریا' لکھا جارہا تھا۔ افسوس کہ یونیورسٹیوں میں اردو کا درس دینے والے خود ناول کے نئے افق کے بارے میں کتنا کچھ جاننے کی کوشش کرپاتے ہیں، پچھلے پچاس سالوں میں لکھے گئے ناولوں کے کامیاب اور ناکام نمونوں اور انکے فن کی تفصیلی چھان بین پر کون کون سی اہم کتابیں آئیں اور اُن پر کب اور کہاں ایسے مکالمے قائم ہوئے جن سے کچھ حاصل ہوتا۔ کوئی ٹھوس اور اکیڈمک پلیٹ فارم کسی بھی شکل میں کہیں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ پچھلے پچاس برسوں میں ترکی، ایران، فرانس، روس، جرمنی، لاطینی امریکہ وغیرہ میں جو اہم ناول لکھے گئے، ان کا باقاعدہ ترجمہ اور اشاعت کا بیڑا اٹھانے والا ہمارے پاس کوئی ادارہ نہیں۔ پاکستان کے انگریزی ناول نگار کون کون سی چونکانے والی ناولیں لکھ چکے ہیں جن میں جنرل ضیا کے قتل پر لکھی گئی ناول بھی شامل ہے۔ اس کی ہمارے یہاں کتنوں کو خبر ہے؟ کوئی ایسا اردو کا معیاری مبصر پرچہ نہیں جو بین الاقوامی ناولوں کے منتخب نمونے چھاپ کر ان پر تفصیلی تبصرہ کرے۔ یہ کام مینیجروں کے بس کا نہیں، اسکالروں کے کرنے کا ہے جیسے کہ فاروقی مگر افسوس ہمارے ادب کے سرخیل عرصے سے گروہی سیاست کے شکار ہیں۔ اور گروہی سیاست میں، ہر گروہ کا چودھری حکومت کے وارث کی

طرح خود کو سب سے بڑا الفاظ کا وارث سمجھتا ہے اور حکومت کے وارث ہی کی طرح خود کو ہمیشہ غیر محفوظ محسوس کرتا ہے اور اپنی جانب دوستوں کی طرف سے بھی اچھالے گئے چھوٹے سے پتھر کو بھی حکومت کے وارث کی طرح اپنی ساکھ کے خلاف ایٹم بم سے کم نہیں سمجھتا۔ اس لیے وہ اپنے علمی اور ادبی مرتبے کے تحفظ کے لیے اپنے ادبی قصر کے دروازوں اور کھڑکیوں میں بلٹ پروف شیشہ لگانے کے ان تھک جتن میں ہی دن رات لگا رہتا ہے۔ پھر بھلا کہاں کا ناول اور کہاں کی شاعری۔ (ایسے سے می نار، کھڑکیوں میں بلٹ پروف شیشہ لگانے کے کام میں لائے جاتے ہیں)۔ دیدہ ور نقادوں کے دائیں بائیں بیٹھے نیم بیروکریٹ یا چلّے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے والے پروفیسر اب ناول نہیں لکھیں گے۔ ممکن ہے کہ ان سے می ناروں سے دور کوئی سر پھرا، پھکّو چاک گریباں اور حق شناس ادیب لکھے۔ رشید امجد اور برادرم خورشید اکرم کے افسانے غور سے پڑھے۔ اکرم صاحب کو میں ایک باصلاحیت ادیب مانتا ہوں۔ یہ دونوں افسانے پڑھنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ ہر افسانے کا ایک خفیہ ایجنڈا ہوا کرتا ہے۔ دونوں افسانوں کا خفیہ ایجنڈا تقریباً مشترک ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ افسانہ تحریر کرتے وقت اکثر ایسے غیر مطلوبہ جملے، بیانات اور کردار وغیرہ تخلیق میں گھس آتے ہیں (کبھی مواد کے غلط انتخاب کے سبب اور کبھی غفلت کے سبب) اور افسانے کے خفیہ ایجنڈا تک قاری کو پہنچنے میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ اس لیے مختصر افسانے میں 'کیا لکھا جائے' سے کہیں زیادہ اہمیت کی بات 'کیا نہ لکھا جائے' ہوا کرتی ہے۔ رشید امجد کے افسانے کی دوسری قرأت میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ افسانے کو اسکے تلازمے دستیاب ہو گئے ہیں۔ (صرف نیا مکان ہی نہیں بلکہ موٹر بھی جس پر کلائمکس قائم ہوئی ہے۔ پھر مرکزی کردار کا اشیا سے ہم کلام ہونے کا عادی ہو جانا) ان کے استعمال میں بھی قدم قدم پر احتیاط اور Economy of words سے کام لیا گیا ہے جس نے کہیں بھی غیر مطلوبہ جزئیات کو افسانے میں گھسنے نہیں دیا ہے۔ جو لکھا ہے، اس کی تعداد اور تقدیم و تاخیر پر گہری نظر رکھی ہے تا کہ اس کے افسانوی ایجنڈے کو کسی جانب سے ٹھیس نہ پہنچے۔ (یاد کیجیے منٹو نے موذیل کے خفیہ ایجنڈے کو کتنے جتن سے آخیر تک بچایا تھا) ہم لکھنے والوں سے افسانے میں اس طرح کے گھپلے ہو جایا کرتے ہیں۔ 'قدرت کی جستجو اور فنون لطیفہ' ہم جیسے کم علم کے لیے خاصہ معلومات بخش مضمون ہے۔ تخلص بھوپالی کی تحریر میرے لیے نئی ہے، میں نے ان سے بھوپال ریڈیو پر کئی بار مزاحیہ تقریریں نشر کروائی تھیں۔ نسیم احمد صاحب کا مضمون شہریار کی شاعری کے گوشے روشن کرنے میں کامیاب ہے۔ فی الحال لکھنؤ میں ہوں اور 'آمد' فیاض رفعت سے ادھار لایا تھا۔ جون میں بھوپال پہنچ کر بقیہ چیزیں پڑھوں گا۔

● **سید امین اشرف (علی گڑھ)** ''آمد'' پہلے ہی شمارے میں جس معیار و وقار کے ساتھ دنیائے ادب میں نمودار ہوا تھا، مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ دوسرے اور تیسرے شمارے میں بھی یہ آن بان کم نہیں ہوئی ہے۔ شمارہ ۳ کے مشمولات خواہ وہ شعری ہوں یا نثری، تحقیقی ہوں یا تنقیدی، افسانے پر مبنی ہوں یا شعری کائنات پر محصر، فکر و فن کی حرمت و عظمت سے عبارت ہیں۔ نسیم احمد نسیم کو ہماری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے شہریار کی قربت حاصل رہی ہے اور وہ ان کے عقیدت مند بھی ہیں۔ خوشی کا مقام ہے کہ احترام و عقیدت کے باوصف انھوں نے شہریار پر جو تحریر پیش کی ہے، وہ پُر مغز ہے اور متوازن بھی۔ انھوں نے شہریار کی مطلقہ اہلیہ نجمہ محمود کے شہریار مخالف بیانات کو حوالہ بنا کر شہریار کی شخصیت کا دوسرا رُخ بھی اُجاگر کیا ہے جو ان کی غیر جانب دارانہ روش کا آپ ہی جواز فراہم کر دیتا

ہے۔ کھری، معتبر اور بامعنی تحقیق و تنقید وہی ہوتی ہے جو احباب نوازی، جانب داری اور ہر طرح کے تعصبات و تحفظات سے بالاتر ہو۔ راجندر سنگھ بیدی کے ناول ''ایک چادر میلی سی'' جس کا تحقیقی جائزہ اظہار خضر نے پیش کیا ہے، ثابت کرتا ہے کہ جائزہ کار کے پاس فکشن کو دیکھنے اور پرکھنے والی نگاہ بھی ہے اور درک و آگہی بھی۔ ناول کی گہرائیوں میں اُتر کر انھوں نے ناول کی خصوصیات اور بیدی کے فکر و فلسفے کو قارئین کے سامنے جس مدلل انداز میں پیش کیا ہے، اس کی تعریف نہ کرنا بددیانتی ہوگی۔ خورشید اکبر کی دس غزلوں کی روشنی میں ان کے فکر و فن کو سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگر چہ وہ خیال کا اظہار علامتوں اور استعاروں میں لپیٹ کر پیش کرتے ہیں اور ابہام بھی روا رکھتے ہیں پھر بھی ان کے اشعار کے معانی و مفاہیم تک رسائی بآسانی ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی وہ جہات بھی روشن ہو جاتی ہیں جن کی طرف اشعار اشارہ کرتے ہیں۔ جمال اویسی کی نظموں اور غزلوں میں تہہ داری ہے اور گہری معنویت بھی۔ ان کے اسلوب کا اعجاز بھی متاثر کرتا ہے۔ راشد انور راشد نے اپنی شعری کائنات کی تعمیر میں جمالیاتی رنگ و بو سے ملنے والے کیف و کم اور لطف و سرور کی شمولیت کا بھی خاصا خیال رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام بصیرت کے ساتھ مسرت بھی عطا کرتا ہے۔ دیگر شعرا کا کلام بھی جملہ خصوصیات سے متصف ہونے کے سبب متاثر کرتا ہے۔

● **جسٹس سہیل اعجاز صدیقی، نیشنل کمیشن فار مائنوریٹی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز (نئی دہلی)** سہ ماہی اردو ''آمد'' کا شمارہ موصول ہوا، شکریہ۔ اردو کُشی کے اس دور میں اس قدر معیاری ادبی رسالہ نکالنے کے لیے آپ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس ادبی رسالے کے ذریعہ آپ اردو زبان و ادب کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں، وہ لائق صد ستائش ہے۔ امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

● **ناوک حمزہ پوری (شیر گھاٹی، گیا)** بھائی! آپ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم ہے۔ رباعیاں بالکل تازہ ہیں اور 'آمد' ہی کے لیے لکھی ہیں۔ روا روی میں انھیں لکھا ہے۔ حالاں کہ ایک نظر ڈال لی ہے لیکن اپنے بال بچوں کے عیوب کسے نظر آتے ہیں اور تب جب بینائی بھی بے حد کم زور ہو؟ لیکن جناب! خطا معاف۔ رباعیاں سب چھپیں گی اور من و عن چھپیں گی۔ دو صفحات پر نمایاں چھپیں گی۔ وصولیابی کی اطلاع کر دیں تو اطمینان ہو جائے گا۔ 'آمد' خدا کرے اردو دنیا کا ''آمد نامہ'' بن جائے۔ بیشتر اردو رسائل نے تجارت شروع کر دی ہے۔ اللہ 'آمد' کو ان مکروہات سے محفوظ رکھے۔

● **فیاض رفعت (لکھنؤ)** فون پر تم سے بات ہوئی تھی۔ اداریے کے تعلق سے میں نے اپنی اچھی بری رائے کا اظہار کیا تھا۔ تم نارنگ صاحب سے بلاوجہ بدظن ہو۔ زندگی کرنے کا ہر شخص کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے۔ نارنگ صاحب کامیاب آدمی ہیں۔ اور یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، اور ان کے ''یہ سب اپنے'' اردو والے ہی ہیں جو پیر تسمہ پا بنے ہوئے ہیں۔ اور چھوٹے بڑے فائدوں کے لیے جی حضوری اور خوشامد کو اپنا وتیرہ بنائے ہوئے ہیں۔ خوشامد تو خدا کو بھی اچھی لگتی ہے، نارنگ صاحب تو انسان بشر ہیں۔ وہ بھی اپنے حلقہ بگوشوں سے خوش ہوتے ہیں اور حسب دل خواہ انھیں انعام و اعزاز سے نوازتے ہیں تو برا کیا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ ساہتیہ اکادمی پر ان کا قبضہ ہے، جو غیر دستوری ہے۔ جناب من، آپ کو منصف کی کرسی پر کس نے بٹھا دیا۔ ساہتیہ اکادمی نے سب سے زیادہ بہار والوں کو نوازا ہے — الیاس احمد گدی، عبدالصمد، مظہر امام، جابر حسین، وہاب اشرفی اور ابوالکلام قاسمی وغیرہ سند یافتہ انعامی و اعزازی ادیب بہار ہی کے تو ہیں۔ ابھی حال ہی میں دوحہ قطر کا انعام خطیر بھی ''مہا بھارت'' ناول

کے مصنف کی جھولی میں آیا ہے۔ یہ بھی تو بہار کے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کا انعام پانے کے لیے غضنفر، شوکت حیات اور کچھ اور ادیب کیو میں ہیں۔ تحی شافع قدوائی اور پروفیسر بیگ احساس کی امیدواری بھی پکی ہے۔ مزید ناموں میں فریدہ ترنم ریاض کا نام بھی جوڑ لیجیے۔ مشرف عالم ذوقی، ف۔س۔ اعجاز وغیرہم کے نام بھی قرعۂ فال نکل سکتا ہے۔ میاں یہ دنیا ہے، اس سے دل لگاؤ اور اپنا دل میلا نہ کرو ـــ کہ اسی میں نجات کا پہلو مضمر ہے۔ نارنگ صاحب نے اعلیٰ مناصب حاصل کرنے کے لیے ساٹھ برس تک کڑی مشقت کی ہے، بے شمار ذہنی اذیتیں سہی ہیں؛ تب جاکے گوہر آب دار بننے کا شرف حاصل کیا ہے۔ تمھارے اعتراضات بجا ہیں یا بے جا: اس کا فیصلہ کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔ ہاں مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ تمھارے اداریے میں تلخی بہت آگئی ہے اور تم نے حفظ مراتب کا بھی خیال نہیں رکھا۔ نارنگ صاحب اسی کے پیٹے میں ہیں۔ اگر آپ ان کی علمی دبازت کے کچھ زیادہ قائل نہیں تو کم از کم ان کی پکی عمر کا تو خیال رکھتے۔ ساتھ میں تم نے فاروقی صاحب کو بھی رگیدا ہے۔ اس "شریف آدمی" نے تمھارا کیا بگاڑا تھا: ویسے ایک زمانے تک نارنگ صاحب انھیں اپنا ہمدمِ دیرینہ مانتے رہے ہیں۔ دونوں کے درمیان اقتدار کی جنگ تو بہت بعد میں شروع ہوئی۔ اردو کے بیشتر اداروں پر پھن کاڑھے زہریلے سانپ بیٹھے ہوئے ہیں جو اندھے اور بہرے بھی ہیں۔ میاں، آرام سے رسالہ نکالو اور Vicious Circle کا حصہ نہیں بننا چاہتے ہو تو نہ بنو۔ امید ہے، آیندہ اداریوں میں تم مہذب لہجہ اختیار کروگے اور دل آزاری سے گریز کروگے۔ نارنگ صاحب کے ادبی منصب کے پیشِ نظر اپنے جارحانہ خیالات سے گریز کرو۔ کچھ بھی ہو وہ اردو کے بڑے آدمی ہیں۔ میں اپنا شمار سُنّیوں میں کرتا ہوں نہ شیعوں میں۔ گذشتہ پچپن سالوں سے ستایش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر الٹا سیدھا لکھ پڑھ رہا ہوں۔ نہ خود کو مانتا ہوں نہ دوسروں کو ـــ کہ بت پرستی مرا شعار نہیں۔ قادری کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ شائستہ فاخری کی کہانی بہت اچھی ہے ـــ بہت، بہت اچھی۔ ثمینہ راجا کی نظمیں پڑھ کر سرشار ہو گیا ('آمد' ۲)۔

پس نوشت : ہو سکے تو کتابوں کا اشتہار 'آمد' کے آنے والے شمارے میں شامل کر لینا۔ جی چاہے تو تبصرہ بھی کر دینا۔ اگلے ماہ جون میں بمبئی جانا ہوگا۔ میں وہاں روزنامہ صحافت کا ریزیڈنٹ ایڈیٹر ہوں۔ اور وہاں اپنا حلقہ بھی ہے، وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ دوستی کا ایک اپنا الگ لطف ہے ـــ دشمنی میں کیا رکھا ہے!

نوٹ : محترم بھائی جان! آپ کا یہ فکر انگیز خط مخصوص تنبیہی، تلقینی اور تاکیدی اثرات سے معمور نیز بعض تہذیبی اور نفسیاتی مضمرات کی آگہی کا نوشتہ ہے۔ زندگی کرنے اور دنیاداری نبھانے کے تعلق سے آپ کا تجویز کردہ آموختہ بھی خوب ہے؛ مگر اپنی اس طبیعت کا کیا کروں جو تہذیب اور منافقت میں فرق کرنا جانتی ہے۔ بہار کے تعلق سے آپ نے سچّی باتیں کہی ہیں۔ سوائے الیاس احمد گدی کے دیگر انعام یافتگان کی ادبی خدمات کے علاوہ ان کے ذاتی تعلقات اور مشروط وفاداری کو بھی یکسر منہا نہیں کیا جا سکتا ہے ہر چند کہ انھیں یہ انعامات محض بہاری ہونے کے سبب حاصل نہیں ہوئے بلکہ اردو کے لکھاری کی حیثیت سے تفویض کیے گئے ہیں۔ خاکسار نے 'آمد' ۲ کے اداریے میں اگر خلافِ تہذیب کوئی بات لکھی ہے تو سرزنش لازم ہے ورنہ کسی کو خوش کرنے کے لیے بھی گوشمالی کی جا سکتی ہے، اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ یہ تو آپ جیسے بڑے بھائی کا بنیادی حق ہے۔ ملحوظِ خاطر رہے کہ خوشامد خدا کو پسند نہیں بلکہ ساری تعریفیں اسی کے لیے ہیں پھر بھی وہ ان باتوں سے بے نیاز ہے! (خورشید اکبر)

● **ضیا فاروقی (بھوپال)** 'آمد' کا تیسرا شمارہ بھی پوری آب وتاب کے ساتھ رونق افروز ہوا۔ آپ نے اس بار بھی اپنے اداریہ میں دھما کا خیز مادہ رکھ دیا۔ دیکھیے اس کی گونج کہاں تک جاتی ہے۔ ویسے بھی ہمارا موضوع سخن سیاسی یا غیر سیاسی ادب ہوتا تھا، اب ہر طرف ادبی سیاست کی ہنگامہ آرائی ہے۔ بہر کیف۔ متذکرہ شمارے میں احمد جمال پاشا پر تخلص بھوپالی، رتن سنگھ اور اقبال مجید جیسے قدآور ادیبوں کے مضامین صرف یادِ رفتگاں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں آج سے نصف صدی قبل کے نوجوانوں اور طالب علموں کے ادبی مذاق اور ان کے سماجی سروکار کی ایک تاریخ بھی مضمر ہے۔ محمد حمید شاہد کا ناول "مٹی آدم کھاتی ہے" بیانیہ کی تازگی اور مناظر کی رنگا رنگی کے سبب دلچسپ ہے۔ شہر غزل کے مناظر بھی خوش رنگ ہیں۔ پروفیسر امین اشرف، مختار شمیم کے علاوہ خورشید اکبر کی غزلوں میں تہہ داری کے ساتھ ساتھ عصری حسیت کے عکس بھی لرزاں ہیں۔

● **مصطفیٰ کریم (اسکاربرو، یو۔کے)** چند دن پہلے آمد کا تیسرا شمارہ ملا تھا جس کے ملنے کی اطلاع میں نے دے دی تھی' اور اس سے پہلے آپ کے جائزادبی مطالبے کا جواب بھی ایک مختصر مضمون کی شکل میں آپ کو روانہ کیا تھا۔ دونوں ای میل کے ذریعہ بھیجے گئے تھے۔ امید ہے، دونوں مل گئے ہوں گے۔ علالت کی وجہ سے ابھی میں ساری تحریریں نہیں پڑھ سکا ہوں۔ صرف اداریہ اور شہر ملال میں شامل مضامین کا مطالعہ کیا ہے۔ آپ کے اداریوں اور جس طور سے ایک ادیب کے ناول پر روشنی ڈالی تھی۔ ان سے آپ کی غیر معمولی ادب جویائی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ کے مخلص قاریوں کو آپ سے بڑی توقعات وابستہ ہو چکی ہوں گی جنھیں آپ مستقبل میں بھی پورا کریں گے۔ آمد ۳۔ میں بھی آپ کا اداریہ غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ سیاست معاشرے کی تشکیل کرتی ہے۔ اور اسی معاشرے سے ادیب اپنی تخلیقات کے لیے گوہر نایاب چنتا ہے۔ وہ کس طرح اس کا انتخاب کرتا ہے، اپنی تخلیق کی زینت بناتا ہے؛ اس کا انحصار ادیب کی فہم وادراک پر ہے۔ آپ نے اس موضوع پر قلم اٹھا کر ایک اہم ضرورت پوری کی ہے۔ ماضی میں روشن خیال ادیب اس جانب واضح اشارے کرتے رہے ہیں۔ اردو ناول نگاری پر مختصر آرا مجھے بہت دلچسپ محسوس ہوئیں۔ اگر زندگی نے وفا کی تو اس سلسلے میں کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا۔ پھر بھی اس وقت چند خیالات ذہن میں آرہے ہیں جن کا اظہار کر رہا ہوں۔ کانفرنس کے سکریٹری نے انگریزی میں خیر مقدمی تقریر کی' اس سے اردو کا بھلا نہیں ہوا۔ بہتر ہوتا اگر وہ اردو ناول اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ناولوں کی مزاج آشنائی کرتے اور اس طرح جو مسائل سامنے آرہے ہیں وہ ناول نگاروں اور سامعین کو اشاروں سے آگاہ کرتے۔ ان کی شکایت کہ بیشتر ناول تقسیم ہند' فرقہ واریت اور اقلیت طبقہ کے عدم تحفظ کی نفسیات پر محیط ہیں۔ ان کی شکایت بیجا ہے۔ تقسیم ہند کے ساتھ جو فرقہ وارانہ فساد ہوئے اور جس طرح بڑے پیمانے پر ہجرتیں ہوئیں اور قیام پاکستان کے بعد ہندوستان میں جو مسلمان رہ گئے تھے، ان پر جو قیامت ٹوٹی، وہ ممکن ہے سکریٹری صاحب کے لیے المیہ نہ ہو اور وہ شاید صبر کر چکے ہوں۔ لیکن ایسے المیے بھلائے نہیں جاتے۔ انگلستان میں ابھی تک نہ صرف دوسری جنگ عظیم بلکہ پہلی جنگ عظیم کے اثرات برطانوی ادیبوں کی نگارشات میں نظر آتے ہیں۔ رہ گیا عدم تحفظ کا احساس تو مجھ سے بہتر ہندوستان کے اردو فکشن کے ادیبوں کو ضرور ہوگا اور جب تک کشمیر میں امن وامان نہیں ہوتا ہے' اس احساس کی شدت سے فرار ممکن نہیں۔ جب بڑے ناولوں کے فقدان کا ذکر میں نے پڑھا تو میں اس سوال پر سوچنے پر مجبور ہوا ہوں کہ بڑے ناول کی کیا خصوصیتیں ہیں جو اب تک اردو کے اہم ناولوں میں بھی نظر نہیں آرہی ہیں۔

مابعد جدیدیت کے تحت ناول لکھنا ادیب پر غیر معمولی ذمہ داری عائد کرتی ہے۔ اس کے ذہن میں یہ نکتہ بالکل صاف ہونا چاہیے کہ مابعد جدیدیت کیا ہے؟ اور جن مقتدر فلسفیوں نے اس نظریے کو رائج کیا، انھوں نے کیا لکھا ہے؟ اس موضوع پر میں سرسری نگاہ ڈال رہا تھا تو مجھے حیرت اور خوشی اس بات پر ہوئی کہ مابعد جدیدیوں میں کافکا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ شہر ملال میں مظہر امام پر ارمان نجمی کا مضمون بہت عمدہ ہے۔ مجھے ہمیشہ یقین رہا ہے کہ شاعر پر کسی دوسرے شاعر کا مضمون ایسے نکات روشن کرتا ہے جو آسانی سے نظر نہیں آتے۔ میرے ذہن میں اب بھی نقوش کا میر تقی نمبر ہے۔ جس میں میر پر فراق اور اثر لکھنوی کے مضامین تھے۔ دونوں بلند پایہ شاعروں نے شاعر شناسی کا حق ادا کر دیا تھا۔ مظہر امام جدید شاعروں کی تیسری نسل کے بہت اچھے شاعر تھے اور جس طرح انھوں نے اپنی زندگی سنواری وہ قابل رشک ہے۔ شہر یار کی تخلیق مجھے ہمیشہ متاثر کرتی تھی اور نسیم احمد نسیم نے ان کی شاعری کا عمدہ جائزہ لیا ہے۔ شہر یار کی زندگی بھی ایک سبق ہی ہے۔ نجمہ نے جو کچھ ان کے بارے میں کہا، وہ درست ہوگا۔ چونکہ جو ستم شہر یار پر ٹوٹے انھوں نے یقیناً شہر یار کی شخصیت کو مسخ کیا ہوگا۔ لیکن اس المیے سے شہر یار کی شاعری پر اثر نہیں پڑتا۔ انسانیت کا تقاضہ ہے کہ وہ ان کی شاعری پر نظر رکھے، چونکہ اسی نے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔

● **ناصر عباس نیر (لاہور)** ''آمد'' کا شمارہ نمبر ۲ کل ہی برادرم غلام حسین ساجد نے عنایت کیا۔ آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے یہ پرچہ بھیجا۔ ابھی آپ کا داریہ، شافع قدوائی صاحب کا مضمون اور ان کی کتاب پر صفدر امام قادری کا مضمون پڑھا ہے۔ باقی تحریریں جلد پڑھوں گا۔ رسالے کا مجموعی تاثر بہت اچھا ہے۔ تفصیلی میل پھر کسی وقت لکھوں گا۔ یہ چند سطور محض رسید اور شکریے کے طور پر ہیں۔

● **شاہین (کینیڈا)** 'آمد' کا کتابی سلسلہ ۳ موصول ہوا۔ تہہ دل سے ممنون ہوں۔ رسالہ ملتے ہی تھوڑی دیر پہلے فون سے رسید کی اطلاع دینے کی کوشش کی۔ اُدھر سے صرف اتنا سنائی دیا کہ'' آواز نہیں آرہی ہے۔'' چنانچہ اب ای۔ میل کے ذریعے آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ 'آمد' بے حد خوب صورت رسالہ ہے۔ ابھی تو بس اسے دیکھنے اور چھونے کا مرحلہ ہے۔ اسے پڑھنے اور جذب کرنے کو وقت چاہیے!

● **شاہد عزیز، اودے پور (راجستھان)** 'آمد' کا تازہ شمارہ نمبر ۳ کچھ دن قبل مجھے مل گیا تھا تب سے 'آمد' میرے مطالعے میں ہے۔ اشاعت پذیر خطوط پڑھ کر لگتا ہے کہ پرچہ اپنی پہلی اشاعت ہی سے اہلِ ادب کے ذہن پر چھا گیا ہے۔ پرچے میں ایسے مضامین اور اداریے شائع ہوتے رہے ہیں جو ادب کی دُکھتی ہوئی نسوں پر ہاتھ رکھنے کے مترادف ہیں۔ پچھلے کچھ سالوں سے کچھ لوگ اس گمان میں ہیں کہ ادب پر نثر حاوی ہوتی جارہی ہے۔ اور اس وجہ سے یہ کہا جانے لگا ہے کہ یہ صدی نثر کی صدی ہے پچھلی صدی میں جب ''سوغات'' دوبارہ شائع ہونے لگا تو لوگ ''سوغات'' میں اشاعت پذیر نثر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ یہ صدی نثر کی صدی ہے۔ اسی درمیان ذہن جدید [۱۹۹۱ء] کا اجرا بھی ہو چکا تھا اور اس میں چھپنے والی نثر کا معیار 'سوغات' میں چھپنے والی نثر سے کسی طرح کم نہ تھا اور آج بھی نہیں ہے۔ 'آمد' بھی نثر کی آب یاری میں اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہے۔ اور اس میں اشاعت پذیر اداریہ میں ذکر کردہ سے می نار میں بھی کسی پڑھے لکھے جاہل نے یہ کہا کہ یہ ''صدی نثر کی صدی ہے''۔ تو جناب یہ کس نثر کی بات کر رہے ہیں؟ میں نے تو ''سوغات'' کی دوبارہ اشاعت ۱۹۹۱ء سے آج ''آمد'' کی ۲۰۱۲ تک ایسی کوئی نثر نہیں پڑھی جسے

بڑھ کر لگنے کہ یہ صدی نثر کی ہے۔ اس درمیان ایک ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' ضرور سامنے آیا ہے۔ جس کی نثر نے اہلِ ادب کو بہت متاثر کیا ہے۔ جو کہیں کہیں شاعری کو اُوور ٹیک کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے یہ نثر بھی ایک شاعر کے قلم سے نکلی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نثر ہمیشہ ہی ادب میں دوسرے درجے کی چیز رہی ہے۔ جو لوگ شاعری نہیں پڑھتے میرا دعوا ہے کہ نثر بھی کبھی اچھی نہیں لکھ سکتے۔ جس کی زندہ مثال فاروقی صاحب کا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' ہے۔ ایسی با اثر نثر کسی اور ادب پارے میں پڑھنے کو نہیں ملتی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اچھی نثر لکھنے کے لیے اچھی شاعری کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ جو لوگ شاعری نہیں پڑھتے میرا ماننا ہے کہ وہ لوگ زبان کی تہذیب سے نا آشنا ہی رہ جاتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ 'یہ صدی نثر کی صدی ہے' بڑی بے معنی بات ہے۔ صدی کوئی بھی رہی ہو ہر صدی میں شاعری (نظم) اپنی بلندی پر رہی ہے اور آنے والی صدیوں میں بھی اس کی کبھی کم ہونے والی نہیں۔ اس لیے صنف کو کسی صدی سے منسلک کرنا بڑا عجیب مذاق ہے۔ 'آمد' ایک معیاری پرچہ ہے اور اس میں اشاعت پذیر چیزیں معیاری ہیں، زیادہ تر مضامین معلوماتی اور بحث طلب ہیں ایک خط میں ان سب کی خرابیوں اور خوبیوں کے بارے میں تفصیل سے نہیں لکھا جا سکتا۔ میں آپ کے اداریہ پر کچھ تبصرہ ضرور کرنا چاہتا ہوں: آپ نے اپنے اداریہ میں جو بے باکی دکھائی ہے وہ بڑے بڑے خیموں میں کھلبلی مچا سکتی ہے۔ مگر میں جو بات کہنے جا رہا ہوں اس پر اگر مدیران اور وہ قاری جو میری بات سے اتفاق کرتے ہوں عمل کریں تو ایسے متعصب اور مغرور سروں کو جھکایا جا سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ایسے ادبی مافیا ڈون کی چیزوں کو اپنے رسالوں میں نہ چھاپا جائے اور نا ہی ان کے حواریوں کے مضامین چھاپے جائیں۔ ان کی کسی کتاب پر کوئی تبصرہ نہ کیا جائے۔ وہ فن کار جسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا جا رہا۔ ان کو چاہیے کہ وہ ان کے وجود کو ہی نظر انداز کر دیں۔ یہ تو سب اس لیے ہو رہا ہے کہ ہم ان کے وجود کو تسلیم کیے ہوئے ہیں۔ اک ذرا یہ سب کر کے تو دیکھیے۔ پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ ان کو اپنے خیموں میں ناچنے کودنے دیجیے۔ ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی مت دیکھیے مگر یہ کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے ان سبھی لوگوں کو مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے جو ایسے متعصب و منافق لوگوں سے اتفاق نہیں رکھتے۔

● **رومانہ روحی (کراچی)** اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے، سہ ماہی 'آمد' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا شکریہ، پٹنہ سے ایک گہرا قلبی تعلق ہے، جس کا ذکر ہم آپ سے فون پر کر چکے ہیں اس لیے اس کی آمد ہمارے لیے قلبی خوشی کا باعث ہوئی آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے ہمیں اتنی دور سے یاد رکھا، اس کے تفصیلی مطالعہ سے یہ بات تو واضح ہوگی کہ 'آمد' کی ادب میں آمد ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ سب سے پہلے مشمولہ 'مدعا' میں خورشید اکبر صاحب کا مدعا پڑھا تو ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم بھی وہیں کہیں موجود تھے۔ مشمولہ 'احتساب' میں 'بے جڑ کے پودے' کا جناب خورشید اکبر صاحب نے اس خوبصورتی سے مرکزی خیال بیان کیا کہ ہم نے ناول تو نہیں پڑھا تھا مگر ان کے تبصرے نے نہ صرف اس ناول کو پڑھنے بلکہ اس کے تھیم پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا۔ آپ کا تبصرہ ذہن کو جھنجھوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ تحقیق و تجزیہ میں ''ایک چادر میلی سی'' پر گفتگو کرتے ہوئے جناب اظہار خضر صاحب نے بڑی عمدگی سے بیدی کے اس ناولٹ پر ایک جامع گفتگو کی اور بیدی کی جزئیات نگاری کو بڑی باریک بینی سے بیان کرتے ہوئے اُس کے فن تخلیق کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ 'اسلوبِ فیض میں داخلیت اور خارجیت' کے عنوان سے مامون ایمن کا فیض پر مضمون بھی اچھا لگا۔ مشمولہ 'غزل' میں آپ

کے انتخاب کی داد دیتے ہیں۔ جب کہ 'شہر افسانہ' میں خورشید اکرم صاحب کا افسانہ 'اپنے بے گانے' اپنی بُنت اور موضوع کے حوالے سے خوب رہا۔ علی حیدر ملک صاحب کا 'نہ جائے ماندن' ایک خوبصورت اور لاجواب افسانہ ہے۔ 'آمد' کی خوبصورتی میں ایک اور چیز نے اضافہ کیا اور وہ ہے اُردو تراجم جو مختلف زبانوں کی اور خوبصورت شاعروں کی نظموں کو ترجمہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس سے نہ صرف ہم مختلف زبانوں کے شاعروں کو پڑھ سکیں گے بلکہ اُن کے کلام کو سمجھ بھی پائیں گے۔

● **اسیم کاویانی** 'آمد' کے دو شمارے (نمبر 3،2) باصرہ نواز ہوئے۔ آغاز تو اچھا ہے، انجام خدا جانے۔ نمبر 2 میں شافع قدوائی کی کتاب پر صفدر امام قادری کا جائزہ اور مصطفا کریم کا ناول 'شادی کا دن' اسی درمیان میں معاصر جریدوں میں پڑھ چکا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شافع قدوائی کی کتاب کا جائزہ نہایت عمدہ اور اہمیت کا حامل ہے، لیکن کوشش کیجیے کہ آپ کے جریدے میں تازہ تحریروں کی تکرار اشاعت نہ ہو۔ کلاسیکی تحریروں کا ایسا انتخاب جو آج بھی معنویت کا حامل ہو، کبھی کبھی شاملِ جریدہ ہوا کرے تو قندِ مکرر کا لطف بھی اُٹھایا جاسکتا ہے۔ ظفر کمالی کا 'گلستان کا باب پنجم اور کبیر احمد جائسی' مجھے خاص طور پر پسند آیا۔ انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ 'گلستان' کی حکایتوں سے سعدی کے موقف کی ترجمانی کی ہے۔ میں خوش ہوں کہ کسی نے تو محتسبانِ ادب کے خلاف جراُتِ تحریر کا اظہار کیا۔ ہر دور میں ادب کہیں نہ کہیں ناروا دارانِ ادب یا نامتحملانِ ادب کے ہاتھوں زک اُٹھاتا رہا ہے۔ ممکن ہو تو کمالی صاحب اگلی بار ایران کے نظریاتی ادارے 'فرہنگ ارشاد اسلامی' کی خبر لیں اور ادب دوستوں کو بتائیں کہ اُن سر کہ جبینوں کے گروہ نے نظامی کی 'داستانِ شیریں و خسروؔ' کے کلاسیکی نسخے سے عاشقانہ واردات کے اشعار حذف کر کے اُس کی کیا درگت بنائی ہے۔ حافظ شیرازی سے غالباً اب تک اس لیے چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی کہ اُن کے عارفانہ کلام کی دنیا کی نگاہ میں بڑی اہمیت ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُن کا کلام بھی ہوا و ہوس کے انسانی جذبات سے خالی نہیں، لیکن یہی تنگ نظر گروہ اُن کے مستیِ صہبا میں بہکنے اور معشوقِ چہاردہ سالہ کی چاہ میں چہکنے کے مقامات پر بھی مشاہدۂ حق کے افسانے تراشنے سے نہیں چوکتا اور اُن کے جامِ سفال تک کو ساغرِ معرفت کا نام دے کر انھیں رندِ لم یزل قرار دیتا آیا ہے۔ ان دونوں ہی شماروں کے اداریے مجھے پسند آئے۔ 'آمد' نمبر 3 کے اداریے 'ادب یا سیاست کا ذیلی نظام' میں آپ کی عمدہ نثر مطالب کی ترسیل میں پوری طرح کامیاب اور اثر انگیز ہے، چونکہ اردو مترادفات برمحل اور موزوں ہیں، اس لیے اُن کے انگریزی متبادلات قوسین میں درج کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ 'شہرِ غزل' (آمد: 3) پُر رونق ہے۔ پتا نہیں، رونقِ شہری کیوں بجھے بجھے رہے! عبدالاحد ساز کے کلام نے من موہ لیا۔ تین غزلوں کا عرب ایرانی بہاؤ اُن کی چوتھی غزل (ع بند فصیلیں شہر کی توڑیں، ذات کی گرہیں کھولیں) میں مہند ہو چلا ہے۔ اگر یہ ایک اتفاق ہے تو خیر، اور اگر اُن کی شاعری نیا رُخ اختیار کر رہی ہے تو نیک شگون ہے۔ مدیر رسالہ کی غزلوں میں مجھے خصوصیت سے پانچویں (ع کھلا یہی کہ یہ دنیا ہے قید خانے میں) اور چھٹی (ع ہمارے سر پہ جو رکھا ہے آسماں جیسا) غزل پسند آئی۔ رشید امجد اور خورشید اکرم کے افسانوں میں خورشید کا افسانہ اُن کے معروضات کے ساتھ بلاشبہ فوقیت کا حامل ہے۔ شجاع خاور تو پوری طرح پڑھے جانے والے شاعروں میں سے ہیں، بہر حال آپ نے اُن کی غزلوں کا اچھا انتخاب کیا۔ اظہار خضر کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ بیدی نے 'ایک چادر میلی سی' کے اردو متن کو علاقائی اور مقامی بولیوں کا رنگ بخشا، جس سے ناول

کے اسلوب واداکے حسن میں نکھار پیدا ہوا۔ یہ ناول اُن کے فنی کمال کا مظہر ہے اور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی بیدی کی عظمت سے انکار نہیں، لیکن اُن کی زبان نامعتبر ہے۔ میں یہ بات بیدی کے اس ناول کے پہلے اردو ایڈیشن کو پیش نظر رکھ کر کہہ رہا ہوں، تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ 'شہر آئینہ' میں صفدر امام قادری نے سچ پوچھیے تو تبصرہ نگاری کا حق ادا کردیا ہے۔ اُن کے دونوں ہی تبصرے خوب ہیں۔ خاص طور پر کلیم الدین احمد پر وہاب اشرفی کے 'تیار کردہ' مونوگراف کا اُنھوں نے جس دقتِ نظر سے پوسٹ مارٹم کیا ہے، وہ دادوستائش کے لائق ہے۔ اُنھوں نے کلیم الدین احمد سے ہمارے نقادوں اور ادبی مورخوں کی تغافل شعاری پر ایک اہم سوال قائم کیا ہے، جو دیدہ وروں کی توجہ کا مستحق ہے۔ اسے ایک ادبی المیہ ہی کہا جائے گا کہ کلیم الدین احمد جیسے نابغۂ عصر نقاد پر آج تک کسی رسالے نے کوئی خاص نمبر نہیں نکالا۔ (کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا) مکتبہ جامعہ کے آرگن 'کتاب نما' نے اُن کی وفات کے فوراً بعد اُن پر ایک خصوصی شمارہ شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اُس اعلان کے بعد سے اب تک درجنوں ادیبوں پر 'کتاب نما' کے خصوصی شمارے چھپ گئے۔ پاکستان کے ایک مہمان ادیب (غالباً فرمان فتح پوری) کی آمد پر خصوصی شمارے میں مُدیر نے فخریہ طور پر تحریر کیا تھا کہ اُنھوں نے مہمان ادیب کی پذیرائی میں یہ خاص نمبر صرف بیس دنوں میں تیار کرکے شائع کردیا ہے، لیکن تیس برسوں میں بھی اس ادارے کو کلیم الدین احمد پر اپنا اعلان کردہ خصوصی شمارہ شائع کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے کتنے ہی پختہ عمر نقاد ادب فہمی تک میں کچے ہیں، لیکن نقدِ ادب کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اُن نام نہاد نقادوں کو اور کچھ نہیں تو کلیم کی 'عملی تنقید' سے انتقادِ ادب کا بنیادی درس لینے کی ضرورت ہے۔
آخری بات یہ کہ جریدے کے معیار سے سمجھوتا نہ کریں۔ اِن دوشماروں میں کم از کم 20فی صدی مواد قطعی طور پر نظرانداز کیے جانے کے قابل موجود ہے۔ مجھے اِس قیمت پر سو، پچاس صفحات کی کمی منظور ہے۔ معیار کا زوال منظور نہیں۔

- **کرشن کمار طور، (دھرم شالہ، ہماچل پردیش)** 'آمد' کا تازہ شمارہ مجھے دستیاب ہوا۔ شکریہ! اپنی بے حد مصروفیات کے باعث اسے میں ذرا ٹھہر ٹھہر کے پڑھنے کی سعی کروں گا اور لطف اندوز ہوں گا۔

- **ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگل پور، بہار)** 'خورشید اکبر ادب کے زندہ لہو کی گردش کے لیے تو اترسے'' آمد'' نکال رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے تیسرا شمارہ بھی آگیا۔ ''شہرِ مدعا'' ''شہرِ ثقافت''، ''شہرِ احتساب''، ''شہرِ تحقیق''، ''شہرِ نقد ونظر''، ''شہرِ اعتراف''، شہرِ غزل، ''شہرِ افسانہ''، شہرِ اشتراک''، ''شہرِ آہنگ''، ''شہرِ حیات''، شہرِ ملال''، ''شہرِ اضطراب''، ''شہرِ آئینہ''، ''شہرِ آمد'' اور شہرِ خیر وخبر'' کے مستقل کالم کے تحت ۳۲۰ صفحے کے شمارہ میں پڑھنے کے لیے بہت مواد ہے۔ انشائیہ نما اداریہ اس لیے مزہ دے رہا ہے کہ چُچی تلی زبان میں خورشید اکبر نے جس بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی داد شاید ہی ملے! مصلحت اور جی حضوری کے پنجے ہر طرف گڑے نظر آرہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نئی نسل کی اجتہادکاری میں وہ بھی حصّہ لے رہے ہیں میں کشادگی اور نڈرتا ہے۔ عصری معنویت سے بھرپور جادوئی حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے انھوں نے ایک سوال انگیخت کیا ہے کہ دہلی کے ایک بڑے سرکاری ادارے کی طرف سے منعقدہ سیمینار (ناول پر) میں انھیں کیوں بلایا گیا جب کہ وہ نہ تو ناول نگار ہیں اور نہ ناول کے ناقد ہیں۔ شاید اس لیے کہ ''آمد'' جیسے رسالے کے وہ مالک و مدیر ہیں؟ انھوں نے بعض ناپسندیدہ اشخاص کی موجودگی کا بھی ذکر کیا ہے——! اس شمارہ میں نظام صدیقی کا مضمون نئے عہد کی شعری تخلیقیت کی تیسری کائنات بھی تشنہ ہے۔

اکیسویں صدی کے تناظر میں شعری تخلیقیت کی یہ تمہید ہے۔ بغیر مثالی کے معنویت فروزاں نہیں ہوئی ہے۔ سورج آسا سچائی کی پرتیں کھلنی ابھی باقی ہیں! احمد جمال پاشا پر گوشہ اہم ہے۔! ''شہر اشتراک'' کا کالم جاری رہنا چاہیے کے بیشتر رسائل اُس طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ محمد حمید شاہد میرے لیے نیا نام ہے۔ ان کے ناول ''مٹی آدم کھاتی ہے'' کا ذائقہ الگ ہے۔ اس میں پوشیدہ طوفان کو اور سیاہ تناظر کے اجلے سفر کی بیکرانی کی وسعت کو محسوس کیا جا سکتا ہے! اس شمارہ کا سب سے غیر اہم بلکہ گمراہ کن مضمون رؤف خیر کا ہے۔ عنوان ہے ''ریختی: امیر خسرو سے زبیر رضوی تک''۔ جب کہ امیر خسرو ریختی کے موجد نہیں ہیں اور زبیر رضوی کو اس صنف سے واسطہ نہیں رہا ہے۔ غزل کی ہیئت میں یہ صنف اپنا الگ وجود رکھتی ہے جو اپنے لہجے سے پہچانی جاتی ہے۔ زبیر کی نظم اور ان کے گیت کو فاضل مقالہ نگار نے ریختی کا نام دیا ہے۔ انھیں چاہیے تھا کہ رنگین، انشا، قیس، جان صاحب، بے چین، شیدا وغیرہ کی ریختی کا مطالعہ کرکے اس صنف کو سمجھ لیتے، یا پھر ڈاکٹر ایاز احمد کی تنقیدی و تحقیقی کتاب ''کلیاتِ ریختی'' پڑھ لیتے۔ یہ کتاب ۲۰۱۰ء میں سات سو چار صفحے میں چھپی ہے۔ اندور کے ڈاکٹر خلیل احمد کی کتاب ''ریختی کا تنقیدی مطالعہ'' بھی ان کے لیے مفید ہوتی۔ نظام اردو لائبریری، حیدر آباد میں ریختی کی مطبوعہ کتابیں اور قلمی نسخے موجود ہیں۔ ویسے خدا بخش لائبریری، پٹنہ رضا لائبریری، رامپور اور مسلم یونیورسٹی لائبریری، علی گڑھ میں بھی ریختی پر وافر سرمایہ موجود ہے جس سے ریختی صنف کی اصلیت کا پتہ مل سکتا ہے۔ 'آمد' کے اس شمارے میں صفدر امام قادری کے دونوں تبصرے ان کے مطالعہ پر دال ہیں! دیگر تخلیقات بھی متوجہ کرتی ہیں۔

● **اسرار گاندھی** (الہ آباد) آمد کا تیسرا شمارہ ملا، خوب ہے۔ آپ نے احمد جمال پاشا پر مختصر سا گوشہ نکال کر بہت اچھا کام کیا ہے۔ پاشا ادب کے حاشیے پر چلے گئے تھے۔ آپ نے ایک بار پھر انھیں ادب کے میدان میں لاکر کھڑا کر دیا۔ یہ گوشہ، ادب سے آپ کے Concern کا گواہ بن گیا ہے۔ پاشا مرحوم سے میری بھی کئی ملاقاتیں رہی ہیں۔ وہ واقعی ایک اچھے ادیب اور لاجواب انسان تھے۔ پاشا پر رتن سنگھ اور اقبال مجید کے مضامین بہت اچھے ہیں اور دل کو چھوتے ہیں۔ ایسی دوستیاں تو اب خواب خواب سی ہو کر رہ گئی ہیں۔ تنقیدی مضامین میں فاطمی کا مضمون سب سے کمزور ہے۔ پچاسی فیصد حوالے اور پندرہ فیصد میں خود ان کی بے معنی نوں تاں۔ دراصل وہ اردو تنقید کی دنیا کے گلشن نندہ بن کر رہ گئے ہیں (گلشن نندہ کی روح سے معذرت کے ساتھ) ہندوستان کے جتنے بھی اردو کے اچھے برے، سڑے اور گلے رسالے نکلتے ہیں، سب میں آپ کو ان کے مضامین مل جائیں گے اور اگر کسی رسالے میں مضمون رہ گیا تو اس میں ان کا کوئی لمبا سا خط مل جائے گا۔ وہ اتنا ہی نہیں کرتے بلکہ ایک ہی مضمون کو کئی کئی رسالوں کی زینت بنا دیتے ہیں۔ یہ مضمون بھی ''نقش نو'' میں شائع ہو چکا ہے۔ لوگ تو یہ بھی بتاتے ہیں کہ آپ شام کو ایک مضمون کا آرڈر place کیجیے اور صبح جا کر لے لیجیے۔ دراصل ان کا تعلق quality writing سے نہ ہو کر Quantity writing سے ہے۔ زود نویسی کا یہی انجام ہوتا ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ میں یہ ساری باتیں ان کی تضحیک کرنے کے لیے نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ شاید میری کوئی بات ان کو چبھ جائے اور وہ اپنی تنقیدی سمجھ کو اس طرح Waste نہ کریں۔ ع شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات۔ رؤف خیر کے مضمون کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ The Less said the better والا محاورہ اس مضمون پر پوری طرح سے چسپاں ہوتا ہے۔ معلوم

نہیں، اتنا بکواس مضمون شائع کر کے آپ کو افسوس ہوا یا نہیں۔ بھائی آپ اتنے اچھے رسالے کے اوراق اس طرح ضائع نہ کریں۔ کہانیوں میں سب سے اچھی کہانی نور الحسنین کی ہے۔ زندگی کے بہت قریب اور اسے پوری طرح Identify کرتی ہوئی۔ انھیں بہت بہت مبارکباد۔ خورشید اکرم کی کہانی نامکمل سی محسوس ہوتی ہے، انھیں اس کہانی کو پھر سے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ صفدر امام قادری کے تبصرے غضب کے ہیں۔ ان کے یہاں بڑی کاٹ پیدا ہوگئی ہے اور یہ کاٹ منطق کی آگ میں تپ کر ہی سامنے آئی ہے۔ وہاب اشرفی کی انھوں نے خوب خبر لی اور ابوالکلام قاسمی پر بھی گرم گرم پھواریں چھوڑی ہیں۔ تبصرہ نگاری شاید اسی کا نام ہے اور صفدر اس فن پر پورے اترتے ہیں۔ 'شہر ملال' کا جواب نہیں۔ آپ نے مرحومین کا حق ادا کر دیا ہے۔ خالد قادری سے مغنی تبسم کی گفتگو دلچسپ اور خاصی کارآمد ہے۔ خالد قادری جیسی اچھی زبان لکھنے والے کم ہی کم رہ گئے ہیں۔ ان کی زبان میں ایک خاص طرح کی Creativity کا احساس ہوتا ہے۔ آپ کی دس غزلیں پڑھیں۔ آپ نے ایک نئے آہنگ اور نئی لفظیات کا استعمال کر کے اپنی غزلوں کو کافی بھاری بھرکم بنا دیا ہے۔ ویسے آپ کی غزلوں سے الگ ہٹ کر سید امین اشرف، عبدالاحد ساز، مدحت الاختر اور راشد کی غزلیں اچھی لگیں۔ 'بے جڑ کے پودے' پر آپ کا تجزیاتی مضمون بہت اچھا ہے۔ آپ کا مضمون پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ ۷۸ء کے آخر میں جب میں اور فاطمی پٹنہ لوگوں سے ملنے ملانے کے لیے گئے تھے تو ایک شام میں اور برادر بزرگ سہیل عظیم آبادی گاندھی میدان سے گزر رہے تھے۔ اچانک چلتے چلتے میں نے رک کر سہیل صاحب سے پوچھا ''کیا آپ نے 'بے جڑ کے پودے' کو اس خبر کی بنیادوں پر لکھا ہے جو سیلون (اب شری لنکا) سے آئی تھی۔ جس میں ایک بھائی نے انجانے طور پر اپنی سگی بہن سے شادی کر لی تھی اور پھر چند ہی دنوں بعد حقیقت معلوم ہونے پر دونوں نے ہی خودکشی کر لی تھی۔'' سہیل بھائی قدرے سناٹے میں آگئے اور مجھے دیکھتے ہوئے بولے ''کیا تم نے وہ خبر پڑھی تھی۔'' ''ہاں میں نے پڑھی تھی۔ شاید ۷۴ء کے اردگرد یہ خبر اخباروں میں چھپی تھی۔'' ''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ خبر اسی زمانے میں چھپی تھی اور 'بے جڑ کے پودے' کا مرکزی خیال اسی خبر سے لیا گیا ہے۔'' خورشید صاحب کسی خبر پر لکھی گئی کوئی کہانی یا ناولٹ کا کینوس ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا ہے۔ اسے وسیع کینوس میں تبدیل کرنا بے حد مشکل کام ہے، جو ہر کسی کے بس کا نہیں ہوتا۔ خط قدرے لمبا ہو گیا ہے۔ بہر حال ''آمد'' کے اس لاجواب شمارے کے لیے پھر سے مبارکباد۔ یقین ہے کہ اگلا شمارہ اس سے بھی بہتر ہوگا۔

- **رؤف خیر (حیدرآباد)** ''آمد'' نے تو تہلکہ مچا رکھا ہے۔ یہ ہر جگہ Talk of the town موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ آپ کا اداریہ بہت زیادہ بولڈ Bold ہو گیا ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی کے سیمی نار کی روداد بیان کرتے ہوئے آپ نے سخت رویہ اپنایا ہے۔ صحافت کی پالیسی تو ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ سب کو لے کر چلو۔ آپ نے پہلے یہ اعلان کیا تھا کہ آمد کسی گروہ کا موافق یا مخالف نہیں رہے گا۔ اس کے دروازے سب کے لیے کھلے رہیں گے مگر اس بار آپ نے کچھ اور اقدام کیا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ سیمی نار میں موافقین کے ساتھ ساتھ مخالفین کو بھی مدعو کیا جانا چاہیے۔ ایسا کہیں نہیں ہوتا۔ ورنہ سیمی نار میدان جنگ کا روپ دھار لے گا۔ کیوں کہ مخالفین تو صرف مخالفت کرنے کے لیے ہی تشریف لائیں گے۔ ''بے جڑ کے پودے'' پر آپ کا احتساب خوب ہے۔ جناب اظہار خضر صاحب نے ''ایک چادر میلی سی'' پر خوب داد تحقیق دی کہ یہ منظور احمد کی ترجمہ کردہ ناولٹ ہے۔ بیدی نے اسے اپنانے کے لیے جو کوشش کی، وہ مترجم کے درجے

کو نہیں پہنچتی۔ منظور احمد کو پس منظر میں ڈھکیل دیا گیا۔ احمد جمال پاشا کے سلسلے میں اچھے مضامین پڑھنے کو ملے۔ آپ کی دس غزلیں بھی اچھی لگیں ع۔ یہ واقعہ ہے کہ پتھر میں بھی شگاف لگا رو ایک پھول کھا اس طرح سے خلاف لگا۔ اشرف یعقوبی کی غزل مجھے بہت پسند آئی:

یہ آفت مول لی ہے شیر نے ناخن تر شوا کر　　　اسے جانے لگی ہے لومڑی بھی آنکھ دکھلا کر

واحد نظیر نے مظہر امام کی تاریخ وفات تو صحیح نکالی ہے مگر جغرافیہ غلط ہو گیا ہے۔ ''وہاب اشرفی بہ نام کلیم الدین احمد'' میں جناب صفدر امام قادری نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ مدلل گفتگو کی ہے۔ ان کے دلائل پکّے ہیں۔ صفدر امام قادری صاحب جیسے بے باک حق گو کی اردو ادب کو ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ میرا مضمون ''ریختی'' کافی احباب نے پسند کیا۔ مجھے کئی فون آئے۔ سب سے پہلے داد دینے والوں میں خود آپ ہیں ورنہ یہ چھپتا کیسے۔ خاص طور پر ندا فاضلی صاحب کی داد نے حوصلہ بڑھایا۔

نوٹ : محترم! مجھے آپ کا مضمون شائع کرنے میں تامّل تھا۔ پھر بھی آپ کے مسلسل اصرار پر اسے 'آمد' میں شامل کیا گیا، جس کا مجھے ذاتی طور پر افسوس ہے!! (خ۔ا)

● **فضل حسنین (الہ آباد)** 'آمد' کا تیسرا شمارہ موصول ہوا، شکریہ! پہلے ''شہرِ اعتراف'' کے پانچوں مضامین 'ایک سانس' میں پڑھ گیا۔ اب ایسی شگفتہ تحریریں لکھنے والے ہیں ہی کتنے! احمد جمال پاشا کی یاد تازہ کرا کر آپ نے نیک کام کیا۔ پہلی ہی ملاقات میں احساس ہو گیا تھا کہ مرحوم نہایت بلند اخلاق اور منکسر مزاج تھے۔ ان کا شاہکار مضمون ''ادب میں مارشل لا'' ہی ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ رتن سنگھ اور اقبال مجید کے مزاج میں خاصی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں بھی اسی طرح کی شگفتگی ملتی ہے۔ اسی برس سے زائد کی عمر میں بھی رتن سنگھ میں وہی زندہ دلی برقرار ہے اور فعّال بھی ہیں۔ گذشتہ ماہ ایک جلسے میں شرکت کی غرض سے رتن سنگھ اور اقبال مجید الہ آباد تشریف لائے تھے۔ تین روزہ جلسے کے دوران رتن سنگھ کی فعالیت دیکھتے ہی بنتی تھی۔ ان کا مضمون بھی بہت اچھا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی کے حوالے سے صفدر امام قادری کی تحریر پڑھ کر بے ساختہ زبان پر آ گیا:

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم　　　تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

اشرفی صاحب کی ''صلاحیتوں'' کے بارے میں تو تھوڑا بہت پڑھ سن رکھا تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ موصوف 'اتنے اونچے کلاکار' بھی ہیں۔ مجموعی طور پر شمارہ معیاری اور متنوع ہے۔ مبارک باد قبول فرمائیں!

پسِ نوشت : ناچیز کا خیال ہے کہ آپ اپنی جو تصویریں اپنے رسالے میں پابندی سے چھاپ رہے ہیں، اگر یہ کسی دوسرے رسالے میں چھپیں تو اور اچھی لگیں گی۔ اپنے رسالے میں مسلسل اپنی تصویریں چھاپنا Ethics کے خلاف ہے لیکن فی زمانہ زیادہ تر مدیر صاحبان اپنی تصویر اپنے رسالے میں غالباً اس خیال سے چھاپتے رہتے ہیں کہ پتا نہیں کہیں اور چھپنے کی نوبت آئے یا نہیں۔ آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ آپ کے کلام میں ندرت اور تازگی ہے، کہیں بھی (مع تصویر) چھپ سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ مخالفین کی سخت سے سخت بات کا جواب بھی شائستگی اور انکسار سے زیادہ موثر طریقے سے دیا جا سکتا ہے، یہ مولانا عبدالماجد دریابادی اور پروفیسر احتشام حسین وغیرہ کی تحریروں میں صاف نظر آتا ہے۔

نوٹ: محترم فضل حسنین صاحب! آپ کا خط 'درسِ اخلاقیات' کی عمدہ مثال ہے لیکن اس کے برعکس پروفیسر وہاب

اشرفی کو'کلاکار'تصور کرنا کس مدرسۂ تہذیب کا آموختہ ہے؟ رہی بات اپنی تصویروں کی اشاعت کی، تو یہ جواز سے خالی نہیں ہے کہ یہ تصویریں ساہتیہ اکادمی سے ہی تار کی گواہ بنی ہیں۔ ویسے آپ کے مشورے پر عمل کرنا کچھ غلط بھی نہیں ہوگا۔ شکریہ! (خ۔ا)

● سلیم انصاری، جبل پور (مدھیہ پردیش) ''آمد'' کا دوسرا شمارہ موصول ہوا۔ اس سے قبل آمد کا پہلا شمارہ بھی ملا تھا، ابھی میں پہلے شمارے کے سحر سے آزاد ہی ہوا تھا کہ دوسرے شمارے کی خوشگوار حیرتوں میں ڈوب گیا۔ تازہ شمارے میں، ''آمد'' کے تعلق سے قارئین کے تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب کی منجمد جھیل میں ''آمد'' نے ہلچل پیدا کر دی ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں شامل مضامین، افسانے اور منظومات کے انتخاب میں آپ کی محنت نمایاں ہے۔ اقبال مجید کا افسانہ 'ایک مبلّغ کی دوزخ'' بے حد متاثر کن ہے۔ اس افسانے کا پلاٹ، زبان اور اسلوب سب کچھ منفرد ہے۔ اس کے علاوہ سید محمد محسن کی 'انوکھی مسکراہٹ'' نفسیاتی افسانہ ہے جس میں جنسی اپنی نفسیاتی پیچیدگی کے سبب کہانی کو پر اسرار بنا دیتی ہے۔ شائستہ فاخری کا افسانہ ''مندر کی سیڑھی'' پڑھ کر میں خوشگوار حیرتوں میں ڈوب گیا۔ کہانی کی شروعات منگلا جیسے کمزور اور قابلِ رحم کردار سے شروع ہوتی ہے مگر دوار یکا پرساد کی راجنیتی اور سوارتھ نے منگلا کے کردار کو بے حد اہم بنا دیا اور آخر میں منگلا ایک بار قربان کر دی گئی سوارتھوں کی سولی پر۔ نظموں کا انتخاب عمدہ ہے۔ رؤف خیر کی نظم ہمیں خود احتسابی کے عمل سے گزرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ شکیل اعظمی کی نظمیں واقعی معصوم اور سیدھی سچی ہیں۔ کلیم حاذق کی نظموں کا کینوس وسیع ہے۔ 'آمد' میں شامل غزلیں ہمیں اپنے عہد کے ادبی مزاج و معیار کا پتہ دیتی ہیں۔ مشرف عالم ذوقی کی نثر مجھے اچھی لگتی ہے۔ ان کے براہِ راست اظہار کا بیباک اور سچا لہجہ۔ 'آتشِ رفتہ کا سراغ' موجودہ عہد میں ناانصافی، عصبیت اور ایک مخصوص طبقے سے نفرت کے خلاف ایک نڈر اور کھرے انسان کا حلفیہ بیان ہی تو ہے۔ مشرف عالم ذوقی ایک بے حد فعال، ذہین اور باصلاحیت قلمکار ہیں۔ ایک ایسا قلمکار جس کے یہاں حق گوئی کی جراءت مندی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ تازہ شمارے میں منصور فریدی کے مضمون کی شمولیت کیا واقعی ضروری تھی۔ 'آمد' کے خلاف اگر کچھ لوگ ادھر اُدھر رسائل میں زہر افشانی کرتے بھی ہیں تو ہمیں ان کا کوئی نوٹس نہیں لینا چاہیے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد کی ادبی نسل کے مسائل پر گفتگو کا آغاز کریں، نئی نسل کے نقادوں کی توجہ اس جانب بھی مبذول کرائیں۔

● راشد جمال فاروقی (دہرہ دون، اتراکھنڈ) خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔ میں ایک کوہستانی فقیر اردو کے تمام قابلِ ذکر مراکز سے بہت دور اتراکھنڈ کی وادیوں میں مست الست پڑا ہوں۔ مجھ پر کسی کی نظر نہیں جاتی مجھے خود آگے بڑھ کر اپنا تعارف پیش کرنا پڑتا ہے اور تعارف کے نام پر میرے پاس ایسا کوئی کارنامہ بھی نہیں کہ کوئی توجہ دے۔ سہ ماہی 'آمد' کی خبر مجھے مل گئی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ شمارہ نمبر ۳ منظرِ عام پر آچکا ہے، ماشا اللہ۔ آپ شاعری کی جس بلندی پر متمکن ہیں وہاں دیکھنے پر ٹوپی گرنا لازمی ہوتا ہے اور مجھے اپنی شعری صلاحیتوں پر ہمیشہ شک رہا ہے۔ لہٰذا مرعوب رہا اور آپ کو اپنی تخلیقات بھیجنے سے بچتا رہا۔ اب کنٹرول نہیں ہوتا۔ آخر ایسے ایسے خوبصورت تبصرے 'آمد' کے آرہے ہیں۔ میں کب تک اس سے خود کو دور رکھوں اور کیوں۔ ایک غزل اور ایک نظم ارسالِ خدمت ہیں۔ اگر کسی لائق ہوں تو شاملِ اشاعت فرمالیں ورنہ ضائع کر دیں۔ اگر گذشتہ شمارے مرحمت فرماسکیں تو کرم ہوگا۔

● نورالحسنین (اورنگ آباد، مہاراشٹر) 'آمد' کی آمد نے اُردو رسائل میں اپنی انفرادیت کو پہلے شمارے ہی سے

ثابت کر دیا۔ یہ اپنا ایک مزاج رکھتا ہے ورنہ اُردو کے ۷۵ فی صد رسائل ایسے ہیں جن کا اپنا کوئی مزاج نہیں ہے اور خوشی اس بات کی ہے کہ آپ کو مطلوبہ مواد حاصل ہے۔ اس میں بلاشبہ آپ کی کڑی محنت اور سلیقہ کو دخل ہے ۔ آپ کی شعری صلاحیتوں سے تو میں واقف تھا لیکن آپ اتنی عمدہ نثر بھی لکھتے ہیں اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ آپ نے اداریے میں جو کچھ لکھا وہ دعوت فکر دیتا ہے۔ بعض مقامات پر آپ کا لہجہ شدت پسند بھی ہو گیا لیکن جب حق بات زبان سے نکلتی ہے یا قلم کی نوک پر آتی ہے تو پُر زور ہو ہی جاتی ہے۔ آپ نے رسالے کے ہر حصے کے لیے نہایت عمدہ عنوانات قائم کیے ہیں جو آپ کے سلیقے کی داد دیتے ہیں۔ آپ کا رسالہ مجھے اس لیے بھی پسند ہے کہ اس میں پڑھنے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ آپ کل کے ادب کا جائزہ بھی پیش کرتے ہیں اور آج کے ادب کی سیر بھی کرواتے ہیں۔ چنانچہ 'شہر احتساب' کے ذریعے اس بار 'بے جڑ کے پودے' کو آپ نے پھر سے ایک بار قاری کے مطالعے کی میز پر پہنچا دیا۔ اسی طرح 'ایک چادر میلی سی' کے حوالے سے اظہار خضر نے بہت سی نئی باتیں پیش کی ہیں۔ ' شہر اعتراف' احمد جمال پاشا کی یادیں تازہ کر گیا۔ مجھے اُن پر لکھے گئے خاکے بے حد پسند آئے۔ ہمیشہ کی طرح 'شہر افسانہ' اس بار بھی خوب ہے۔ رشید امجد کا افسانہ جنریشن گیپ اور بدلتی قدروں کے موضوع پر ایک نہایت عمدہ افسانہ ہے حالانکہ یہ موضوع افسانے کے لیے کوئی نیا موضوع نہیں ہے لیکن رشید امجد نے جس طرح بھرپور تاثر پیدا کیا وہ اُن ہی کا حق ہے۔ خورشید اکرم کا افسانہ بھی موضوعی اعتبار سے وہی ہے لیکن رشید امجد کے افسانے میں مکالمہ نہ صرف کرداروں کی نفسیاتی گرہیں کھولتا ہے بلکہ کہانی کو آگے بھی بڑھاتا ہے جبکہ خورشید اکرم کا افسانہ سپاٹ بیانیہ کی مثال ہے۔ دونوں افسانے موضوعاتی مماثلتوں کے باوجود پیش کشی کے اپنے اپنے انداز رکھتے ہیں۔ علی حیدر ملک کا افسانہ بھی پسند آیا۔ آپ نے میرا بھی افسانہ شامل کیا اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ ' شہر حیات ' کے تحت محمد حمید شاہد کا ناول 'مٹی آدم کھاتی ہے' ہر لحاظ سے نہایت عمدہ ناول ہے۔ یہ خاص کر اپنے عنوان کو کلائمکس پر پہنچا کر معنی و مطالب کی ایک نہایت وسیع کائنات پر پھیل جاتا ہے۔ اس ناول میں کئی خوبیاں ہیں لیکن جس اسلوب میں اسے لکھا گیا وہ اکثر مطالعاتی وصف کھو دیتا ہے، مثال کے طور پر خالد جاوید کا ناول ہمارے سامنے ہے لیکن محمد حمید شاہد کا کمال ہے کہ اُس اسلوب کو برتتے ہوئے بھی اُنھوں نے مطالعاتی وصف اور تجسس کو برقرار رکھا، کردار بھی تشکیل دیئے، انسانی نفسیات کا بھرپور احاطہ کیا، اور ایک پلاٹ کو اسلوب کے دھاروں میں اس طرح تقسیم کیا کہ وہ بکھر بکھر کر بھی مربوط ہو جاتا ہے۔ یہ مزاج اور انداز مغربی ناولوں میں موجود ہے لیکن ہم اُردو والے جب اسے برتنے کی کوشش کرتے ہیں تو اکثر لڑکھڑا جاتے ہیں۔ محمد حمید شاہد اس سفر میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس کے علاوہ بھی رسالے میں بہت ساری عمدہ تخلیقات شامل ہیں جن پر یقیناً احباب روشنی ڈالیں گے۔ اسی شمارے میں ایک شاعر کی نہایت عمدہ دس غزلیں شامل ہیں جس کے اشعار قاری کو ٹھہر ٹھہر کر سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ مجھے وہ شاعر حضرتِ غالبؔ کی طرح مشکل پسند نظر آیا جی ہاں وہ شاعر میرا بھائی خورشید اکبر ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے دس لاجواب غزلوں سے قاری کے ذہن کو مالا مال کیا۔ ایک آخری بات: رسالے میں تبصروں کا حصہ بھی بے حد عمدہ ہے ورنہ آج کل تبصروں کے نام پر صرف چند سطروں میں تعارف شائع کر دیا جاتا ہے جس کا فائدہ نہ مصنف کو ہوتا ہے اور نا ہی قاری کو۔ آپ تفصیلی تبصرے شائع کر رہے ہیں اس کے لیے آپ کو مبارک باد۔

• **مشتاق احمد نوری، پھلواری شریف (پٹنہ)** ''آمد'' کا تیسرا شمارہ اپنے خوبصورت سرورق کے ساتھ سامنے ہے۔ اداریے میں تم نے ادب وادبی سیاست پر گفتگو کی ہے۔ ساہتیہ اکادمی، دلی میں ہونے والے سیمینار میں شرکت کے بعد تم نے جو محسوس کیا اس کو رپورٹ کی شکل میں پیش کر دیا۔ لیکن بھائی، تم سارے مورچے ایک ساتھ کھولنے پر کیوں آمادہ ہو؟ سچائیاں تو بہت ساری ہوتی ہیں لیکن بہت سی سچائیوں پر پردہ پڑا رہے تو بہتر ہے۔ تم نے زمینداروں کے یہاں نہیں دیکھا کہ کس طرح سارے لوگ اپنا اپنا لٹھیت پالتے تھے۔ آج ادب میں بھی زمینداروں کی روایت داخل ہوگئی ہے۔ بقول سلطان اختر:

فصیل لب پہ جو سے ہیں سکوت کے شیشے　　　زباں کو زخم لگائیں تو کچھ کہیں ہم بھی

تم نے 'بے جڑ کے پودے' پر مختصر لیکن اہم گفتگو کی ہے اور ان لوگوں کو آئینہ دکھایا ہے جو سہیل عظیم آبادی کو پریم چند کا مقلد ٹھہرا کر اطمینان سے بیٹھ گئے ہیں۔ 'بے جڑ کے پودے' پر تمھاری یہ رائے اچھی لگی: ''اس ناول کی پوری کائنات مسز سنہا کے باطنی گناہ اور ظاہری سخاوتوں کے اردگرد گھومتی ہے۔'' جس عصر میں سہیل عظیم آبادی نے 'بے جڑ کے پودے' جیسا ناول تحریر کیا تھا اس وقت خفیہ جنسی تعلقات کو سماج کے لیے بہت بڑا مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بھائی آج کا دور تو بے شرمی کی انتہا پر پہنچ گیا ہے اور Live-in-Relationship کو قبولیت کا درجہ حاصل ہونے لگا ہے۔ اظہار خضر، علی احمد فاطمی اور نظام صدیقی کے مضامین پسند آئے۔ احمد جمال پاشا پر بھی مختصر گوشہ دے کر تم نے اچھا کیا، اس سے پاشا کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اور ان کا دور نظر کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ شہر ملال کے تحت بھی مرحومین کو بہتر خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ افسانوی باب ابھی توجہ کا محتاج ہے۔ رشید امجد کی تخلیق اور خورشید اکرم کی کہانی میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ اگر تم زمین پر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف غور سے دیکھو تو اس کے کنارے زمین کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ بس یہی مغالطہ خورشید اکرم کو بھی ہو گیا۔ اس وقت تمھارا ہی ایک پرانا شعر یاد آ رہا ہے:

دھرتی سے آکاش کا جھک جھک کر ملنا　　　جھوٹ ہے پھر بھی کتنا سچا لگتا ہے

دونوں کہانیوں میں نقل مکانی کی مرکزی حیثیت ضرور ہے۔ لیکن رشید امجد کے یہاں جو بات ہے، وہ کافی Deep-rooted ہے۔ لیکن خورشید اکرم کے یہاں معاملہ بالکل سطحی ہے۔ خورشید اکرم کے یہاں احباب اور گلیاں چھوٹنے کا غم ہے لیکن رشید امجد کے یہاں بے جان چیزوں سے بھی عشق کی انتہا کا یہ عالم ہے کہ وہ ان چیزوں سے بھی محو گفتگو نظر آتے ہیں۔ کہانی کے عنوان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح ناسٹلجیا کے شکار ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ پرانی گاڑی کو فراٹے سے دوڑانے والا شخص بالکل نئی گاڑی کو چلانے سے قاصر نظر آتا ہے۔ ہم عصروں کے یہاں خیالات کا ٹکراؤ تو ہوتا ہے لیکن بقول فراق گورکھپوری: ''ہوائی جہاز کا ٹکراؤ بیل گاڑی سے نہیں ہوسکتا'' نورالحسنین ان دنوں اچھی کہانیاں لکھنے لگے ہیں۔ ان دنوں تو انھوں نے تنقید کے میدان میں بھی جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ ان کی نئی کتاب ''نئے افسانے نئے نام'' فکشن کی تنقید میں اہم تصور کی جارہی ہے۔ غزلوں کا حصہ بھی کافی معیاری ہے۔ امین اشرف اور عبدالاحد ساز کی غزلیں متاثر کرتی ہیں اور ان غزلوں کے ساتھ تمھاری غزلیں بھی تھوک کے بھاؤ پڑھنے کو ملیں۔ تمھارا یہ شعر آج کے خانقاہی نظام کو آئینہ دکھانے کے لیے کافی ہے:

چلے تو دین کے رستے پہ مل گئی دنیا　　　فقیر بیٹھ گئے شاہ کے گھرانے میں

آج بس یہی تو ہو رہا ہے۔ آج کے فقیر دین کے رستے پہ دنیا تلاش کرنے کے ساتھ بڑے عہدوں پر پہنچنے کے ''جگاڑ'' میں ہیں، جھونپڑیاں ادھر ادھر محلوں میں تبدیل ہو رہی ہیں اور خواب آسمان کی وسعتوں کی جانب پرواز کرنے لگے ہیں۔ تمھاری کسی ایک اور غزل کا شعر مجھے ابھی تک پکڑے ہوا ہے جس کی گرفت سے میں ہنوز آزاد نہیں ہو سکا ہوں:

روتا ہوں تو سیلاب سے کٹتی ہیں زمینیں　　　ہنستا ہوں تو ڈھہ جاتے ہیں گھربار مری جاں

یہ Statement of fact کی طرح کون اپنا بیان درج کرا رہا ہے؟ فقیر ہے۔ بادشاہ ہے۔ اوگھڑ ہے۔ یا پھر اپنے زمانے کا پہنچا ہوا درویش ہے؟ یہ نہ تو کسی ظالم کا بیان ہے اور کسی مظلوم کی صدا تو ہرگز نہیں۔ مظلوم کے رونے کی صدا تو غالب کے اس شعر میں ہے:

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں　　　دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

غالب کا پورا شعر تمھارے پہلے ہی مصرعہ میں کھو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں تمھیں غالب سے بڑا شاعر تصور کرتا ہوں۔ لیکن تمھارا مذکورہ شعر اپنے تیور کے لحاظ سے تمہاری شناخت بن گیا ہے۔ کبھی کبھی ہی سہی لیکن سچ ہے کہ:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

بہر حال تم ادھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے اپنی شاعری پر توجہ دو تو آنے والی نسلیں فراق کی طرح تم پر بھی فخر کریں گی۔

پہنچ گیا ہے جنوں اس مقام پر خورشید　　　جہاں دوا نہیں دستِ دعا ہی کافی ہو

جنوں کے اس مقام پر پہنچنے کے لیے کتنی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے اسے تم مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہو۔

شہر آئینہ سے عجب طرح کی بو آ رہی ہے۔ تبصرہ کے لیے کتاب کی دو جلدیں لازمی قرار دی گئی ہیں۔ لیکن وہاب اشرفی کی کتاب پر کتاب بھیجے بغیر تبصرہ کر دیا گیا۔ صفدر امام قادری نے جو تبصرہ کیا ہے، اسے کون سا نام دیا جائے؟ صفدر امام کو آخر یہ ہو کیا گیا ہے؟ بڑی بڑی لکیروں کو مٹانے پر اپنی قوت صرف کرنے کے بجائے اگر اس کی بغل میں اس سے بڑی لکیر کھینچنے کی کوشش کی جائے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ صفدر اردو کے استاد ہیں۔ انھیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ تبصرے کے تقاضے کیا ہیں؟ اور اس کے حدود کہاں تک ہیں؟ لیکن اس نے حدود سے باہر نکل کر تنقیدی نہیں بلکہ تنقیصی مضمون لکھ کر وہاب اشرفی کے قد کو بونا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ صفدر کی اس کاوش سے نہ تو وہاب اشرفی کا قد چھوٹا ہوگا اور نہ ہی تنقیص کی اس بیساکھی سے صفدر کا قد اونچا ہوگا۔ اس میں دو رائے نہیں کہ صفدر کے اندر بے پناہ صلاحیت موجود ہے، اس کا مطالعہ بھی کافی وسیع ہے، اسے بات کہنے کا سلیقہ بھی آتا ہے لیکن اس کے دماغ کے اندر رینگنے والی شئے کا علاج کس طرح کیا جائے؟ اپنی صلاحیت کے منفی استعمال سے اگر صفدر اپنے قد کو چھوٹا کرنے سے باز آ جائیں تو اردو دنیا کو ایک باصلاحیت ناقد مل سکتا ہے۔ اگر وہاب اشرفی کے کلیم الدین احمد پر کیچڑ اچھالنے سے ان کا قد چھوٹا نہیں ہوا تو پھر صفدر کی بھی اس کیچڑ اچھال تحریر سے وہاب اشرفی کا قد چھوٹا نہیں ہونے والا۔ وہاب اشرفی ہوں یا شمس الرحمن فاروقی، شکیل الرحمن ہوں یا گوپی چند نارنگ یا ان جیسے نقاد؛ یہ تو ادب کے ایسے بت ہو گئے ہیں جن سے ٹکرانے پر ان کا کچھ نہیں بگڑنے والا۔ ہاں اپنے سر کا نقصان ضرور ہوگا۔ اپنی صلاحیت کا لوہا منوانے کے طریقے اور بھی ہو سکتے ہیں۔ کسی پر کیچڑ اچھالے بغیر اونچا مقام حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ابوالکلام قاسمی بھی اردو تنقید کا ایک معتبر نام ہے لیکن صفدر

نے نہ جانے کس بات کی خنّس نکالنے کے لیے ان پر بھی زور آزمائش کی ہے۔ آؤ اب خطوط پر بھی کچھ باتیں ہو جائیں۔ یہ کالم بالکل قاری کا اپنا ہوتا ہے۔ اس میں مدیر کی دخل اندازی پسند نہیں کی جاتی۔ چوں کہ ہر قاری اپنے طور پر اپنی رائے دینے کے لیے آزاد ہوتا ہے، اس پر کسی طرح کا قدغن لگانے کی آزادی مدیر کو نہیں دی جا سکتی۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ مدیر ہر قاری کی رائے سے اتفاق کرے۔ کچھ مدیر اس کالم کا نام ''تلخ، تند، شیریں'' بھی رکھا کرتے تھے کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ ہر طرح کی رائے آ سکتی ہے۔ میرے خیال سے مدیر تخلیق کے معاملے میں مکمل آزاد ہی نہیں خود مختار بھی ہوتا ہے، بلکہ اسے خطوط کی اشاعت پر بھی فیصلہ لینے کا حق ہے لیکن احسن طریقہ یہ ہے کہ خطوط کی اشاعت من وعن کی جائے اور نتیجہ اخذ کرنے کی ذمہ داری قارئین پر چھوڑ دی جائے کیوں کہ آج کے قاری مدیر کی عینک کے محتاج نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں اپنی طرف سے مزید کچھ کہنے کے بجائے اس شمارے میں کوثر مظہری کے خط پر تمھارے نوٹ کے چند جملے نقل کر رہا ہوں: ''قاری اپنے طور پر قرأت کے لیے آزاد ہے۔ آپ اس کی آزادی پر قدغن لگانے والے ہوتے کون ہیں؟ گویا آپ کی اچھی بری تخلیق پر رائے زنی سے پہلے آپ سے اجازت حاصل کر لی جائے۔'' یہ جملے خود تمھارے اپنے، ہیں پھر بھی جو تم پر لاگو نہ ہو کاٹ دینا۔

نوٹ: محترم نوری صاحب! آپ کی باتیں 'زخمِ منصفی' پر تازیانے کی طرح ہیں۔ آپ سے اختلاف رائے کا حق خاکسار کو بھی حاصل ہے مگر نیا مورچہ کھولنا فی الحال مناسب نہیں کہ آپ کی تنبیہ پابہ زنجیر کیے دے رہی ہے!! بس اتنا بتا دیجیے کہ مدیر کو حقِ قراءت حاصل ہے کہ نہیں؟ اگر ہاں، تو اس کے ذاتی تاثرات پر پہرے کیوں؟ کیا مدیر ادب کی کوئی اضافی مخلوق ہے، وہ بھی اس صورت میں جب کہ وہ تخلیق کار ہونے کی 'خوش گمانی' میں بھی مبتلا ہو؟ (خ۔ ا)

● **شہپر رسول (دہلی)** ''آمد'' ۲ مل گیا۔ یقیناً یہ ''آمد'' کا اگلا قدم ہے، بھرپور اور بیباک۔ آپ مشمولات کے انتخاب میں خوش سلیقگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ جس قدر آگے بڑھتے جائیں گے، یہ خوش سلیقگی مزید رنگ نکھارتی جائے گی نیز ''آمد'' کو ادبی رسائل کی روایت کا درخشندہ باب خیال کیا جائے گا۔ ''آمد'' سے متعلق کچھ مناقشوں کی گونج بھی سنائی دے رہی ہے۔ آپ جانیں، ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے۔ مجھے مسرت اس بات کی ہے کہ آپ کسی سرپرستِ اعلیٰ کے مطیع نہیں ہیں۔ ورنہ ہر رسالے پر کوئی نہ کوئی کنڈلی مارے ہوئے بیٹھا ہے۔ آپ بتائیے جس شخص کو اس رکیک سیاست سے کوئی سروکار نہ ہو وہ کیا کرے؟ شریف آدمی کا تو اس راہ سے گزر مشکل ہو گیا ہے۔ اس کیفیت اور ان حالات میں آپ قابلِ داد ہیں کہ ایک آزاد رائے رکھتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ آپ کی رائے سے اختلاف کا حق بھی سب کو حاصل ہے۔

● **رئیس الدین رئیس (علی گڑھ)** ''آمد'' ۳ ملا تھا۔ ادھر اپنی اور اہلیہ کی بیماری میں گھرا رہا۔ رابطہ نہ کر سکا۔ قمر نقوی نقشبندی صاحب کی ''کتاب الشعر'' بھیجی تھی، امید ہے ملی ہوگی۔ یہ دوسری کتاب 'حماسہ' آئی ہے، حاضر کر رہا ہوں۔ آمد ۳۲۰ صفحات کو محیط ایسا ضخیم وجسیم اور موقر ومعتبر کتابی سلسلہ طشت از بام فرما کر آپ نے مجلاتی صحافت میں جو رفیع الشان کارنامہ انجام دیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ پچھلے دو شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی بہ اعتبار مشمولات معیاری ادب کی یادگار تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ کا علمی، ادبی نوعیت کا اداریہ بھی آپ کی انفرادی فکر ونظر کو مترشح کرتا ہے۔ آپ کا سیاست کے ذیلی نظام کے حوالے سے یہ فرمانا کہ ''دنیا کی دیگر ثقافتوں کی طرح اردو ادب وثقافت کا

دامن بھی سیاست کے رنگ و روغن سے پاک نہیں ہے'' اپنے بطن میں سچائی لیے ہوئے ہے۔ دہلی اردو اکیڈمی اس کی روشن مثال ہے جس پر غیر دستوری اور خارجی طاقت کی حکمرانی کا آسیب آج بھی اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ اس آسیب کی جانب رمز و کنایہ کی زبان میں آپ نے جو بلیغ اشارے کیے ہیں، ان سے مطلق العنان شخصیت کا چہرا صاف طور پر نگاہوں میں گردش کرنے لگتا ہے۔ آدم سیلانی نے ہردواری لال کے مضمون (جو فنون لطیفہ پر ہے) کا بڑا رواں اور بامعنی ترجمہ کیا ہے جو رگ وآگہی پر دستک دیتا ہے۔ اظہار خضر اور آپ نے بھی اپنے مضامین میں اپنی فکر و نظر کی جولانیاں خوب دکھائی ہیں۔ داخلیت و خارجیت کے موضوع پر مامون ایمن نے بھی اچھی علمی گفتگو کی ہے۔ خورشید اکرم نے اگرچہ دوسری ہی بات کہی ہے مگر ایسا لگتا ہے انھوں نے اپنا افسانہ رشید امجد کے افسانے کے بعد ہی لکھا ہے پھر بھی رشید امجد کی کہانی سے کہیں زیادہ بالغ و باشعور کہانی ہے جو کہیں کہیں Old is Gold کے نظریے سے انحراف کر کے پوشیدہ حقائق کو سامنے لاتا ہے، اس کے برعکس رشید امجد کی کہانی اس خوبی سے محروم ہے۔

● **محمد اسلم پرویز (ممبئی)** ابھی ''آمد'' کا دوسرا شمارہ میرے مطالعے کی میز پر ہی تھا کہ 'آمد' ۳ کی آمد ہوگئی۔ گوگول کی کہانی 'ایک پاگل کی ڈائری' کا رفیق شاہین نے بہت خوب صورت ترجمہ کیا ہے۔ میں اس کے سحر سے نکل ہی نہیں پایا۔ مجھے یاد ہے : اسے بنیاد بنا کر نادرہ ظہیر ببّر نے ایک ڈرامہ کھیلا تھا 'دیا شنکر کی ڈائری'۔ برسوں بعد اسے پڑھ کر سچ مچ بہت اچھا لگا۔ 'آمد' ۳ کسی بھی طرح اپنے نقش ثانی سے کم نہیں۔ اداریے سے لے کر تبصرے تک اس کے مشمولات ٹھوس ہیں۔ یہ سبھی چیزیں کسی نہ کسی پہلو سے ہمارے ادبی معاشرے کا عکس ہیں........ بلکہ بلو پرنٹ۔ 'ضمیر مدعا' کے تحت آپ نے اپنے اداریے میں جو ایشوز اٹھائے ہیں ان کا جواب ان سوالوں میں کہیں پنہاں ہے جو آپ نے 'آمد' ۲ کے اداریے میں سوالوں کی شکل میں کھڑے کیے تھے۔ محمد حمید شاہد کا ناول 'مٹی آدم کھاتی ہے' اپنے فارم اور زبان کے اعتبار سے اہم ناول ہے۔ زبان کے خلاقانہ استعمال نے ناول میں گہرائی اور گیرائی بھی پیدا کردی ہے۔ اس کے لیے محمد حمید شاہد مبارکباد کے مستحق ہیں۔ احمد جمال پاشا کے گوشے کے تحت آپ نے جو تحریریں جمع کی ہیں قابل داد ہیں اور آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا جیتا جاگتا ثبوت۔ اقبال مجید جتنا اچھا فکشن لکھتے ہیں اتنے ہی اچھے مضامین بھی لکھتے ہیں۔ ذہانت اور دیانت کا جلوہ ان کے افسانوں اور ناولوں ہی میں نہیں ان کی غیر فکشن تحریروں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان سے آپ ڈرامے اور ڈراموں پر مضامین لکھوائیں۔ ابھی بہت سی چیزیں پڑھنا باقی ہیں۔ 'آمد' کی اشاعت پر ایک بار پھر سے مبارک باد!!

● **مراق مرزا (ممبئی)** ''آمد'' کا تازہ شمارہ ہمدست ہوا۔ آپ کی محبت وعنایت کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ کا ارسال کردہ یہ مجلّہ میرے لیے ایک بیش قیمت ادبی سوغات کی حیثیت رکھتا ہے۔ نہایت آرٹسٹک سرورق سے آراستہ 'آمد' کے صفحات پر معیاری مضامین و افسانے نیز بصیرت افروز منظوم تخلیقات دیکھ کر خوشی ہوئی۔ زیر نظر شمارے کے مشمولات کے پیش نظر یہ کہنا کسی بھی طور exaggeration نہ ہوگا کہ ''آمد'' کو عصر حاضر کے چند بڑے اور باوقار رسائل کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

● **شبیر احمد (کولکاتا)** آمد کا پہلا دو شمارہ تو پہلے ہی مل چکا تھا۔ جستہ جستہ پڑھ بھی لیا تھا لیکن کچھ تو علالت اور کچھ تساہلی درپیش تھی محسوسات کو صفحۂ قرطاس پر نہ بکھیر سکا۔ اب تو تیسرا شمارہ بھی مل گیا ہے۔ کورپیج کی سرخی ایک خاص کمٹمنٹ کا

اشاریہ بن گیا ہے۔ انقلاب، تبدیلی اور بدلاؤ جیسی معانی اخذ ہورہے ہیں۔ زیادہ تر مشمولات بھی اسی جانب اشارہ کرتے نظر آرہے ہیں۔ اور کور پیج کے پیچھے آپ کی بولتی ہوئی تصویر ایسا لگتا ہے کہ آپ اچھے اچھوں کی بولتی بند کرنے پر آمادہ ہوگئے ہیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے اور نظر توصیف وتوقیر سے بھی کہ ساہتیہ اکادمی کی دعوت ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہے۔ اور مقالہ پیش کرنے اور سوال اٹھانے کے مواقع تو خاص الخاص کو ہی ہاتھ آتے ہیں۔ آپ کا اداریہ ایک جسارت مندانہ قدم ہے، اور اخیر میں ''نوٹ'' لگا کر معذرت طلبی ایک اچھی تکنیک۔ آپ فہیم اور دور اندیش ہیں، امید ہے ردّعمل کی تیاریاں پوری کر لی ہوں گی۔ آپ نے 'بزمِ آمد' پر جو شہر بسائے ہیں، سب کے سب لاجواب ہیں۔ 'شہرِ مدعا' سے لے کر 'شہر خیر وخبر' تک بھی اپنی اپنی جگہ بارونق، کشادہ اور روشن ہیں۔ لیکن سچ پوچھیے تو 'شہر آمد' کچھ اٹ پٹا سا لگا۔ مخمل پر جیسے ٹاٹ کا پیوند۔ علامہ شبلی صاحب اپنے چھوٹوں پر محبت نثار کرتے ہیں، 'طلوع خورشید' اور 'تہنیتی رباعیاں' اس کی دلیل ہیں۔ مگر کیا ضروری تھا کہ اس دلیل کو نذر قارئین کریں اور ان کے ذہن کو بوجھل بنائیں۔ 'شہر آئینہ' میں صفدر امام قادری نے وہاب اشرفی اور ابوالکلام قاسمی کا چہرہ خاصا مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ اگر چہ یہ شہر تبصروں کے لیے بسایا گیا تھا لیکن صفدر قادری نے اپنی تلخ زبانی، تندخوئی اور ترش روئی سے اسے تجزیاتی رزم گاہ بنا دیا ہے۔ ممکن ہے، صفدر قادری کے بیانات حقیقی اور صداقت پر مبنی ہوں، مگر ان کا لہجہ، رویہ اور طرز تکلم نہایت جارحانہ ہے۔ ادبی تحریریں 'ادب' کے دائرے میں بھلی لگتی ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو ان حضرات کی خامیوں وکوتاہیوں کو سلیقے سے نرم ملائم لہجے میں بھی پیش کر سکتے تھے۔ اس سے ان کی باتیں شاید زیادہ پُراثر ہوجاتیں۔ آپ نے 'شہر خیر وخبر' میں بہت سارے خطوط مع نوٹ شائع کیے ہیں۔ ان خطوط کا مطالعہ کرتے وقت خورشید اکرم کے پہلے خط پر نگاہ ٹھہر گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ انھوں نے یہ خط آپ کو ذاتی طور پر بحیثیت دوست لکھا تھا مگر آپ نے خواہ مخواہ اسے عام کردیا۔ ان کہانیوں پر تجزیہ کرانے سے معذرت چاہ لی۔ وہ بھی کسی ٹھوس وجہ کے بغیر ہی۔ میں نے دونوں کہانیاں پڑھیں۔ میں یہ نہیں سمجھ پایا کہ خورشید اکرم نے کیوں اتنی اچھی کہانی دس بارہ برسوں تک قارئین سے چھپائے رکھی، حالاں کہ انھیں اس کہانی کے اہم ہونے کا گمان تھا۔ بہر حال کہانی کی اٹھان اچھی ہے۔ اردو کی اہم شخصیتیں ایک ایک کر کے ہمارے درمیان سے اٹھتی جارہی ہیں۔ آپ نے پچاس صفحات پر مشتمل 'شہر ملال' میں شہریار، مظہر امام، مغنی تبسم اور شجاع خاور کو جگہ دے کر انھیں اچھا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ آپ نے 'شہرِ احتساب' میں سہیل عظیم آبادی کے ناول 'بے جڑ کے پودے' پر اپنی معروضات کو بڑے پُرمغز طریقے سے پیش کیا ہے، اگر چہ یہ مزید طوالت کا متقاضی تھا۔

نوٹ : برادرم شمیر صاحب! 'شہر آمد' پر آپ کا ردِّعمل خالص ذاتی اور نفسیاتی مسئلے کا غماز ہے۔ میں بزرگوں کی شفقت کا منکر نہیں۔ 'شہر آمد' رسالہ اور اس کے متعلقات پر ذاتی وتبصراتی اظہار کے لیے مختص ہے۔ واضح رہے کہ خورشید اکرم کے خط پر 'عدم اشاعت' یا 'پرسنل' جیسا کچھ تحریر نہیں کیا گیا تھا اور یہ ان کے ادبی نیز تخلیقی موقف کے بیان سے لبریز تھا، یہی اس خط کی اشاعت کا جواز بنا اور کچھ نہیں! (خ۔ا)

● شہناز صبیح (الہ باد) ''آمد'' اپریل تا جون ۲۰۱۲ء موصول ہوا۔ شکریہ۔ آپ نے اپنے رسالہ کے ذریعہ بہت سے شہروں کی سیر کرائی لیکن میری گاڑی ''شہر افسانہ'' میں بڑی دیر تک رکی رہی۔ یہ ہجرت کی باتیں انگریزوں کی ہندوستان آمد سے شروع ہوتی نظر آتی ہیں جب ہندوستانی شہزادے اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ولایت جایا کرتے تھے۔

ایک عدد گوری میم کے دم چھلّے کے ساتھ واپس آتے، پھر رونمائی کے بعد دونوں غائب ہوجاتے۔ وہ اپنے ملک کی گلی، کوچوں، باغوں اور بازاروں کی یاد میں گھلا کرتے۔ انکی نسل مغربی تہذیب کا پیوند بن جاتی۔ بس اسکے بعد تو انسانی خواہشوں کے ساتھ ساتھ گاؤں سے شہروں، شہر کے پرانے محلّوں سے کالونیوں کی ہجرت خوب سے خوب تر کی تلاش میں جاری ہے لیکن ابھی تک وہ اس راز کو نہیں پا سکا ہے کہ زندگی آپسی خلوص، محبت، ہمدردی اور رواداری کی بھوکی، پیاسی ہے؛ باقی سب ضمنی ضروریات ہیں۔ بھلا پرانے لوگوں کو چھوڑ کر نئی آبادی میں یہ ذائقے کیسے نصیب ہوسکتے ہیں؟ بہر کیف رسالہ وقیع ہے۔ ہر نئے رسالے کی طرح اس سے بھی نیک امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ اسکی بقا اور معیار کے لیے دعا کرتی ہوں۔ جلد ہی قلمی اور مالی تعاون کرنے کی کوشش کروں گی۔

● **وصیہ عرفانہ (سمستی پور)** ''آمد'' کا پہلا شمارہ نہایت تب و تاب سے منظرِ عام پر آیا۔ پھر دوسرا اور تیسرا شمارہ بھی وقت مقررہ پر اضافی تابناکی کے ساتھ جلوہ گر ہوگیا۔ ''آمد'' کے پہلے شمارے نے ہی اپنے رنگ و آہنگ اور اپنی ضخامت سے شائقین ادب کو حیرت آمیز مسرت سے دوچار کیا۔ لہٰذا جیسی بھرپور پذیرائی ایسے رسالے کا حق تھا، وہ اسے ملی۔ حالیہ شمارہ سابقہ شماروں سے بھی بہتر ہے۔ گویا ارتقائے مسلسل ہے۔ اداریہ سے شہر خیر و خبر تک دل چسپیوں کا ایک جہانِ رنگ و بو ہے جو قاری کے انہماک کو ٹوٹنے نہیں دیتا۔ حسب سابق اس بار بھی اداریہ فکر انگیز ہے۔ کیا واقعی ادب سیاست کا ذیلی نظام بن کر رہ گیا ہے؟ یقین تو نہیں آتا لیکن حالات و شواہد اسی اندیشے کی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں۔ کیا ایک جینوئن ادیب محض اس خوف سے تخلیقی عمل سے کنارہ کش ہوجائے کہ کہیں وہ بھی غیر محسوس طریقے سے اسی سیاسی نظام کا حصہ نہ بن جائے یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ ایک تخلیق کار اپنی تخلیقی کلبلاہٹ کے اظہار محض کو ہی اپنا مقصد، اپنا نصب العین سمجھے۔ اس کی تخلیق ادبی منظرنامے پر کس مقام و مرتبے پر آویزاں کی جائے گی......اس اندیشہ ہائے دور دراز سے بے نیازی میں ہی نجات مضمر ہے۔ فن پارے کی تعین قدر کا فیصلہ قاری کی صوابدید پر ہو تو اور بھی بہتر ہے۔ آپ نے درست فرمایا ہے کہ منصب و جاہ کی ہوس نے ہی ادب (یا ادیبوں) کا بیڑا غرق کیا۔ بہر کیف! آدم سیلانی نے اردو قاری کے لیے ایک وقیع موضوع کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ترجمہ در ترجمہ کا سلسلہ ہے لیکن بہر صورت موضوع کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ شہر احتساب کے تحت مشہور زمانہ ناول ''بے جڑ کے پودے'' کا خورشید اکبر نے اپنے مخصوص تیکھے انداز میں جائزہ لیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ پریم چند سے موضوعاتی مشابہت نے سہیل عظیم آبادی کو ان کے واقعی مقام و مرتبے سے محرومی عطا کی ہے۔ ہر چند کہ ان کی خلاقانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔ میرے خیال میں ''بے جڑ کے پودے'' کا بھرپور تخلیقی احتجاج نہ بن پانا اتنا اہم نہیں ہے جتنی اہمیت اس بات کی ہے کہ اس ناول کے ذریعے سہیل عظیم آبادی نے موضوعاتی اعتبار سے اپنی آئندہ نسل کے لیے ایک مناسب زمین فراہم کردی۔ انھوں نے نقش اوّل پیش کردیا تاکہ نقش ثانی زیادہ بھرپور، زیادہ مزاحمتی اور زیادہ پائیدار تخلیق ہوسکے۔ شہر تحقیق میں اظہار خضر نہایت عرق ریزی اور باریک بینی سے ''ایک چادر میلی سی'' کے متون کا تجزیہ کر تحقیق کے منصب سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ فیض اور مجاز صدی کی مناسبت سے مامون ایمن اور علی احمد فاطمی کے مضامین عام روش سے مختلف بھی ہیں اور منفرد بھی، موثر بھی ہیں اور وقیع بھی۔ ساتھ ہی ساتھ، مذکورہ شاعروں کی تخلیقات کے مطالعے کے ذیل میں نئی جہتوں اور نئے امکانات کے در بھی وا کر رہے ہیں۔ اس بار کا شہر اعتراف خوب

ہے۔ احمد جمال پاشا پر لکھے گئے خاکوں اور خود ان کی تحریروں سے ان کی شخصیت کی بوقلمونی اور ان کی ذات کی نرمی و نرم روی جھلک رہی ہے۔ ان خاکوں میں احمد جمال پاشا چلتے پھرتے، ہنستے مسکراتے اور دلدوز و دلگیر نظر آتے ہیں۔ کچھ اس طرح کہ ان خاکوں کا قاری بھی رتن سنگھ کی طرح رفاقت کی شرط سے آزاد ہو کر احمد جمال پاشا سے آشنا اور ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ احمد جمال پاشا کی شخصیت کی خوبی کے ساتھ ساتھ یہ عمدہ خاکہ نگاری کا اعجاز ہے۔ شہر اشتراک کے تحت عرفان کبیر کی ترجمہ شدہ بنگلہ نظموں کے مطالعے کا موقع ملا۔ یہ سلسلہ بھی خوب ہے۔ دیگر زبانوں کے ادب سے عام قاری کا براہ راست تعارف مشکل ہے۔ اس سلسلے کے تحت بنگلہ نظموں کی لطافت اور نغمگی نے لذت یاب کیا۔ شعری گوشہ کا انتخاب لا جواب ہے۔ صبا اکرام، جمال اویسی اور کامران ندیم کی نظمیں بے حد پسند آئیں۔ اس بار غزلیں بہت کم ہیں لیکن سبھی منتخب ہیں۔ دس غزلوں کے انتخاب میں خورشید اکبر کی غزلیں نادر لفظیات اور تراکیب کے ساتھ جہانِ معانی کے طلسم کھول رہی ہیں۔ دلچسپ امر ہے کہ فرائض منصبی کی کثافت نے ان کی شاعری کی لطافت کو مجروح کرنے کے بجائے مزید دھاردار بنا دیا ہے۔ ان غزلوں میں احساسات و کیفیات کا نگار خانہ کھلا ہوا ہے۔ واقعی ''بہت سنجیدہ پیچیدہ شگفتہ خوش بیانی ہے۔'' شہر افسانہ کی رونق اس بار شباب پر ہے۔ رشید امجد اور خورشید اکرم کے افسانے موضوعاتی اور تاثراتی اعتبار سے مماثلت رکھنے کے باوجود الگ الگ مزہ دیتے ہیں۔ دونوں افسانوں میں بچھڑی رفاقتوں کا درد، ذات کی تنہائی اور دو نسلوں کا فکری تضاد موضوع بنا ہے۔ اس کے باوجود دونوں افسانے اپنی علیحدہ شناخت اور انفرادیت رکھتے ہیں۔ نور الحسنین کی کہانی تکنیکی اعتبار سے بہت خوب ہے۔ ماضی اور حال کے واقعات باہم پیوست بھی ہیں اور متوازی بھی۔ کہیں حقیقت الیوژن کے پیکر میں ہے، تو کہیں الیوژن حقیقت کا تاثر دیتا ہوا سحر انگیز رومان کا کیف ابھار رہا ہے۔ اس افسانے میں عمر کی پونجی گنوا چکے انسان کی تنہائی کی خود کلامی ہے۔ احساسات کی لرزشوں کو ملفوظی پیکر عطا کرنے کے لیے نور الحسنین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مکمل ناول کی اشاعت ''آمد'' کی اضافی و امتیازی خوبی ٹھہری۔ عموماً رسالوں کے توسط سے افسانے اور شاعری کے مطالعے کے ذوق کی تسکین ہو جاتی ہے لیکن عصری ناول تک عام قاری کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ پہلے ہی شمارے میں غضنفر کے مکمل ناول نے قاری کو چونکایا بھی اور مسرور بھی کیا ہے۔ حالیہ شمارے میں محمد حمید شاہد کا ناول ''مٹی آدم کھاتی ہے'' دلچسپ بھی ہے اور مختلف بھی۔ تجسس ہے کہ آئندہ آپ کون سا ناول پیش کر رہے ہیں۔ نئے سال کی آمد کے ساتھ کیسی بادِ سموم چلی کہ گلستانِ شعر و ادب کے کیسے کیسے جاں فزا پھول کھلاتے، مرجھاتے اور بکھرتے چلے گئے۔ مظہر امام، شجاع خاور، شہریار اور مغنی تبسم پر رسالے کے پچاس صفحات مختص کیے گئے ہیں...... یہ باعث تسکین ہے۔ ہر چند کہ حق کی ادائیگی ممکن نہیں۔ ارمان نجمی، نسیم احمد نسیم اور منظر اعجاز کے مضامین شخصی تاثر کے ساتھ ساتھ متعلقین کی تخلیقات کی فنی قدر و قیمت کو بھی نمایاں کر رہے ہیں۔ سید خالد قادری کی گفتگو کے مرحلے میں مغنی تبسم کی شخصیت اور ان کی فکر آئینہ ہو گئی ہے۔ مذکورہ مضامین اور مرحومین کے کلام کے انتخاب نے اس شمارے کو دستاویزی حیثیت عطا کر دی ہے۔ اور آخر میں...... ''آمد'' کے پہلے شمارے میں بطور قلم کار شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ میرے مضمون کے سلسلے میں شہر خیر و خبر کے توسط سے مختلف لوگوں کے تاثرات مجھ تک پہنچے۔ چند کرم فرماؤں نے فون پر بھی رابطہ کیا۔ ان تمام لوگوں کا تہہ دل سے شکریہ اور ان کا بطور خاص شکریہ جنہوں نے میری تحریر کی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کی، کیونکہ یہ میرے لیے آئندہ مشعل راہ ہوں گی۔

● راشد انور راشد (علی گڑھ) ''آمد'' کے لیے سردست پانچ سو روپے کا چیک روانہ کر رہا ہوں۔ اگر ہم سب اردو کے معیاری رسائل خرید کر پڑھنا شروع کر دیں تو اشاعت کے ضمن میں تعطل کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ تازہ شمارے میں آپ کا اداریہ اور صفدر امام قادری کے تیور بہ طور خاص موضوع بحث بنے رہے۔ وہاب اشرفی کی کتاب پہ تبصرہ حق بجانب ہے، لیکن ابوالکلام قاسمی کی کتاب پر جو اعتراضات کیے گئے، ہیں وہ مزید دلائل کے محتاج ہیں۔ آپ ہر شمارے میں ایک مختصر ناول شائع کر رہے ہیں لیکن ناول کے فن سے متعلق کوئی کلیدی مضمون بھی اگر ہر شمارے میں جگہ پائے تو رسالہ مزید قابلِ قدر ہو جائے گا۔ آپ مشمولات کے انتخاب میں سختی تو برتتے ہیں لیکن بعض چیزیں پھر بھی ایسی شائع ہو جاتی ہیں جن پر سوالیہ نشان قائم کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر نظام صدیقی کا مضمون ہمیشہ کی طرح مبہم، گنجلک اور بے معنی نظر آیا۔ اگر ہم جیسے لوگوں کو ان کی تحریر کوشش کے باوجود سمجھ میں نہیں آتی تو ادب کے عام قاری کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ کتابی سلسلے کی پروف ریڈنگ میں توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ شعری متون بالخصوص نظم کے سلسلے میں یہ احتیاط زیادہ سنجیدگی کا تقاضہ کرتا ہے۔ میری تین نظموں میں تین تین چار چار مصرعے درمیان یا آخر سے غائب ہو گئے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نظم کے مجموعی تاثر میں اس سے کتنا فرق پڑ سکتا ہے۔

نوٹ : کاش! آپ نے کمپوزنگ کی غلطی کے سبب غائب شدہ مصرعوں کی نشان دہی کی ہوتی۔ (خ۔ا)

● یٰسین مومن ایڈوکیٹ (بھیونڈی) ''آمد'' کا تیسرا شمارہ بھوپال میں ضیا فاروقی صاحب نے دیا۔ ملک میں اردو کے چند معیاری رسائل میں آپ کا پرچہ شامل ہے۔ طباعت، کاغذ اور مواد کے اعتبار سے بہت ہی اچھا ہے، اُردو میں رسالہ نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ میں آپ کے حوصلے کی داد دیتا ہوں۔ رسالے میں جن چند باتوں کا خیال رکھا جانا ضروری سمجھتا ہوں، چاہتا ہوں آپ کے ساتھ Share کروں۔ سب سے اہم بات یہ کہ رسالہ کو کسی بھی فرد یا ادبی گروپ سے منسلک مت کیجیے۔ جو آپ حق سمجھتے ہیں اور جو باتیں سچائی و ایمانداری پر مبنی ہیں، انھیں اپنے رسالہ میں جگہ دیجیے۔ رسالے کا سرکولیشن جتنا زیادہ ہوگا، اُس کی لاگت اُتنی ہی کم آئے گی، لہٰذا کوشش کیجیے کہ رسالے کا سرکولیشن نہ صرف ہندوستان بلکہ دُنیا کے دوسرے ممالک میں بھی بڑھے۔ معیار سے کبھی بھی سمجھوتہ مت کیجیے۔ اگر کسی شاعر یا افسانہ نگار کی تخلیق آپ کے معیار پر پوری نہیں اُترتی تو اُسے شائع مت کیجیے۔ اُس شاعر یا افسانہ نگار کی دل شکنی نہ ہو، اس کے لیے اُسے باور کرائیے کہ وہ کوئی دوسری تخلیق آپ کو روانہ کرے۔ نئے قلم کار، جو بہت اچھا لکھ رہے ہیں، انھیں اپنے رسالے میں جگہ دیجیے۔ دو چار صفحہ ماضی کے کسی گمنام شاعر یا ادیب کے نام مختص کیجیے تا کہ آج کا قاری جانے کہ اردو ادب میں کیسے کیسے اساتذہ گزرے ہیں۔ اردو کی مجموعی صورت حال مہاراشٹر، آندھرا پردیش، کرناٹک اور بہار میں بہت اچھی ہے۔ مہاراشٹر میں لاکھوں طلبا و طالبات اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور نئی جنریشن میں بھی اردو کے تئیں کافی جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ مہاراشٹر میں اردو اسکولوں میں اساتذہ، شعرائے کرام اور رائٹرس سے رابطہ قائم کیجیے، انشا اللہ اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔ مہاراشٹر اور آندھرا کا دورہ کیجیے، سرکولیشن میں کافی اضافہ ہوگا، اس کا مجھے یقین ہے۔ اللہ آپ کے رسالے کو قائم و دائم رکھے، اور آپ کو حوصلہ عطا فرمائے۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو بتایئے گا، میں ہر اُس شخص کی قدر کرتا ہوں جو اردو کے Cause کے لیے کام کرتا ہے۔

نوٹ : محترم یٰسین مومن صاحب، اردو کے تئیں آپ کے بے لوث جذبات قابلِ قدر ہیں۔ ادارہ 'آمد' آپ کے مشوروں پر عمل کر رہا ہے۔ بہت شکریہ! (ادارہ)

● **قیصر ضیا قیصر (مدھوپور، جھارکھنڈ)** ''آمد'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ۔ اس شمارے کے بیشتر شمولات اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر لائق مطالعہ ہیں لیکن اداریہ، خورشید اکبر کی دس غزلیں، صفدر امام قادری کے تبصرے، اور نسیم احمد نسیم کا مضمون، خاص توجہ کے حامل ہیں۔ ''اداریہ'' اس اعتبار سے مصلحت پسندوں کی پشت پر دورِ فاروقی (حضرتِ عمر فاروقؓ) کا تازیانہ ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ ساہتیہ اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام ہونے والے سہ روزہ سیمینار کی تفصیل پیش کی گئی ہے بلکہ اس میں انتہائی بے باکانہ انداز میں (جس میں بخشائش کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی) اس حقیقت کو منکشف کیا گیا ہے کہ ساہتیہ اکادمی، دہلی ایک سرکاری ادارہ ہے۔ اس کے زیر نگرانی ہونے والے تمام تر پروگراموں کے اخراجات سرکاری خزانے سے پورے کیے جاتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مذکورہ ادارے سے متعلق پروگراموں کے دعوت نامے بھیجتے وقت کسی فردِ واحد کی پسند و ناپسند کا خیال رکھا جائے........ لیکن اداریے میں ''دیدہ ور نقاد''، ''ملا احساس''، ''ملا بخشی'' اور ''ملا مظہری'' جیسے اشاروں کے استعمال سے طنزیہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ کیا ان اشاروں کے بغیر اداریے کی تحریر کا زور کم ہو جاتا؟ خورشید اکبر کی شاعری کے بارے میں میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں (؟) کہ وہ اپنی شاعری میں لفظوں کو پُرشکوہ اور رجزیہ انداز میں برتنے کے عادی ہیں جس کے باعث ان کی شاعری میں جمال کے بجائے جلال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ''آمد'' کے تازہ شمارے میں ان کی دس غزلیں اس حقیقت کا روشن ثبوت ہیں۔ ان غزلوں میں شعر کیا، ایک بھی تجربہ نرمی و نازکی کا ترجمان نہیں بلکہ ہر تجربہ کنول کی آنکھ میں شبنم کی جگہ سیلاب دیکھنے کا تجربہ ہے (حالاں کہ ان کی تیسری غزل اپنی ردیف ''رہی ہے جان'' کی وجہ سے اپنے شعروں میں نرم و نازک تجربے کے ہونے کا فریب قائم کرتی ہے)۔ یہ خورشید اکبر کی شاعری کے وہ فن کارانہ اعمال ہیں جو اُن کی شاعری کو عہدِ حاضر کے تمام تر شعرا کی شاعری سے ممتاز و منفرد کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی پہلی اور دوسری غزل میں لفظوں کو نقرئی موتیوں کے مانند جس فن کارانہ مہارت کے ساتھ مصرعوں میں پرویا ہے کہ شعروں میں حد درجہ غنائیت و موسیقیت پیدا ہو گئی ہے جس کے لیے خورشید اکبر داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ صفدر امام قادری کے دونوں تبصرے بے حد پُرمغز ہیں بالخصوص وہاب اشرفی صاحب کی کتاب کے تبصرے کا تو جواب ہی نہیں کہ اس میں انھوں نے نہ صرف یہ انتہائی چابک دستی سے حقیقت کو فاش کیا ہے بلکہ ایک ایک نکتے پر جس پُرحوصلہ طریقے سے واضح اسلوب میں گفتگو کی ہے کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن ان تبصروں کے مطالعے کے بعد ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر تبصرہ ایسا ہی ہوتا ہے تو تنقید کیسی ہوتی ہے؟ شہریار کی شخصیت اور شاعری پر نسیم احمد نسیم کا مضمون ''شہریار کو یاد کرتے ہوئے'' اپنے عنوان ہی کی طرح بے مغز اور پھسپھسا ہے۔ اس مضمون میں نسیم احمد نسیم نے بظاہر شہریار کی شخصیت اور شاعری کے نادیدہ گوشوں کو دیدہ بنانے کی کاوش کی ہے۔ لیکن بباطن انھوں نے یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ شہریار کے رشتے دار ہیں بلکہ ان کے بہت ہی عزیز شاگرد بھی ہیں۔ نسیم احمد نسیم کی ان دونوں باتوں میں صداقت تو ہے لیکن آٹے میں نمک کے برابر۔ اوّل تو یہ کہ شہریار کی صاحبزادی کی شادی ان کے رشتے کے ایک سالے سے ہوئی ہے نہ کہ ان کے سگے سالے سے۔ دوم یہ کہ وہ شہریار کے شاگردوں میں سے ضرور

تھے لیکن ایسے عزیز شاگردوں میں قطعی نہ تھے کہ شہریار ان سے یہ فرماتے کہ ”مجھ سے کبھی رشتے نہ جتانا میں استادتم شاگرد یہ رشتہ میرے نزدیک سب سے بڑا ہے۔ تم جس طرح پہلے عزیز تھے آئندہ بھی رہو گے“ پہلی بات تو یہ کہ شہریار ایسی مداریوں والی زبان میں بات کرنے کا مزاج ہی نہ رکھتے تھے کہ نسیم احمد نسیم سے یوں کہتے کہ ”مجھ سے کبھی رشتے نہ جتانا میں استادتم شاگرد“۔ دوسری بات یہ کہ شہریار حقیقت پر دھول ڈال کر ایسی Loose Talk کرنے کے بھی عادی نہ تھے۔ جہاں تک نجمہ صاحبہ کا ”دینک جاگرن“ کے نمائندے سے گفتگو کرنے کا سوال ہے تو مجھے یہ لکھتے ہوئے کوئی عار نہیں کہ نجمہ صاحبہ نے دینک جاگرن کے نمائندے کو شہریار کے بارے میں جتنی ساری باتیں بتائیں وہ بعید از قیاس نہیں۔ دراصل شہریار جب شراب کے نشے میں ہوتے تھے تو تمیز کی تمام تر حدوں سے گزر جاتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کا لباس سے عاری ہو جانا، اپنی بے وفا معشوقوں کو یاد کر کے فحش لفظوں میں ان کی دھجیاں اُڑانا اور سامنے والے سے بے سروپا سوالات کر کے اسے گندی گندی گالیوں سے نوازنا ان کی ہر رات کا مشغلہ تھا۔ لیکن ان باتوں سے شہریار کی ذات کو اور ان کے ادبی مرتبے اور احترام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب دن نکل آتا اور شہریار نہادھو کر اور تیار ہو کر ڈپارٹمنٹ چلے آتے تو ان کے وجود پر ان کی رات کی حرکتوں کا ایک بھی داغ نظر نہیں آتا تھا۔ خاطر نشان رہے کہ میں یہ ساری باتیں اتنے وثوق سے اس لیے لکھ رہا ہوں کہ میں نے نہ صرف یہ کہ شہریار کی نگرانی میں اپنے ایم۔ فل کا مقالہ مکمل کیا ہے بلکہ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۷ء تک ان کے ساتھ ایک شاگرد اور رازدار دوست کی طرح دن رات کے مختلف مرحلوں کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ ان کے ساتھ کوالیٹی بار، علی گڑھ میں بیٹھ کر ”اسمال“ اور ”لارج“ کی اصطلاحیں سیکھی ہیں۔ ان کے پیالے میں نہ جانے کتنی رنگین بوتلیں خالی کی ہیں۔ ان کے کچن میں ان کے ساتھ مل کر انگنت موسمیوں اور سنگتروں کے جوس نچوڑے ہیں (؟)۔ حتیٰ کہ راتوں میں ان کی گالیوں سے بھڑک کر ان کے ساتھ جھگڑے بھی کیے ہیں۔ آج ان باتوں کو یاد کر کے آنکھیں چھلک جاتی ہیں۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ اتنی مدت میں میں نے نسیم احمد نسیم کو شہریار کے اردگرد بھی بھٹکتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نسیم احمد نسیم کا مضمون اس اعتبار سے بھی بہت کمزور اور بے قوت ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ اس فکری انسلاک کا فقدان ہے جو کسی بھی مضبوط و مستحکم مضمون کی جان ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں ہر قدم پر واقعات کی تضاد بیانیاں (مثلاً شہریار بچپن سے ہی پیشہ ور حسیناؤں کی صحبت کا حظ اٹھاتے رہے، حسن و جمال کے دلدادہ رہے لیکن بوالہوس نہ تھے، مزاجاً دبّو تھے لیکن دبّو پن ان کی کمزوری نہ تھی) جملوں کی بے ربطیاں اور زبان و بیان کی خامیاں منہ چڑھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نسیم احمد نسیم کے مضمون کا ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو۔ ”مجھے شہریار کی آنکھوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ انہیں ڈوب کر پڑھنے کا بھی تھوڑا بہت حوصلہ ہوا ہے۔ وہ جتنے بڑے فن کار تھے، اس سے کمتر انسان بھی نہ تھے۔ آج جب کہ وہ مٹی میں مل کر خاک ہو چکے ہیں۔“ مذکورہ بالا اقتباس کی دیگر کمزوریوں سے قطع نظر دوسرے جملے کی ابتدا ”انہیں ڈوب کر“ اور آخری جملے کے الفاظ ”مٹی اور خاک“ کی ”فصاحت“ قابل غور ہے۔ ایسے میں اگر پروفیسر قاضی عبدالستار اور ان جیسے دوسرے بزرگ جدید تر نسل کی زبان پر انگشت نمائی اور حرف آرائی کرتے ہیں تو کیا غلط ہے۔ ”آمد“ کا تازہ شمارہ میرے لیے اس اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے مطالعے نے میرے احساس کو یقین میں بدل دیا ہے کہ ”آمد“ کے کتابی سلسلے نے اردو کے ادبی حلقے میں ایک ایسا رجحان پیدا کر دیا ہے کہ جس کے تحت لوگ مصلحت پسندی کو پس پشت ڈال کر آزادی کے ساتھ گفتگو

کرنے کا جو کھم اٹھانے لگے ہیں۔

نوٹ : برادرم قیصر! آپ کا خط جراءت مندانہ واشگافی کا مظہر، بلکہ قدرے انکشافی نوعیت کا ہے۔ شاعری میں جمال وجلال کی کیفیات کو شناخت کرنا انتہائی نازک اور باریک مرحلہ ہوتا ہے۔ کسی شاعر کے جزوی شعری بیان کا اطلاق اس کی پوری شاعری پر کرنا مستحسن رویہ نہیں کہا جا سکتا۔ چوں کہ آپ نے خاکسار کی محض معمولی شاعری پر سوال اٹھایا ہے، اس لیے کچھ مزید کہنا مناسب نہیں، قارئین اس بابت بہتر رائے پیش کر سکتے ہیں۔ شہریار کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے محتاط روی لازمی تھی جس کا آپ نے خیال نہیں رکھا کہ بہر حال شہریار صرف محسن و مشفق استاد ہی نہیں تھے بلکہ علی گڑھ میں آپ کے گارجین کا بھی درجہ رکھتے تھے۔ (خورشید اکبر)

● باسط امام 'آمد' کے تیسرے شمارے میں ڈھیر سارا مواد آپ نے دیا ہے۔ خطوط کے کالم میں آپ کا جوابی نوٹ مزہ دیتا ہے۔ آپ کی تصویر سے بھی آپ کی ذہانت ٹپکتی ہے۔ 'آمد' کے تیسرے شمارے میں سب سے کمزور اور لایعنیت سے بھرا مضمون رؤف خیر کا ہے۔ اتنا لچر مضمون آپ نے کیسے شائع کیا۔ عنوان ہی غلط ہے۔ خسرو کے دوہا کو ریختی بتارہے ہیں اور طرفہ تماشا یہ کیا کہ زبیر رضوی کی نظم کو ریختی شمار کیا ہے۔ انشا، رنگین اور ریختی پر کتابیں اردو میں ہیں۔ رؤف خیر ایک کتاب بھی پڑھ لیتے تو ریختی کی تعریف انھیں معلوم ہو جاتی۔ تعریف تو دور، ان کے مضمون میں تاریخی غلطیاں بھی ہیں۔

☆☆☆

اعزازی کاپی بھیجنے سے ادارہ قاصر ہے۔ اس لیے 'آمد' کے مالی استحکام اور اس کے تسلسل کے پیشِ نظر خریداری قبول فرمائیں۔ ازراہِ کرم اسے اپنی ادب دوستی اور اردو نوازی پر محمول کریں۔

☆☆☆

'آمد' کے لیے غیر مطبوعہ اور معیاری تخلیقات / مضامین مطلوب ہیں۔

☆☆☆

ایجنٹ / کتب فروش حضرات توجہ دیں

آمد کی خریداری پر کمیشن :

(۱) پانچ کاپیوں تک : 20%

(۲) پچیس کاپیوں تک : 25%

(۳) پچاس یا اس سے زائد کاپیوں پر : 30%

مذکورہ شرح یک مشت خریداری کے لیے رکھی گئی ہے۔

خصوصی گزارش

جن ادبا رشعرا رقارئینِ کرام کو 'آمد' پہلے شمارے سے بھیجا جا رہا ہے ان کے زرِ تعاون کی مدت 'آمد' کے چوتھے شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ اس لیے متعلقہ حضرات سے خصوصی گزارش ہے کہ فوراً سے پیشتر تجدیدِ خریداری پر توجہ فرمائیں۔ ساتھ ہی جن احباب نے ابھی تک 'آمد' کی سالانہ رُکنیت قبول نہیں فرمائی ہے اور انھیں بدستور پرچہ ارسال کیا جا رہا ہے ان سے بھی اس سمت میں عملی پیش قدمی کی توقع ہے۔ امید کہ ہماری اپیل پر لبیک کہہ کر آپ اردو نوازی کا ثبوت فراہم کریں گے اور 'آمد' کے تسلسل کے ضامن بھی بنیں گے۔ (ادارہ 'آمد')

اشتہار

☆☆☆

- 'آمد' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔
- 'آمد' سے متعلق تنازعات کی قانونی چارہ جوئی پٹنہ کی عدالتوں میں کی جا سکتی ہے۔
- 'آمد' ایک غیر کاروباری رسالہ ہے جس سے منسلک افراد بغیر معاوضہ کے اپنی خدمات انجام دیتے ہیں۔

- ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر عظیمہ فردوسی نے کلاسک آرٹ پریس، دہلی۔۶ سے چھپوا کر آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج، پٹنہ۔۷ سے شائع کیا۔

Editor, Printer, Publisher and Proprietor Azeema Firdausi, Arzoo Manzil, Sheesh Mahal Colony, Alamganj, Patna-800007,Bihar (INDIA)

شہرِ پیام

آخری صفحہ

قارئینِ عالی مقام! آداب وسلام!!

ہم آپ سے پہلی بار مخاطب ہیں اور یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اپنے دلی جذبات واحساسات کا اظہار کس طرح کریں — آپ لوگوں نے جس طرح 'آمد' کے کتابی سلسلے کو سراہا اور پسند کیا، اس کا اعتراف لازم ہے!

'آمد' کا یہ چوتھا کتابی سلسلہ ہے جسے سالگرہ شمارہ بھی تصور کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ پہلے شمارے ہی سے ہماری کوشش رہی ہے کہ ہر شمارہ کچھ خاص اور ہٹ کر ہو، یہی سبب ہے کہ کسی بھی شمارے کو کسی الگ جہت سے مخصوص کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور یہ اچھا بھی ہوا کہ ہم قید وبند سے آزاد رہے۔

سب سے پہلے ہم معذرت خواہ ہیں ادب کے ان تمام بزرگان اور وابستگان سے، جن کی امیدوں کے خلاف 'آمد' میں بے باک اور بے لاگ تحریریں شائع کی گئیں۔ اگر ہمارے اس آزاد رویے سے کسی کو ذاتی تکلیف پہنچی ہو تو درگزر فرمائیں اور ہماری خلوص نیتی پر شک نہ کریں کہ ہم نے خود کو کسی مخصوص گروہ رخیمہ رلابی اور ادبی سیاست سے منسلک نہیں کیا ہے۔ اور آیندہ بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ غیر جانبداری ہماری اصل پونجی ہے اور کمائی بھی، جسے ہم ہر حال میں عزیز رکھنا چاہیں گے ہر چند کہ اس کے خطرات بھی کم نہیں ہیں۔

ہم چاہیں گے اور ہماری یہی کوشش بھی رہے گی کہ 'آمد' کو ہر آزاد ذہن کا آزاد پلیٹ فارم بنائے رکھا جائے اور اسے اردو کے ہر سچے اور جینوئن مصنف کا تعاون بدستور ملتا رہے۔ ہمیں کسی سے بیَر نہیں اور ہم کسی کے محکوم بھی نہیں ہیں۔ 'آمد' سب کے لیے کھلا منچ ثابت ہو اور ہر دکھی دل کی آواز بنے، یہی تمنا ہے!!

کبیرا کھڑا بزار میں سب کی مانگے کھیر (خیر)

نا کاہو سے دوستی، نہ کاہو سے بیَر [کبیر داس]

☆ طباعت اور کاغذ کی بڑھتی ہوئی قیمت کے علاوہ دیگر اخراجات کے پیشِ نظر ہمارے سامنے دو متبادل صورتیں ہیں: یا تو 'آمد' کی قیمت میں فی شمارہ پچیس ۲۵ روپے کا اضافہ کردیا جائے ریا اس کے اسی (۸۰) صفحات [ناول کے لیے مختص] کم کردیے جائیں۔ پانچویں شمارے سے ہم اس فیصلے پر عمل کرنا چاہتے ہیں لیکن اس

سے قبل مشورے مطلوب ہیں۔ آپ کے مثبت جواب کا انتظار رہے گا!

☆ اطلاعاً عرض ہے کہ 'آمد' کی کوئی مجلسِ مشاورت نہیں ہے۔ ادارت کا سارا کام بلا شرکتِ غیرے مدیرِ اعزازی خود سے انجام دیتے ہیں اور مشمولات کے سلسلے میں ان کا فیصلہ حتمی ہوتا ہے۔ ہم حسبِ ضرورت تعاون وانتظامات میں شامل رہتے ہیں لیکن بحیثیت مدیر تکنیکی اور قانونی ذمے داریوں سے خود کو بَری تصور نہیں کرتے۔

اظہارِ تشکر

● ہم بے حد شکر گزار ہیں ان تمام ادبا/شعرا/ناقدین/قارئین کے جنھوں نے دامے، درمے، سخنے، قدمے، عملے اور قلمے 'آمد' کی معاونت فرمائی!

● ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے بہت مسرت ہو رہی ہے کہ اردو کے ایک سچے اور بے لوث بہی خواہ **جناب جلال کاکوی** (آسنسول)، جو ادب و شعر سے بھی گہرا شغف رکھتے ہیں، نے غیر مشروط طور پر بیس ہزار روپے کی خطیر رقم سے 'آمد' کی مالی اعانت فرمائی ہے۔ اللہ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین!

● ہم خصوصی طور پر زبیر رضوی صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اپنے رسالہ ''ذہنِ جدید'' (شمارہ نمبر ۶۲، بابت: دسمبر ۲۰۱۱ء تا فروری ۲۰۱۲ء) میں 'آمد' کی اشاعت کا خیر مقدم کیا۔

● ہم ممنونِ احسان ہیں محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے، جنھوں نے 'خبرنامہ شب خون'' (نمبر ۱۷، بابت: فروری تا اپریل ۲۰۱۲ء) میں 'آمد' ۲ کے چند ''عبرت انگیز اور خندہ آور'' خطوط (بقولِ فاروقی) کو شائع فرما کر اپنی ادبی خوش مذاقی کا ثبوت فراہم کیا اور 'آمد' کے 'رفت' ہونے کی دعائیہ پیشین گوئی بھی فرمائی۔ (اللہ انھیں تا دیر قائم رکھے، آمین!)

● اردو کے معروف شاعر اور فلم گیت کار شکیل اعظمی (ممبئی) مسلسل 'آمد' کی توسیعِ اشاعت کے لیے کوشاں ہیں، یہ ان کا خاص کرم ہے۔ اللہ انھیں سلامت رکھے، آمین!

● ہم اردو کے ان مصنّفین کی خوش حالی اور فارغ البالی کے لیے بھی دعا گو ہیں جنھوں نے خیمہ پسندیوں اور مشروط وفاداریوں کے زیرِ اثر 'آمد' کو تاہنوز اپنی نگارشات سے محروم رکھا ہے۔

● ہم اردو کے ان تمام سرکاری/نیم سرکاری/رضا کار اداروں کے بھی دل سے ممنون ہیں جن کی طرف سے اب تک 'آمد' کے مالی استحکام اور فروغ کی کوئی معقول سبیل پیدا نہیں کی جا سکی!!

● ہم تمام محبانِ اُردو اور مخلصینِ زبان و ادب کے احسان مند ہیں اور ہمارے حوصلے بلند ہیں کہ ہم انھیں امید بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں...............!!!!!!

آج اتنا ہی ـــــ باقی آیندہ! والسلام

پٹنہ
۲۸؍ جون ۲۰۱۲ء

عظیمہ فردوسی (مدیر)
بہ شمول جملہ اراکین و متعلقینِ 'آمد'